دیوی

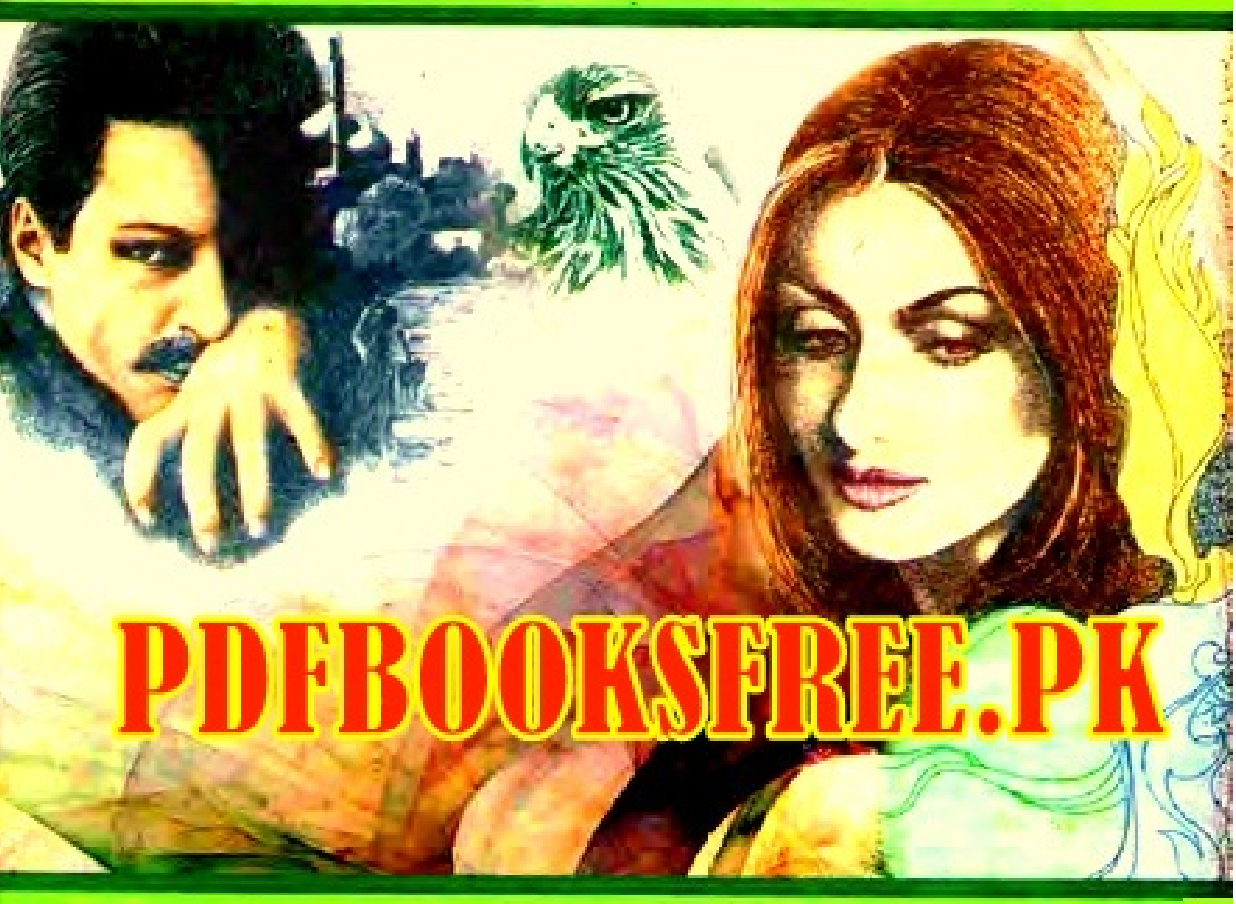

PDFBOOKSFREE.PK

طاہر جاوید مغل

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اول ——— ۲۰۰۹ء
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— عاطف کمپوزر۔ لاہور
قیمت ——— ۲۵۰ روپے

ISBN 978-969-517-282-7

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

کسی نے عقب سے دو زوردار ٹھوکریں رستم کی پشت پر ماریں مگر لگا کہ یہ ٹھوکریں رستم کو نہیں کسی اور کو ماری گئی ہیں۔ وہ بدستور شانی کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اس کے سیاہ ہونٹوں میں حرکت پیدا ہوئی وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا مگر آواز شانی کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ آواز شانی تک پہنچانے کی جدوجہد میں اس کے گلے کی رگیں پھول گئیں۔ رستم کی گردن پر دو تین گہرے زخم تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان زخموں نے اس کے بولنے کی صلاحیت متاثر کی ہے۔ شانی اس طرف کچھ اور جھک گئی۔

کچھ نوجوان لڑکے کہیں سے ایک گدھا گھیر کر لے آئے۔ شور بلند ہو رہا تھا۔ ''گدھے پر بٹھاؤ..... منہ کالا کرو۔'' جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔

چوہدری کے کارندوں کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ گدھے کی پشت پر چوبی پالان بندھا ہوا تھا..... اسے کھولا جانے لگا۔ کچھ لڑکے گدھے کے گلے میں ڈالنے کے لئے رسی تلاش کرنے لگے۔

دوسری طرف چار آنکھیں ایک دوجے کو دیکھ رہی تھیں۔ رستم نے ایک بار پھر اپنے سینے کی پوری قوت صرف کرتے ہوئے اپنی آواز شانی کے کانوں تک پہنچانی چاہی۔ اس کے ہونٹوں سے بس بیٹھی ہوئی ایک مدھم سرگوشی ہی نکل پائی۔ ''بی بی..... آپ..... کیوں آئیں؟''

وہ سسکی۔ ''تم بڑے ظالم ہو رستم..... تم مارتے ہو..... اور رونے بھی نہیں دیتے۔''

وہ پھر بے حد قوت صرف کر کے بہت مدھم آواز میں بولا۔ اس مرتبہ اس نے کل پانچ الفاظ کہے۔ پانچ الفاظ کا ایک انوکھا اور بظاہر بے معنی جملہ۔ اس نے کہا ''بی بی..... آپ..... میرے ساتھ چلیں۔''

وہ شدت سے رونے لگی...... وہ بے اختیار تھی...... وہ اس سے بڑھ کر بے اختیار تھا اور وہ یوں جانے کی بات کر رہا تھا جیسے ابھی تک انیکسی کے کمرے میں..... رات کے سناٹے میں بیٹھا ہو۔ وقت کی ساری راسیں اس کے ہاتھ میں ہوں۔

شانی نے ہمت کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور سرتاپا کانپ گئی۔ پوری جان سے لرز گئی۔ زخم زخم رستم کی اشک بار آنکھیں شاید وہی بات کہہ رہی تھیں جو اس نے کچھ عرصہ پہلے انیکسی کے کمرے میں کہی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ''بی بی! چوہدریوں کے یہ دو ٹانگوں والے کتے گنتی میں دوگنا یا تین گنا بھی ہوں تو میں انہیں چیر کر نکل جاؤں گا۔ یہ دروازے، یہ دیواریں اور یہ بندوقڑیاں ہمارا راستہ نہیں روک سکتیں۔ آپ بس ایک بار چلنے کی ہامی بھریں، پھر دیکھیں میں ان کرائے کے ٹٹوؤں کو کس طرح ادھیڑ کر نکلتا ہوں۔''

شانی نے دیکھا، رستم کے ماتھے اور گلے کی رگیں پھولتی جا رہی ہیں۔ اس کے اعضا میں سختی پیدا ہو رہی ہے۔ ایک عجیب ہیجانی کیفیت بتدریج اسے اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ اس کے زخمی ہونٹوں نے ایک بار پھر زخمی سرگوشی کی۔ ''بی بی جی...... آؤ...... یہاں سے چلے جائیں۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''کیسے جاؤ گے رستم..... کیسے جاؤ گے۔ یہ تو تمہیں دو قدم نہیں چلنے دیں گے۔ ابھی...... اسی جگہ مار دیں گے۔''

''نہیں بی بی!'' اس نے بڑے کرب سے نفی میں سر ہلایا۔ خون اس کی باچھوں سے بہہ رہا تھا اور اس کے دائیں کان سے ٹپک رہا تھا اور پتا نہیں کہاں کہاں سے رس رہا تھا۔

''نہیں رستم...... یہ فلم نہیں ہے۔ یہ زندگی ہے..... یہ بڑی ظالم ہے...... یہ مار دے گی۔ ابھی دو منٹ میں ہم دونوں کو ختم کر دے گی۔''

اس کی آنکھوں میں جنون تھا لیکن اس جنون میں عجیب سا ٹھہراؤ تھا جیسے مہیب سمندر اوپر سے پُرسکون ہوتے ہیں۔ اس نے عجیب ڈرامائی لہجے میں نہایت مدھم سرگوشی کی۔

''بی بی! بس ایک بار میرا...... ہاتھ پکڑ لیں۔ بس ایک بار...... پھر...... میں رکوں گا نہیں۔''

اس نے اپنا خون آلود کمزور ہاتھ شانی کی طرف سرکا دیا۔ ہواؤں میں اس کے فقرے کی گونج تھی۔ ''پھر میں رکوں گا نہیں..... پھر میں رکوں گا نہیں۔''

شانی ششدر تھی۔ وہ جانتی تھی، کیا ہونے والا ہے۔ اگلے چند سیکنڈ میں ان دونوں کے ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ رستم اپنی پوری قوت سے تڑپا پھڑکتا تو بھی دو چار بندوں کو گھائل کر سکتا

تھا۔ اس کے بعد وہی ہونا تھا جو حقیقت میں ہوتا ہے...... اور جو افسانوں میں نہیں ہوتا۔

وہ عقل کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی اور ٹھیک دیکھ رہی تھی لیکن کوئی دوسرا عشق کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا اور شاید وہ اپنے طور پر ٹھیک دیکھ رہا تھا۔

چند سیکنڈ صدیوں پر بھاری تھے۔ یہ قیامت کی کشمکش تھی۔ عقل کے پاؤں ٹھوس زمین پر تھے اور مضبوطی سے جمے ہوئے تھے مگر عشق کی بلاخیزی پہاڑی دریاؤں کا مزاج رکھتی ہے۔ یہ پاؤں ٹکنے نہیں دیتی۔ یہ دلیل اور منطق کی دھجیاں اُڑا دیتی ہے۔ آگ میں کودتی ہے۔ کچے گھڑے پر تیر جاتی ہے۔ شانی کے جسم و جاں میں ایک عجیب بے نام لہر اٹھی۔ اس لہر نے اسے گردوپیش سے یکسر بے گانہ کر دیا۔ اس نے روتے روتے اپنا ہاتھ ہولے سے بڑھایا اور رستم کے زخمی ہاتھ میں دے دیا۔

کائنات کی گردش جیسے تھوڑی دیر کے لئے رک گئی...... اور ساتھ ہی شاید شانی کا دل بھی۔ وہ چند سیکنڈ تک زمان و مکاں کی قیود سے آزاد تھی۔ پھر شانی نے رستم کا ہاتھ اٹھایا اور بے ساختہ اپنے ہونٹوں سے لگا کر چوم لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح گرے اور رستم کے ہاتھ پر پھسل گئے۔ اس ہاتھ پر زخم تھے، چوٹیں تھیں اور سگریٹ سے داغے جانے کے نشان تھے۔ شانی نے اس ہاتھ اور کلائی کو کئی جگہ سے چوما اور اسے اپنے گھٹنے پر رکھ کر اس پر اپنا رخسار رکھ دیا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہونے والا تھا، وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ دیکھنے کی سکت ہی نہیں رکھتی تھی۔ وہ بس مر جانا چاہتی تھی بڑی جلدی کے ساتھ۔ اس نے اپنی آنکھوں میں مُنے کی تصویر سجائی تھی اور جان لیوا ضربیں سہنے کے لئے تیار تھی۔

چند سیکنڈ بعد اس نے محسوس کیا کہ رستم کا ہاتھ ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے ہاتھ سے جدا ہو گیا ہے۔ شاید رستم نے خود ایسا کیا تھا یا کسی نے اسے کھینچ لیا تھا۔ اس کے بعد جو آوازیں شانی کے کانوں تک پہنچیں، ان سے پتا چلا کہ رستم ایک وحشی چنگھاڑ کے ساتھ کسی سے ٹکرایا ہے۔ چند چیخیں بلند ہوئیں، چند للکارے گونجے۔ شانی کو اپنے اردگرد گھمسان کا رن پڑتا محسوس ہوا۔ اس نے آنکھیں نہ کھولنے کی قسم کھا رکھی تھی لیکن وہ اس قسم کو نبھا نہ سکی۔ اس نے دیکھا گیس کے ہنڈولوں اور بلیوں اور بانسوں سے لگی ہوئی ٹیوب لائٹوں کی روشنی میں رستم کسی خون آلود عفریت کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنے قریب موجود کسی چوہدری کے ہاتھ سے چھوٹے دستے کی کلہاڑی چھین لی تھی اور اب دیوانہ وار اسے چلا رہا تھا۔ جو

سامنے آ رہا تھا، زخم کھا رہا تھا اور گر رہا تھا۔ شانی اور رستم کے گرد لوگوں کا حلقہ جو کچھ دیر پہلے بہت تنگ ہو گیا تھا، اب وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ ایک ہولناک ہراس تھا جو اس مختصر سی جگہ پر پھیل گیا تھا۔ یوں نظر آتا تھا کہ تماشے کی خاطر ہجوم میں لایا جانے والا کوئی خونی جانور اچانک آزاد ہو گیا ہے۔ پھر رستم نے اچانک تڑپ کر ایک گری ہوئی رائفل اٹھا لی...... وہ اس رائفل کو سیدھا کرنا چاہ رہا تھا...... مگر اس کے لئے مہلت درکار تھی۔ اس کے سینکڑوں دشمن اسے اتنی مہلت دینے کو ہرگز تیار نہیں تھے۔ شدید ہراس کے چند سیکنڈ گزر گئے تھے۔ قادرے نے جیسے ہوا میں جست لگاتے ہوئے نیم جان رستم کو عقب سے دبوچ لیا اور گھما کر زمین پر دے مارا۔ رستم، شانی کے قریب گرا تھا۔ اس نے شانی کا ہاتھ تھام لیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ شانی کو لے کر یہاں سے نکل جانا چاہتا ہے۔ یہ آنکھیں بند کر کے چناب میں کود جانے والی دیوانگی تھی اور دیوانگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ ابھی رستم پوری طرح اٹھا بھی نہیں تھا کہ درجنوں افراد اس سے چمٹ گئے۔ رائفل پکے پھل کی طرح اس کے "ہاتھ کی شاخ" سے جدا کر لی گئی۔ اسے مارا اور گھسیٹا جانے لگا مگر اس کا ہاتھ بدستور شانی کی کلائی پر تھا۔ کئی افراد شانی کا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگے مگر یہ انسان کی گرفت نہیں تھی۔ یہ جذبے کی گرفت تھی اور جذبہ بھی وہ جو اپنی مثال آپ ہے۔ وہ شانی کا ہاتھ نہیں چھڑا سکے۔ وہ رستم کے ہاتھ پر ایک ٹوٹی ہوئی لاٹھی کی ضربیں لگانے لگے۔ اس کے بازو کو نوچنے کھسوٹنے لگے اور گرفت کمزور کرنے کے لئے اسے دانتوں سے کاٹنے لگے لیکن وہ ہاتھ...... وہ کمزور ہاتھ شانی کی کلائی پر جما رہا۔ ہاں...... جی دار مرد جب اپنی محبوبہ کا ہاتھ تھامتا ہے تو پھر یہ گرفت مستقل ہوتی ہے۔ لاؤڈ سپیکر پر آواز پکار رہی ہے۔

ڈونگے پانیاں دے وچ دیوے پئے بلدے
مقدراں دے لکھے ٹل نئیوں سکدے

شانی کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ اپنے اردگرد قیامت کا شور سن رہی تھی۔ رستم کو یوں مارا جا رہا تھا جیسے وہ گوشت پوست کا انسان نہیں ربڑ کا پتلا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنی کمزور مزاحمت جاری رکھے ہوئے تھا جیسے مزاحمت نہ کر رہا ہو، اتمام حجت کر رہا ہو۔ ان کے اردگرد جو شور تھا اس کی نوعیت اب بدل گئی تھی۔ للکاروں کا آہنگ اور ہو گیا تھا۔ جملے بھی نئے تھے۔ ان جملوں میں اب پولیس کا ذکر نہیں تھا۔ فوری سزائے موت کا ذکر تھا۔

ایک موٹی بھدی آواز گونجی۔ "مار دو ان زانیوں کو۔ اسی جگہ ٹوٹے کر دو۔"

ایک دوسری آواز نے تائید کی۔ "ہاں مار دو، پار کر دو دونوں کو۔"

فضا کی سنسنی خیزی یک لخت ہی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ شانی کی آنکھیں بند تھیں مگر وہ ان بند آنکھوں سے ہی نار پوری چوہدریوں کے وحشت سے بگڑے ہوئے چہرے اور ان کی شعلہ بار آنکھیں دیکھ رہی تھی۔ مشتعل ماحول نے چوہدریوں کو یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ اسی جگہ اسی وقت اپنے کلیجے ٹھنڈے کر لیں۔ اسے اور رستم کو مار کر اور لاشیں گلیوں میں گھسیٹ کر اپنے خونی انتقام کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیں۔ انہیں کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان کی راہ میں آ سکے۔ یقیناً اس بپھرے ہوئے ہجوم میں کچھ لوگ مختلف سوچ بھی رکھتے ہوں گے۔ دو چار ایسے بھی ہوں گے جو رستم اور شانی پر رحم کھا رہے ہوں گے۔ شاید ان سب میں بابر بھی ہو۔ میانہ کا چھوٹا مالک بھی ہو...... لیکن انتقام کے اس چیختے چنگھاڑتے طوفان میں ان کی آوازیں کچھ معنی نہیں رکھتی تھیں۔ شاید اسی لئے وہ بھی خاموش ہو گئے تھے۔

لیکن ظلم تو ظلم ہوتا ہے، بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ خون تو خون ہوتا ہے، ٹپکتا ہے تو جم جاتا ہے۔ جب فرعون خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو ایک موسیٰؑ ضرور اس کے دعوے کو با آواز بلند رد کرتا ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ یہی خدا کا نظام ہے۔ یہی فطرت کا تقاضا ہے۔ نار پور کے چوہدری جب شانی کا ہاتھ کسی صورت رستم کے ہاتھ سے نہیں چھڑا سکے تو ایک للکارتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ "رک جا چوہدری قادرے، رک جا، پیچھے پلٹ جا۔"

ساعت شکن شور و غل چند لمحے کے لئے تھما۔ آواز نے پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ کہا۔ "قانون کو اپنے ہتھ میں نہیں لینے دیں گے یہ ظلم ہے، یہ ناانصافی ہے...... یہ نہیں ہونے دیں گے۔"

"ہاں، یہ نہیں ہونے دیں گے۔" کئی آوازوں نے پہلی آواز کا ساتھ دیا۔

"یہ کون لوگ تھے؟ یہ کیا کہہ رہے تھے؟" شانی نے ڈوبتے ذہن کے ساتھ سوچا۔

شاید یہ وہی لوگ تھے جن کو قدرت جابروں کے سامنے کلمۂ حق کہنے کے لئے کھڑا کرتی ہے۔ قدرت انہیں وسیلہ بناتی ہے اور اپنے ہونے کا اظہار کرتی ہے۔

پہلی آواز نے ایک بار پھر للکار کر کہا۔ "قانون سب کے لئے ایک سا ہونا چاہئے۔ چوہدری! اس بندے کو چھوڑ دو۔"

"تم قانون کے مامے مت بنو۔ مارے جاؤ گے۔" ایک چوہدری گرجا۔

"زیادہ زور سے چلاؤ گے تو جھوٹ سچ نہیں ہو جائے گا چوہدری!" پہلی آواز گرجی۔

"ہماری پردہ دار عورتوں کے ساتھ تمہارے پتر منہ کالا کریں گے تو یہ ہماری عورتوں کی قسمت...... اگر تمہاری عورت کے ساتھ ایک ڈاکو نے رشتہ جوڑا ہے تو وہ موت کا حق دار

ہے..... واہ واہ..... کیا بات ہے۔ کتنا کھرا انصاف ہے۔ تجھے تو وڈی کچہری کا جج ہونا چاہئے تھا چوہدری حشامے۔'' آواز میں بے پناہ زہر تھا۔

یہ زہر بھری آواز کس کی تھی؟ پھر شانی نے پہچان لیا۔ یہی زہر بھری آواز جواں سال صفیہ کی موت کے بعد تاؤ حشام کی حویلی میں گونجی تھی۔ بعد میں نوکرانی حمیدہ نے شانی کو بتایا تھا کہ یہ صفیہ کے چاچے کی آواز ہے۔ ہاں، یہ وہی آواز تھی۔ آج اس میں پہلے کی نسبت سوگنا زیادہ زہر تھا اور آج یہ آواز اکیلی بھی نہیں تھی۔ بیسیوں دیگر آوازیں اس کے ساتھ شامل تھیں۔ ایک بلند لہر تھی جو لہروں کے درمیان سے اٹھی تھی اور زور پکڑتی جا رہی تھی۔

ہاں..... صفیہ مر جاتی ہے لیکن..... مارنے والوں کے ہاتھوں پر اس کا خون چمکتا رہتا ہے اور یہ خون صرف قاتلوں کے ہاتھ پر ہی نہیں جمتا، پورے معاشرے کے ہاتھوں پر جمتا ہے۔ یہ اپنی جگہ موجود رہتا ہے اور انصاف طلب کرتا رہتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے شانی کے اردگرد شور وغل کے سارے زاویے اور آہنگ بدل گئے۔ اسے یوں لگا جیسے دو متحارب گروہ پوری شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے ہیں۔ چاروں طرف زلزلے کی کیفیت محسوس کر کے شانی نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ خدا کی پناہ ناقابلِ یقین منظر تھا۔ لاٹھیاں چل رہی تھیں۔ سر پھٹ رہے تھے۔ کلہاڑیوں کے پھل بڑی بے رحمی کے ساتھ جسموں سے ٹکرا رہے تھے۔ شانی نے اپنے عین سامنے ایک شخص کے چہرے پر کلہاڑی کا بلیڈ لگتے دیکھا۔ اس کی سانولی پیشانی سے خون کا فوارہ چھوٹا اور وہ ڈکراتا ہوا دو ٹیوب لائٹوں پر گر کر انہیں چکنا چور کر گیا۔ تین افراد ایک شخص کو لاٹھیوں سے دیوانہ وار پیٹ رہے تھے اور وہ منحنی سے بڑے بڑے تھالوں پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ شانی نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔ ایک چوہدری کی انتڑیاں پیٹ سے باہر تھیں اور وہ لڑنے والوں کے قدموں تلے مٹی کی طرح روندا جا رہا تھا۔

شانی کا ہاتھ ابھی تک رستم کے خون آلود ہاتھ میں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ ہاتھ شانی کے جسم کا حصہ بن چکا ہے۔ شانی کو رستم کے دائیں ہاتھ میں ایک کمانی دار چاقو دکھائی دیا۔ چوہدری قادرے کی طرف سے کیا جانے والا کلہاڑی کا ایک طوفانی وار رستم نے جھک کر بچایا اور چاقو دستے تک اس کے پیٹ میں گھسیڑ دیا۔ قادرا چلا کر دہرا ہوا اور پھر اوندھے منہ گر گیا۔ تماشے کے لئے لایا جانے والا گدھا قادرے کو تقریباً لتاڑتا ہوا کسی جانب نکل گیا۔ دو کلہاڑی بردار یہ منظر دیکھ کر بڑی وحشت سے رستم پر جھپٹے لیکن اس سے پہلے کہ وہ پہنچتے، کمبوہ برادری کے دو لٹھ بازوں نے انہیں روک لیا۔ اسی دوران میں رستم نے ایک اور شخص کو بڑی وحشت

سے زخمی کیا اور شانی کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا مزار کی طرف بڑھا۔

شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس طرف کیوں جا رہا ہے لیکن وہ اس کے ساتھ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر حقیقت اس پر واضح ہوئی۔ ایک سٹارٹ جیپ پر کمبوہ برادری کے تین افراد کھڑے تھے اور رستم کو پکار پکار کر اپنی طرف بلا رہے تھے۔ یہ ایک کھلی جیپ تھی۔ چند ہی سیکنڈ میں رستم اور شانی دونوں جیپ پر تھے۔ تڑتڑ کی خوفناک آواز سے فائرنگ ہوئی۔ جیپ میں موجود ایک کمبوہ پٹ سے جیپ کے فرش پر گرا۔ اس کے ساتھ ہی رستم بھی دہرا ہو گیا۔ شانی کے دماغ میں فوراً آیا کہ رستم کو گولی لگ گئی ہے، تاہم چند لمحے بعد رستم سیدھا ہوا تو یہ بھیانک خیال غلط ثابت ہوا۔ رستم کے ہاتھ میں مضروب کمبوہ کے ہاتھ سے گرنے والا ماؤزر تھا۔ اس نے ماؤزر سیدھا کیا اور پلٹ کر کئی فائر کئے۔ شانی ایک بار پھر آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس نے جیپ کی طرف بڑھنے والے دو تین کلہاڑی برداروں کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔ جیپ ایک طوفانی جھٹکے سے آگے بڑھی۔ شانی اور رستم دونوں فرش پر گر گئے۔ یہ ان کے حق میں اچھا ہی ہوا تھا۔ وہ وہیں گرے رہے۔ جیپ نے کئی شامیانوں کے بانس اکھاڑے اور توڑے..... اور قرب و جوار کو تاریکی میں ڈبوتی ہوئی مزار کی مخالف سمت میں بڑھی۔ مزار کے اردگرد ساعت شکن شور تھا اور فائرنگ کی پُرہول آوازیں تھیں۔ شانی نے دیکھا ماؤزر رستم کے دونوں ہاتھوں میں بڑی مضبوطی سے تھما ہوا ہے اور لمبے بالوں کے اندر سے اس کی آنکھیں یوں چمک رہی ہیں جیسے جھاڑیوں میں کوئی خوفناک درندہ گھات لگائے بیٹھا ہو۔ وہ عقب میں دیکھ رہا تھا۔

☆======☆======☆

شانی اور رستم ایک جھونپڑا نما مکان میں موجود تھے۔ اس میں تین کمرے تھے۔ ایک برآمدہ اور ایک کھلا سا صحن تھا۔ یہ بستی ایک بڑے ڈیک نالے کے کنارے کنارے دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ شانی اور رستم کو یہاں تک لانے والے افراد نے اپنی کھٹارا جیپ کافی دور درختوں کے درمیان چھوڑ دی تھی اور پیدل یہاں تک پہنچے تھے۔ ان تین افراد میں سے ایک کی ٹانگ میں گولی لگی تھی اور اسے اٹھا کر بستی تک لایا گیا۔ باقی دو افراد میں سے ایک نہایت ٹھٹھے ہوئے جسم اور گھنگریالے بالوں والا تیس بتیس سالہ شخص تھا۔ اس کے دونوں کانوں میں سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں۔ اس نے دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا۔ اس کی شخصیت رعب دار اور متاثر کن تھی۔ اس کا ساتھی ستائیس اٹھائیس سال کا چھریرے بدن والا شخص تھا۔ اس کا رنگ اپنے ساتھی کی نسبت صاف تھا اور ناک کا بانسا بھی کافی اونچا تھا۔ شانی کو پتا چلا کہ یہی

صفیہ کا چاچا عارف کمبوہ ہے۔ اس کے چہرے پر وہی تمتماہٹ اور چمک تھی جو انقلابی سوچ رکھنے والے نوجوانوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ سونے کی بالیوں والا سانولا شخص اور عارف کمبوہ دوست ہیں اور فی الوقت شانی اور رستم ''سانولے شخص'' کی بستی میں مہمان کی حیثیت سے موجود ہیں۔

میلے کے خونریز ہنگامے سے اس بستی تک پہنچنے کا سفر قریباً ایک گھنٹے میں طے ہوا۔ یہ سارا کچے کا سفر تھا۔ اس جھونپڑا نما مکان میں بھی شانی اور رستم کو قریباً ایک گھنٹہ ہو چلا تھا۔ شانی کے اندازے کے مطابق یہ رات نو بجے کا وقت تھا۔ رات تاریک و نیم سرد تھی۔ کمرے میں ایک لالٹین روشن تھی۔ کچے فرش پر کھجور کی ایک بڑی چٹائی بچھائی گئی تھی۔ دو عدد بان کی چارپائیاں دیوار کے ساتھ کھڑی تھیں۔ ایک کونے میں تین جستی ٹرنک تھے۔ ایک پر چھتی پر المونیم کے برتن اور گھنیا چینی کی پلیٹیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ کھڑکی کے پاس بہت سے چھاج، چنگیر اور ٹوکرے دھرے تھے..... جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس گھر کے رہنے والے سرکنڈوں سے ایسی اشیاء بنانے کا کام کرتے ہیں۔

عارف کمبوہ اور اس کا گٹھیلے جسم والا مسلح ساتھی شانی اور رستم کو تسلی دینے اور کچھ ضروری اشیاء فراہم کرنے کے بعد کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ باہر جاتے ہی انہوں نے رکھوالی کے کتے چھوڑ دیئے تھے اور بستی کے پہرے داروں کو چوکس کر دیا تھا۔ اب شانی اور رستم اس نیم روشن کمرے میں تنہا تھے۔ رستم چٹائی پر بیٹھا تھا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ دونوں گھٹنے اوپر اٹھے ہوئے تھے اور پیشانی گھٹنوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ شانی کو اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس لمبے خون آلود بال ہی نظر آتے تھے۔ رستم نے جیب سے جو ماؤزر اٹھایا تھا وہ اب اس کے پہلو میں دھرا تھا۔

شانی بہت دیر تک اپنے اندر حوصلہ جمع کرتی رہی پھر اس نے ہولے سے کہا۔ ''رستم!''

''جی بی بی جی!'' اس نے گھٹنوں میں سر جھکائے جھکائے بے حد بھرائی اور بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں نے بہت دکھ دیا ہے تمہیں۔''

اس نے نفی میں سر کو جنبش دی۔

''میں خود کو اس قابل بھی نہیں سمجھتی کہ تم سے معافی مانگ سکوں۔''

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''خدا کے لئے بی بی!'' اس کے ہونٹوں سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

''رستم! میں خون خرابے کو روکنا چاہتی تھی۔'' وہ دل فگار آواز میں بولی۔ ''مجھے ڈر تھا رستم کہ چوہدری بشیر کے ساتھ تمہاری لڑائی ہو جائے گی۔ تم چوہدری کو مار دو گے۔ پھر کوٹھی کے لوگ تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مم..... مجھے مُنے کا بھی ڈر تھا۔ اگر انیکسی میں گولیاں چلتیں تو وہ معصوم بھی لپیٹ میں آ جاتا..... مم..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں نے تمہارے پستول سے گولیاں.....'' وہ کوشش کے باوجود بات مکمل نہ کر سکی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

چند سیکنڈ تک خاموش رہنے کے بعد اس نے پھر سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''رستم! مجھ سے جو کچھ ہوا وہ کسی اور کے لئے نہیں تھا صرف مُنے کے لئے تھا۔ مُنے کی زندگی کے لئے تھا اور شاید تھوڑا بہت بھابو کے لئے تھا۔ میری اس غلطی کے لئے تم جو چاہو سزا مجھے دے سکتے ہو۔ میں اُف نہیں کروں گی..... اور میں صرف بات ہی نہیں کر رہی، میں دل و جان سے ہر کفارے کے لئے تیار ہوں۔ یہ ماؤزر تمہارے سامنے پڑا ہے۔ بے شک مجھے گولی مار دو۔''

''خدا کے لئے بی بی..... خدا کے لئے۔'' اس نے ایک بار پھر بے قراری سے نفی میں سر ہلایا۔ چہرہ بدستور گھٹنوں میں چھپا تھا۔

''میں جانتی ہوں رستم! تمہارے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ تمہیں بدترین ذہنی اور جسمانی تکلیفیں دی گئی ہیں اور یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں گناہ گار ہوں تمہاری۔ مجھے بتاؤ رستم! میں کیسے مداوا کر سکتی ہوں۔ کس طرح تمہارے زخموں پر مرہم رکھ سکتی ہوں..... تم جو کہو رستم! میں کرنے کے لئے تیار ہوں اور میں جانتی ہوں، سب کچھ کرنے کے بعد میں بھی کچھ نہ کر سکوں گی، کچھ بھی نہیں رستم!''

ایک سسکی رستم کے گھٹنوں کے عقب سے بلند ہوئی۔ اس نے اپنا چہرہ اٹھایا۔ خدا کی پناہ! اس کے چہرے پر دنیا جہاں کا کرب سمٹ آیا تھا۔ آنکھیں انگارہ تھیں۔ آنسو آتشیں سیال کی طرح سُرخ آنکھوں سے اتر کر خون آلود داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ پیشانی کی رگ جیسے بے پناہ اذیت کے زیر اثر تڑپ رہی تھی۔ اس نے شانی کی طرف دیکھا اور بڑی عاجزی سے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''نہ بی بی!'' اس کے زخمی ہونٹ بس اتنا ہی کہہ سکے۔

ان دو الفاظ میں اذیت، منت سماجت، التجا اور فریاد کے سارے رنگ سمٹ آئے تھے۔

شانی نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور انہیں رخسار سے لگا کر ان پر اپنے آنسو گرانے لگی۔ اس کا سارا جسم لرزاں تھا۔ اچانک شانی کی نگاہ چٹائی پر پڑی۔ خون کے دو تین قطرے پُپ سے کھجور کی چٹائی پر گرے..... پھر ایک اور گرا۔ یہ خون رستم کے سر سے رس رہا تھا۔ یوں تو اس کے جسم پر کئی زخم تھے، تاہم سر کا کوئی زخم ابھی تک خون اگل رہا تھا۔ شانی نے

اس کے لمبے بالوں میں سے خون کا ماخذ ڈھونڈنا چاہا مگر ناکام رہی۔ سارے بال خون میں لتھڑے تھے اور سر سے چپکے ہوئے تھے۔ عارف کمبوہ جو چیزیں اس کمرے میں رکھوا گیا تھا ان میں گرم دودھ کا جگ، مکئی کی روٹی، گرم پانی کی بالٹی، ٹھنڈے پانی کی بالٹی، زخموں پر لگانے کے لئے ایک دیسی مرہم، روئی اور پٹیاں وغیرہ شامل تھیں۔

جب شانی رستم کے سر کا خونچکاں زخم ڈھونڈنے میں ناکام ہوئی تو اس نے گرم پانی میں تھوڑا سا ٹھنڈا پانی ملا کر اسے نیم گرم کیا۔ بالٹی کا باقی ٹھنڈا پانی اس نے ایک گھڑے میں انڈیل دیا۔ ٹھنڈے پانی والی خالی بالٹی اس نے رستم کے سامنے رکھ دی۔ وہ اس کا سر دھونا چاہتی تھی۔ رستم کے چہرے پر شدید ہچکچاہٹ کے آثار تھے مگر شانی کا مصمم ارادہ اور دوٹوک رویہ دیکھ کر اسے اپنی ہچکچاہٹ پر قابو پانا پڑا۔ شانی نے بڑی نرمی اور احتیاط سے رستم کا سر دھویا۔ سر کے وسط اور عقب میں دو زخم زیادہ گہرے تھے۔ ایک زخم کو تو ''اسٹچنگ'' کی ضرورت تھی مگر یہ سہولت یہاں میسر نہیں ہوسکتی تھی۔ مقامی طریقہ کار کے مطابق شانی نے ایک انگیٹھی میں سے کچھ راکھ لے کر ان زخموں سے خون کا اخراج بند کیا اور پھر ایک چوڑی پٹی ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر باندھ دی۔ سر کے عقبی زخم کے لئے ایک پٹی کو سر کے گرد بل دینا پڑا۔ اس پٹی نے پیشانی کے ایک زخم کو بھی ڈھانپ لیا۔ یہ سب کرتے ہوئے شانی نے اپنی دودھیا کلائی کے نیل کو چھپائے رکھا تھا۔ یہ نیل کسی کی ناقابل شکست گرفت کی نشانی تھی۔ رستم کی قمیص دھجیوں کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ یہ دھجیاں شانی نے رستم کے جسم سے علیحدہ کردیں۔ رستم کی کمر دیکھ کر آنسوؤں کا ایک آبشار شانی کے حلق میں گرنے لگا۔ اس کا دل چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے مگر ایسا کر کے وہ ماحول کو گھمبیر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے صاف روئی نیم گرم پانی میں بھگوئی اور بڑی احتیاط سے رستم کی کمر کو خون آلود گرد سے صاف کیا پھر وہ اپنی انگلیوں کی پوروں سے زخموں پر راکھ اور مرہم لگاتی گئی۔ ایک دو جگہوں پر اسے پٹی بھی باندھنا پڑی۔ جسم کی اندرونی چوٹوں اور پٹھوں کی ٹوٹ پھوٹ کا اس کے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔

جب وہ رستم کی پنڈلیوں اور پاؤں کی چوٹوں کی طرف آئی تو وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ اب یہ سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہوگیا ہے۔ وہ شانی کو اپنی خدمت گزاری کرتے ہوئے مزید نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے اصرار کے ساتھ روئی اور مرہم وغیرہ شانی کے ہاتھ سے لے لئے۔

شانی نے اسے دودھ پلایا۔ وہ روٹی کے چند لقمے بھی دینا چاہتی تھی، تاہم اسے اندازہ

ہوا کہ رستم کے گلے کی اندرونی چوٹیں زیادہ سنگین ہیں۔ دودھ جیسی رقیق چیز بھی اسے حلق سے اُتارنا مشکل ہو رہی تھی۔ وہ بمشکل چند الفاظ بول سکتا تھا۔ شانی نے کہیں پڑھا تھا کہ گلے کے اندر ایک صوتی خانہ (ساؤنڈ بکس) ہوتا ہے۔ اسے نقصان پہنچے تو بندے کی گویائی متاثر یا سلب ہوسکتی ہے۔ رات دھیرے دھیرے سرکتی رہی۔ شانی اپنے آنسو خاموشی سے حلق میں گراتی رہی اور پارہ پارہ رستم کی دیکھ بھال میں مصروف رہی۔

شانی اور رستم نے اگلے چوبیس گھنٹے اسی بند کمرے میں گزار دیئے۔ شانی اس بستی میں اسی لباس کے ساتھ آئی تھی جو اسے رقاصہ نیناں نے کھوٹی گاؤں میں فراہم کیا تھا۔ یہ ایک ناچنے والی کا لباس تھا اور شانی کو اپنے جسم پر کانٹا محسوس ہوتا تھا۔ ویسے بھی میلے کی دھینگا مشتی میں یہ کپڑے خستہ حال ہوچکے تھے۔ ایک مقامی عورت نے شانی کو ایک شلوار قمیص دی۔ وہ کافی کھلی تھی، تاہم شانی کو تن ڈھانپنے سے غرض تھی۔ رستم کے پھٹے پرانے لباس کی جگہ بھی اسے ایک دھوتی کرتہ فراہم کردیا گیا تھا۔ ان چوبیس گھنٹوں میں تین چار بار عارف کمبوہ اور اس کا ساتھی کمرے میں آئے۔ ایک بار ان کے ساتھ ایک قبول صورت عورت بھی تھی۔

عارف کمبوہ کے ساتھی کا نام دراج تھا۔ وہ ذات کا مہتم تھا...... اور ڈیک نالے کے کنارے آباد اس مہتم بستی کا سردار تھا۔ بستی کے زیادہ تر لوگ سرکنڈوں اور بانس سے مختلف اشیاء تیار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں میں شکار کو بھی پیشے کی حیثیت حاصل تھی۔ دراج مہتم اور عارف کمبوہ میں یارانہ تھا۔ عارف کمبوہ نے ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا اور میلے میں ہونے والی لڑائی کے بعد شانی اور رستم کو اپنے گاؤں میں لے جانے کے بجائے دراج کے پاس اس مہتم بستی میں لے آیا تھا۔ عارف کمبوہ نے شانی اور رستم کو بتایا کہ میلے میں ہونے والی لڑائی میں تین بندے جان سے مارے گئے ہیں۔ ان میں دو نارپوری اور ایک کمبوہ ہے۔ قریباً تیس افراد کو گولیوں اور کلہاڑیوں کے زخم آئے تھے اور انہیں گوجرانوالہ اور وزیرآباد کے ہسپتالوں کی طرف روانہ کردیا گیا تھا۔ عارف کمبوہ کی زبانی شانی کو یہ بھی معلوم ہوا کہ تاؤ کا بھتیجا چوہدری قادرا شدید زخمی ہے۔

عارف کمبوہ بڑے ہیجانی لہجے میں بولتا تھا۔ وہ شلوار قمیص پہنتا تھا اور کمبوہ برادری کے دوسرے مقامیوں کے برعکس کچھ پڑھا لکھا بھی نظر آتا تھا۔ اس کے کُرتے کے نیچے ہر وقت پستول کی موجودگی ثابت ہوتی تھی۔ دوسری طرف دراج مہتم سرتاپا بستی کا سردار دکھائی دیتا تھا۔ وہ درمیانے قد کا مگر نہایت مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اسے دیکھ کر ہی کہا جاسکتا تھا کہ لوہے کی طرح ٹھوس اور جنگلی سانڈ کی طرح طاقتور ہے۔ وہ جب دن کے وقت شانی اور رستم کے

پاس آیا تو اس کے کندھے پر ایک خوفناک کلاشنکوف لٹک رہی تھی اور کمر کے گرد گولیوں کی ڈبل بیلٹ تھی۔ مرنے اور مار دینے والا شخص دکھائی دیتا تھا۔

اس نے رستم کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے جذبے سے کہا۔ ''ہم مہتم ہوتے ہیں۔ یاروں کے لئے سر کٹا دیتے ہیں۔ کسم پیدا کرنے والے کی، ہمارے ہوتے ہوئے کوئی تم دونوں کی طرف میلی نجر سے نہیں دیکھ سکتا۔''

عارف کمبوہ بولا۔ ''علاقے میں بڑی ٹینشن ہے۔ نارپور کے بلی مار چوہدری زنانیوں کی طرح چوڑیاں ڈال کر بیٹھ گئے ہیں اور پولیس کو آگے کر دیا ہے۔ پولیس نے ہمارے تین دیہاتوں سے ساٹھ کے قریب بندے پکڑے ہیں۔ انہیں مارا پیٹا گیا ہے۔ ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے۔ ہم بھی سب کچھ اپنے سینے پر لکھ رہے ہیں۔ ایک ایک زیادتی کا بدلہ لیں گے۔''

شانی نے کہا۔ ''آپ لوگ ہماری خاطر بہت تکلیف اٹھا رہے ہیں..... یہ بہت بڑا احسان ہے آپ کا..... لیکن..... کیا یہ جگہ محفوظ ہے؟ میرا مطلب ہے اگر نارپور والے اس طرف آ گئے تو.....؟''

دراج نے سینہ پھیلایا اور اپنی کلاشنکوف پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''بی بی! یہ ایک سیکنڈ میں دس گولیاں نکالتی ہے۔ اک پھر لانگ (فرلانگ) تک جو شے سامنے آئے اس کو پھڑکا کر رکھ دیتی ہے..... سمجھو کہ آکھ جھپکنے کی دیر میں دس بندوں میں موری کر سکتی ہے۔ اگر بلی ماروں نے اِدھر آنے کی بھادری (بہادری) کی تو کسم سے لاشوں کا ڈھیر لگا دیں گے۔ مہتموں کا بچہ بچہ تم دونوں پر جنھڑی وار دے گا۔ ہم جہان دے کر پیچھے ہٹنے والے لوک نہیں ہیں۔''

''لل..... لیکن..... بھائی، ہم اپنے لئے کسی طرح کا خون خرابا نہیں چاہتے۔'' شانی نے کہا پھر وہ عارف کمبوہ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''اگر کسی طرح تم ہم دونوں کو کسی قریبی قصبے تک پہنچا دو تو یہ ہمارے لئے بہت اچھا ہوگا۔ ہم پکی سڑک کے راستے اس علاقے سے نکل جائیں گے اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر کسی طرح رستم کے دوستوں سے رابطہ کرا دو۔ میرے پاس دو فون نمبر موجود ہیں۔''

عارف کمبوہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بی بی! آپ غلط سوچ رہی ہو۔ یہاں سے نزدیک ترین پکی سڑک بھی پینتیس میل کے فاصلے پر ہے۔ باقی رہی ٹیلی فون کی بات تو اس کی کوشش کی جا سکتی ہے مگر جس قسم کے حالات ہیں، بہتر یہی ہے کہ ابھی کسی باہر کے بندے کو یہاں بلا کر اس کی جان کو خطرے میں نہ ڈالا جائے۔ پولیس اور بلی ماروں کے بندے چپے چپے پر تم دونوں کو ڈھونڈ رہے ہیں خاص طور سے پولیس والے بہت شیر ہو رہے ہیں۔ ہسپتال میں ان

کا ایک بندہ بہت دیر تک بیمار رہنے کے بعد پندرہ بیس دن پہلے مرا ہے۔ وہ اس بندے کا قتل رستم پر ڈال رہے ہیں۔''

دراج نے سینہ پھلا کر شانی کو مخاطب کیا۔ ''او کنڑی (چھوٹی) تُو خون شون کی باتیں چھوڑ۔ ہم نے پھیسلہ کیا ہے کہ تم دونوں کا اصل مسئلہ ہی حل کر دیں گے۔ ایک دم کھلاص، سب کچھ صاف۔ ہم اگلے دو دن کے اندر اندر تم دونوں کی شادی کر دیں گے۔ تم دونوں کلمے پڑھ کر ایک ہو جاؤ پھر دیکھیں گے کہ تم کو کون مائی کا لال ایک دوجے سے دور کرتا ہے۔''

شانی حیرت سے دراج کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ کتنی آسانی سے کتنی بڑی بات کر دی تھی اس نے۔ رستم بھی سُرخ آنکھوں سے دراج کو دیکھنے لگا۔ اس کے ماتھے اور گلے کی رگیں پھول گئیں۔ دراج نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ ''رستم! تم بھادر (بہادر) پیو کے بھادر پتر ہو اور بھاداروں کی کدر کرنا مہتموں کے کھون میں شامل ہے۔ میں دیکھوں گا تم دونوں کو ایک ہونے سے کون روکتا ہے۔ میں دیکھوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ عارف کمبوہ کو اپنے ساتھ لے کر طاقت ور سانڈ کی طرح جھومتا ہوا باہر نکل گیا۔

رات کو عجیب واقعہ ہوا۔ نیم جان رستم چٹائی پر لیٹا تھا۔ شانی چارپائی پر نیم دراز تھی۔ شانی کے بہت اصرار کے باوجود رستم نے دوسری چارپائی پر لیٹنا پسند نہیں کیا تھا۔ شانی کا ذہن ہزار ہا سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ سوچوں کی اس یلغار میں گاہے بگاہے دراج کا وہ عجیب و غریب فقرہ بھی ابھر کر گونجتا تھا اور شانی کو شرمندگی کے سمندر میں ڈبو دیتا تھا۔ دراج نے پتا نہیں کیوں ایسی بات کہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شانی اور رستم کو ایک کر دے گا۔ کتنی بڑی، کتنی مہیب بات کتنی آسانی سے کہہ ڈالی تھی اس نے۔ سوچتے سوچتے شانی کی آنکھ لگ گئی..... اس کی آنکھ شور سے کھلی۔ اس نے جلدی سے چٹائی کی طرف دیکھا۔ رستم موجود نہیں تھا۔ بس خالی گدیلا تھا اور پھول دار تکیہ تھا۔ اچانک اسے اندازہ ہوا کہ اس نیم پختہ مکان سے باہر زبردست ہنگامہ ہو رہا ہے۔ پہلا خیال شانی کے ذہن میں یہی آیا کہ نارپوری چوہدری یا پولیس کے لوگ موقع پر پہنچ گئے ہیں۔ اس نے اوڑھنی لے کر چپل پہنی اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔ مشعلوں اور لالٹینوں کی روشنی میں اسے عجیب منظر نظر آیا۔ رستم کے ہاتھ میں وہی کلاشنکوف تھی جو کل شانی نے دراج کے کندھے پر دیکھی تھی۔ دو تین مہتم رستم سے چمٹے ہوئے تھے اور اسے روکنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہے تھے۔ شانی کے دیکھتے ہی دیکھتے رستم نے دو افراد کو کلاشنکوف کے کندے سے کاری ضربیں لگائیں اور خود کو چھڑا کر لنگڑاتا ہوا بستی کی مخالف سمت میں بھاگا۔ دو دن میں ہی اس کے نحیف و زخمی جسم میں اتنی طاقت نہ جانے کہاں سے

آ گئی تھی۔

شانی نے دیکھا کہ ایک شخص رستم کے پیچھے لپک رہا ہے۔ یہ بستی کا سردار دراج تھا۔ اس نے چند قدم بھاگنے کے بعد رستم کو عقب سے دبوچ لیا۔ دونوں اوپر نیچے کچی زمین پر گرے۔ دراج، رستم کو صرف روکنا چاہتا تھا..... رستم بھی خود کو دراج سے صرف چھڑانا چاہتا تھا لیکن چند ہی سیکنڈ میں یہ جدوجہد باقاعدہ لڑائی میں بدل گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو کاری ضربیں لگائیں۔ اب باقی لوگ مداخلت نہیں کر رہے تھے۔ شاید انہیں یقین تھا کہ ان کا نہایت زور آور اور پھرتیلا سردار زخمی رستم پر قابو پالے گا مگر عملی طور پر ایسا نہیں ہوا۔ بے شک دراج سانڈ کی طرح طاقت ور اور چیتے کی طرح پھرتیلا تھا مگر اس کے مقابل کوئی عام شخص نہیں تھا، رستم سیال تھا۔ لڑائی بھڑائی میں جس کی صلاحیت یکتا تھی۔ جس کے بارے میں لاہور کے ایک پولیس افسر نے کہا تھا۔ ''یہ شخص اپنے مدمقابل کو قتل کرنے کی خداداد صلاحیت رکھتا ہے۔'' زخمی ہونے کے باوجود چند ہی سیکنڈ میں رستم نے دراج مہتم کو لتاڑ کر رکھ دیا۔ دونوں کیچڑ سے بھرے ہوئے ایک جوہڑ میں لڑ رہے تھے اور لت پت ہو رہے تھے۔ رستم کے سر کی ایک خوفناک ٹکر دراج کے چہرے پر لگی اور وہ ڈکراتا ہوا پشت کے بل جوہڑ میں گرا۔ رستم کلاشنکوف لہراتا ہوا کنارے کی طرف بڑھا، تاہم اس دوران میں دراج کے دوست عارف کمبوہ نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عقب سے رستم کو دبوچ لیا۔ اردگرد کھڑے افراد نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور رستم کو روکنے کے لئے اس سے چمٹ گئے۔ رستم کے جسم میں جیسے کوئی جناتی قوت تھی۔ وہ درجن بھر افراد کی گرفت سے نکلنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ شاید نکل بھی جائے۔ غنیمت یہی تھا کہ اس نے ابھی تک فائر نہیں کیا تھا۔

جونہی شانی کا سکتہ ٹوٹا وہ دوڑتی ہوئی باہر نکلی اور مشعل برداروں کے درمیان سے رستہ بناتی رستم کے سامنے آ گئی۔ وہ غضب کے عالم میں سینے کی پوری قوت سے چیخ رہا تھا مگر آواز چند فٹ سے زیادہ دور نہیں جا رہی تھی۔ جو الفاظ شانی کی سمجھ میں آ سکے وہ یہ تھے۔ ''زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ایک ایک کو مار دوں گا، ختم کر دوں گا۔''

ان کے بدن میں ناقابل مزاحمت طوفان کی ہلچل تھی لیکن جب شانی نے اس کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھے تو یہ طوفان جیسے ایکا ایکی اپنے کناروں میں سمٹنے لگا۔ شانی نے اس کے دونوں کندھے تھام لئے۔ ''نہیں رستم..... نہیں رستم..... تم کہیں نہیں جاؤ گے۔'' اس نے بار بار کہا۔ رستم کے اعضاء کی تشنج کی کیفیت دھیرے دھیرے مدھم پڑنے لگی۔

چند منٹ بعد رستم، شانی کے ساتھ ایک بار پھر جھونپڑا نما کمرے میں موجود تھا۔ کیچڑ

میں لتھڑی ہوئی کلاشنکوف زخمی دراج کے پاس واپس پہنچ چکی تھی۔ رستم کے کئی پرانے اور نئے زخم خون اُگلنے لگے۔ وہ ایک دم نڈھال سا ہو کر چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگائی۔ سر اپنے گھٹنوں پر رکھ کر چہرہ شانی کی نظروں سے اوجھل کر لیا۔ اس کے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے بال پنڈلیوں پر جھول رہے تھے۔ شانی نے بے ساختہ اس کے کندھے پر سر رکھا اور سسکنے لگی۔ ''نہیں رستم! میں تمہیں یہ سب نہیں کرنے دوں گی۔ میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ لوگ تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ وہ سب اکٹھے ہو چکے ہیں۔ پولیس ان کے ساتھ ہے۔ عام لوگ ان کے ساتھ ہیں.....''

وہ خاموش بیٹھا رہا جیسے جواب دینا ہی نہ چاہتا ہو۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ جواب دیتے ہوئے اس سے کوئی گستاخی ہو جائے گی۔

اس کے کئی زخموں کے منہ پھر کھل گئے تھے۔ شانی ایک بار پھر اس کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گئی۔ عارف وغیرہ نے احتیاط کے طور پر کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔

اگلے روز رستم دیر تک سویا رہا۔ شانی جاگتی رہی اور اس کے اردگرد موجود رہی۔ رستم سیدھا لیٹا تھا۔ اس کے لمبے بالوں کی ایک لٹ ٹم کھا کر اس کی ناک سے چھو رہی تھی۔ ناک سے آتی جاتی ہر سانس کے ساتھ یہ لٹ حرکت کرتی تھی اور رستم کی نیند میں خلل ڈالتی تھی۔ شانی محویت سے دیکھتی رہی۔ اس کا دل چاہا اس لٹ کو آہستگی سے ہٹا کر رستم کے کان کے پیچھے اڑس دے مگر ایسا کرتے ہوئے اسے عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ شرم ایک سنسناہٹ کی طرح اس کے جسم میں دوڑ جاتی تھی۔ وہ اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ اس کے نقوش میں عجیب سی حلاوت تھی، تاہم حالت نیند میں بھی یہ ''حلاوت'' تکلیف اور دکھ سے متاثر نظر آتی تھی..... وہ دیکھتی رہی اور اس کے سینے میں کچھ رستا رہا۔ پھر اس نے ہمت کی اور رستم کی کیچڑ آلود لٹ آہستہ سے اس کے چہرے سے ہٹا کر اس کے کان کے پیچھے اڑس دی۔

یکا یک دبی دبی ہنسی کی آواز سنائی دی اور شانی بُری طرح چونک گئی۔ اس نے دیکھا کہ کمرے کی شکستہ کھڑکی کی درزوں میں سے دو تین عورتیں اندر جھانک رہی تھیں۔ شانی نے دیکھا تو وہ ہنستی ہوئی تیزی سے پلٹ گئیں۔ یہ مہتم عورتیں تھیں۔ انہوں نے گھاگھرے اور چولیاں وغیرہ پہن رکھی تھیں۔ شانی اپنے آپ میں خجل سی ہو گئی اور رستم سے کچھ دور ہٹ کر بیٹھ گئی۔

شام کے وقت جب شانی، رستم کو ہلدی ملا دودھ پینے پر مجبور کر رہی تھی۔ ایک بار پھر کچھ لڑکیاں اور بچے کھڑکی کے آس پاس نظر آئے۔ ان کی دبی دبی ہنسی بھی شانی کو سنائی دی۔

شام کے فوراً بعد وہی عورت کمرے میں داخل ہوئی جو تین دن پہلے عارف کمبوہ اور دراج مہتم کے ساتھ اندر آئی تھی۔ شانی جان چکی تھی کہ یہ کھیا دراج کی بیوی ہے۔ اس کا نام ماکھو ہے۔ یہ سانولے رنگ کی اٹھائیس تیس سالہ اور قدرے فربہ عورت تھی۔ اس کے ہاتھوں میں چاندی کے وزنی کڑے اور کانوں میں جھمکے وغیرہ اسے دوسری عورتوں سے ممتاز کرتے تھے۔ یہ گھاگھرا چولی کے بجائے کڑھائی دار شلوار قمیص پہنتی تھی۔ گرتے کے گریبان پر بے شمار سیپیاں اور چاندی کے ستارے وغیرہ جڑے ہوئے تھے۔ بستی کی دیگر اہم عورتوں کا لباس بھی اسی طرح کا تھا۔ ماکھو کے ساتھ دو تین عورتیں بھی کمرے میں آئیں۔ عارف کمبوہ بھی ان کے ساتھ تھا۔

ماکھو سنجیدہ تھی لیکن دوسری عورتوں کی آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ دکھائی دیتی تھی۔ ماکھو نے اپنائیت بھرے لہجے میں شانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''چل نکڑی! تو ہمارے ساتھ دوسرے کمرے میں آجا۔ بندے اور جنانی کا ایک ساتھ رہنا اچھا نہیں لگتا۔ وہاں ہم آپس میں گل بات بھی کرتے رہیں گے۔ تمہارا دل بھی لگا رہے گا۔''

بات تو ماکھو کی صحیح تھی لیکن شانی کو رستم کی فکر بھی تھی۔ شانی نے تذبذب کی نظروں سے رستم کو دیکھا۔ عارف کمبوہ بولا۔ ''میری بہن! اس کے بارے میں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم ہیں ناں، ہر طرح خیال رکھیں گے۔''

شانی جب سے عارف کمبوہ سے ملی تھی، اس کے لہجے میں شانی کو سچائی، جذبہ اور خلوص ہی دکھائی دیا تھا۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ عارف جو کچھ کہہ رہا ہے درست کہہ رہا ہے۔ رستم پتھر کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے فی الوقت سب کچھ شانی پر چھوڑ دیا ہے۔ (رستم کے دل و دماغ کے اندر کیا چل رہا تھا اس بارے میں شانی کو کچھ معلوم نہیں تھا)

شانی نے رستم سے ایک دو باتیں کیں۔ اسے دوا اور مرہم پٹی کے بارے میں چند ہدایتیں دیں اور ماکھو کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔ عارف کمبوہ کمرے میں رستم کے پاس ہی رہ گیا۔ شانی کو جس دوسرے مکان میں لایا گیا، وہ پہلے مکان کے ساتھ ہی تھا، تاہم قدرے بڑا اور کشادہ تھا۔ یہ پختہ اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ بیرونی چار دیواری جو آٹھ دس فٹ اونچی تھی کچی تھی، صحن بھی کچا تھا۔ مکان کے کسی بھی حصے میں پلاستر نہیں کیا گیا تھا۔ کمروں کی دیواروں پر سستی قسم کی دو چار رائفلیں اور کلہاڑیاں آویزاں تھیں۔ اس نیم پختہ مکان کو سرکنڈوں سے بنی ہوئی اشیاء سے سجانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہی سردار دراج اور اس کی بیوی ماکھو کا ٹھکانہ تھا۔ چند ہی گھنٹوں میں شانی کو یہاں وی آئی پی مہمان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

بستی بھر کی عورتیں اسے دیکھنے کے لئے آنے لگیں۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کرتی تھیں اور ان کی سرمہ لگی آنکھوں میں شوخی کروٹ لیتی محسوس ہوتی تھی۔ ان میں سے کئی نے چاندی، شیشے اور پلاسٹک وغیرہ کے زیورات پہن رکھے تھے۔ ان کے رنگ گندمی یا سانولے تھے۔ بالوں کو خاص انداز میں مینڈیوں کی شکل میں بنایا گیا تھا۔ شانی ان کے لئے ایک عجوبے کی طرح تھی۔

شانی کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھا جارہا تھا۔ دودھ، مکئی اور جوار کی روٹی، گز والے چاول، مرغی کا گوشت یہاں کے خاص کھانے تھے۔ رات کو ماکھو نے کہا۔ ''کسی چیز کی جرروت ہو تو بالکل شرم نہ کرنا۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم اور رستم دو چار دن میں ہی بٹے کٹے ہوجاؤ۔''

شانی بولی۔ ''میں نے تمہارے خاوند سے منت کی تھی کہ کسی طرح رستم کے ساتھیوں تک رستم کے بارے میں اطلاع پہنچا دو۔ پتا نہیں کہ اس نے کچھ کیا ہے کہ نہیں۔''

ماکھو پھسکڑا مار کر شانی کے سامنے بیٹھ گئی اور بولی۔ ''تم اتنا بھٹکر کیوں کرتی ہو۔ ملوک سی جندڑی ہے تمہاری۔ اس کو اتنی مصیبت میں مت ڈالو۔ وہ عار پھ (عارف) ہے ناں میرے بندے کا یار، وہ آج اپنے پنڈ واپس جارہا ہے۔ وہ پڑھا کو اور ہوشیار بندہ ہے۔ وہ ٹھیک موقع دیکھ کر رستم کے ساتھیوں کو اس کے بارے میں جرور بتا دے گا۔''

''وہ واپس کیوں جارہا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''اس کا جانا جروری ہے نکڑی! وہ جیادہ دیر اپنے پنڈ سے غیب رہے گا تو پلس کو اس پر شک ہوگا۔ پلس والے ہر جگہ تم دونوں کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ اللہ مولا کا شکر ہے کہ ابھی وہ ہمارے علاقے سے دور دور ہیں.....''

اگلے دن عجیب واقعہ ہوا۔ بہت سی عورتیں مکان کے برانڈے میں جمع ہوگئیں اور کوئی مقامی گیت گانے لگیں۔ سازوں کے طور پر ڈھولکی کے علاوہ اک تارہ، بانسری، طبلہ وغیرہ استعمال کئے جارہے تھے۔ یہ خوشی کا گیت تھا جس میں دریا کے کنارے سرکنڈوں میں مٹیاروں کے ناچنے اور محبوب سے ملنے کا ذکر تھا۔ ان لڑکیوں کا ذکر تھا جو اپنے نازک کومل ہاتھوں سے سرکنڈوں کے چھلکوں اور سوکھی ہوئی داب سے خوبصورت آرائشی چیزیں بناتی ہیں۔ ایسی چیزیں جن کو دیکھ کر شہری بابو..... بنانے والیوں کے اَن دیکھے ہاتھوں پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی کئی خوشی بھرے گیت مہتم لڑکیوں نے گائے۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ شاید ان لوگوں کا کوئی تہوار قریب آرہا ہے۔

رات کو مشعلوں کی روشنی میں بہت سے مرد و زن اور بچے جمع ہوئے۔ بچوں میں سے کچھ نیم سرد موسم کے باوجود بالائی لباس نہیں پہنے ہوئے تھے۔ پہلے گانے بجانے کا سلسلہ ہوتا رہا پھر مکان کے سامنے احاطے میں موجود مردوں کے جمگھٹے میں سے کچھ مردوں نے اٹھ کر ڈھول کی تھاپ پر ناچنا شروع کر دیا۔ ان میں سے کچھ لوگ مقامی طور پر تیار کی گئی ایک سفید شراب بھی پی رہے تھے۔ الاؤ کے گرد ناچتے ہوئے ان کے چہرے تمتمانے لگے اور حرکات و سکنات میں ایک خوشی بھرا جوش نمایاں ہوتا چلا گیا۔ صحن کے اندر عورتیں مسلسل گانے بجانے میں مصروف تھیں۔ شانی کمرے کی کھڑکیوں میں سے یہ سارے مناظر دیکھ رہی تھی۔

اچانک ایک گھڑ سوار مردوں کے جمگھٹے کی طرف نمودار ہوا۔ اس کے سر پر بڑا سا پگڑ اور کندھے پر رائفل تھی۔ تین چار مزید کلہاڑی بردار افراد بھی اس کے ساتھ تھے۔ یہ لوگ تیزی سے صحن کی طرف آئے۔ اس سے پہلے کہ اندر موجود عورتیں دروازہ اپنی طرف سے بند کرتیں، وہ دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ پگڑ والے بہنے کئے نوجوان نے رائفل سونتی تو عورتیں چیخ اٹھیں۔ وہ سیدھا ایک نوجوان لڑکی کی طرف بڑھا۔ اس بجی سنوری لڑکی نے اٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن پگڑ والے نوجوان نے اسے لپک کر دبوچ لیا۔ باقی عورتوں نے اسے چھڑانے کی کوشش کی مگر کلہاڑی بردار نے للکارے مار کر عورتوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ دھیگا مشتی میں بجی سنوری لڑکی کا لباس پھٹ گیا۔ تنومند نوجوان نے ایک نعرہ مارا اور اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ مردوں کی طرف سے کئی افراد مزاحمت کے لئے آگے مگر پگڑ والے نے بائیں ہاتھ سے لڑکی کو کندھے پر دبوچے رکھا اور دائیں ہاتھ سے کئی ہوائی فائر کئے۔ شانی نے دیکھا کہ لڑکی کے ہاتھ اپنے یا پگڑ والے کے خون سے لتھڑے ہوئے ہیں۔ جب پگڑ والا لڑکی کو لے کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو لڑکی نے یہ خون آلود ہاتھ ایک ادھیڑ عمر شخص کے کندھے پر ثبت کر دیئے جیسے اس کے کندھے پر اپنی نشانی چھوڑ کر جا رہی ہو۔ شانی نے دیکھا کہ ڈھولک بجانے والی کچھ عورتیں اس ہنگامے کے باوجود مسلسل ڈھولک بجا رہی تھیں۔ باہر الاؤ کے گرد کچھ مہتم مرد بھی بدستور محو رقص تھے۔ اچانک شانی کی سمجھ میں آیا کہ یہ سب کچھ کھیل تماشے کا حصہ ہے..... خوشی منانے کے اس مقامی طریقے میں غالباً کسی قدیم واقعے کی جھلک پیش کی گئی تھی..... مختلف برادریوں اور قبیلوں میں شادی کے لئے لڑکیوں کو اغوا کرنے کی رسم بہت پرانی ہے..... پگڑ والے نے لڑکی کو اپنے آگے سفید گھوڑے پر بٹھایا اور الاؤ کا ایک چکر مکمل کرنے کے بعد اسے گھوڑے سے اُتار دیا۔ وہ بھاگتی اور ہنستی ہوئی عورتوں کے درمیان واپس آ گئی۔ اس نے ہاتھوں پر غالباً کسی پرندے کا خون لگایا تھا۔ اس خون کی چھاپ اس نے

اپنے ''اغوا'' کے وقت اپنے باپو کے کندھے پر لگائی تھی۔ یہ ناچ گانا رات دس گیارہ بجے تک جاری رہا۔ کھیا دراج اس میں پیش پیش تھا، تاہم عارف کمبوہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

رات سونے سے پہلے ماکھو نے اسے بتایا کہ عارف واپس چلا گیا ہے۔ شانی نے ماکھو سے ناچ گانے کے بارے میں پوچھا۔ ماکھو نے اس کا کوئی واضح جواب نہیں دیا..... جب شانی نے پوچھا کہ کیا یہ سب کسی تہوار کے حوالے سے ہے تو ماکھو نے مبہم انداز میں اثبات میں جواب دیا۔ شانی نے صاف محسوس کیا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے۔ شانی نے ماکھو سے رستم کی خیر خیریت دریافت کی پھر گفتگو کا رخ مقامی حالات کی طرف مڑ گیا۔

ماکھو نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں شانی کو جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ یہ بہتھوں کی بستی ہے اور ڈیک نالے کے کنارے اس طرح کی دو بستیاں اور بھی ہیں۔ یہ لوگ خانہ بدوش نہیں تھے، تاہم سیلانی مزاج رکھتے تھے اور آوارہ گردی کی عادتیں ان میں موجود تھیں۔ یہ زبردست قسم کے شکاری بھی تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جو مسلمان ہونے کے باوجود اب بھی جنگلی سؤر کا گوشت کھا جاتے تھے یا شاید وہ ویسے ہی لامذہب لوگ تھے۔ ماکھو نے جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ نرسل (سرکنڈا) سے گھریلو استعمال کی مختلف اشیاء بنانا ان لوگوں کا پیشہ ہے۔ ویسے یہ خود کو راجپوتوں کی شاخ قرار دیتے تھے۔ عموماً شہروں اور قصبوں سے کچھ فاصلے پر چھپروں یا نیم پختہ مکانوں میں رہائش رکھتے تھے۔ مقامی کمبوہ برادری کے ساتھ ان لوگوں کے اچھے تعلقات تھے۔ ماکھو سے باتوں کے دوران میں شانی کو ایک نئی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ کمبوہ برادری کے مقامی لوگوں نے لڑکی کی موت کا مسئلہ ابھی تک اٹھا رکھا ہے۔ وہ صفیہ کی قبر کشائی کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس کا پوسٹ مارٹم کرانا چاہتے ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے ماکھو گاہے بگاہے شانی کو محبت بھری نظروں سے دیکھتی تھی اور اس کے بال سنوارنے لگ جاتی تھی۔ وہ شانی کے لئے بچی ہمدردی محسوس کر رہی تھی اور ماضی کے حوالے سے اسے کریدنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ اس نے شانی کو بتایا ''ہمارے ایک پیر و مرشد ہیں۔ سر پر ہتھ رکھ کر بندے کا ہر دکھ درد دور کر دیتے ہیں۔ میں تمہیں ان سے جرور ملاؤں گی۔ تم دیکھنا کتنا چین ملتا ہے تمہیں۔ پھر سے جندہ نہ ہو جاؤ تو میرا نام بدل دینا۔''

اسی دوران میں شانی نے کھڑکی سے دیکھا۔ بہت سے مشعل بردار ہتھ ایک چارپائی اٹھائے بستی کی طرف آ رہے تھے۔ پہلے تو وہ سمجھی کہ شاید کوئی جنازہ ہے۔ مگر چارپائی پر جو بھاری بھرکم جسم تھا وہ حرکت کر رہا تھا۔ وہ سرتاپا ایک سفید چادر میں چھپا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

ماکھو بولی۔ ''ہماری آبادی کی ایک جنانی (عورت) ہے۔ شہر میں نوکری کرتی تھی۔ اُدھر بیمار پڑ گئی۔ وہاں وڈے ہسپتال میں ایک مہینے تک اس کا علاج شلاج ہوتا رہا ہے۔ اب ٹھیک ہوگئی ہے اور واپس آئی ہے۔''

چارپائی والی عورت کو ایک قریبی جھونپڑے میں لے جایا گیا۔ یہ خاصا بڑا مکان نما جھونپڑا تھا۔ کافی رات ہونے کے باوجود یہاں بہت سے مرد و زن جمع ہوگئے اور خوشی بھری آوازیں آنے لگیں۔

☆======☆======☆

اگلے روز دوپہر کو شانی نے کمرے کی کھڑکی سے عجیب منظر دیکھا۔ بہت سے مہتم مکان کے صحن اور باہر گلی میں جھنڈیاں لگا رہے تھے۔ صحن اور گلی کو خوب اچھی طرح صاف بھی کیا گیا تھا۔ دو افراد مسلسل ڈھول اور بانسری بجانے میں مصروف تھے۔ ایک گیدڑ کے گلے میں پٹا ڈال کر اسے گلی کے بیچوں بیچ باندھا گیا تھا۔ اس گیدڑ کی پشت ایک پھول دار ریشمی کپڑے سے ڈھانپی گئی تھی۔ صحن کے ایک گوشے میں پیتل کے دو بڑے بڑے پتیلوں میں کچھ پکایا جا رہا تھا۔ ایک مہتم لڑکی اپنی چاندی کی ننھی سی چمکتی ہوئی شانی کے پاس سے گزری تو شانی نے پوچھا۔ ''بہن! یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''ہم کو کیا پتا؟'' لڑکی نے کہا اور مسکراتی ہوئی آگے نکل گئی۔

ایک ادھیڑ عمر عورت آگے بڑھی۔ اس نے محبت سے شانی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولی۔ ''کنڑی! آج تیری ڈھولک ہے۔ کل ویاہ ہونا ہے تیرا..... رستم سیال کے ساتھ۔'' شانی کے سر پر جیسے کسی نے وزنی ہتھوڑا مار دیا تھا۔ وہ حیرانی سے ادھیڑ عمر مہتم عورت کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ ویاہ یعنی شادی کا لفظ اس کی سماعت کو مفلوج کر رہا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' شانی نے ششدر لہجے میں پوچھا۔

''ہائے ہائے کنڑی! اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ تمہارا ویاہ ہو رہا ہے، کوئی تمہیں اٹھا کر تو نہیں لے جا رہا ہے۔ ہمارے وڈ وڈیرے ایک زمانہ پہلے کہہ گئے ہیں جب کسی جوان جنانی کا کھاونڈ مر جائے تو اس پر چادر ڈالو۔ اس کام کا اتنا بڑا اجر ہے کہ کوئی کھیال بھی نہیں کر سکتا۔ جتنا اجر چادر ڈالنے والوں کو ہوتا ہے اتنا اس کو بھی ہوتا ہے جس پر چادر ڈالی جائے۔ (شادی کی جائے)''

شاید بوڑھی عورت کچھ اور بھی کہتی مگر شانی کے ذہن میں تو آندھی چل رہی تھی۔ وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں آ گئی۔ اب اسے پتا چل رہا تھا کہ رات کو جو کھیل تماشے ہوئے

بھی وہ بھی اسی ''شادی'' کی تقریب کا حصہ ہی تھے۔

یہ کیا ہو رہا تھا؟ کیسے ہو رہا تھا؟ کیا رستم کو اس ساری صورتِ حال کا علم تھا؟ اگر اسے علم تھا تو کیا یہ سب اس کی مرضی سے ہو رہا تھا؟ عورتوں نے شانی کے سامنے کھل کر کوئی بات نہیں کی تھی مگر عارف کمبوہ اور دراج وغیرہ تو رستم کے سامنے کھل کر بات کرتے تھے۔ چار دن پہلے دراج نے شانی اور رستم کے سامنے ہی کہا تھا کہ وہ کلے پڑھوا کر ان دونوں کو ایک کر دے گا۔ رستم کی صورت شانی کی نگاہوں میں گھومنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شانی سے پوچھے بغیر رستم یہ سب کچھ کیسے ہونے دے رہا تھا۔ اتنا بڑا قدم اور ایسی بے خبری کے عالم میں..... ایسی من مرضی کے ساتھ۔ شانی کے سینے میں ٹیسیں سی اٹھنے لگیں۔ اسے لگا جیسے اس کے سینے کے اندر کوئی عظیم الشان شے ٹوٹ رہی ہے۔ اس میں دراڑیں پڑ رہی ہیں۔

وہ ایک بار پھر کھڑکی میں آ گئی۔ آنکھوں میں موجودنی نے اردگرد کے مناظر کو دھندلا رکھا تھا۔ وہ رستم سے ملنا چاہتی تھی..... وہ اسے دیکھنا چاہتی تھی..... کبھی کبھی دل کی آرزو بڑی جلدی پوری ہو جاتی ہے۔ جونہی شانی کھڑکی میں آئی، رستم اسے کھلیا دراج کے گھر سے نکلتا دکھائی دیا۔ دو مہتم جن کے کندھوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں اس کے عقب میں تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے رستم پر نگاہ رکھی ہوئی ہے جیسے انہیں اندیشہ ہو کہ باہر آنے کے بعد رستم کچھ بھی کر سکتا ہے..... شانی آج کئی دن بعد اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ اس کے سر پر ابھی تک پٹیاں بندھی تھیں۔ چال میں بھی لنگڑاہٹ موجود تھی، تاہم اس نے لباس بدلا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر ریشمی لاچہ اور کرتہ تھا۔ اپنے کندھے کے زخم کو بائیں ہاتھ سے سہلاتے ہوئے اس نے جنگلی گیدڑ کی طرف دیکھا۔ مہتم بچوں نے اس کے سامنے کھانے پینے کی بہت سی مزیدار اشیاء ڈال دی تھیں۔ رستم کو دیکھ کر یہ بچے رستم کے گرد جمع ہوگئے اور خوف آمیز اپنائیت سے اسے دیکھنے لگے۔ رستم کے چہرے پر بھی حیرانی کے تاثرات تھے پھر اس کی نگاہ اوپر اٹھی اور وہ کھڑکی میں شانی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ دونوں کئی سیکنڈ تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دونوں ہی کی آنکھوں میں سوالات تھے..... وہ دونوں ہی جیسے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے، یہ کیا ہو رہا ہے، کیا ہو رہا ہے؟

شانی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ ان آنسوؤں کو دیکھ کر رستم کے چہرے پر نظر آنے والے کرب میں اضافہ ہو گیا۔ وہ ایک دم زیادہ بے قرار و بے چین نظر آنے لگا۔ ان دونوں کے درمیان پچیس تیس میٹر سے زیادہ فاصلہ تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے مگر بات نہیں کر سکتے تھے۔ تب شانی نے دیکھا کہ رستم ایک جواں سال مہتم سے کچھ پوچھ رہا

ہے۔ یہ مہتم کھیا راج کی بیوی ماکھو کا بھائی تھا۔ ان دونوں کے درمیان قریباً دو منٹ تک بات ہوئی پھر شانی نے دیکھا کہ رستم ایک دم مشتعل ہو گیا ہے۔ کچھ وہی کیفیت اس پر طاری ہو گئی تھی جو تین چار دن پہلے ہوئی تھی۔ وہ اپنے زخمی جسم کو تیزی سے حرکت دیتا ہوا رنگی برنگی جھنڈیوں کی طرف بڑھا اور انہیں توڑ توڑ کر نیچے گرانے لگا۔ پھر اس کا دھیان پیتل کے بڑے بڑے دیگچوں کی طرف گیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کرتا، اس نے دونوں دیگچے زمین پر الٹا دیئے۔ چاروں طرف افراتفری پھیل گئی۔ بچے خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے۔ مہتم عورتیں دروازوں میں سمٹ کر چلانے لگیں۔ رستم نے ایک ڈھولچی کو پکڑا اور اس سے ڈھول چھین کر دیوار سے دے مارا۔ زوردار دھماکے کے سبب خوش خورا کی کرتا ہوا گیدڑ بے طرح خوفزدہ ہوا اور اپنا رسہ تڑانے کی مضحکہ خیز کوشش کرنے لگا۔ کئی مہتم مردوں نے رستم کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا اور پوری قوت سے چلا رہا تھا، تاہم اس کی آواز اتنی میٹھ پکی تھی کہ بمشکل اس کے اپنے کانوں تک ہی پہنچ سکتی ہوگی۔

یہ منظر دیکھ کر شانی کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ وہ کھڑکی سے ہٹی اور بے دم سی ہو کر کمرے میں رکھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ واقعات میں عجیب سی تیزی آ گئی تھی۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ باہر موجود ہنگامہ اب سرد ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد شانی نے محسوس کیا کہ رستم اس کی طرف آ رہا ہے۔ وہ غالباً اکیلا آ رہا تھا۔ دروازہ کھلا تھا پھر بھی اس نے دستک دی۔ شانی نے کہا۔ ''آ جاؤ!''

وہ آ گیا۔ وہیں دہلیز پار کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے چہرے پر زلزلے کی کیفیت تھی۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔ گلے کی رگیں پھول گئیں۔ بس کھی کھی کی آواز نکل کر رہ گئی۔ اس نے بڑے کرب کے ساتھ حلق میں اٹکے ہوئے دیگچوں اور بکھری ہوئی جھنڈیوں کی طرف اشارہ کیا پھر شانی کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس نے نہیں کیا۔ نہ ہی اس کی مرضی سے ہو رہا تھا۔ شانی کے سینے میں مدوجزر تھا۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مجھے پتا تھا رستم..... مجھے پتا تھا۔''

وہ اس کے قریب چلی آئی۔ وہ بولا۔ چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ بمشکل شانی کے کانوں تک پہنچ پائے۔ ''میں نے نہیں..... سوچ بھی نہیں سکتا.....''

شانی نے آنسو بہاتے ہوئے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

اس موقع پر رستم سے مزید کیا کہے۔ وہ اس کے زخموں کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔ اس کی آواز کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی تھی جو پہلے سے زیادہ خراب اور ناقابل سماعت تھی..... لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ بس اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر کرب، مایوسی اور بے چارگی کے ایسے تاثرات تھے جو صرف دیکھتے جا سکتے تھے، بیان نہیں کئے جا سکتے تھے۔ شاید ہی ویسے تاثرات تھے جو ایک عرصہ پہلے رنگ والی کی حویلی میں شانی کا طمانچہ کھا کر اس کے چہرے پر نمودار ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ شانی کچھ کہہ پاتی، وہ مڑا اور لنگڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

اس کے انداز میں تسلیم و رضا کی ایک ایسی کیفیت تھی جو ایک شدید لیکن میٹھی چبھن کی طرح شانی کے سینے میں گہرائی تک اُتر جاتی تھی۔ وہ درد سے بے حال ہوتی تھی مگر یہ درد اسے اچھا بھی لگتا تھا۔ عجیب دیوانہ تھا وہ۔ بے مثال جذبے اور رویے تھے اس کے۔ کسی وقت تو وہ شانی کو اتنا انوکھا لگتا تھا کہ وہ بالکل چکرا جاتی تھی۔ وہ اس کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتا تھا۔ تاؤ حشام کے بندی خانے میں رستم کے حوالے سے شانی نے جو کچھ دیکھا تھا وہ ابھی تک اس کے ذہن میں تازہ تھا۔ وہ خود فراموشی کی کیفیت، وہ اذیت پسندی، وہ رقص مستانہ..... رستم کے جانے کے بعد وہ دیر تک کمرے میں بند رہی۔ ہاں، اس کے سینے میں مدوجزر تھا۔ آنسو بے وجہ ہی آنکھوں سے امڈے پڑ رہے تھے۔

رستم کی حالت زار لحہ لحہ اس کے دل پر چرکے لگا رہی تھی۔ اچانک کچھ قدموں کی چاپ ابھری اور پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ شانی نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے درمیانی عمر کی قریباً دس مہتم عورتیں کھڑی تھیں۔ ان میں ماکھو سب سے آگے تھی۔ یہ ساری عورتیں ممتاز حیثیت کی حامل تھیں کیونکہ ان سب نے چاندی کے زیورات پہن رکھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں شانی کے لئے اپنائیت اور ہمدردی تھی۔ وہ اپنے کپڑے سنبھالتی اور زیورات کڑکڑاتی ہوئی شانی کے اردگرد بیٹھ گئیں۔ ماکھو نے محبت سے شانی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولی۔ ''بکری! یہ بر تیرے لئے بڑا چنگا ہے۔ وہ جنانی بڑی کھش قسمت ہوتی ہے جسے کوئی بندہ اپنے من سے چاہتا ہے..... اور وہ چاہتا ہے تجھے..... دیکھ ہم دس جنانیاں تیرے چاہنے والے کی سیھارش بن کر تیرے پاس آئی ہیں۔ ہماری برادری کے دس بڑے کھاندان ہیں۔ ہر کھاندان کی ایک بڑی جنانی تیرے سامنے ہے اور تیری منت کرتی ہے کہ تُو اپنے چاہنے والے کی وہٹی بن جا۔ وہ ہر طرح سے تیرے لئے اچھا ہے۔ وہ ان ساری دشمنیوں کے سامنے دیوار بن جائے گا جو تیرے چاروں پاسے ال رہی ہیں۔ اگر وہ.....''

''یہ آپ...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' شانی نے بے حد پریشانی سے اس کی بات کاٹی۔

''ہم وہی کہہ رہی ہیں نکڑی جو تیرے اپنے من میں بھی ہے۔'' ایک دوسری عورت نے مسکراتے لہجے میں کہا۔ ''شرع میں شرم نہیں۔ شرم تو لُچے پن میں ہوتی ہے۔ یہ تو وہ کام ہے جس میں اللہ کھش اور اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی کھش۔ تم دونوں ایک دوجے کو چاہتے ہو۔ بس یہی بات یاد رکھو، باقی سب کچھ بھول جاؤ۔ جگ والوں کو تو کوئی کھش کر سکا ہے نہ کر سکے گا۔''

ماکھو نے شانی کے رخسار پر ہاتھ پھیرا۔ ''من جا نکڑی! من جا! نئیں تو پتا ہے کیا ہوگا؟'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بڑے پیار سے بولی۔ ''ہم سب کے سب سارے بستی والے بھک ہڑتال کر دیں گے...... تیری جان مصیبت میں ڈال دیں گے۔''

اچانک ایک شور سا شانی کے کانوں میں داخل ہونے لگا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پہلو بدلا اور گردن لمبی کر کے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہاں بیسیوں مہتم گھر کے سامنے جمع ہو چکے تھے اور ابھی مزید آ رہے تھے۔ ان میں عورتیں، بچے، مرد سب شامل تھے۔ قریباً چالیس پچاس عورتیں اور لڑکیاں اگلی صف میں تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹیں تھیں۔ کئی ایک کے ہاتھوں میں دف نما ساز تھے۔ اچانک انہوں نے ایک ساتھ سروں کو جنبش دی اور گانا شروع کر دیا۔ یہ ایک قدیم پنجابی گیت تھا۔ اس میں گورمکھی اور مقامی بولیوں کی آمیزش تھی۔ دوہے کی طرز کے اس گیت کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

من جا پیاری من جا
ہماری راج دلاری من جا
تیرا ماہی بڑی دور سے آیا ہے
اس کا مکھڑا زخموں نے گہنایا ہے
اس کے جسم میں کانٹے ٹوٹے ہیں
اپنے پرائے سب اس کے چھوٹے ہیں
دیکھ نی! اس کے بھیڑے حالوں کو
دیکھ نی! اس کے پاؤں کے چھالوں کو
بڑا پیاسا ہے اپنا روپ پلا دے اس کو
گلے لگا لے اس کو

تُو اس کی ووہٹی بن جا
من جا پیاری من جا
راج دلاری من جا
پنج دریاؤں کی کوکھ سے ابھرنے والے اس قدیم گیت کی لے بلند ہو رہی تھی......

☆======☆======☆

شانی کے ماتھے پر پسینہ آنے لگا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا......؟ گیت کے اولین بول بار بار دہرائے جا رہے تھے۔

من جا پیاری من جا
راج دلاری من جا

شانی کے سامنے بیٹھی ہوئی دس ممتاز مہتم عورتیں مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے محبت ٹپکتی تھی۔ شانی کی ابتر حالت دیکھ کر ماکھو اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اٹھتے ہی باقی عورتیں بھی اپنے لباس سنبھالتی اور زیورات کڑکڑاتی اٹھ گئیں۔ ماکھو نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''نکڑی! آکھری پھیسلہ تو تُو نے ہی کرنا ہے...... اور تُو یہ پھیسلہ کھوب سوچ کر، کر...... یہاں پر آپاں (ہم) سب کی منت تجھ سے یہی ہے کہ تُو رستم سیال کے ساتھ جوڑی بنا لے۔''

سب عورتوں نے اسے پیار دیا۔ ایک دو نے ماتھا بھی چوما پھر وہ ایک ایک کر کے باہر نکل گئیں۔ باہر ہجوم میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ بن باسی شہر کے باسیوں سے کہیں زیادہ محبت کرنے والے ثابت ہو رہے تھے۔ ہر کوئی اسے چاہتا ہے۔ خوش و خرم دیکھنا چاہتا ہے اور شاید رستم کے حوالے سے بھی ان کے احساسات یہی تھے۔

یہ ہنگامہ آدھ پون گھنٹہ جاری رہا پھر مکھیا دراج کے ڈانٹنے پر لوگ بھیرے دھیرے منتشر ہو گئے۔

وہ رات شانی کے لئے امتحان کی رات تھی۔ مکھیا دراج کے گھر کے ایک کچے کمرے میں لالٹین کی لَو تھرتھرا رہی تھی۔ کمرے سے باہر شب کی تاریکی تھی۔ اس تاریکی میں رکھوالی کے کتوں کا شور تھا اور گیدڑوں کی آوازیں تھیں۔ شانی کبھی بان کی چارپائی پر بیٹھ جاتی تھی، کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتی تھی۔ اس کے اندر سے ایک آواز ابھر رہی تھی۔ یہ آواز اس سے کہہ رہی تھی۔

''شانی...... ! تیری وجہ سے رستم کو جو تکلیفیں پہنچی ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں...... اسے مسلسل کئی ہفتوں تک دکھ، اذیت اور ذلت کی عمیق گہرائیوں سے گزرنا پڑا ہے اور یہ سب کچھ تیری

وجہ سے ہوا ہے۔ بے شک تُو اس سے ویسی محبت نہیں کرتی جیسی وہ تجھ سے کرتا ہے لیکن تُو محبت تو کرتی ہے۔ تُو اس محبت سے رستم کے جان سوز زخموں پر زندگی کا مرہم رکھ سکتی ہے۔ تُو اپنا آپ رستم کے سپرد کر کے اس کے جانکاہ دکھوں کا کچھ نہ کچھ مداوا کر سکتی ہے۔ وہ تیری وجہ سے بدترین عذابوں سے گزر رہا ہے۔ اب تیرے لئے موقع ہے کہ تُو اپنی غلطیوں کی تلافی کر۔ ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر خود کو رستم کی دسترس میں لے آ..... اور تُو یہ کر سکتی ہے، کیونکہ تُو اسے زندہ درگور نہیں دیکھ سکتی۔ تُو اس کو چاہتی ہے..... تُو چاہتی ہے اور ایسا کرنا شاید تیرے لئے بھی زندگی کا راستہ کھول دے۔ رستم کی پناہوں میں آ کر تُو ریزہ ریزہ ہونے سے بچ جائے۔''

پھر ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا کہ رستم کس انداز سے سوچ رہا ہے۔ کیا موجودہ حالات میں وہ اس شادی کے لئے تیار ہوگا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی سوچ دوسروں کی سوچ سے مختلف ہو کیونکہ جب سے وہ آزاد ہوا تھا۔ اس کا رویہ بالکل ناقابل فہم تھا۔ شانی اس کے بارے میں کسی قسم کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی تھی کسی وقت اسے لگتا تھا کہ جیسے یہ وہ رستم ہی نہیں ہے۔

☆======☆======☆

رستم کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کے بال چہرے پر جھول رہے تھے۔ جھونپڑے کی کچی دیوار پر اس کا سایہ مہیب نظر آتا تھا۔ اس کے سینے میں ایک طوفان تھا۔ اس طوفان کے بارے میں صرف وہ جانتا تھا کسی اور کو پتا نہیں تھا اور نہ پتا لگ سکتا تھا۔

اتنے میں کھیا دراج اور عارف کمبوہ اندر داخل ہوئے اور ہولے سے رستم کے قریب بیٹھ گئے۔ رستم نے اپنی آنکھیں نگاہوں سے انہیں دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ کیا لینے آئے ہو۔

دراج نے عارف کمبوہ کو ٹہوکا دیا۔ عارف نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''رستم! خدا کے لئے خود کو سنبھالو، تم بالکل جذبے لگتے ہو..... غیر..... اجنبی..... نہ کچھ سنتے ہو، نہ سمجھتے ہو کسی وقت تو لگتا ہے کہ تمہیں دوست دشمن کی پہچان بھی نہیں رہی۔''

دراج نے کہا۔ ''ہاں بھائیا! آپاں دشمن نہیں دوست ہیں اور تیرے لئے دوستوں کی طرح سوچ رہے ہیں۔ تجھے کھبر نہیں کہ آپاں تیرے کتنے پاپڑ بیل رہے ہیں۔''

عارف نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ''رستم! اب یہ بات بالکل دھکی چھپی نہیں ہے کہ تم چھوٹی چوہدرانی کو دل و جان سے چاہتے ہو وہ بھی تم کو پسند کرتی ہے..... تم دونوں کی سخت ضرورت بھی ہے کہ تم ایک دوجے کے ہو جاؤ۔ ایک دوجے کا سہارا بن جاؤ۔ خاص طور پر

چھوٹی چوہدرانی کے لئے تو یہ بات بہت ضروری ہے۔''

رستم نے انگارہ آنکھوں سے عارف کو گھورا، پھر وہ بے حد مدھم اور بیٹھی ہوئی آواز میں پھنکارا۔ ''چلے جاؤ، خدا کے لئے چلے جاؤ۔''

عارف کمبوہ کا چہرہ ایک لمحے کے لئے پھیکا پڑ گیا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ ''دیکھو رستم، تم بنا بنایا کام خراب مت کرو۔ اوپر والا تمہارے دل کی تمنا بڑی سخاوت سے پوری کر رہا ہے۔ تمہیں چھپر پھاڑ کر دے رہا ہے۔ انکار کرو گے تو بہت بڑی ناشکری کرو گے۔ بے وقوفی کرو گے۔''

دراج نے کہا۔ ''آج آپاں کے دس کھاندانوں کی دس بڑی زنانیاں چھوٹی چوہدرانی کے پاس گئیں تھیں۔ انہوں نے دیر تک چوہدرانی سے بات کی ہے..... وہ..... وہ بڑی حد تک مان گئی ہے..... اس نے۔''

''بڑی حد تک نہیں..... وہ بالکل مان گئی ہے۔'' عارف کمبوہ نے دراج کی بات کاٹتے ہوئے رستم کا ہاتھ دبایا۔ ''ہاں رستم وہ مان گئی ہے..... وہ بے وقوف نہیں ہے۔ ہر اونچ نیچ سمجھ رہی ہے اور پھر تُو اس کا پیار بھی ہے۔''

رستم نے آنسوؤں سے بھری ہوئی سُرخ آنکھیں عارف پر مرکوز کیں۔ ''جھوٹ مت بول ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں بی بی جی کو جتنا جانتا ہوں کوئی اور نہیں جان سکتا۔''

''تیرے سر کی قسم رستم! میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ ہم سب نے مل کر اسے منا لیا ہے۔ ہم شرع کے مطابق تم دونوں کو ایک کریں گے تمہارا بیاہ کریں گے۔''

رستم کے سارے جسم میں لرزش سی نمودار ہو گئی تھی۔ اس لرزش کے سبب اس کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا پانی بھی تھرکنے لگا۔ وہ جیسے اس بات پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ اس ''بات'' کا بوجھ بہت زیادہ تھا۔ رستم کی ہمت اس بوجھ کی نسبت بہت کم تھی۔ وہ ششدر تھا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم غلط کہتے ہو'' وہ بولا۔

''تم ابھی آٹھ دس گھنٹوں میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔'' عارف کمبوہ نے پورے یقین سے کہا۔

رستم کی سمجھ میں جب کچھ نہیں آیا تو اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ تنہائی چاہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ دونوں یہاں سے چلے جائیں۔

وہ دونوں اٹھ گئے۔ اٹھتے ہوئے انہوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا کمرے سے باہر نکل کر دراج نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ لوہا گرم ہو رہا ہے۔ ایک دو آخری چوٹ کی

جرورت ہے۔ میرا کھیال ہے کہ اگر اس موقع پر رستم کو یقین ہو جائے کہ چھوٹی چوہدرانی مان گئی ہے تو وہ بھی ہر الٹی پلٹی بات بھول جائے گا۔''

عارف نے ملبورن کا سگریٹ سلگایا اور سرگوشی میں دراج سے بولا۔ ''اب ذرا بھرجائی کو چھوٹی چوہدانی کی طرف بھیجے۔'' دراج اثبات میں سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

☆======☆======☆

شانی بے قراری سے کمرے میں ٹہل رہی تھی، اس کے اندازے کے مطابق رات کے بارہ بج چکے تھے۔ نینداس کی آنکھوں سے دور تھی۔ دل و دماغ میں جنگ جاری تھی۔ یہ زندگی کس کام کی تھی؟ یہ کسی بھی وقت دشمنی کی آگ میں جل کر خاکستر ہو سکتی تھی۔ اگر یہ کسی کے کام آ جاتی، کسی کے زخموں کا مرہم بن جاتی تو کیا برائی تھی لیکن دوسری طرف بہت سے مہیب سوال بھی اٹھتے تھے۔ وہ اپنوں سے دور تھی۔ ایک ایسے شخص کے ساتھ اس کا ناتا جڑ رہا تھا جو قانون کے کاغذوں میں قاتل اور ڈاکو تھا۔ پولیس پھانسی کا پھندا لے کر اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی اور ماکھو اندر آ گئی، اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری سی تھی۔ عجیب دہقانی گرم جوشی کے ساتھ وہ آگے بڑھی اور اس نے شانی کو گلے سے لگا لیا۔ اس کا سر اپنے کندھے پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''نکڑی! سیانے کہہ گئے ہیں.....

سدا نہ باغیں بلبل بولے سدا نہ باغ بہاراں
سدا نہ ماپے حسن جوانی سدا نہ سوہت (صحبت) یاراں

جو کچھ بھی اس جندگی سے مل جائے لے لینا چاہئے۔ چاہے گھڑی دو گھڑی کی کھشی ہی کیوں نہ ہو۔ اور نکڑی! تمہاری کھشی تو اللہ نے چاہا تو بڑی لمبی ہونی ہے۔ تم دونوں ویاہ کر کے کہیں دور نکل جانا۔ پٹھانوں کے علاقے کی طرپھ..... وہاں پلس کی ہوا بھی تم دونوں کو نہیں لگے گی۔ میں سچ کہتی ہوں نکڑی.....! کدرت نے یہ بڑا ہی اچھا موکع تم دونوں کو دیا ہے۔''

''لیکن.....''

''لیکن شیکن نہ کر میری نکڑی.....!'' ماکھو نے اُسے اپنے ساتھ بھینچ کر ماتھا چوما۔ ''ابھی دراج اور عارپھ دونوں رستم کے پاس گئے تھے۔ بڑی دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہے ہیں..... بڑے اونچے دماک (دماغ) والے ہیں یہ دونوں۔ رستم کو ویاہ کے لئے راجی کر کے ہی اٹھے ہیں۔ ابھی آ کر انہوں نے مجھے بتایا ہے۔''

شانی نے پوری آنکھیں کھول کر ماکھو کی طرف دیکھا۔ ''تم..... سچ کہہ رہی ہو ماکھو یا.....؟''

''تو کیا اپنی نکڑی بہن سے جھوٹ بولوں گی۔''

شانی گم صم کھڑی تھی۔ ماکھو اپنے ساتھ جو ٹوکری لائی تھی وہ زمین پر پڑی تھی۔ اس نے جھک کر بانس سے بنی ہوئی ٹوکری اٹھائی اور شانی کے سامنے اس کا ڈھکن اٹھایا۔ یہ ٹوکری اوپر تک چھوٹے چھوٹے سفید پھولوں سے بھری ہوئی تھی، سینکڑوں پھول ہوں گے، ہلکی ہلکی مہک کمرے میں پہلے سے موجود تھی، اب یہ اور تیز ہو گئی۔ اس نے ٹوکری سامنے کھڑکی کی دہلیز پر رکھی اور بولی۔ ''یہ بھی آپاں کی (ہماری) ایک رسم ہے۔ یہ پھول بستی کے لوگوں نے اکٹھے کئے ہیں۔ ہر بچے بڑے نے ایک ایک پھول دیا ہے۔ یہ کاہو کے پھول ہیں۔ یہ جنگلی پھول پیار کی نشانی ہوتے ہیں۔ میں یہ پھول یہاں تیری کھڑکی میں چھوڑے جا رہی ہوں۔ اگر سویرے تک تیرا جواب ہاں میں ہوا تو یہ سارے پھول اپنے دوپٹے میں ڈال کر ٹوکری کھالی کر دینا..... اور..... اور مجھے یکین ہے نکڑی! تیرا جواب، جرور ہاں میں ہو گا۔ سویرے یہ ٹوکری کھالی ملے گی۔''

وہ بڑے اعتماد کے ساتھ شانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لالٹین کی روشنی اس کی سرمہ لگی آنکھوں میں منعکس ہو رہی تھی۔ شانی کے جسم میں ہلکی سی لرزش تھی۔ اسے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ فی الوقت اس کی خواہش تھی کہ ماکھو جلد از جلد یہاں سے چلی جائے۔

وہ بڑی دانا عورت تھی اس کی دہقانی دانائی نے اسے بتا دیا کہ اب اسے یہاں سے چلے جانا چاہئے اور وہ چلی گئی۔

شانی کمرے میں تنہا رہ گئی۔ ہاں وہ تنہا رہ گئی۔ پھولوں کے ساتھ، روزن سے جھانکنے والے چاند کے ساتھ اور کہیں دور بجتی بانسری کے ساتھ۔

وہ سوچتی رہی، خیالات کے لشکر اس کے دل و دماغ پر یلغار کرتے رہے۔ آج تک اس نے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ نہ ہی کبھی اپنے مستقبل کی کوئی شکل متعین کی تھی لیکن مستقبل کا ایک موہوم سا خاکہ اس کے ذہن میں بھی تھا۔ فاخر سے جدا ہونے کے بعد یہ موہوم سا خاکہ اس کے ذہن میں نمودار ہوا تھا اور بس کبھی کبھار ہی اپنی جھلک دکھاتا تھا۔ اس خاکے میں ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ پھولوں سے ڈھکا ہوا اور جھرنوں میں گھرا ہوا، سرِ شام اس گھر میں خوشبوئیں بکھر جاتی تھیں، ستارے جھروکوں سے جھانکتے تھے۔ اس گھر میں ایک بچے کی چہکاریں اور شرارتیں بھی تھیں۔ بچہ کون تھا؟ ہاں یہ وہی معصوم تھا جو ماں کی موت کے

بعد شانی کو اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھا تھا۔ یہ مُنا تھا۔ اس گھر میں شانی اور مُنا آگے پیچھے بھاگتے تھے..... اس گھر میں چوڑے سینے اور مضبوط بازوؤں والے ایک مرد کا ہیولا بھی تھا۔ یہ مرد کون تھا؟ کون تھا جو بھاری قدموں سے آتا تھا..... شانی اور مُنے کو ایک ساتھ اپنی محبت بھری بانہوں میں لے کر بھینچ لیتا تھا اور پھر..... پھر کسی اچھے سے کھانے کی فرمائش کرتا تھا۔ اس تصوراتی گھر میں ایک صاف ستھرا، خوشبودار بستر بھی تھا۔ ایسا بستر جس پر گھنے بالوں اور بوجھل سانسوں والا کوئی جسم شانی کو روندتا نہیں تھا۔ اس کے کومل جسم کو اپنی اذیت رسانی سے کچلتا نہیں تھا۔ بلکہ اس ریشمی بستر کے گرد نرم، خوشبودار محبت کا چمکیلا حصار بنتا تھا۔ اس مرد کا ہیولا اس بستر کو اور بھی دل نشیں بنا دیتا تھا، کون تھا یہ مرد؟ اس مرد کی شکل شانی کو واضح طور پر نظر نہیں آتی تھی..... لیکن..... لیکن وہ بہت حد تک شانی کو جانا پہچانا لگتا تھا۔ اس کے لمبے بال تھے۔ اس کی چھوٹی سی ریشمی داڑھی تھی۔ اس کے شانے چوڑے اور ہموار تھے۔ وہ بڑی ٹھہری ہوئی آواز میں بولتا تھا۔ وہ کچھ رستم سے ملتا جلتا تھا اور کبھی کبھی شانی کو لگتا تھا کہ وہ رستم ہی ہے۔ آج بھی وہ اسے اپنے تصور کے موہوم سے خاکے میں دیکھ رہی تھی لیکن آج اس کی شکل شانی کو ہمیشہ سے واضح نظر آ رہی تھی۔

شانی نے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کرنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو اس کی نگاہ اپنی کلائی پر پڑی، دو دھیا جلد پر نیل ابھی تک موجود تھا۔ یہ کٹھولی گاؤں میں رستم کی ناقابل شکست گرفت کا نیل تھا۔ کٹھولی گاؤں کے میلے اور خونی بنگے کا سارا منظر ایک بار پھر شانی کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ چوہدریوں کے ہاتھوں بے بس ہونے کے باوجود رستم بے بس نہیں ہوا تھا۔ دشمنوں کی بھیڑ اور لاٹھیوں کی بارش میں اس نے شانی کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ شاید اگر وہ ہمت ہار جاتا تو وہ صدائے احتجاج بلند نہ ہوتی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے اردگرد کا سارا منظر بدل دیا تھا۔ داناؤں نے سچ کہا ہے، جب سروں میں سودا ہو اور ارادے مصمم ہوں تو دیواروں میں در بنتے ہیں۔

سوچتے سوچتے شانی کا ذہن تھک گیا۔ وہ چارپائی پر نیم دراز حالت میں لیٹ گئی۔ غنودگی کی کیفیت میں اس کا اپنا ہیولا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ یہ رنگ والی کی چھوٹی بی بی کا ہیولا تھا۔ بھاری بھرکم کپڑوں میں لپٹا ہوا، زیورات سے سجا ہوا۔ ہیولے نے اس سے کہا۔

''آج ایک آخری فیصلہ کر لے شہناز، تُو چاہتی کیا ہے لیکن جو فیصلہ بھی کرنا ہے اس سے پہلے یہ سوچ لینا تُو رنگ والی کے اُجڈ شملے والے چوہدری ارشد کی دھی رانی ہے۔''

''میں سب جانتی ہوں لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ کوئی انسان چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ اس

کا کردار اسے چھوٹا یا بڑا بناتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، تُو خود کو رستم کے بستر پر لٹائے گی۔ اپنا آپ اس کے سپرد کر دے گی ہمیشہ کے لئے۔''

''اگر اس کے ساتھ، دستور کے مطابق میری شادی ہوتی ہے..... تو پھر..... ایک بیوی کی حیثیت سے اسے محبت دینا میرا فرض ہوگا اور میں یہ کروں گی۔''

''شاید تُو غلط کہہ رہی ہے۔ تُو یہ شادی اس لئے نہیں کرے گی کہ رستم سے بے حد محبت کرتی ہے۔ تُو یہ شادی اس لئے کرے گی کہ تیری وجہ سے رستم بہت سی تکلیفوں سے گزرا ہے۔ تُو یہ شادی ایک کفارے اور سزا کے طور پر کرے گی۔ رستم تیرے جسم سے خوشی کشید کرے گا۔ اس سے کھیلے گا، اسے فتح کرے گا۔ اس طرح تجھے احساس ہوگا کہ تُو اپنی کوتاہیوں کی تلافی کر رہی ہے۔ یہ شادی نہیں ہے، یہ تو ایک تلافی ہے۔''

''اگر ایسا بھی ہے تو اس میں کیا حرج ہے اور یہ فقط تلافی ہی تو نہیں ہے۔ اس میں محبت بھی تو ہے اور محبت تلافی کے ساتھ مل کر حسین ترین ہو جاتی ہے۔ پھر جب اس محبت کو ازدواجی رشتے کی طاقت ملے گی تو اس میں اور شدت آئے گی۔''

''سوچ لے شہناز.....! وہ تجھے پوجتا ہے اور پوجا بس اس کی ہوتی ہے جس کا حصول نہیں ہوتا۔ جب تُو حاصل ہو جائے گی تو دیوی نہیں رہے گی۔ فقط گھر والی کہلائے گی۔''

''اگر ایسا ہے تو مجھے یہ بھی قبول ہے لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ وہ مختلف ہے، اس کا پیار بھی مختلف ہے اور وہ باتیں بھی سب سے جدا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہیر رانجھا مل بھی جاتے تو زندگی کی آخری سانس تک ہیر رانجھا ہی رہتے.....''

''سب اسی غلط فہمی میں ہوتے ہیں شہناز..... ! کہ ان کا پیار انوکھا ہے۔ آخر میں وہی ہوس کی کہانی نکلتی ہے۔ تاج محل مت بناؤ شہناز کیونکہ یہ گر جاتے ہیں۔''

''غلط کہتی ہو۔ میں نے کسی سے سنا تھا، تاج محل بنانے چاہئیں..... کیونکہ کبھی کبھی سچ مچ کے تاج محل بن جاتے ہیں اور وہ گرتے نہیں۔ انہیں دریائے جمنا کے کنارے ہر کوئی دیکھ سکتا ہے..... چھو سکتا ہے۔''

''کتابوں، کہانیوں کی باتیں کر رہی ہو۔ تمہیں پچھتانا پڑے گا۔ ایک بار پھر اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔''

اس سے پہلے کہ شانی جواب دیتی اسے لگا کہ درجنوں، بیسیوں مہتم عورتیں اور بچے ہاتھوں میں کاہو کے پھول لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ وہ گا رہے تھے۔

تیرا ماہی بڑی دور سے آیا ہے ... اس کا مکھڑا زخموں نے گہنایا ہے۔

دیکھ نی! اس کے بھیڑے حالوں کو..... دیکھ نی! اس کے پاؤں کے چھالوں کو۔

مسکراتے چہروں والے لوگ امڈتے چلے آئے۔ شانی کا مخالف ہیولا ان چہروں کے پیچھے اوجھل ہوگیا۔ اندھیرے میں اجالے کی آمیزش بڑھتی چلی گئی۔ چڑیوں کے چہکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ مویشیوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں اس وسیع جھونپڑا بستی کے طول وعرض میں جلترنگ بکھیرنے لگیں۔ شانی بڑے وقار کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس کے سامنے کھڑکی کی دہلیز پر بانس کی ٹوکری پڑی تھی۔ اس میں کاہو کے پھول تھے۔ اسے لگا، یہ پھول نہیں بلکہ آنکھیں ہیں جو اس کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔

شانی کے سینے میں ایک میٹھی سی لہر اٹھی۔ ایک ایسی کیفیت جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی، وہ دھیرے دھیرے کھڑکی کے سامنے آگئی۔ پھول اس کے سامنے تھے۔ وہ ان پھولوں کے حوالے سے آخری فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ رات کو ماکھو نے اسے بتایا تھا کہ اگر اس کا جواب ہاں میں ہو تو وہ ان پھولوں کو اپنی اوڑھنی کے دامن میں بھر لے اور شانی اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ ان پھولوں کی جگہ اب اس کی اوڑھنی کا دامن ہی ہے۔

وہ ٹوکری کے پاس پہنچ کر اپنی انگلیوں کی پوروں سے ان پھولوں کو چھونے لگی، ان پر شبنم کی ہلکی سی نمی تھی اور خوشبو ان کے مساموں سے پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی، یکایک حیا کی لہر سے شانی کے رخسار تپ گئے۔ اسے لگا جیسے وہاں چھپی سینکڑوں نگاہیں اس کھڑکی کی طرف دیکھ رہی ہیں اور شاید ان نگاہوں میں کہیں رستم کی نگاہ بھی ہے۔ شانی نے اپنی بوجھل پلکوں سے اس چار دیواری کی طرف دیکھا جہاں رستم کا قیام تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس ''چار دیواری'' کو نہیں اس میں موجود رستم کو دیکھ رہی ہے۔

اس کے رخساروں کی تپش بڑھ گئی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ آئی۔ یہ کام وہ اندھیرے میں کر گزرتی تو زیادہ اچھا تھا۔ وہ جانتی تھی ابھی تھوڑی دیر میں ماکھو اپنے زیورات کڑکڑاتی کمرے میں پہنچ جائے گی۔ یہاں پہنچنے کے بعد اس نے سب سے پہلے سوال ٹوکری اور پھولوں کے بارے میں ہی کرنا تھا۔

ایسے میں شانی اس پر اپنی مرضی واضح کرسکتی تھی۔ اسے بتا سکتی تھی کہ اس کا جواب ''ہاں'' میں ہے۔ پھر شاید ماکھو خود ہی ٹوکری پکڑ کر شانی کی اوڑھنی میں الٹ دیتی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گئی اور تصور کی نگاہ سے ماکھو اور اس کی ساتھی عورتوں کے خوشی سے دمکتے چہرے دیکھنے لگی۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ پھر شانی کو قدموں کی چاپ سنائی دی۔ چاپ کے ساتھ زیورات کی کڑکڑاہٹ بھی تھی، یقیناً ماکھو اس کی طرف آرہی تھی۔ شانی کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور رخسار پھر تپنے لگے۔

ماکھو تیزی سے اندر آئی۔ شانی سے کچھ کہے بغیر اس نے چارپائی پر سے دری اور پھولدار چادر کھینچ لی، پھر وہ ان برتنوں کی طرف بڑھی جس میں رات کو شانی نے کھانا کھایا تھا۔ اس نے وہ برتن دوسرے برتنوں سے علیحدہ کر کے کھڑکی سے باہر پھینک دیئے تب وہ دندناتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے پر پہنچ کر اسے جیسے کچھ یاد آیا۔ وہ پلٹی، کھڑکی کی دہلیز پر پھولوں والی ٹوکری رکھی تھی۔ اس نے بڑی نفرت سے ٹوکری بھی پھولوں سمیت نیچے پھینک دی۔

شانی ہکا بکا تھی۔ ماکھو دروازے سے باہر نکلنے لگی تو شانی نے آواز دی۔ ''کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے.....؟''

ماکھو جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گئی۔

شانی ششدر تھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا۔ ٹوکری سے پھول نہ اٹھانے کی وجہ سے تو ماکھو اس قدر برہم نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ تو ایک علامتی سی رسم تھی۔ یقیناً بات کچھ اور تھی اور یہ جو بات بھی تھی خاصی گھمبیر تھی۔

ابھی شانی اسی ادھیڑبُن میں تھی کہ نیچے گلی سے تین چار افراد کے تیز لہجے میں بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ شانی بے تاب ہوکر دوسرے کمرے کی طرف بڑھی۔ ایک جواں سال مہتم عورت اپنے تنگ دھڑنگ بچے کو گود میں اٹھائے برآمدے کی طرف جا رہی تھی۔ شانی نے اسے آواز دی۔ ''بہن بات سنو..... بہن!''

اس عورت نے ایک ڈری ہوئی سی نگاہ شانی پر ڈالی اور جواب دیئے بغیر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

اسی دوران میں وہ بڑی عمر کی عورت شانی کے پاس پہنچی جس نے دو دن پہلے بھی شانی سے بات کی تھی اور بڑی محبت کا اظہار کیا تھا۔ اس کا نام داری تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پتیلی تھی جس میں گرم پانی کے اندر نیم کے پتے تیر رہے تھے۔ شانی کو دیکھ کر اس کا چہرہ کرخت ہوگیا، بالکل اجنبی لہجے میں بولی۔ ''حرامجادی، اوتری، نکھتری، تجھے اپنی نوست (نحوست) پھیلانے کے لئے یہی جگہ ملی تھی؟''

''مم..... میں نے کیا کیا ہے ماسی؟''

''تُو نے کیا نہیں کیا ہے..... نی! تُو گئے کی رن ہے۔ تیرے ہتھ بھی گل کر جھڑ جائیں تو یہ کم ہے۔''

''مجھے کچھ بتاؤ تو ماسی؟''

''تُو نے جمرت صاحب کی بیبیوں پر ہتھ اٹھایا ہے۔ ان کو مارا ہے۔ تُو نے جمرت صاحب کو دکھ دیا ہے۔ ان کا پاک برتن توڑا ہے۔ تیری جبان میں کیڑے پڑیں..... تُو نے پیرو مرشد کے کھلاف باتیں کی ہیں۔ آپاں تم کو کبھی ماف نہیں کریں گے، نہ تیرے سنگی ساتھیوں کو.....''

''میری بات تو سنو ماسی۔''

''کھبر دار کتیا..... جو ہتھ لگایا مجھے تو..... اپنا پر چھانواں دور رکھ مجھ سے۔'' ماسی داری تیزی سے ایک طرف کو کھسکتے ہوئے بولی۔

اس سے پہلے کہ شانی مزید کچھ کہتی، وہ جلدی جلدی سیڑھیاں اُترتے ہوئے نیچے چلی گئی۔ شانی آنکھوں میں آنسو لئے کھڑی تھی۔ اس کی نگاہ بے ارادہ ماسی داری کا تعاقب کر رہی تھی۔ ماسی داری نے دراج کے مکان کے سامنے والا کھلا احاطہ پار کیا اور دوسرے سرے پر بنے ہوئے جھونپڑوں کی طرف چلی گئی۔ اس طرف ایک بڑے جھونپڑے کے سامنے ایک چارپائی بچھی تھی۔ اس چارپائی کے اردگرد کوئی ایک درجن مہتم عورتیں موجود تھیں۔ چارپائی پر ایک بھاری بھرکم عورت لیٹی تھی۔ شانی کو یاد آیا یہ وہی بیمار عورت ہے جسے دو دن پہلے رات کے اندھیرے میں شانی نے دیکھا تھا۔ مقامی لوگ اس کی چارپائی کندھوں پر اٹھا کر لائے تھے، ماکھو نے بتایا تھا کہ یہ عورت شہر میں کام کرتی تھی، وہاں سخت بیمار ہو کر ہسپتال پہنچ گئی تھی اور اب ہسپتال سے واپس اپنے گھر آئی ہے۔

شانی نے اس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ آج بھی وہ عورتوں کی اوٹ میں تھی کچھ دیر بعد سامنے کی عورتیں اِدھر اُدھر ہوئیں تو شانی کو بیمار عورت کی صورت نظر آئی یکایک شانی کے جسم میں چیونٹیاں رینگ گئیں۔ یہ بیمار عورت جالاں تھی، شانی کی نگاہ دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ وہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل کر گہرا سیاہ ہو گیا تھا۔ چہرے پر کھرنڈ سے تھے اور یہ کھرنڈ جسم کے سارے ننگے حصوں پر بھی تھے۔ وہ اب بھی بھاری بھرکم تھی لیکن نسبتاً پہلے سے کمزور ہو چکی تھی۔

یکایک ساری صورتِ حال شانی کی سمجھ میں آ گئی۔ جالاں مہتم تھی اور اسی مہتم بستی کی رہنے والی تھی۔ اسے شانی کے بارے میں کیا معلوم نہیں تھا..... اور اسے جو کچھ معلوم تھا اس نے مقامی لوگوں کو بتا دیا تھا۔ شانی نے دو تین دن پہلے بھی ماکھو سے کسی پیرو مرشد کا ذکر سنا

تھا، ماکھو نے کہا تھا کہ پیرو مرشد دعا کریں گے، اب اس کے سارے بگڑے کام سنور جائیں گے۔ اب شانی پر انکشاف ہو رہا تھا کہ وہ پیرو مرشد بہروپیا پیر قدرت اللہ ہی تھا۔

شانی کے دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے مرد و زن جالاں کے جھونپڑے کے اردگرد اور سامنے کے کھلے احاطے میں جمع ہو گئے۔ ان سب کے چہروں پر تناؤ کی کیفیت تھی۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے اور ان کی غصیلی نگاہیں گاہے بگاہے اس کھڑکی کی طرف اٹھ جاتی تھیں جس کے عقب میں شانی موجود تھی۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جالاں ہاتھ نچا نچا کر بلند آواز میں کچھ کہہ رہی تھی مگر فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب آواز شانی تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ یہ بڑی مختلف صورتِ حال تھی، کل تک یہی لوگ تھے، یہی جگہ تھی لیکن چہرے مسکرا رہے تھے، آنکھوں سے شانی کے لئے محبت چھلک رہی تھی۔ آج سب کچھ بدل گیا تھا۔ وہ ایک دم سہم سی گئی۔ کچھ دیر پہلے نگاہوں میں جو خواب سجے تھے وہ چکنا چُور ہونے لگے۔ خوشی کتنی مدت کے بعد ملی تھی اور کتنی تھوڑی مدت کے لئے ملی تھی۔ وہ تو ابھی ایک بار کھل کر مسکرائی بھی نہیں تھی کہ آنکھوں میں پھر سے نمی اُترنے لگی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو ننھے ننھے پھول کھڑکی کی دہلیز پر اس کے لئے مہک رہے تھے..... اور اس کی ''ہاں'' کے لئے بے قرار نظر آتے تھے، وہ اب نیچے دھول میں پڑے تھے اور لوگ انہیں روندتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اتنے میں دروازے پر آہٹ ہوئی شانی نے گھوم کر دیکھا۔ عارف کمبوہ تیزی سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ شانی کے پاس پہنچ کر وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے بی بی..... ! اس خبیث عورت نے سارا کام خراب کر دیا ہے۔ یہ شہر کے ہسپتال میں ہی کہیں مر جاتی تو اچھا تھا۔''

عارف کا اشارہ یقیناً جالاں ہی کی طرف تھا۔ شانی نے پوچھا۔ ''کیا کہا ہے اس نے؟''

''وہ سب کچھ جسے سن کر یہ مہتم آگ بگولا ہو سکتے تھے۔ قدرت اللہ کو یہ مہتم برادری جتنا مانتی ہے اتنا کوئی اور نہیں مانتا۔ وہ اس پر اندھا یقین رکھتے ہیں۔ اب تمہارے حوالے سے جالاں کی باتوں نے انہیں غم و غصے سے بھر دیا ہے، تمہارے اور رستم کے لئے ان کی ساری کی ساری محبت، خوف اور نفرت میں بدل گئی ہے۔ میں بڑی غلط سلط باتیں سن کر آ رہا ہوں..... مجھے ڈر ہے کہ.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ شاید اسے احساس ہو گیا کہ بات مکمل کر کے اسے شانی کی پریشانی میں اضافہ نہیں کرنا چاہئے۔

اتنے میں کھیا دراج بھی اندر آ گیا۔ شانی نے دیکھا کہ کلاشنکوف اس کے کندھے سے لٹک رہی ہے۔ اس کی چوڑی پیشانی پسینے سے تر تھی..... شانی سے نظر ملائے بغیر عارف سے

مخاطب ہو کر بولا۔ ''ماملہ کھراب ہوتا جارہا ہے۔ حجرت صاحب کا بڑا مرید جالب آپے سے باہر ہورہا ہے۔ اس نے جالاں کے ساتھ مل کر لوگوں کو بہت بھڑکا دیا ہے۔ کوئی اور ماملہ ہوتا تو مجھے سنبھالنے میں جرا دیر نہ لگتی۔ پر یہ بڑا نا جک ماملہ ہے۔ ایسی لڑائی کو لوک ایک منٹ میں کافر مسلمان کی لڑائی بنا لیتے ہیں۔''

''وہ دیکھو..... میرا خیال ہے کہ دوسرے پنڈ سے بھی لوگ آرہے ہیں۔'' عارف نے کھڑکی میں سے دور کچے راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شانی اور کھیا دراج نے ایک ساتھ پلٹ کر دیکھا، چھوٹی بڑی ٹولیوں کی صورت میں درجنوں افراد تیز قدم اٹھاتے اس جھونپڑا بستی کی طرف آرہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور کلہاڑیاں وغیرہ تھیں۔ اپنے حلیے اور شکل وصورت سے وہ بھی مہتم ہی نظر آتے تھے۔ ماکھو نے شانی کو بتایا تھا کہ ڈیک نالے کے ساتھ ساتھ اوپر کی طرف دو تین مزید مہتم بستیاں موجود ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے بستی کے وسط میں کھلی جگہ پُر ہجوم میں اضافہ ہونے لگا۔ لوگوں کے چہرے تنے ہوئے تھے۔ کھیا دراج کے خاص آدمی جو لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے، ہجوم کو ایک حد سے آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ خاص آدمیوں میں سے دو تین کے پاس دیسی ساخت کی رائفلیں بھی نظر آرہی تھیں۔

کھیا دراج نے ایک گہری سانس لی تو اس کا چوڑا سینہ دیوار کی طرح نظر آنے لگا۔ وہ مستحکم آواز میں بولا۔ ''نکڑی! تم کو پریشان ہونے کی جرورت نہیں۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔ میں نیچے جا کر ان لوگوں سے بات کرتا ہوں۔''

عارف کمبوہ نے کہا۔ ''کیا یہ اچھا نہیں کہ سب کے سامنے جانے کے بجائے تم دس بندوں کو اندر بلا کر بات کرلو۔ (غالباً دس خاندانوں کی دس عورتوں کی طرح دس مردوں کو بھی اکائی کی طرح سمجھا جاتا تھا)

ابھی دراج نے عارف کمبوہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اچانک سیڑھیوں کی طرف سے شور وغل سنائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے افراد سیڑھیوں پر دندناتے ہوئے اوپر آنے لگے۔ ان کے لاکارے بڑے خوفناک تھے..... وہ ایک دوسرے کو مشورہ دے رہے تھے..... باہر نکالو اس کو..... ٹوٹے کردو..... تھاں مار دو.....

دراج کے سانولے چہرے پر خون کی سُرخی دوڑ گئی۔ اس نے بلا تامل اپنی خوفناک کلاشنکوف کندھے سے اُتار کر ہاتھ میں لے لی۔

جو افراد سیڑھیاں چڑھ کر دروازے پر نمودار ہوئے، ان کی تعداد دس کے لگ بھگ تھی۔ ان میں پانچ چھ نوجوان تھے۔ چھوٹی داڑھی والا نوجوان سب سے آگے تھا اس کے ہاتھ میں چھوٹے سے دستے والی چمکیلی کلہاڑی تھی۔ وہ شکل وصورت سے دراج کا قریبی رشتے دار لگتا تھا۔

یہ پُرغضب ٹولی کھیا دراج کو اپنے سامنے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے چونکی شاید انہیں توقع نہیں تھی کہ دراج یہاں موجود ہوگا۔ دو تین سیکنڈ خاموشی رہی پھر سب سے پہلے اندر داخل ہونے والا داڑھی والا نوجوان کڑک کر بولا۔ ''حرامجادی! یہاں چھپ کر بیٹھی ہوئی ہے..... باہر نکل..... تُو نے حجرت صاحب کی بیبیوں پر ہتھ نہیں اٹھایا..... ہماری ماؤں پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ تُو نے ہم سب کی عجت کا جنازہ نکالا ہے۔ آپاں تجھے اس کی سجا جرور دیں گے۔''

کھیا دراج اور عارف کمبوہ آگے بڑھ کر مشتعل ٹولی اور شانی کے درمیان آگئے۔ دراج اپنی پاٹ دار آواز میں پھنکارا۔ ''تمہارا دماک کھراب ہوگیا ہے؟ کھبر دار اگر کسی نے اسے ہتھ لگایا تو..... ابھی اس پر صرپھ الجام لگا ہے۔ الجام سچا ہے یا جھوٹا، اس کا پھیصلہ ابھی نہیں ہوا، جب تک پھیصلہ نہیں ہوتا یہ بے کسور ہے، بالکل بے کسور ہے۔''

''پھیصلہ ہوگیا ہے چاچا..... ماسی جالاں نے اک اک بات بتا دی ہے اس حرامجادی کی۔ اب آپاں کو کسی تھانے کچہری کی جرورت نہیں ہے۔''

ایک بہت مشتعل شخص نے نوجوان کے پیچھے سے چھوٹے دستے کی کلہاڑی پھینک کر شانی کو ماری، شانی خوف سے چیخ کر ایک طرف سمٹی، کلہاڑی اس کے پہلو سے ہوتی ہوئی پُرشور آواز کے ساتھ بڑے جستی ٹرنک سے ٹکرائی۔

اب کھیا دراج کے لئے اپنی اتھارٹی ثابت کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور کلاشنکوف کا آہنی دستہ گھما کر کلہاڑی پھینکنے والے شخص کے جبڑوں پر دے مارا وہ ڈکرا کر لڑکھڑایا اور سیڑھیوں سے نیچے گر گیا۔ داڑھی والے نوجوان نے دراج کی بغل میں سے نکل کر شانی کی طرف آنا چاہا۔ اس کا راستہ عارف کمبوہ نے روکا اور اسے زوردار دھکے سے پیچھے ہٹا دیا۔ اسی دوران میں کھیا دراج نے ایک اور شخص کے پیٹ میں لات ماری اور باقیوں کی طرف اپنی کلاشنکوف سیدھی کرلی۔

یہ لوگ شانی پر جھپٹنا تو چاہتے تھے مگر اپنے سردار سے دست وگریباں ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ سردار یعنی کھیا دراج گرجا۔ ''پیچھے ہٹ جاؤ..... جان سے مار دوں گا..... پیچھے ہٹ جاؤ۔''

داڑھی والے نوجوان سمیت وہ لوگ سیڑھیوں کی طرف پسپا ہو گئے اور پھر نیچے اُتر گئے، تاہم احاطے میں شور وغل کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ کئی پتھر اُڑتے ہوئے آئے اور اس کھڑکی سے ٹکرائے جس کی دہلیز پر کل شب پھولوں بھری ٹوکری رکھی گئی تھی۔

کھیا دراج نے عارف کمبوہ کے کان میں چند سرگوشیاں کیں اور شانی کی طرف تسلی دینے والے انداز میں دیکھتا ہوا نیچے اُتر گیا۔ سیڑھیوں کی طرف آنے والے چوبی دروازے کو وہ باہر سے مقفل کر گیا تھا۔

اچانک شانی کو بستی کے جنوبی حصے سے دھوئیں کے مرغولے اٹھتے دکھائی دیئے۔

''ہائے اللہ..... یہ کیا ہے۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

عارف نے اپنے ہونٹ سکوڑے۔ تشویش ناک انداز میں بولا۔ ''مجھے لگتا ہے لوگوں نے کلینک کو آگ لگا دی ہے۔''

''یہاں کون سا کلینک تھا؟' شانی نے حیرانی سے پوچھا۔

''ابھی بن رہا تھا۔ دو جھونپڑے کھڑے کئے گئے تھے۔ ہم ہی بنا رہے تھے۔'' وہ افسردہ لہجے میں بولا۔

جدھر سے دھواں اٹھ رہا تھا، اسی طرف سے لوگوں کا شور بھی بلند ہو رہا تھا۔ وہ نعرہ زنی کا انداز اختیار کئے ہوئے تھے۔

شانی کا دھیان رستم کی طرف چلا گیا۔ ''رستم کہاں ہے.....؟'' شانی نے عارف سے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں ہی ہے۔''

''مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ بھڑک نہ اٹھے۔ لوگ بھی بہت غصے میں ہیں، کہیں خون خرابا نہ ہو جائے۔''

''دراج اسی کی طرف گیا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں، وہ سب سنبھال لے گا۔'' پھر وہ کھڑکی سے نیچے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ دیکھیں..... دراج کے ذاتی ملازموں نے گھر کو گھیرے میں لے لیا ہے۔''

شانی نے دیکھا۔ یہ دس پندرہ صحت مند مہتم تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں تھیں..... ایک دو رائفلیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ لوگوں کو کھیا کے گھر سے دور رہنے کا کہہ رہے تھے۔ لوگ بدستور بپھرے ہوئے تھے۔

شانی، جالاں کی لگائی ہوئی یہ آگ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ عقیدوں

کی وجہ سے لوگ کتنی جلدی اور کتنی شدت سے بدلتے ہیں۔ یہی ہنستے مسکراتے لوگ تھے جو کل تک شانی کے لئے اپنی بہترین خواہشات کا اظہار کر رہے تھے، آج اپنے عقیدے پر زد پڑنے کی وجہ سے اس کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔

پانچ دس منٹ بعد ہجوم احاطے سے گلیوں کی طرف منتشر ہو گیا نعروں اور للکاروں میں بھی کمی آ گئی، مگر فضا میں شدید تناؤ کی کیفیت بدستور موجود رہی۔ عارف کمبوہ بڑی چوکس حالت میں شانی کے پاس موجود تھا۔ شانی جانتی تھی کہ اس کی قمیص کے نیچے پستول لگا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہانپتا ہوا کھیا دراج دوبارہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔ اس نے اپنے دوست عارف کو بتایا۔ ''گھبرانے کی بات نہیں۔ لوک کابو میں ہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے پنچوں کو بھی بلایا ہے۔ مل بیٹھ کر کوئی بھیسلہ کرتے ہیں۔''

پھر وہ رخ پھیر کر شانی سے مخاطب ہوا۔ ''نکڑی..... تجھے بھکر کرنے کی کوئی جرورت نہیں۔ بالکل بھی جرورت نہیں۔ تم دونوں دراج کے پرونے (مہمان) ہو اور اپنے پرونوں کی حفاجت کرنا دراج کھوب اچھی طرح جانتا ہے۔''

''لیکن..... لوگ بہت..... غصے میں نظر آتے ہیں۔'' شانی ہکلا کر بولی۔

''اوئے..... ! ایسی کی تیسی ان کے گھسے کی۔ پیدا کرنے والے کی کسم، تم دونوں کی کھاطر مجھے دس بیس بندے پھڑکانے پڑے تو ایک سیکنڈ میں پھڑکا دوں گا۔''

شانی الجھی ہوئی نظروں سے کبھی عارف اور کبھی دراج کی طرف دیکھ رہی تھی، اسے یہ خون خرابے والی باتیں خوفزدہ کرتی تھیں۔ اس نے دراج سے پوچھا۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا کہ رستم کے کسی ساتھی سے رابطہ کریں، پولیس اور دوسرے محکموں میں بھی رستم کے کئی جاننے والے ہیں۔ وہ اس مشکل وقت میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔''

دراج کے بجائے عارف بولا۔ ''ایک بندے کو اس کام پر لگایا تو ہوا ہے میں نے لیکن ابھی اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی ہے۔ یا شاید وہ بھی کہیں نار پوری چوہدریوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔''

دراج کے باہر جانے کے بعد عارف کمبوہ نے سگریٹ کے کئی گہرے کش لئے۔ اس کی چوڑی پیشانی پر سوچ کی لکیریں گہری ہو گئیں۔ ''کیا سوچ رہے ہو بھائی؟'' شانی نے پوچھا۔

عارف نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر کہا۔ ''دراج یاروں کا یار ہے۔ وہ بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر لے گا مگر ہماری حمایت سے ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔''

''نقصان سے تمہاری کیا مراد ہے بھائی.....؟''

''تینوں مہتم بستیوں کے تقریباً سارے لوگ ہی ایک طرف ہو گئے ہیں۔ وہ کسی کی کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ میں تو یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ دراج کے گھر والے اور ذاتی نوکر چاکر بھی اس معاملے میں اس کے ساتھ نہیں ہیں۔ یہ تو دراج کا رعب اور اثر ورسوخ ہے جس کی وجہ سے لوگ ابھی کنٹرول سے باہر نہیں ہوئے۔ دراصل ان لوگوں نے قدرت اللہ کو اپنے دماغوں پر اتنا زیادہ سوار کر رکھا ہے کہ ان کے خلاف چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ان سے برداشت نہیں ہوتی اور جو کچھ جالاں اور جالب وغیرہ بتا رہے ہیں وہ تو بہت زیادہ ہے۔''

''لیکن..... یہ جالاں تو خود بھی چوہدری بشیر کی حمایت میں قدرت اللہ کے خلاف چلتی رہی ہے۔''

''وہ اپنی اس غلطی کو مانتی ہے اور کہتی ہے کہ اس غلطی کی وجہ سے اس نے بہت زیادہ سزا بھگتی ہے۔ وہ لوگوں کو اپنا جلا ہوا پنڈا دکھاتی ہے اور توبہ کرتی ہے۔'' عارف کمبوہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''ان علاقوں میں قدرت اللہ کو پہلے بھی بہت زیادہ مانا جاتا تھا لیکن جب سے قدرت اللہ اور اس کے مریدوں سے جھگڑا کرنے والوں کے بیمار ہونے کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس پر لوگوں کا اعتقاد اور بھی پکا ہو گیا ہے۔ اس عجیب بیماری کی واقعی کوئی سمجھ نہیں آئی۔ صرف چوہدری بشیر کے گھرانے اور گھرانے سے تعلق رکھنے والے ہی بیمار ہو رہے ہیں۔''

''یہ کوئی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی اوپر والا لوگوں کے یقین کا امتحان بھی تو لیتا ہے۔'' شانی نے کہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن فی الوقت سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہئے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس بستی میں اب ہمارا رہنا خطرناک ہے۔ اب پولیس زیادہ دیر یہاں سے دور نہیں رہے گی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں رہنے سے دراج کی مشکلیں بڑھیں گی۔''

''لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں سے نکل کر جائیں گے کہاں، پولیس کے مخبر اور بلی ماروں کے کارندے دور دور تک بکھرے ہوئے ہیں۔''

''تمہارے گاؤں کی طرف جانے کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ تو پہلے ہی پولیس کی نگرانی میں ہے۔'' شانی نے انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا۔

''لیکن کچھ بھی ہے شانی بہن یہاں سے تو نکلنا ہوگا۔'' عارف کمبوہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میں اس بارے میں کچھ سوچتا ہوں۔ آپ اتنی دیر میں اپنی چیزیں وغیرہ سنبھال لو۔''

دروازے پر دراج کے دو وفادار ملازموں کو چھوڑنے کے بعد عارف اسی جھونپڑا نما مکان کی طرف بڑھا جہاں رستم قیام پذیر تھا۔ شانی اوپر کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔ ابھی عارف نے احاطہ پار نہیں کیا تھا کہ دو گھڑ سوار اس کے سامنے آ گئے۔ وہ دونوں راستے کی گرد میں اٹے ہوئے تھے اور پتا چلتا تھا کہ دور سے آئے ہیں۔ دونوں نے اپنے سر منہ بڑے بڑے سفید صافوں میں لپیٹ رکھے تھے۔ ایک شخص کے گھوڑے کے پیچھے ایک دوسرا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ اس گھوڑے پر گھریلو استعمال کا کچھ سامان لدا ہوا تھا۔ کچھ زرعی دوائیں تھیں اور غالباً بیجوں کے دو تھیلے تھے۔ دونوں گھڑ سواروں نے عارف سے کچھ باتیں کیں، شانی کو عارف کے چہرے پر ہیجانی کیفیت نظر آئی۔ اس نے دو تین بار تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک بار پھر دونوں افراد سے مصافحہ کیا اور انہیں بڑے احترام سے لے کر اس جھونپڑے میں چلا گیا جہاں رستم اور کھیا دراج موجود تھے۔ جھونپڑے کے عقب میں تقریباً آدھ فرلانگ کی دوری پر جلے ہوئے کلینک سے ابھی تک دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔

شانی بے قراری سے کمرے میں گھومتی رہی، کبھی چارپائی پر بیٹھ جاتی، کبھی کھڑکی میں آ کھڑی ہوتی۔ کھڑکی میں کھڑے ہونا بھی اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لوگوں کے چہروں پر اس کے لئے بیگانگی اور کدورت کے آثار تھے، بچوں کی نگاہ بھی اس پر پڑتی تھی تو ان میں خوف سا اُمڈ آتا تھا۔ کتنی جلدی بدلا تھا سب کچھ۔ ابھی تک شانی کو قدرت اللہ یا اس کی بیبیوں میں سے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ غالب گمان یہی تھا کہ وہ اس دور دراز بستی میں فی الوقت موجود نہیں ہیں۔ دونوں گھڑ سوار ابھی تک جھونپڑے میں موجود تھے۔ دراج اور رستم وغمرہ کے ساتھ ان کی ملاقات طویل ہوتی جا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں شانی کو احساس ہو رہا تھا کہ دونوں گھڑ سوار اہم ہیں اور ان کا تعلق موجودہ صورتِ حال سے بھی ہے۔ ان دونوں کے گھوڑے ایک چھپر تلے باندھ دیئے گئے تھے۔ اب وہ دانہ پانی لینے کے بعد ستا رہے تھے۔ شانی کی خواہش تھی کہ عارف جلد از جلد واپس آئے اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کرے۔

تقریباً آدھ گھنٹہ مزید گزر گیا۔ پھر شانی کو دونوں گھڑ سوار رستم کے جھونپڑے سے نکلتے نظر آئے۔ ان کے چہرے بدستور منڈاسوں میں چھپے ہوئے تھے۔ عارف کمبوہ اور کھیا دراج بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ سیدھے اسی کمرے کی طرف آئے جہاں شانی موجود تھی۔ شانی کا دل انجانے خدشوں سے دھڑکنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر بعد دونوں گھڑ سوار اور عارف کمبوہ شانی کے کمرے میں تھے، کھیا دراج کسی اور طرف نکل گیا تھا۔ عارف نے شانی سے مخاطب ہو کر جذباتی لہجے میں کہا۔ ''دیکھو

بہن! کون آیا ہے؟''

گھڑ سواروں میں سے ایک جو عمر میں قدرے بڑا نظر آتا تھا، آگے بڑھا اور اس نے اپنے سر اور چہرے سے منڈاسا ہٹا دیا۔ شانی سکتے کی سی کیفیت میں رہ گئی۔ خوشی اور حیرت کی ملی جلی کیفیت سے اس کی زبان جیسے گنگ ہوگئی تھی۔ اس کے سامنے اس کے تایا معصوم کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے اور ان کی نیم سفید داڑھی سے ذرا اوپر ان کے سُرخ ہونٹ تھراتے چلے جا رہے تھے۔

پھر شانی حیرت کے شدید جھٹکے سے سنبھلی۔ ''تایا جی......!'' اس کے ہونٹوں سے کراہ نکلی اور وہ بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔ تایا معصوم نے بھی اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور ہچکیوں سے رونے لگے۔ تایا بھتیجی کے ملنے کا منظر دیدنی تھا۔ شانی کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ تایا معصوم اس کے سر اور پیشانی کو چومتے چلے جا رہے تھے۔

تین چار منٹ بعد یہ رقت آمیز منظر ختم ہوا۔ شانی اور تایا معصوم چارپائی پر بیٹھ گئے۔ عارف اور دوسرا گھڑ سوار باہر جا چکے تھے تاکہ تایا بھتیجی آزادی کے ساتھ ایک دوجے سے بات کر سکیں۔ شانی روتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تو لگتا ہے تایا! آپ مجھے بھول ہی گئے ہیں۔ بس میرے حال پر چھوڑ دیا ہے مجھے...... آپ کو کیا پتا میں کیسے کیسے عذابوں سے گزری ہوں۔''

''بیٹی! اگر تم تکلیفوں سے گزری ہو تو ہم پر بھی ہر روز قیامت ٹوٹتی رہی ہے۔ سمجھو کہ مر مر کر جیتے رہے ہیں......''

''تایا! میری چچی پروین کیسی ہیں؟ اور خالو اعجاز اور آمنہ پھوپھی اور فوزیہ...... میں آمنہ پھوپھی کو بہت یاد کرتی رہی ہوں...... آپ سب کو بہت بہت یاد کرتی رہی ہوں۔''

''سب ٹھیک ہیں میری بیٹی...... سب ٹھیک ہیں۔''

''اور سکینہ، صغراں، بابا خادم حسین، بابا فخری اور مختاری اور ثناء اللہ۔'' وہ ایک ایک کا نام لے کر اس کے بارے میں پوچھتی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ تایا معصوم مسلسل اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

وہ ذرا چپ ہوئی تو وہ رقت بھرے لہجے میں بولے۔ ''نارپور کی حویلی میں آگ لگنے کے بعد تو ہم تجھے گنوا ہی بیٹھے تھے دھی رانی۔ ہمیں یہی لگا تھا کہ تُو ہمیں ہمیشہ کے لئے وچھوڑا دے گئی ہے۔ تیری چاچی نے تو رو رو کر خود کو منجھی سے لگا لیا تھا...... رات دن تیرا نام لے کر آہیں بھرتی تھی اور ایک چاچی ہی کیا، پوری حویلی سوگ میں ڈوبی رہتی تھی۔ خادم حسین کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ وہ حویلی چھوڑ کر ہی کہیں چلا گیا اور ابھی تک واپس نہیں آیا...... پھر ہمیں یہ

پتا چلا کہ تُو زندہ سلامت ہے اور اپنے خاوند کے رشتے داروں کے پاس کہیں لاہور میں ہے۔ پہلے تو اس خبر کو ہم نے افواہ سمجھا لیکن بعد میں یہ سب کچھ سچ نکلا۔ ہمیں یہ بھی پتا چلا کہ تیرے سسرالی رشتے دار تیری جان کے لئے خطرہ بن گئے ہیں اور تیرے ایک جیٹھ نے تجھے اپنی حفاظت میں رکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد ہم نے تجھ تک پہنچنے اور تجھے ان لوگوں کے چنگل سے نکالنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ یہ بڑی لمبی اور تکلیف دہ کہانی ہے میری دھی رانی، تجھے تسلی سے سب کچھ بتاؤں گا۔ اس وقت...... اس وقت تو ہمیں بس جلدی سے ایک دو فیصلے کرنے ہیں۔ ہمارے آس پاس حالات بہت خراب ہیں۔ پولیس کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتی ہے۔''

''آ...... آپ کے ساتھ کون ہے تایا جی......؟''

''یہ پولیس والا ہی ہے۔''

''پولیس والا......؟'' شانی کے چہرے پر تشویش گہری ہوگئی۔

''ہاں...... لیکن یہ ہماری مدد کے لئے یہاں آیا ہے۔ شاید تم نے اس کے بارے میں سنا ہی ہو...... یہ رستم سیال کا دوست ہے۔ ایس پی ہے۔ حاجی حیات نام ہے اس کا۔''

شانی سناٹے میں رہ گئی۔ حاجی حیات کے بارے میں اس نے پہلے بھی کئی بار سنا تھا۔ تایا معصوم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''شاید تم نے ہی عارف کمبوہ وغیرہ سے کہا تھا کہ رستم کے دوستوں تک اس کے بارے میں اطلاع پہنچائیں۔ پرسوں رات کمبوہ برادری کا ایک بندہ کسی طرح حاجی حیات کے ایک ماتحت تک پہنچا اور وہاں سے حاجی حیات تک اطلاع پہنچی۔ حاجی حیات بہت اچھا بندہ ہے۔ ہم تجھے ڈھونڈنے کے لئے جو کوششیں کرتے رہے ہیں ان میں حاجی حیات بھی شریک رہا ہے۔ پرسوں بھی جیسے ہی اس تک اطلاع پہنچی، وہ اپنے سارے کام چھوڑ کر رنگ والی پہنچا اور مجھ سے ملا...... رنگ والی سے ہمارے یہاں تک پہنچنے کی روداد بھی کافی لمبی ہے، راستے میں چپے چپے پر پولیس اور نارپوری چوہدریوں کے کارندے پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم مقامیوں کے بھیس میں یہاں پہنچے ہیں۔ شاید تم نے دیکھا ہی ہو، ایک گھوڑے پر ہم نے سامان لادا ہوا ہے۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

تایا معصوم نے اپنی گھڑی پر نگاہ دوڑائی اور اٹھتے ہوئے بولے۔ ''ہمارے پاس وقت بہت کم ہے، باقی باتیں بعد میں کریں گے۔ پہلے میں حاجی صاحب کو اندر بلا لوں۔''

شانی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی تایا معصوم اٹھے اور دوسرے گھڑ سوار کو اندر لے آئے۔ عارف کمبوہ بھی ساتھ ہی آیا۔ دوسرے گھڑ سوار کا چہرہ اب منڈاسا نما پگڑی سے آزاد تھا۔ یہ

بھرے بھرے چہرے اور چھوٹی داڑھی والا ایک بارعب شخص تھا۔ اس کے سر اور داڑھی میں دس پندرہ فیصد سفید بال نظر آتے تھے۔ اس نے شانی کی طرف دیکھ کر اپنائیت سے السلام علیکم کہا۔ شانی نے کھڑے ہو کر جواب دیا۔ پھر وہ چاروں بیٹھ گئے۔

حاجی حیات نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''پوچھنے اور کہنے کے لئے تو بہت سی باتیں ہیں لیکن اس وقت ہمیں صرف بہت ضروری باتیں ہی کرنا ہوں گی۔ وقت بہت کم ہے۔ اس علاقے میں پیر قدرت اللہ کے ماننے والے ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے ذریعے تم دونوں کے یہاں موجود ہونے کی اطلاع مقامی پولیس تک پہنچ چکی ہوگی یا بس پہنچنے والی ہوگی۔ اس کے بعد پولیس کو یہاں پہنچنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ ہرگز نہیں لگے گا۔'' ایس پی حاجی حیات نے چند لمحے توقف کر کے اپنی متاثر کن آنکھوں سے شانی کی آنکھوں میں جھانکا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''شانی بی بی! اس تھوڑے سے وقت میں تمہیں دو اہم فیصلے کرنے ہیں اور یہ دونوں فیصلے بہت ضروری ہیں۔''

شانی نے چہرہ پھیر کر دیکھا، تایا معصوم اور عارف کمبوہ دونوں باہر جا چکے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے شانی اور تایا معصوم کمرے میں تنہا تھے۔ اب حاجی حیات اور شانی تنہا تھے۔ حاجی حیات نے گھمبیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''رستم میرا بہت پرانا دوست ہے۔ ہم نے بہت مشکل موقعوں پر ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے رازداں بھی ہیں۔ میری ساری ہمدردیاں رستم کے ساتھ ہونی چاہئیں اور ہیں بھی..... لیکن میں اس موقع پر وہی بات کہوں گا جو وقت اور حالات کے مطابق مجھے کہنی چاہئے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ امید بھی کروں گا کہ تم یہ بات مان لو گی۔''

شانی نے کہا۔ ''تایا معصوم اور آپ میرے بڑوں کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں۔ ظاہر ہے آپ ہمارے فائدے کی بات ہی کہیں گے۔''

حاجی حیات نے سگریٹ کا ایک چھوٹا سا کش لے کر کہا۔ ''میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ رستم تمہیں بے انتہا چاہتا ہے، اتنی شدید چاہت میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے، تم بھی اسے ناپسند نہیں کرتی ہو لیکن یہاں سوال حالات کا ہے..... حالات سراسر رستم کے خلاف جا رہے ہیں اور اتنے خلاف ہیں کہ شاید تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔''

آخری الفاظ کہتے کہتے ایس پی حیات کا لہجہ دکھ سے بھر گیا۔ اس دکھ میں گہری تشویش بھی شامل تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''پنڈی میں رستم کے ہاتھوں شدید زخمی

ہونے والا پولیس ملازم ہسپتال میں دم توڑ چکا ہے۔ دفعہ 302 کیا بلا ہے، یہ تو ہر کوئی جانتا ہے لیکن جب اس دفعہ کا اطلاق کسی سرکاری یا پولیس ملازم کے حوالے سے ہوتا ہے تو پھر یہ طوفان مچا دیتی ہے۔ محکمے کا بندہ ہونے کی حیثیت سے میں یہ بات بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس سنگین واقعے کے چند ہی دن بعد رستم کے ہاتھوں ایک قتل اور ہو چکا ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے تم اس واقعے کی چشم دید گواہ بھی ہو۔''

''مم..... میں کچھ نہیں.....''

''یہ کوئی ایسی پرانی بات تو نہیں ہے شانی بی بی..... ! کٹھولی کے میلے میں جو ہنگامہ ہوا اس میں مرنے والوں کی تعداد اب پانچ ہو گئی ہے۔ ان میں سے ایک شخص سراج لوہار رستم کی چلائی ہوئی گولیوں سے مرا ہے۔ جب تم دونوں عارف وغیرہ کے ساتھ جیپ پر سوار ہو کر میلے کے ہنگامے سے نکلے تو رستم نے پیچھے آنے والے چار پانچ بندوں پر ماؤزر سے فائرنگ کی تھی۔ اس فائرنگ میں سراج موقع پر ہلاک ہوا۔ اس قتل کی ایف آئی آر بھی خاص رستم کے نام سے کٹی ہے۔ بے شک ان دونوں واقعات کے سبب رستم کے خلاف پولیس کی کارروائی تیز تر ہو گئی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی رستم پر کئی ایک سنگین کیس بنے ہوئے ہیں ان میں دفعہ 302، ڈکیتی کی دفعات 390 اور 391، حملے کی دفعات 325 اور 326 جیسے کئی کیس شامل ہیں۔ شاید تمہیں حیرانی ہو رہی ہو کہ میں اپنے ہی دوست کے خلاف تمہیں یہ ساری باتیں اتنی تفصیل سے کیوں بتا رہا ہوں۔''

شانی نے کوئی جواب نہیں دیا اور بس سکتہ زدہ سی بیٹھی رہی۔

حاجی حیات چند لمحے تامل کرنے کے بعد بولا۔ ''شانی بی بی! اگر میرے دل کی بات پوچھتی ہو تو میں یہی چاہوں گا کہ رستم تم سے جدا نہ ہو اور نہ تم رستم سے لیکن یہ وقت جذبات سے سوچنے کا نہیں۔ اگر جذبات سے سوچیں گے تو پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا اور شاید تم دونوں بھی اپنی زندگیاں نہ بچا سکو۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے ایک بار پھر حاجی حیات کی آواز بھرا گئی۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''اس وقت رستم کے لئے سب سے بہتر راستہ یہی ہے کہ وہ پولیس کی خوفناک چڑھائی سے بچ کر نکل جائے اور اپنی جان بچانے کی کوشش کرے، لیکن میں جانتا ہوں وہ اکیلا نہیں جائے گا۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہے گا..... اور ہو سکتا ہے..... ہو سکتا ہے کہ تم بھی اس کے ساتھ جانا چاہو لیکن اگر تم دونوں نے یہ فیصلہ کیا تو یہ بالکل تباہی کی طرف لے جائے گا۔ مجھے بڑے دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ رستم کے لئے بچ نکلنے کے امکانات سو میں پچیس تیس سے زیادہ نہیں ہیں اور وہ بھی اسی صورت

میں جب وہ مزید وقت ضائع نہ کرے۔ اگر وہ پولیس والوں اور نار پوریوں کے جان لیوا گھیرے سے بچ کر نکلنا چاہتا ہے تو اسے سرتوڑ کوشش کرنا پڑے گی اور جہاں تک میں نے نتیجہ نکالا ہے، اس کوشش میں کوئی اس کا ساتھ بھی نہیں دے سکے گا۔ سردار دراج اور عارف کمبوہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ اسے ڈیک نالا پار کرا کے چھ سات میل آگے پہنچا دیں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

شانی نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔

حاجی حیات بولا۔ ''اب تم سوچو، اگر رستم کو اپنے ساتھ تمہاری جان بھی بچانا پڑی تو کیا ہوگا۔ وہ خود یہاں سے نکل سکے گا نہ تمہیں نکال پائے گا اور بات صرف اس علاقے سے یا پنجاب سے نکل جانے کی ہی نہیں ہوگی اس کے بعد بھی خود کو چھپانے کے لئے اسے نہ جانے کہاں کہاں بھٹکنا پڑے گا۔ ان سارے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب ترین راستہ یہی ہے کہ رستم یہاں سے اکیلا جائے اور تم خود کو پولیس کے سامنے پیش کر دو .....''

''جی.....؟'' شانی نے چونک کر حاجی حیات کی طرف دیکھا۔

وہ تسلی بخش انداز میں بولا۔ ''میں نے تمہارا سارا کیس دیکھا ہے۔ ساری اونچ نیچ کا جائزہ لیا ہے۔ میں نے اور تایا معصوم نے دو دن پہلے لاہور کے ایک بڑے وکیل سے مشورہ بھی کیا ہے۔ تمہارے خلاف کوئی سنگین الزام عائد نہیں اور نہ کوئی ٹھوس ثبوت ہے۔ نار پور کے چوہدریوں کی طرف سے جو الزام لگائے گئے ہیں، ان کی قانونی حیثیت بڑی کمزور ہے۔ اپنے تجربے کی بناء پر میں کہہ سکتا ہوں کہ دو تین پیشیوں میں ہی تمہاری ضمانت ہو جائے گی۔ میرے ہوتے ہوئے اللہ نے چاہا تو تمہیں پولیس سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ رہی چند ہفتے جیل میں رہنے کی بات تو اس کا انتظام بھی ہم مل جل کر کر لیں گے۔ جیل تمہارے لئے ہیل نہیں ہوگی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ ہم ''میڈیکل بیس'' پر تمہارے لئے کوئی بہتر حل سوچ لیں گے۔''

شانی کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ غیر جذباتی طور پر سوچا جاتا تو ایس پی حیات کی بات میں وزن تھا..... لیکن کیا رستم ایک بار پھر اس سے جدا ہو جائے گا؟ تن تنہا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہونے کے لئے؟ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا..... وہ بے حال ہونے لگی۔ ایس پی حیات نے اس کے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو میں اپنے جگری دوست کی جانبداری نہیں کر رہا۔ میں وہی بات کہہ رہا ہوں جو فی الوقت تمہارے اور رستم کے لئے بہتر ہے۔ تمہیں ہمت اور حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ میں

جانتا ہوں یہ فیصلہ مشکل ہے لیکن دل کڑا کر کے اس آزمائش سے گزر جاؤ۔ رستم کو اور خود کو فوری آفت سے بچا لو، زندگی باقی رہے گی تو زندگی کے سارے امکانات بھی باقی رہیں گے۔ کیا پتا دو چار مہینے یا دو چار سال بعد زندگی کے کسی بھی موڑ پر حالات ایک بار پھر تمہیں اور رستم کو ایک دوسرے کے پاس لے جائیں۔''

شانی کو یوں لگا جیسے اس کا سینہ گلے تک نمکین آنسوؤں سے بھر گیا ہے..... اک ماہی بڑی دور سے آیا تھا۔ اس کا چہرہ زخموں نے گہنایا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جان لیوا مسافتوں کی گرد اور پاؤں کے چھالے تھے۔ وہ تو ابھی دو پل کو ستایا بھی نہیں تھا۔ ابھی تو شانی کی انگلیاں اس کے پارہ پارہ جسم کو سہلا بھی نہیں سکی تھیں کہ ایک بار پھر اذنِ سفر ہو گیا تھا اور سفر بھی ایسا جس میں واپسی کے امکانات معدوم تھے۔

حاجی حیات کی آواز شانی کے کانوں میں پڑی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں جانتا ہوں شانی بی بی! وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہے گا۔ اس کی خواہش ہوگی کہ وہ تمہیں چوہدریوں اور پولیس والوں کے گھیرے سے نکال کر کہیں بہت دور لے جائے۔ دیکھنے میں یہ خواہش بڑی خوبصورت لگتی ہے لیکن تم پڑھی لکھی ہو۔ تمہیں بھی معلوم ہوگا، حقیقتیں بڑی تلخ اور کڑوی ہوتی ہیں..... رستم کی اس خواہش کے رستے میں بس تم ہی دیوار بن سکتی ہو..... میں چاہتا ہوں کہ تم رستم سے خود بات کرو۔ جو کچھ میں نے تمہیں سمجھایا ہے تم اسے اپنے طور پر سمجھا دو۔ اس سے صاف لفظوں میں کہہ دو کہ تم اس کے ساتھ جا کر اس کی اور اپنی زندگی شدید خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتی ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم اسے قائل کر سکتی ہو۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا.....'' شانی روہانسی ہو کر بولی۔

اسی دوران میں عارف نے حاجی حیات کو باہر بلایا۔ اس کے لہجے میں ہیجانی کیفیت تھی۔ حاجی حیات اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے دو منٹ بعد شانی کے تایا معصوم اندر آ گئے، گہری تشویش ان کے سُرخ و سپید چہرے پر درج تھی۔ انہوں نے اندر آ کر ایک بار پھر شانی کو گلے سے لگا لیا۔ گلوگیر آواز میں بولے۔ ''میری دھی رانی، مجھے پتا ہے تُو شرماں والی بیٹی ہے۔ اپنی ماں کی طرح تیرے سینے میں بھی سونے کا دل ہے۔ تُو غلط رستے پر نہیں چل سکتی۔ میں تیرے نام کے ساتھ رستم سیال کا نام سن رہا ہوں۔ اگر ایسی بات ہے تو ضرور اس کی کوئی نہ کوئی وجہ بھی ہوگی۔ ہمیں تجھ پر پورا بھروسہ ہے دھی رانی..... لیکن اس وقت مسئلہ اور ہے۔ تیری وجہ سے رستم اور رستم کی وجہ سے تیری جان خطرے میں پڑ رہی ہے۔ تقدیر کا پھیر ہے کہ رستم اس وقت سخت مصیبتوں میں جکڑا گیا ہے۔''

''تایا.....! اس کی مصیبتوں کی بڑی وجہ تو میں ہی ہوں۔ پنڈی میں مجھے بچاتے ہوئے وہ پولیس والوں سے لڑا تھا۔ چوہدریوں سے اس کی دشمنی بھی میری وجہ سے ہے۔ کٹھولی کے میلے میں بھی وہ میری وجہ سے پہنچا تھا اور پھر وہاں سے بھاگتے ہوئے بھی جب اس نے گولیاں چلائیں.....تو اس کے پیچھے میں کھڑی تھی.....''

''شانی.....! میں سب سمجھ رہا ہوں۔ تُو نہ بھی بتائے تو سمجھ رہا ہوں لیکن اب بات یہ ہے کہ پولیس زہریلی مکھیوں کی طرح اس کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ اعلیٰ افسروں نے ہر صورت اسے زندہ یا.....میری بات سمجھ رہی ہو ناں تم.....؟''

شانی سر جھکائے سسکیاں لیتی رہی۔

تایا معصوم نے بات جاری رکھی۔ ''ایس پی حیات خان کو پتا چلا ہے کہ لاہور کا ایک بڑا کرخت ڈی ایس پی رستم کو پکڑنے کے کام پر لگایا گیا ہے۔ یہ بڑا ظالم بندہ ہے۔ لوگ اس کے نام سے ڈرتے ہیں اور بات صرف پولیس کی ہی نہیں ہے۔ نارپور کے سارے چوہدری بھی اپنے اندر کی لڑائیاں بھول کر رستم کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں رستم کے لئے صرف ایک ہی رستہ بچا ہے۔ وہ کسی طرح غیر علاقے کی طرف نکل جائے اور اپنی جان بچانے کی کوشش کرے۔ باقی رہی تمہاری بات تو تمہارا معاملہ اور ہے۔ ہم اسے کسی نہ کسی طرح سنبھال لیں گے۔ رستم کے ساتھ اس وقت سب سے بڑی ہمدردی اور محبت یہی ہے کہ اسے کسی طرح موت کے اس گھیرے میں سے نکال دیا جائے اور یہ کام تم کر سکتی ہو شانی۔''

وہ اشک بار لہجے میں بولی۔ ''تایا! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ایس پی صاحب کسی طرح ہمیں یہاں سے نکال کر کسی پکی سڑک تک پہنچا دیں۔ آخر ان کا عہدہ ہے، اختیار بھی ہے.....رستم کہتا تھا، اگر ہم ایک دفعہ پکی سڑک تک پہنچ جائیں تو پھر میانوالی سے ہوتے ہوئے بنوں یا کوہاٹ کی طرف نکل سکتے ہیں۔''

تایا معصوم نے بڑے کرب سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ ''نہیں شانی! تم سمجھ نہیں رہی ہو.....اس کام کے لئے وقت بہت پہلے گزر گیا ہے۔ اب تو بس ایک آدھ گھنٹے کی بات ہے۔ کئی تھانوں کی پولیس مل کر اس علاقے کی طرف بڑھ رہی ہے اور کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے عارف کے بندے نے یہی اطلاع اسے دی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، ہم اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔ ''یہ بڑی زیادتی ہو گی تایا جی.....وہ ہمارے لئے.....صرف ہمارے لئے.....'' وہ بات مکمل نہ کر سکی،

اس کی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔

تایا نے اس کی پیشانی چومی، سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''ہم اس کی مدد کر رہے ہیں دکھی رانی! ہم نے بروقت یہاں پہنچ کر اسے خطرے کے بارے میں بتایا ہے۔ ہم یہاں سے نکلنے میں بھی اس کی مدد کریں گے۔ جہاں تک ہو گا، اس کا ساتھ دیں گے۔ کوشش کریں گے کہ وہ ہماری حفاظت میں دور سے دور نکل جائے۔''

شانی نے سر اپنے گھٹنوں پر جھکا لیا، اس کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ تایا معصوم اس کے سگے تایا نہیں تھے لیکن وہ سگوں کی طرح ہی ان کا احترام کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے بھلے کے لئے کہہ رہے ہیں لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتی، حالات نے کیا قیامت ڈھائی تھی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے وہ اپنی زندگی کی حسین ترین ساعتوں سے گزر رہی تھی، اس کے دل و دماغ اور اس کی روح نے بڑے جذب کے ساتھ رستم کے قرب کو قبول کیا تھا اور اپنے اندر سمویا تھا.....اور اب وہ جدائی کے زہر سے بھرا ہوا پیالہ اپنے سامنے دیکھ رہی تھی۔

کشمکش کی گھڑیاں بڑی کٹھن اور جانکاہ تھیں، تایا معصوم تسلسل اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ آخر وہ ہاری ہوئی آواز میں بولی۔ ''کیا وہ اکیلا جائے گا؟''

''ہو سکتا ہے اکیلا جائے.....اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عارف کمبوہ یا دراج اپنا کوئی بااعتماد ساتھی اس کے ساتھ کر دیں۔''

''تایا.....! اسے اکیلا نہ بھیجیں۔'' وہ تایا کا ہاتھ تھام کر کسی بچی کی طرح سسکی۔

''تم فکر نہ کرو شانی! ہم اس کے لئے جو بہتر سے بہتر کر سکتے ہیں، کریں گے۔ بس اب تم جاؤ اور جلدی سے اسے یہ ساری بات سمجھا دو۔ وقت بہت کم ہے۔''

تایا معصوم اٹھ کھڑے ہوئے۔ شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ رستم کے سامنے کیسے جائے۔ اس سے کیا کہے اور کیسے کہے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ موجودہ حالات میں اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔

تایا معصوم اور حاجی حیات کی باتوں سے بالکل عیاں ہو گیا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے رستم سے جو طویل ملاقات کی ہے، اس میں رستم نے شانی کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی ہے۔ پھر شانی کا دھیان اپنی کلائی کی طرف چلا گیا۔ وہاں نیل موجود تھا۔ کتنی محبت بھری اور کتنی سخت گرفت تھی یہ۔ اس وقت شانی کو محسوس ہوا تھا کہ شاید ساری دنیا مل کر بھی اس کی کلائی رستم کے ''محافظ ہاتھ'' سے چھڑا نہیں سکتی ہے لیکن.....اب وہ خود اس کلائی کو چھڑانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

دو تین منٹ شدید کشمکش میں گزارنے کے بعد وہ اٹھی۔ اس نے اپنا سر منہ چادر میں لپیٹا اور ایک گہری سانس لے کر تایا معصوم کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔ وہ رستم کی طرف جارہی تھی۔ کمرے سے باہر عارف اور حاجی حیات خان موجود تھے۔ ان دونوں نے شانی کو تائیدی نظروں سے دیکھا۔ وہ بے حد بوجھل قدموں کے ساتھ زینہ اُتری اور احاطے میں آ گئی۔ احاطے میں پہنچ کر تایا معصوم نے اس کا شانہ سہلایا اور خود وہیں ٹھہر گئے۔ اس سے آگے شانی کو اکیلا جانا تھا۔ پندرہ بیس قدم کا فاصلہ تھا مگر شانی کو صدیوں کی ''مسافت'' لگ رہی تھی۔ سینے میں درد کی بلند و بالا لہریں تھیں۔ وہ ابھی تک یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ جو کچھ رستم سے کہنے جارہی ہے، کہہ بھی پائے گی یا نہیں۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہاں جا کر کیا صورتِ حال پیش آئے۔ جذبات کا دھارا اسے کس طرف بہا لے جائے۔ نہ ہی اسے یہ اندازہ تھا کہ اس کی بات پر رستم کا ردِعمل کیا ہوگا۔ ہاں...... اس کے دل سے یہ گواہی ضرور آرہی تھی کہ اگر وہ فیصلہ کن انداز میں بات کر سکی تو رستم اس کی بات کو رد نہیں کرے گا لیکن بڑی قیامت تو یہی ''فیصلہ کن انداز'' والی تھی۔ وہ زخم زخم رستم کے سامنے کہاں سے لائے گی یہ انداز..... ؟

اور پھر وہ اس کمرے میں داخل ہوئی جہاں رستم موجود تھا۔ دل کڑا کر کے اس نے سامنے دیکھا لیکن رستم موجود نہیں تھا، کمرا خالی تھا۔ جھونپڑے نما کمرے کی عقبی کھڑکی کھلی تھی اور پٹ ہوا کے ساتھ ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ شانی کے دل نے پکار کر کہا...... وہ چلا گیا ہے...... اسے زندگی کی کٹھن ترین آزمائش سے بچا کر، اپنے سارے درد بھرے سوال اپنے ہونٹوں میں دبا کر، اپنی ساری آہیں اپنے سینے میں چھپا کر۔ وہ حالات کا مارا، خاموشی سے کسی جانب نکل گیا ہے۔ پتا نہیں اسے کیا ہوا۔ وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا دل جیسے کراہنے لگا۔ کہیں گہرائی سے یہ آواز آنے لگی۔ ''رستم...... ! مجھے اتنا موقع تو دیتے...... میں تمہیں بتا سکتی، میں پتھر نہیں ہوں۔ اگر تھی بھی تو پگھل رہی ہوں...... آج سویرے جب سورج طلوع نہیں ہوا تھا، میں نے اپنے دل کی دھرتی پر تمہاری محبت کا سورج اپنے ہاتھوں سے اُگایا تھا اور اس کی بے پناہ روشنی کو تسلیم کیا تھا...... کاش میں جانے سے پہلے تمہیں بتا سکتی۔''

اسی دوران میں باہر سے ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ ایک مہتم مکھیا دراج سے کہہ رہا تھا۔ ''آپاں دونوں نے ابھی ایک منٹ پہلے کھد (خود) اسے دیکھا ہے جی...... اس نے کالی چادر لپیٹی ہوئی تھی۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ ہے......؟''

''وہی تھا جی ...... لنگڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ آپاں کے دیکھتے دیکھتے کانوں (سرکنڈوں) میں گھس گیا۔ ابھی جیادہ دور نہیں گیا ہوگا جی......''

''ٹھہرو...... میں اندر دیکھتا ہوں۔'' دراج کی آواز آئی۔

چند ہی سیکنڈ بعد وہ دندناتا ہوا جھونپڑے میں داخل ہوا۔ کلاشنکوف اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ اس نے خالی جھونپڑے میں نگاہ دوڑائی۔ شانی کو روتے ہوئے دیکھ کر اس کی حیرت مزید بڑھی۔ ''نکڑی! کہاں ہے وہ...... ؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ نہیں ہے......'' شانی نے روتے ہوئے کہا۔

پانچ دس منٹ کے اندر یہ بات سب لوگوں کو معلوم ہو چکی تھی کہ رستم سیال کسی کو بتائے بغیر خاموشی سے ڈیک نالے کی طرف نکل گیا ہے۔ دو تین افراد اس بات کے گواہ تھے کہ انہوں نے کالی چادر میں لپٹے ہوئے رستم کو سرکنڈوں میں گھستے دیکھا ہے۔

اس واقعے کے صرف پچیس تیس منٹ بعد ہی مکھیا دراج کے کارندوں نے اسے اطلاع دی کہ تقریباً چار جیپوں اور دو گاڑیوں پر سوار پولیس کی بھاری جمعیت تیزی کے ساتھ بستی کی طرف آرہی ہے۔

ایس پی حاجی حیات نے مکھیا دراج کو ضروری ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ لوگ کسی کو کچھ نہیں کہیں گے۔ صرف شانی بی بی کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اگر یہ دو چار مقامی لوگوں کو ساتھ لے کر گئے بھی تو ہم چوبیس گھنٹے کے اندر اندر انہیں واپس لے آئیں گے، اس پولیس پارٹی میں ایک انسپکٹر اور ایک اے ایس آئی اپنے خاص بندے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دیں گے۔''

مکھیا دراج کے چہرے پر خوف کے آثار نہیں تھے۔ اس نے اپنا دیوار جیسا سینہ تان کر کہا۔ ''سرکار...... آپ کے حوصلہ دینے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ پھکر نہ کریں اپنی حفاجت کرنا آپاں کھوب جانتے ہیں۔ اس ڈیک نالے کے کنارے بسنے والے تین ہجار بندے میری ایک آواج پر ایک جان ہو سکتے ہیں۔ آپاں نے کبھی پولیس کو جیادتی کرنے دی ہے نہ اب کرنے دیں گے۔''

حاجی حیات نے کہا۔ ''تمہاری ہمت قابلِ تعریف ہے دراج [illegible] لیکن اس مرتبہ بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ پولیس ملازم کے قتل کی وجہ سے یہ معاملہ کافی نازک ہو گیا ہے۔''

مکھیا دراج کو تمام ضروری ہدایات دینے کے بعد [illegible] عارف [illegible] وہاں سے چلے گئے۔ تایا معصوم شانی کے ساتھ ہی رہے۔ بستی میں [illegible] کی فضا تھی۔

☆======☆======☆

ڈیک نالے کے کنارے نہتم بستی سے اوپر کی طرف تقریباً چار کلومیٹر کے فاصلے پر اونچے سرکنڈوں اور بلند جنگلی گھاس کے اندر رستم موجود تھا۔ اس کے سامنے چار عدد لاشیں پڑی تھیں۔ تین لاشیں کم وبیش سو میٹر پیچھے تھیں۔ چوتھی نالے کے عین کنارے پر کیچڑ اور سیاہی مائل گارے میں لتھڑی ہوئی تھی۔ یہ چاروں کے چاروں افراد ابھی ابھی مرے تھے، چوتھا بندہ جو نالے کے عین کنارے پر موجود تھا ابھی تک نزع کے عالم میں جنبش کر رہا تھا مگر اس کے بچنے کا امکان صفر تھا کیونکہ ایک فٹ لمبے تیز دھار چھرے نے اس کی ساری انتڑیاں پیٹ سے باہر نکال دی تھیں اور اس کے سینے و گردن پر تیز دھار چھرے کے تقریباً ایک درجن جان لیوا گھاؤ تھے۔ تیز دھار چھرا رستم کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی خم دار نوک سے خون ٹپک رہا تھا اور ایسا ہی خون رستم کی آنکھوں سے بھی ٹپکتا محسوس ہوتا تھا۔

یہ چار افراد جو مرے پڑے تھے ان میں تین باوردی پولیس والے تھے اور چوتھا نارپوری چوہدریوں کا خاص کاماں چھیدا تھا...... ابھی تین چار منٹ پہلے یہ لوگ زندہ تھے۔ انہوں نے بڑی رعونت اور قطعیت کے ساتھ رستم کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ مگر جس کا رستہ روکنے کی کوشش کی گئی تھی، وہ رکنے کے لئے نہیں نکلا تھا اور نہ اسے روکا جاسکتا تھا۔ وہ بہت سفاک لوگ تھے لیکن ان کا مدمقابل ان سے کہیں زیادہ سفاک نکلا تھا۔ اس نے دو تین منٹ میں انہیں خاک وخون میں نہلا دیا تھا۔ تین افراد جو پیچھے مرے پڑے تھے، ان میں سے دو کو ماؤزر کے فائر لگے تھے۔ تیسرے کے سینے میں دل کے مقام پر چھرے کا گھاؤ تھا۔ چوتھا شخص جس کے جسم پر اے ایس آئی کی وردی تھی، نالے کے کنارے جاکر قتل ہوا تھا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور رستم نے پیچھا کر کے اسے مارا تھا۔ زیادہ وحشت سے اسی شخص کو قتل کیا گیا تھا۔ یہ میانہ گاؤں کے پولیس سٹیشن کا ناکا تھانیدار مظہر چوہدری تھا۔ یہ تاؤ حشام کا رشتے دار بھی تھا۔ تاؤ کے پالتو کتے کی طرح حویلی میں دُم ہلاتا پھرتا تھا۔ تاؤ کی حویلی میں رستم پر بہیمانہ تشدد کرنے میں یہ پیش پیش تھا اور بات صرف تشدد کی نہیں تھی۔ تاؤ کی حویلی میں رستم کو ایک بہت بڑے ذہنی صدمے سے بھی گزرنا پڑا تھا۔ ایسا صدمہ جس نے اسے بالکل ہی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ رستم کو پکڑنے کے پندرہ بیس گھنٹے بعد ہی چوہدریوں نے رستم کو اس کے قریبی دوست آفندی کی دردناک موت دکھا دی تھی۔ یہ آفندی وہی تھا جسے کچھ عرصہ پہلے چوہدریوں نے بادامی باغ لاہور سے پکڑا تھا اور اس سے رستم کا اتا پتا پوچھتے ہوئے اس کی دونوں ٹانگیں توڑ دی تھیں۔ درحقیقت رستم اور چوہدری کی ''لڑائی'' میں تیزی اسی واقعے کے

بعد آئی تھی۔ رستم نے آفندی کی ٹوٹی ہوئی ٹانگوں کا بدلہ لینے کے لئے لاہور میں چوہدری بشیر کی کوٹھی پر ہلا بولا تھا اور قادرے کے خاص ملازم شادے کی ٹانگیں توڑنے کے علاوہ اس کا لاڈلا کتا بھی مار دیا تھا۔ اب اسی آفندی کو قادرے وغیرہ نے لاہور کے ہسپتال سے اغوا کیا تھا اور اسے تاؤ کی حویلی میں پہنچایا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں پر ابھی تک پلاسٹر چڑھے ہوئے تھے۔ ان پلاسٹروں سمیت آفندی کو رستم کی کوٹھڑی کے عین سامنے چھت سے الٹا لٹکا دیا گیا تھا۔ آفندی ساری رات ناقابلِ برداشت درد سے چیختا اور کراہتا رہا تھا۔ اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ رات آفندی کے لئے ہی نہیں رستم کے لئے بھی زندگی کی دردناک ترین رات تھی...... صبح دم چوہدریوں نے نیم جان آفندی کے منہ پر ایک بڑا شاپر چڑھا دیا تھا، چھت سے الٹا لٹکا ہوا آفندی دم گھٹنے سے مچھلی کی طرح تڑپا مچلا تھا اور پھر ختم ہوگیا تھا۔ ایک دلیر اور یار باش شخص کا یہ بڑا المناک انجام تھا۔

تاؤ کی کوٹھڑی میں پیش آنے والے سارے مناظر رستم کے حافظے پر انگاروں کی طرح پیوست تھے۔ وہ اب کسی منظر کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ پیچھے مڑ کر ہی دیکھنا نہیں چاہتا تھا، وہ بس آگے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سینے میں ایک طوفان تھا۔ اس طوفان کی شدت اور اس کے پھیلاؤ کو صرف وہی جان سکتا تھا۔ کسی اور کے لئے اس کا ادراک ممکن ہی نہیں تھا۔ اس نے بڑی بے رحمی سے جاں بلب اے ایس آئی مظہر کی گردن پر پاؤں رکھا...... پاؤں کے دباؤ کے سبب مظہر کے حلق سے خرر خرر کی بھیانک آواز نکلی۔ پھر اس کی آنکھیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اُس پار جاچکا تھا۔

اے ایس آئی کا پسٹل آٹھ دس قدم پیچھے گرا تھا۔ رستم نے یہ پسٹل اٹھا کر قمیص کے نیچے لگایا۔ پھر وہ تیزی سے باقی تینوں لاشوں کے پاس پہنچا۔ اردگرد کے سرکنڈے خون سے سُرخ ہو رہے تھے۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل کے مُردہ ہاتھوں میں سرکاری رائفل ابھی تک دبی ہوئی تھی۔ رستم کی جوتی کا ایک پاؤں کامے چھیدے کے پہلو میں پڑا تھا۔ رستم نے یہ ''پاؤں'' پہنا۔ اپنی کالی چادر اُتار کر ایک طرف پھینکی...... کامے چھیدے کی چادر خاکی رنگ کی تھی اور یہ ایک طرف سرکنڈوں میں اٹکی ہوئی تھی۔ تقریباً ایک فٹ لمبے چھرے کو مقتولوں کی وردی سے صاف کیا اور ایک سوتی کپڑے میں لپیٹ کر احتیاط سے قمیص کے نیچے رکھ لیا۔ ذرا فاصلے پر پیلے رنگ کی اونچی جنگلی داب میں تین گھوڑے ایک ٹاہلی سے بندھے ہوئے تھے۔ یقیناً ان کا تعلق یہاں رستم کے ہاتھوں ہلاک ہونے والوں میں سے تھا۔ ذرا دیر کے لئے رستم کے جی میں آئی کہ ان میں سے ایک گھوڑا اپنی سواری کے لئے استعمال کرے۔ تاہم اگلے ہی لمحے اس نے

اپنا یہ خیال خود ہی رد کر دیا۔ گھوڑے کی بجائے وہ پیدل زیادہ محفوظ تھا۔ اس نے ایک خونی نگاہ مقتولوں پر ڈالی اور اپنے لمبے بالوں کو جھٹک کر چہرے سے ہٹایا اور لہلہاتے سرکنڈوں میں تیزی سے آگے بڑھنے لگا..... آج..... بہت عرصے بعد وہ ایک بار پھر سراپا ڈاکو رستم سیال نظر آ رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کی رگوں میں خون کی جگہ آتشیں لاوا دوڑ رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ ہر خطرے اور مصلحت سے بے نیاز ہو گیا تھا۔

کچھ عرصے پہلے ایک تاریک رات کو اس کی آنکھوں میں ایک من موہنی صورت سمائی تھی۔ اس صورت کے طفیل اس کی زندگی میں ایک انقلاب آیا تھا۔ اس نے آگ اور خون سے منہ موڑ کر پھولوں اور مسکراہٹوں کی طرف رجوع کرنا چاہا تھا، اس نے اپنے اندر مری ہوئی ''زندگی'' کو پھر سے زندہ کرنا چاہا تھا۔ وہ بڑی ثابت قدمی سے اپنے فیصلے پر قائم رہا تھا۔ بے پناہ صعوبتوں کے باوجود اس نے اپنے قدم نئے راستے پر جمائے رکھے تھے لیکن آخر وہی کچھ ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ مجرم، شرافت اور انسانیت کی طرف لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان کا ماضی اپنے ہزار ہا ہاتھوں سے انہیں واپس کھینچ لیتا ہے۔ رستم بھی واپس کھینچ لیا گیا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ من موہنی صورت اب اس کی آنکھوں میں نہیں تھی۔ وہ تو زندگی کا حصہ بن چکی تھی۔ جسم کے ایک ایک ریشے میں سما چکی تھی۔ مگر اسے اس صورت سے دور ہونا پڑا تھا۔ کھیا دراج کی بستی چھوڑنے سے پہلے وہ ایک شدید ترین کشمکش سے گزرا تھا۔ آخر فیصلہ پسپائی کے حق میں ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا بی بی سے کیا کہا جا رہا ہے اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بی بی نے آ کر اس سے کیا کہنا ہے، وہ بی بی کو اس کڑی آزمائش میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے حقیقت کو تسلیم کیا تھا اور بی بی کو محفوظ ہاتھوں میں چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا تھا اور اب وہ آگے بڑھ رہا تھا۔

تقریباً تین گھنٹے بعد وہ ایک پختہ سڑک پر تھا اور لوکل روٹ پر چلنے والی ایک کھٹارہ بس میں بیٹھا تھا۔ اس لاری نما بس میں مسافروں کے علاوہ دنیا جہاں کا اسباب بھی موجود تھا۔ پھلوں کی پیٹیاں، سبزی کی گانٹھیں، کپڑے کے تھان، مرغیاں، انڈے اور پتا نہیں کیا کیا۔ بس بار بار رکتی تھی۔ مسافر چڑھ رہے تھے، اتر رہے تھے، بچے روتے تھے، عورتیں چلاتی تھیں۔ بس کی چھت پر خبر نہیں کیا کیا چڑھایا اور اتارا جا رہا تھا۔ رستم سیال خاکی چادر میں لپٹا ایک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے گرد بیٹھی اور کھڑی سواریوں کا ہجوم تھا اور یہ ہجوم اس کے لئے بہت مفید تھا۔ وہ کسی نشے باز کی طرح اپنا چہرہ چادر میں چھپائے بے سدھ پڑا رہا۔ مگر وہ اردگرد سے بے خبر نہیں تھا۔ ہر آہٹ اور آواز پر اس کے کان تھے۔ ایک شخص نے دوسرے

سے کہا۔ ''آج جگہ جگہ پولیس کھڑی نظر آ رہی ہے۔''

''کہیں ڈاکہ شاکہ پڑا ہوگا ماسٹر صاحب!'' دوسرے نے کہا۔

ماسٹر یعنی ماسٹر صاحب نے مزاحیہ انداز میں کسی شاعر کا یہ قطعہ پڑھا۔

اِدھر ناکے پہ ناکہ چل رہا ہے
اُدھر ڈاکے پہ ڈاکہ چل رہا ہے
وہاں منصوبہ بندی کا ہے شور
یہاں کاکے پہ کاکا چل رہا ہے

ایک جٹ زمیندار نے اطلاع دینے والے لہجے میں کہا۔ ''سنا ہے کاچھی پور کی طرف ڈیک نالے کے کنڈے پلس مقابلہ ہوا ہے۔ کئی پلس والے مرے ہیں۔ آلے دوالے کے پنڈوں میں بڑی ترتھلی مچی ہوئی ہے۔''

ماسٹر صاحب بولے۔ ''پلس والے کہاں مرتے ہیں پلس مقابلے میں..... ایسے ہی افواہ اڑی ہوگی۔''

''نئیں جی..... سنا ہے مرے ہیں پلس والے۔'' بس کی آخری سیٹ سے ایک دیہاتی کی آواز آئی۔

رستم کے آگے بیٹھے ہوئے ایک پگڑی والے نے دانتوں سے گنا چھیلتے ہوئے کہا۔ ''اک ادھ مر گیا ہوگا۔ اب اس کے بدلے پتا نہیں کتنے بے قصوروں کو اگلی دنیا دکھائیں گے یہ لوگ۔''

بہت سے لوگ ایک ساتھ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگے۔

رستم اپنی جگہ ساکت بیٹھا تھا۔ تنگ سڑک کے کنارے کچے میں چند پولیس والے دو موٹر سائیکل سواروں کے ہاتھ کھڑے کرا کے تلاشی لے رہے تھے۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر دو پولیس والے ایک پرائیویٹ کار میں دھول اڑاتے کسی گاؤں کا رخ کر رہے تھے۔

رستم کے ہونٹوں پر ایک بہت مدھم اور زہریلی مسکراہٹ چمک گئی۔ انتقام در انتقام کا سلسلہ خوفناک شکل اختیار کر گیا تھا۔ اپنے جس دوست کی ٹانگوں کا بدلہ لینے کے لئے رستم نے شادے کی ٹانگیں توڑی تھیں، اسے چوہدریوں نے رستم کے سامنے تڑپا تڑپا کر جان سے مار دیا تھا۔ اب پولیس والے پنڈی میں زخمی ہو کر مرنے والے ساتھی کا بدلہ چکانے جوق در جوق نکلے تھے۔ اس ایک کے بدلے انہیں تین پٹی بھائیوں کی تازہ بہ تازہ لاشیں مزید اٹھانا پڑی تھیں، دفعہ 302 ضرب 3.....

پون گھنٹے تک مزید سفر کرنے کے بعد رستم جی ٹی روڈ پر پہنچ چکا تھا۔ یہ گجرات کا علاقہ تھا۔ کسی بس پر سوار ہونے کے بجائے اس نے ایک ٹرک اڈے کا رخ کیا اور ایک ٹرک والے سے لفٹ لینے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ ٹرک راولپنڈی جا رہا تھا۔ ڈرائیور ایک صحت مند وزیر آبادی تھا۔ اس نے رستم کو اپنے ساتھ ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا لیا اور اونچی آواز میں عیسیٰ خیلوی کا گانا لگا دیا۔ ''چن کتھاں گزاری آئی رات وے......''

رستم کے سر پر حقیقی معنوں میں خون سوار تھا۔ اس نے طے کیا ہوا تھا کہ اگر راستے میں کہیں پولیس سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو وہ گرفتاری نہیں دے گا۔ مارے گا یا مر جائے گا۔ ڈیک نالے کو پار کرتے ہوئے وہ چار قتل آج ہی کر چکا تھا۔ اب چار چھ اور بھی کر دیتا تو بات ایک ہی تھی۔ اس کے ماؤزر میں اب بھی آٹھ گولیاں موجود تھیں۔ بیلٹ میں تقریباً بیس گولیاں اور لگی ہوئی تھیں۔ اعشاریہ 38 کے سرکاری پسٹل میں بھی چھ گولیاں موجود تھیں اور پھر وہ خم دار چھرا جس سے اس نے دو قتل کئے تھے۔ چھرے اور ماؤزر کا انتظام رستم مہتم بستی سے ہی کر کے چلا تھا۔

عیسیٰ خیلوی اور ملنگی کی آواز سے گونجتا ہوا یہ ٹرک راولپنڈی جا رہا تھا۔ راولپنڈی جہاں رستم کا جگری دوست زوار تھا۔ شیری تھی اور بہت سے دیگر جاں نثار تھے لیکن رستم پنڈی نہیں جا رہا تھا۔ نہ وہ زوار یا کسی اور ساتھی سے ملنا چاہتا تھا۔ درحقیقت وہ اپنے کسی جان پہچان والے سے ملنا چاہتا ہی نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا اب پولیس اسے زیادہ دیر زندہ نہیں رہنے دے گی۔ اس بقایا مختصر زندگی کے لئے وہ کسی کا احسان مند ہونا نہیں چاہتا تھا اور نہ کسی پیارے کو مصیبت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اب باقی کی جتنی لڑائی تھی وہ اسے تنہا لڑنا تھی۔ درحقیقت زخمی ٹانگوں والے آفندی کو چھت سے الٹا لٹکے دیکھنے کے بعد اس میں کسی اور سنگی ساتھی کو جان کنی میں دیکھنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔

یہ پوٹھوہار کا علاقہ تھا، رات تقریباً دس بجے کا وقت تھا۔ گوجر خان سے تقریباً آٹھ کلومیٹر شمال مشرق کی طرف ایک قصبے کے نیم روشن مکان کے دروازے پر رستم نے دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ درمیانی عمر کے ایک دراز قد شخص نے دروازہ کھولا۔ اس کا ایک ہاتھ کلائی پر سے کٹا ہوا تھا۔ رستم کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں سے لرزتی آواز نکلی۔

''اوئے تم......اوئے کہاں چلا گیا تھا تُو...... تیرا انتظار کر کر کے آنکھیں بھی دکھنے لگی ہیں۔'' اس نے رستم کو اپنے مضبوط بازوؤں میں لے لیا۔

اسی دوران میں اندر ایک دروازے کی چق میں حرکت پیدا ہوئی۔ تینتیس چونتیس سال

کی بھرے ہوئے جسم والی ایک خوش شکل عورت باہر نکلی۔ اس نے دوپٹہ اپنے سر پر درست کیا اور صحن کی نیم تاریکی میں دھیان سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کون ہے جی...... ؟''

گھر والا بلند آواز سے بولا۔ ''ہماری گورنمنٹ کے بھائی صاحب آئے ہیں اور کون ہے...... ساری خدائی اک پاسے...... جورو کا بھائی اک پاسے۔''

''ہائے اللہ رستم ہے!'' عورت تڑپ کر بولی۔

پھر وہ تیزی سے رستم کی طرف آئی اور خوشی سے چیختی ہوئی رستم سے لپٹ گئی۔ رستم کا سر جھکا کر وہ بار بار اس کا ماتھا اور سر چومنے لگی۔ رستم کے لباس کے نیچے ماؤزر اور پسٹل لگے ہوئے تھے۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ بہن کو ان اشیاء کی سختی محسوس نہ ہو۔ اس نے جلد ہی خود کو بہن کی گرم جوش بانہوں سے آزاد کرا لیا۔

میاں بیوی رستم کو تیزی سے اندر لے آئے۔ اندر بلب کی مدھم روشنی میں چارپائیوں پر ایک لڑکا لڑکی سو رہے تھے۔ لڑکا آٹھ نو سال کا اور لڑکی پانچ چھ سال کی تھی۔ لڑکی شاید پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی۔ ایک کتاب اس کے سینے پر دھری تھی، دوسری تکیے پر۔ کمرے میں آ کر رستم کی بہن اور بہنوئی نے غور سے رستم کو دیکھا۔ بہن کی آنکھوں میں حیرت آمیز تشویش کا سیلاب آ گیا۔ ''ہائے میں مری رستم...... یہ کیا ہوا ہے۔ کیا پھر کوئی......؟''

''نہیں آپو...... نہیں......'' وہ تیزی سے بولا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔ بس ڈیڑھ دو ہفتے پہلے بارڈر پر جا رہا تھا۔ راوی کے پل پر ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ کافی چوٹیں آئیں۔ پھر ساتھ ہی لڑائی بھی ہو گئی...... اب تو کافی ٹھیک ہو گیا ہوں، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' رستم بھرائی ہوئی مدھم آواز میں بولا۔

''ہائے اللہ تُو تو داغوں داغ ہو رہا ہے رستم......! اتنی چوٹیں...... کہیں کچھ چھپا تو نہیں رہا......؟''

''آپو......! تجھ سے کیا چھپاؤں گا۔'' رستم نے بہن کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھے۔

''اور رستم! تیری آواز...... ؟ کیا ہوا ہے آواز کو......؟'' رستم کے بہنوئی نے پوچھا۔

''یہ گلے پر بھی چوٹیں آئی ہیں۔'' رستم نے ٹھوڑی اوپر اٹھا کر چوٹیں دکھائیں۔ ''اب تو پھر بھی تھوڑی بہت آواز نکل رہی ہے۔ پہلے تو لگتا تھا کہ گونگا ہو گیا ہوں۔''

''بیوی جی......! سالا صاحب کو کہیں بٹھاؤ بھی۔ کیا اسی طرح کھڑے کھڑے دو گھنٹے کا انٹرویو لو گی؟''

بہن نے چونک کر دوپٹے کے پلو سے رستم کا چہرہ پونچھا پھر اس کے لئے ساتھ والے

کمرے سے کرسی گھسیٹ کر لائی۔ تینوں بیٹھ گئے۔ بہن کی آنکھوں میں خوشی اور دکھ کے ملے جلے آنسو تھے۔ یہ آنسو چھپانے کے لئے اور چائے پانی لینے کے لئے وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

بہنوئی اکرام نے بڑے دھیان سے رستم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں تو یہاں سے کہیں نکلنے نہیں دیتے ہو اور خود یہاں آتے نہیں ہو۔ ہم منہ اٹھا اٹھا کر تمہارا راستہ دیکھتے رہتے ہیں۔ سرمد اور عاشی بھی اٹھتے بیٹھتے ماموں جی...... ماموں جی کرتے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق تم کوئی چار مہینے کے بعد آئے ہو۔''

''ہاں...... اتنے تو ہو گئے ہوں گے۔'' رستم نے بالوں کی لٹ اپنے چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ چار مہینے بعد آئے ہو۔ کافی چوٹیں شوٹیں بھی لگوا آئے ہو لیکن گڑی کہاں ہے، میرا مطلب ہے ہماری چھوٹی بھرجائی۔''

رستم نے سر جھکایا۔ بہنوئی اکرام کی سوالیہ نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ خاموشی طویل ہوئی تو اکرام نے کہا۔ ''یار! منڈے تو شادی کے بعد چپ ہوتے ہیں۔ تُو پہلے ہی ہو گیا ہے، کہیں شادی کر کے ہی تو نہیں آیا ہے؟''

''نہیں بھیا اکرام...... شادی نہیں کی۔''

''اور گڑی......؟''

''وہ بھی نہیں آئی؟''

اکرام گہری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر اس کے کندھے پر اپنے اکلوتے ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''میں سمجھ گیا تُو حیران کرنا چاہتا ہے مجھے اور زاہدہ کو۔ گڑی ضرور تیرے ساتھ ہوگی۔ بس اِدھر اُدھر چھپا آیا ہوگا۔ ہم جانتے ہیں۔ تیری یہ عادت پرانی ہے۔''

''نہیں بھیا اکرام، وہ اب...... شاید نہیں آئے گی۔'' رستم گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ نے خواہ مخواہ ایک بات کو اپنے دماغ میں بٹھا لیا ہے۔''

''اوئے تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ کیوں نہیں آئے گی وہ، یہاں تیری بہن ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی ہے۔ تیری ووہٹی کے لئے کپڑے بنائے ہیں اس نے...... چادریں کاڑھی ہیں...... بھانڈے خریدے ہیں۔ وہ تو بے چاری......''

''بھیا......'' رستم نے گمبھیر لہجے میں بہنوئی کی بات کاٹی۔ ''میں نے کہا ہے ناں...... وہ نہیں آئے گی۔ شاید کبھی نہیں......''

''پر...... کیوں؟'' اکرام نے بہت پست آواز میں لیکن بڑے زور سے کہا۔

''بس کہا ہے ناں...... اس کا خیال چھوڑ دو۔ تم بھی اور آپو بھی۔ بالکل چھوڑ دو اور ہو سکے تو میرا بھی چھوڑ دو۔''

اکرام کے چہرے پر زرد رنگ لہرا گیا۔ اس نے تعجب سے رستم کی طرف دیکھا۔ ''رستم! یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم...... بالکل بدلے ہوئے لگتے ہو۔ کیا ہوا ہے آخر؟ کہیں پھر......؟''

''کچھ نہیں بھیا؟'' رستم نے ایک بار پھر بے زاری سے کہا۔ ''تمہیں کہا ہے ناں وہ گڑی میرے ساتھ نہیں ہے۔ اب کوئی اور بات کرو۔''

اکرام تھوڑی دیر تک الجھی ہوئی نظروں سے رستم کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''اچھا بہن سے نہ کچھ کہنا اس بارے میں...... رو رو کر بُرا حال کر لے گی۔ پتا نہیں کیا کیا آس لگائی ہوئی ہے اس نے......''

اتنے میں زاہدہ ایک ٹرے میں دودھ کا بڑا گلاس رکھ کر لے آئی۔ ساتھ میں سوجی اور میدے سے بنے ہوئے لڈو تھے۔ رستم نے دودھ پینا شروع کیا تو وہ بے چینی سے اس کے زخموں اور چوٹوں کو دیکھنے لگی۔ اس کے ملیح چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں بھی تھیں۔ یقیناً اپنے شوہر اکرام کی طرح وہ بھی یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھی کہ رستم کو یہ چوٹیں کسی عام ایکسیڈنٹ اور لڑائی میں لگی ہیں۔

وہ اندر سے لال دوا اور روئی وغیرہ لے آئی۔ وہ رستم کے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتی تھی۔ مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ زخم بہت گہرے ہیں۔ اس کی کوشش بہت معمولی ہے۔ رستم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں آپو......! میرے پاس دوا وغیرہ ہے۔ میں سویرے خود لگاؤں گا۔''

تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد اکرام نے کہا۔ ''رستم! تم بہت تھکے ہوئے ہو...... میرا خیال ہے کہ اب لیٹ جاؤ۔ سویرے آرام سے بات کریں گے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے بیوی کو بھی اٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

اس نیم پہاڑی قصبے میں رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ رستم رنگین پایوں والے بستر پر چت لیٹا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ پلکوں کے کنارے نم تھے۔ اس کی آنکھوں میں میلے کا وہ منظر تھا، جب اس نے جذبے کی شدت سے مغلوب ہو کر اپنا ہاتھ بی بی کی طرف بڑھایا تھا۔ ایک شدید کشمکش کے بعد بی بی نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ وہ لمحے رستم کی زندگی کے یادگار ترین لمحے تھے، ان لمحوں میں اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ چاہے تو بلند و بالا پہاڑ

سے ٹکرا کر اس میں سے اپنے اور بی بی کے لئے راستہ بنا سکتا ہے، ان لمحوں میں جو خوشی رستم نے محسوس کی تھی، اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا لیکن پھر..... اگلے دو تین روز میں ہی رستم کو انداز ہونے لگا تھا کہ یہ خوشی دیرپا نہیں ہے۔ درحقیقت نامہربان حالات نے رستم کی زندگی کا نقشہ ایک بار پھر تبدیل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس تبدیلی کا آغاز راولپنڈی کے پولیس مقابلے کے بعد ہوا تھا۔ بعد ازاں بلی مار چوہدریوں کے ساتھ سردلڑائی نے گرم جنگ کی شکل اختیار کر لی تھی اور اب اوپر تلے اس کے ہاتھوں سے کئی قتل ہو چکے تھے۔ قانون اور وہ، ایک بار پھر پوری شدت سے ایک دوجے کے آمنے سامنے تھے۔ نار پوریوں نے بھی ہر اگلی پچھلی کسر نکالنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ایسی صورت میں اگر بی بی نے اس سے دور رہنے کا فیصلہ کیا تھا، تو ٹھیک ہی کیا تھا۔ رستم کے اپنے اندر سے بھی یہی آواز آ رہی تھی کہ وہ اپنی آگ میں بی بی کو جھلسنے گا تو اس سے بڑی خودغرضی اور کوئی نہیں ہوگی اور یہ خودغرضی عشق کی بدترین توہین کے زُمرے میں آئے گی۔ مہتم بستی چھوڑنے سے پہلے اس کی ملاقات بی بی کے تایا معصوم اور اپنے دوست حاجی حیات خان سے ہوئی تھی۔ ان دونوں کی رائے بھی یہی تھی کہ رستم کو اکیلے یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ اس ملاقات میں بی بی کے تایا کا کہا ہوا ایک فقرہ جیسے رستم کے دل و دماغ پر نقش ہو گیا تھا اور یہ فقرہ سننے کے فوراً بعد ہی رستم نے مہتم بستی چھوڑنے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ تایا معصوم نے ملتجی لہجے میں کہا تھا۔ ''شانی کی زندگی اور ہماری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے رستم۔ تم کسی نیک ماں کے بچے ہو۔ مجھے یقین ہے تم ہم پر رحم کرو گے۔''

رستم سر تا پا کانپ گیا تھا۔ بی بی کا ایک بزرگ اس سے رحم کی درخواست کر رہا تھا..... وہ بی بی جس کی پیشانی پر ایک شکن دیکھنے سے بہتر رستم سمجھتا تھا کہ اس کی آنکھوں کی روشنی چھن جائے اور اس کا جسم جان سے محروم ہو جائے..... اور پھر وہ چلا آیا تھا۔ ہرنا تا توڑ کر، ہر آس کا گلا گھونٹ کر۔ حقیقت زہر سے کڑوی، آگ سے بڑھ کر تلخ اور موت سے زیادہ نامہربان تھی مگر اس حقیقت کو اپنے خون میں گھول کر پی گیا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ..... وہ اپنی بی بی کو خدا حافظ کہہ آیا تھا۔

اس کی بند آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔ وہ بستر پر بے حرکت لیٹا رہا۔ جسم کی چھوٹی بڑی چوٹیں درد کا احساس جگاتی رہیں۔ اس کے بند ہونٹوں کی ''خاموشی'' کراہتی رہی۔ وہ جانتا تھا آپو بڑی خاموشی کے ساتھ دو مرتبہ آ کر اسے دیکھ چکی ہے۔ ابھی رات بھر میں اس نے نہ جانے ایسے کتنے چکر لگانے تھے۔ وہ اس کے لئے ہمیشہ سے ایسی ہی دیوانی تھی۔ جب رستم کی والدہ فوت ہوئی تو رستم کی عمر انیس بیس سے زیادہ نہیں تھی۔ آپو زاہدہ نے اسے بڑی بہن

کے ساتھ ساتھ ماں کا پیار بھی دیا تھا۔ ایسے ٹوٹ کر محبت کی تھی کہ شاید ہی کسی نے کی ہو۔ وہ رستم کو ایک کامیاب اور نیک نام آدمی دیکھنا چاہتی تھی لیکن رستم ڈاکو بن گیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا۔ ایسا اس لئے ہوا تھا کہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ رستم کے ''ڈاکو رستم'' بننے کی کہانی نئی نہیں تھی۔ وہی جبر ناانصافی..... اور پھر ردِعمل کی صدیوں پرانی کتھا۔ وہی فسانۂ لہو رنگ، وہی حکایتِ خونچکاں..... رستم کو وہ رات کبھی بھول نہیں سکتی تھی..... اس رات دیرینہ دشمنی کا دیو چنگھاڑتا ہوا آیا تھا اور ایک ہنستے بستے گھر کو تہہ و بالا کر گیا تھا۔ آپو کی شادی کا مونگی کے قریب ایک گاؤں میں ہوئی تھی۔ آپو کا خاوند اکرام زمینداری کرتا تھا۔ سات آٹھ ایکڑ زمین تھی۔ اکرام کی زمین کے ساتھ حسن آباد کے نمبرداروں کے کھیت تھے۔ نمبردار گھرانے سے اکرام کے گھرانے کی پرانی رنجش چلی آ رہی تھی۔ وہ طاقت ور اور بااثر لوگ تھے۔ اکرام معمولی کاشت کار تھا، نمبرداروں کے بیٹے اکثر اکرام کو تنگ کرتے رہتے تھے۔ آپو کے ساتھ اکرام کی شادی کو بہ مشکل ایک سال ہوا تھا کہ ایک جھگڑا ہو گیا۔ یہ جھگڑا پانی کی باری پر ہوا تھا، نمبرداروں کے ایک کامے نے وقت سے پہلے ہی اکرام کا پانی کاٹ کر اپنے کھیتوں کو لگایا، اکرام نے اسے روکنا چاہا اور بات بڑھ گئی۔ نمبرداروں کی بہن جو حاکو کہلاتی تھی، خود بھی کھیتوں میں کام کی نگرانی کرتی تھی۔ وہ اس وقت کھیتوں پر موجود تھی۔ اس نے اکرام کو گالیاں دیں اور اکرام نے اسے تھپڑ مار دیا۔

اس بات کا پتا اکرام کے سسر یعنی رستم کے والد کو لگا تو وہ فوراً اکرام کے گاؤں پہنچے۔ انہوں نے اکرام کو سمجھایا کہ اسے عورت پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے تھا۔ یہ اس سے ایک بڑی غلطی ہوئی ہے۔ انہوں نے اکرام کو ساتھ لیا اور نمبرداروں کی حویلی پہنچے تاکہ اکرام کو معافی منگوا سکیں۔ نمبرداروں نے ان کے لئے حویلی کا دروازہ نہیں کھولا اور بہانہ بنایا کہ بڑے نمبردار صاحب گاؤں سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ رستم کے والد اور اکرام ناکام گھر واپس آ گئے تھے۔

رستم ان دنوں لاہور میں تھا اور اپنے دوست آفندی کے ساتھ مل کر بادامی باغ میں لوہے کی ڈھلائی کا کام شروع کر رہا تھا۔ اسے بہن کے سسرال میں ہونے والے جھگڑے کی خبر پہنچی تو گاؤں گیا۔ وہ رات گئے پہنچا تھا۔ ابھی وہ بہن کے گھر سے کچھ دور ہی تھا کہ اسے ایک ہولناک خبر ملی۔ اس کی بہن کے گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اسے پتا چلا کہ نمبردار کرامت کے بیٹوں نے حملہ کر کے اس کے بہنوئی اکرام کو شدید زخمی کر دیا ہے اور اس کی بہن آپو زاہدہ کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ رستم کی رگوں میں لہو کی جگہ سیال آگ بہنے لگی۔

وہ تیزی سے نمبرداروں کے ڈیرے پر پہنچا۔ اس کی آپو کو وہیں پر لے جایا گیا تھا۔ جب وہ ڈیرے پر پہنچا اس نے اپنے زخمی باپ کو نمبردار کے بیٹوں کے قدموں پر سر رکھے دیکھا۔ وہ دردناک انداز میں روتے ہوئے ان سے رحم کی درخواستیں کر رہا تھا۔ نمبردار کے بیٹے اسے ٹھوکریں رسید کر رہے تھے..... وہ ٹھوکریں کھا کر ان کے پاؤں سے دور نہیں ہو رہا تھا اور وہ کیسے ہوتا۔ ڈیرے کے بند دروازوں کے پیچھے اس کی بیٹی تھی۔ اس کی جان اور آبرو دونوں خطرے میں تھے۔

رستم نے باپ کو اس حالت میں دیکھا تو سراپا آگ بن گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کا جوان خون اسے ہر اندیشے سے بے نیاز کر کے نمبرداروں سے ٹکرا دیتا، اس کا زخمی باپ بازو پھیلا کر اس کے سامنے آ گیا۔ ''نہیں رستم.....'' اس نے چلا کر کہا۔ ''ہم ان سے نہیں لڑ سکتے۔ ہمیں ان سے نہیں لڑنا..... غلطی ہماری ہے..... ہمیں معافی مانگنی چاہئے، ہمیں معافی مانگنی چاہئے۔''

رستم بدستور بپھرا ہوا تھا۔ اس کے باپ نے اسے تھپڑ مارے اور جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ پھر وہ رستم کی طرف سے نمبرداروں سے معافی مانگنے لگا۔ ''یہ بچہ ہے، ناسمجھ ہے اس کی طرف سے میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ غلطی ہماری ہے۔ ہم تمہارے گناہ گار ہیں۔ ہمارے ساتھ جو جی چاہے کر لو لیکن میری بچی بے قصور ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ خدا کے لئے چھوڑ دو۔''

جبر..... عاجزی کا خون پیتا ہے اور مزید پھلتا پھولتا ہے۔ اس کے چہرے پر مزید سُرخی آتی ہے۔ وہاں اس منحوس رات کو اس منحوس ڈیرے کی ناپاک دہلیز پر بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ بیٹی کے درد سے کراہتے ہوئے بوڑھے کی ساری آہ و بکا بے کار جا رہی تھی۔ ہاں..... ایسا اس لئے ہوا تھا کہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ رستم کے رستم ڈاکو بننے کی کہانی بہت پرانی ہے۔ وہی داستانِ لہو رنگ، وہی حکایت خونچکاں۔

بوڑھا بلک رہا تھا۔ اس کا جواں سال بیٹا باپ کے حکم سے ساکت کھڑا تھا۔ پھر کسی اندرونی کمرے سے زاہدہ کی کرب ناک چیخیں سنائی دی تھیں۔ ''بچاؤ..... خدا کے لئے بچاؤ۔''

جب زاہدہ اس انداز میں فریاد بلند کرتی ہے تو کوئی رستم اپنی جگہ ساکت کھڑا نہیں رہ سکتا اور نہ ہی کوئی باپ مزید صبر و تحمل کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ رستم کے باپ نے انعوا کنندگان کے بے رحم قدموں سے سر اٹھایا تھا اور غم سے بے حال ہو کر ڈیرے کے بند دروازوں کی طرف لپکا تھا۔ یہ لپک ایک طرح سے جوان بیٹے کے لئے بھی اشارہ تھی کہ اب وہ مزید

ساکت کھڑا نہ رہے۔ رستم نے یہ اشارہ وصول کیا تھا اور دیوانہ وار نمبردار کے بیٹوں کی طرف بڑھا تھا۔

اگلے تین چار منٹ میں جو کچھ ہوا، وہ بادل کی گرج، بجلی کی کڑک اور طوفان کی بدترین یورش سے مشابہ تھا۔ نوجوان رستم اپنی بڑی بہن کی حفاظت کے لئے سراپا قہر بن کر ڈیرے والوں سے ٹکرا گیا تھا۔ اس کے بازو میں گولی لگی لیکن اس ایک گولی کے بدلے اپنے دشمنوں کے جسموں میں اس نے کم و بیش پانچ برسٹ اُتار دیئے۔ یہ برسٹ انہی سے چھینی گئی ایک سیون ایم ایم گن سے مارے گئے تھے۔ نمبردار کرامت علی کے دو بیٹوں اور ایک داماد سمیت چار افراد موقع پر ہلاک ہوئے (جب کہ نمبردار کرامت کا ایک اور کارندہ ہسپتال میں پہنچ کر چل بسا) اپنی آپو کو لے کر جب رستم اسلحہ لہراتا ہوا ڈیرے سے باہر نکلا تو دور دور کسی مدِ مقابل کا پتا نہ تھا۔ جو دو چار بچ نکلے تھے وہ جان بچا کر بھاگ گئے تھے۔ رستم کا والد ڈیرے کے برآمدے میں زخمی پڑا تھا۔ اس کے سینے میں دو گولیاں لگی تھیں۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا اس کے چہرے پر جان کنی کی کیفیت تھی مگر بیٹی کا ہاتھ بھائی کے مضبوط اور محفوظ ہاتھ میں دیکھ کر یہ کیفیت یوں غائب ہو گئی تھی جیسے صحرا کی دھوپ گھٹاؤں کی آمد سے غائب ہوتی ہے۔ رستم اور اکرام کے ساتھیوں نے رستم کے باپ کو ہسپتال تک پہنچانے کی کوشش کی تھی لیکن اس ''سرخرو بوڑھے'' نے راستے میں ہی جاں، جانِ آفریں کے سپرد کر دی تھی۔ اکرام کو بھی نہایت مخدوش حالت میں لاہور کے میو ہسپتال پہنچایا گیا۔ حا کو تھپڑ مارنے کے جرم میں نمبرداروں نے اس کا جسم زخم زخم کر دیا تھا اور دایاں ہاتھ کلائی سے کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ زیادہ خون بہہ جانے کے سبب لگتا تھا کہ اکرام بچ نہیں پائے گا لیکن اس کی زندگی باقی تھی لہٰذا اسے بچانے کے لئے ڈاکٹروں کی کوششیں کامیاب رہیں۔

اس کے بعد کی کہانی طویل تو ہے مگر اَن سنی اور انوکھی نہیں، رستم کے دشمن طاقت ور تھے اور پولیس اکثر طاقت وروں کے ساتھ ہوتی ہے۔ انصاف کی توقع عبث تھی۔ رستم کچھ عرصہ کراچی میں چھپا رہا پھر علاقہ غیر کی طرف نکل گیا۔ وہیں اس کے تعلقات ایک بڑے ڈکیت گینگ سے بن گئے۔ ''ڈیرے والے'' خونی واقعے کے تقریباً ایک سال بعد ایک تاریک رات میں رستم ایک بار پھر اپنی آپو زاہدہ کے گاؤں میں نمودار ہوا لیکن اس رات وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اس کے گروہ کے کئی خطرناک آدمی تھے۔ انہوں نے پہلے نمبردار کی حویلی پر ہلہ بولا اور نمبردار کرامت کے دو بھائیوں کو قتل کر کے ان کی تجوری سے کئی لاکھ کے زیورات اور کئی لاکھ نقد لوٹ لئے۔ نمبردار کرامت نے اکرام پر کئی مقدمات بنوا رکھے تھے اور اس کی

تین چوتھائی زمین پر بھی قابض ہو چکا تھا۔ اس زمین کی قیمت ''ڈاکو رستم سیال'' نے نمبردار کرامت کی تجوری سے پوری کر لی تھی۔ اکرام ان دنوں ضمانت پر گھر آیا ہوا تھا۔ ڈاکے اور قتل کے بعد رستم نے بیمار بہن اور بہنوئی کو اپنے ساتھ لیا اور علاقہ غیر میں لے آیا۔ رستم اب ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ وہ واپس جائیں لیکن دوسری طرف وہ انہیں اپنے ساتھ بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے انہیں کچھ عرصہ بڑی رازداری کے ساتھ ہری پور میں رکھا۔ پھر انہیں گوجر خان کے اس قریبی قصبے میں لے آیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی بہن اور بہنوئی کے لئے یہ مقام محفوظ ترین ہے۔ ان کی یہاں موجودگی کے بارے میں آج تک زوار اور شیری کے سوا کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ رستم نے بڑی بہن اور بہنوئی سے اپنے سر پر ہاتھ رکھوا کر یہ قسم لے رکھی تھی کہ وہ کسی بھی صورت اس قصبے سے باہر نہیں نکلیں گے۔ ان دونوں کا کوئی ایسا تھا بھی نہیں جس کے لئے انہیں باہر نکلنے کی شدید تمنا ہوتی۔ اب ان کے دو بچے تھے اور انہوں نے اپنی مختصر سی دنیا اسی چھوٹے سے گاؤں نما قصبے کے اندر بنا لی تھی۔ قصبے کے ساتھ ہی کچھ زمین تھی جسے اکرام، کھیت مزدوروں کے ذریعے کاشت کرواتا تھا۔ اس زمین سے اسے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ اس کا چھوٹا سا گھرانا خوشحالی کی زندگی بسر کر سکتا تھا۔ اس قصبے میں اکرام..... محمد شریف کے نام سے مقیم تھا اور مقامی لوگ اسے اسی نام سے جانتے تھے۔ رستم کی آپو زاہدہ..... بھی اصل نام کے بجائے نسرین کے نام سے یہاں مقیم تھی۔

سوچتے سوچتے رات کے کسی پہر اسے نیند آ گئی..... صبح سویرے آنکھ کھلی تو ٹانگوں پر دباؤ کا احساس ہوا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا آپو زاہدہ پائنتی کی طرف بیٹھی ہولے ہولے روئی کے ساتھ اس کی پنڈلیوں کے زخموں کو صاف کر رہی ہے۔ رستم نے جلدی سے روئی ان کے ہاتھ سے لے لی۔ ''آپو، کیا کرتی ہو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں.....'' وہ قدرے بے زاری سے بولا۔

آپو نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''تجھے ماں کی طرح دیکھتی ہوں۔ تیری ذرا سی تکلیف پر دل رونے لگتا ہے۔ یہ تو پھر اتنے سارے زخم ہیں۔''

رستم نے اسے اپنی چوٹوں کے حوالے سے تسلی تشفی دی۔ کچھ دیر بعد آپو اس موضوع کی طرف آ گئی جس سے رستم بچنا چاہتا تھا۔ اس نے آنکھوں میں تھوڑی سی شوخی بھر کر رستم کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''رستم! جاتے ہوئے تم نے کہا تھا۔ اس مرتبہ آؤں گا تو کڑی (لڑکی) ساتھ لے کر آؤں گا۔ بتا، لایا ہے کہ نہیں؟''

''نہیں۔'' رستم نے توقف کے بعد ہولے سے کہا۔

''میری طرف دیکھ کر بات کر.....'' آپو زاہدہ نے تھوڑا سا مزید جھک کر رستم کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا۔ وہ خاموش رہا۔

''کیا بات ہے رستم..... تُو ایک دم اُکھڑا اُکھڑا لگتا ہے۔ کیا..... کوئی مسئلہ ہو گیا ہے؟''

رستم کے جی میں آئی کہ کہہ دے..... ہاں مسئلہ ہو گیا ہے۔ وہ اب نہیں آئے گی۔ شاید کبھی نہیں۔ مگر پھر اسے بہنوئی اکرام کی بات یاد آئی۔ اکرام نے کہا تھا بہن سے کوئی دل شکنی کی بات نہ کرنا..... وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''آپو! کوئی مسئلہ نہیں ہے..... بس ابھی وہ نہیں آئی ہے.....''

''کیوں نہیں آئی ہے، ابھی کتنا انتظار کرانا ہے اس نے.....؟''

''آپو! ہمارا اس پر کوئی زور تو نہیں ہے ناں۔ ہم اس کا رستہ دیکھ سکتے ہیں پکڑ کر تو نہیں لا سکتے..... اگر..... فرض کیا وہ نہ بھی آئے تو یہ دکھ بھی سہنا پڑے گا ہمیں۔''

''خبردار..... ایسی بات کی تو۔'' آپو نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ''کیوں نہیں آئے گی وہ..... اسے آنا پڑے گا۔ تُو نے جس طرح چاہا ہے اسے وہ پتھر اور لوہے کی بھی ہو گی تو موم ہو جائے گی۔ اگر نہ ہو گی تو پھر وہ عورت ہی نہیں ہے۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو آپو! میں نے کیا کیا ہے اس کے لئے۔ اگر کچھ کیا ہے تو اس نے کیا ہے۔''

''کیوں نہیں کیا تم نے.....'' آپو نے لاڈ سے اس کا سر چوما۔ ''تُو نے اس کے لئے خود کو بدلا ہے۔ اپنے سارے سنگی ساتھی چھوڑے ہیں۔ اپنی ہر دوستی دشمنی بھلائی ہے۔ حلال کی روٹی روزی کی طرف آیا ہے۔ نیکی کا رستہ چنا ہے۔ اپنی پوری حیات کا نقشہ بدل کر دکھایا ہے تُو نے۔ وہ اوپر والا کیوں تیری مدد نہیں کرے گا اور وہ خود کیوں تیری طرف نہیں آئے گی۔ وہ آئے گی اور اسے آنا پڑے گا، اگر رستے میں کوئی چھوٹی موٹی رکاوٹ بھی آئی ہے تو دور ہو جائے گی، تُو دیکھ لینا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں رات دن تم دونوں کے لئے دعا کرتی ہوں۔''

رستم سر جھکائے بیٹھا رہا۔ بڑی بہن کی باتیں اس کے دل کو مزید زخمی کر رہی تھیں۔ اس بے چاری کو کیا پتا تھا، رستم اپنا بہت کچھ لٹا آیا ہے اور جو باقی بچا ہے وہ بھی جلد لٹانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ اب بھی اسے نیکی کے رستے کا راہی سمجھ رہی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ صوبے بھر کی پولیس پھانسی کا پھندا لے کر اس ''راہی'' کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ وقت کے سارے اشارے ماضی کی طرف لوٹ گئے ہیں۔ سارے کے سارے۔

آپو زاہدہ اس کے کندھے پر ہاتھ پھیرتی ہوئی الماری کی طرف گئی۔ وہاں سے وہ سُرخ رنگ کا ایک خوبصورت کامدار جوڑا نکال لائی۔ ''یہ دیکھ رستم، میں نے تو تیری ووہٹی کا جوڑا بھی بنالیا ہے۔ سمجھ لے روپے میں سے بارہ آنے کام میں نے مکمل کر لئے ہیں۔ ایک بڑا ہار اور دو چوڑیاں تو میں نے اسے اپنے زیوروں میں سے ڈالنی ہیں۔ تُو جو مرضی کہہ لے لیکن یہ کام تو میں نے کرنا ہی کرنا ہے۔ بے بے جی کے دیئے ہوئے چار کڑوں میں سے دو کڑے بھی تیری ووہٹی کے ہیں۔ باقی جو زیور چاہئے وہ تُو مجھے شہر سے خود لا دینا۔ کم از کم تین سیٹ تو ضرور ہونے چاہئیں۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ ڈیڑھ لاکھ کا خرچا ہو جائے گا...... پچھلی دفعہ تُو نے بتایا تھا کہ لاہور میں آفندی کے ساتھ لوہے کا کام چل نکلا ہے۔ ابا جی کہا کرتے تھے، چلتے کام میں سے ضرورت کے مطابق پیسہ نکال لیا جائے تو زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ آئی چلائی ہوتی رہتی ہے......'' پھر وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''آفندی کے ساتھ معاملہ ٹھیک چل رہا ہے ناں؟''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' رستم نے کہا۔

''وہ خود بھی ٹھیک ہے؟''

''ہاں۔'' رستم نے مختصر جواب دیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر رات بھر ٹوٹی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ رسے سے اُلٹے لٹکے رہنا ٹھیک ہوتا ہے تو وہ ٹھیک ہی ہے اور اگر اسی حالت میں تڑپ تڑپ کر صبح دم جان دے دینا ٹھیک ہوتا ہے تو وہ ٹھیک ہی ہے لیکن وہ یہ کہہ نہیں سکا۔

اسی دوران میں آپو زاہدہ کے دونوں بچے سرمد اور عاشی بھی جاگ گئے۔ وہ ماموں...... ماموں کہتے ہوئے رستم کے دونوں پہلوؤں میں بیٹھ گئے۔ پہلے تو وہ اس کی چوٹوں اور زخموں کو دیکھ کر پریشان ہوئے پھر دھیرے دھیرے معمول پر آگئے اور اس سے باتیں کرنے لگے۔ عاشی حسبِ عادت اس کے ساتھ لگ کر بیٹھنے اور گود میں گھسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سرکاری پسٹل کو رستم نے رات کو ہی چارپائی کے نیچے چھپا دیا تھا لیکن ماؤزر اور ایک فٹ لمبا چھرا ابھی تک اس کی قمیص کے نیچے تھے۔ رستم کو اندیشہ تھا کہ کہیں پھولوں جیسی یہ بھانجی جان لیوا اسلحے کی سختی سے نہ چھو جائے۔ ایسے میں بڑی بہن کے سامنے یہ راز فاش ہو سکتا تھا کہ رستم خوفناک ہتھیاروں کے ساتھ یہاں پہنچا ہے۔ وہ بھانجی کو خود سے ذرا فاصلے پر رکھنے کی کوشش کرنے لگا اور بات صرف بھانجی کی ہی نہیں تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اب ''ساری دنیا'' کو ہی خود سے ذرا دور رکھنے کی کوشش کرے۔ پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ اس کے گرد موت کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے اور اب وہ زیادہ دیر جیتے جاگتے لوگوں میں نہیں رہ سکے گا۔

وہ بھانجے اور بھانجی سے بڑی محبت سے باتیں کرتا رہا۔ وہ اس سے ''شہروں کے شہر'' لاہور کی باتیں پوچھ رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کا ماموں لاہور سے نہیں خونخوار تاؤ حشام کی حویلی سے نکل کر آیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں لاہور کے نظاروں کی بجائے سرکنڈوں میں بکھری ہوئی لاشوں کے مناظر ہیں......اور اس کے لباس میں لاہور کی کوئی سوغات نہیں ہے، سرکنڈے کاٹنے والا ایک فٹ لمبا چھرا ہے۔ ایسا چھرا جس کی دھار پر کئی مقتولوں کا خون ہے۔

آپو زاہدہ اس کے لئے دیسی گھی میں مرغی بھون رہی تھی۔ حلوہ بنا رہی تھی۔ پراٹھے تیار کر رہی تھی اور وہ اس کے سامنے نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

باورچی خانے کی طرف سے آپو زاہدہ کی آواز آئی۔ ''رستم! اٹھ جا پیشی (ظہر) کا وقت ہو گیا ہے۔ نماز پڑھ لے۔''

رستم نے ''اچھا'' کہا اور کمرے کی طرف جانے کی بجائے سُستی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر چلا گیا۔ اس کے سینے میں ایک آگ تھی اور یہ آگ لمحہ بہ لمحہ اس کے رگ و پے میں پھیلتی جا رہی تھی۔ یہ آگ اتنی شدید تھی کہ اردگرد سے آنے والی آوازیں اس کی پھنکاروں میں دب کر رہ جاتی تھیں۔ اس کی روح جیسے اس آگ کی جان لیوا تپش میں رقصِ بسمل کر رہی تھی۔

رات گیارہ بجے کے قریب رستم کو ایک ذہنی جھٹکا لگا۔ اسے اپنے بہنوئی اکرام سے ایسی توقع نہیں تھی۔ اکرام نے اپنی سمجھ کے مطابق شاید اچھا ہی کیا ہو لیکن رستم کے نقطہ نظر سے یہ ہرگز مناسب نہیں تھا۔ بیرونی دروازے پر دستک ہوئی اور زوار اور شیری اندر آگئے۔ ان کے ساتھ چادر میں لپٹی ہوئی ایک اور لڑکی بھی تھی۔ زوار تیزی سے آگے بڑھا۔ پھر اس کا چوڑا سینہ رستم کے کشادہ سینے سے آن ملا۔ دونوں بغل گیر ہوئے۔ شیری بھی آنکھوں میں آنسو لئے سامنے کھڑی تھی۔ رستم نے بے ساختہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ان کی ساتھی لڑکی اندر چلی گئی تھی۔

رستم نے شکوہ کناں نظروں سے بہنوئی اکرام کی طرف دیکھا۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ زوار نے نگاہوں کے اس ٹکراؤ کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''رستم! بھائی اکرام کو گھورنے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے صرف اطلاع دی تھی کہ تم آئے ہوئے ہو۔ باقی کی ساری کارروائی ہماری اپنی ہے اور تم تفصیل سے سنو گے تو مان لو گے کہ ہمارا یہاں آنا خاص طور سے میرا آنا بہتر تھا۔''

رستم اور زوار اندر کمرے میں چلے گئے۔ اچانک ہی بارش شروع ہوگئی تھی۔ شاید اولے بھی پڑ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ دونوں کمبل لپیٹ کر چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ آپو ان کے لئے چائے اور ابلے ہوئے انڈے لے آئی۔ زوار نے کہا۔

''کہاں چھپ گئے تھے یار! تیرے لئے اتنی خاک چھانی ہے میں نے کہ سمجھو خاک کے ڈھیر لگا دیئے ہیں۔ شیری اور نادیہ نے میری جان کھا رکھی تھی۔ رات دن مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھتی تھیں۔ انہیں شک تھا کہ میں جانتا ہوں اور تمہیں پتا ہی ہے، میں کتنا جانتا تھا۔ صرف اتنا پتا تھا کہ تمہارے پاس شانی کا ایک موبائل نمبر ہے اور تم اس نمبر کی کھوج میں لاہور گئے ہو۔ اس کے بعد ایک دم خوفناک خبریں آنا شروع ہوگئیں۔ پہلے پتا چلا کہ لاہور پولیس نے تمہیں چوہدری بشیر کی کوٹھی کے اندر سے پکڑ لیا ہے۔ تم شدید زخمی حالت میں ہو۔ پھر اطلاع آئی کہ پولیس کی گاڑی تمہیں ہسپتال لے جا رہی تھی کہ راستے میں تمہارے ساتھیوں نے تمہیں چھڑا لیا ہے۔ میں حیران تھا کہ وہ کون سے ساتھی ہیں جنہوں نے چھڑایا ہے۔''

''نہیں زارے! میں چوہدریوں کے پاس ہی تھا۔''

''وہ تو تمہاری حالت دیکھ کر ہی پتا چل جاتا ہے۔'' زوار نے رستم کے زخموں پر تاسف بھری نگاہ دوڑا کر کہا۔ پھر اچانک جیسے اسے یاد آیا۔ اس نے پوچھا۔ ''آفندی کو ہسپتال سے اٹھا لیا گیا ہے۔ کچھ پتا ہے اس کے بارے میں؟''

''ہاں پتا ہے۔ جان سے مار دیا ہے انہوں نے۔'' رستم کی آواز کرب میں ڈوبی تھی۔

''کک..... کیسے؟'' زوار نے ششدر لہجے میں پوچھا۔

''وہ نوٹی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ رات بھر چھت سے الٹا لٹکا رہا اور صبح سویرے دم توڑ گیا۔'' رستم کا لہجہ عجیب تھا۔

''اوہ میرے خدا!'' زوار اندوہ کے سمندر میں غرق ہوگیا۔ کتنی ہی دیر وہ گم صم بیٹھا رہا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''شانی صاحبہ کہاں ہیں؟''

''بی بی جی پر بھی بڑی سختیاں کی گئی ہیں زارے! میں سب کچھ بھول سکتا ہوں لیکن دو باتیں نہیں۔ ایک آفندی کی موت اور دوسری بی بی جی کے ساتھ ہونے والی گستاخیاں۔ شاید..... شاید آفندی کی موت بھی کبھی بھول ہی جائے لیکن بی بی جی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ میں کبھی نہیں بھولوں گا اور نہ معاف کروں گا۔'' رستم کے لہجے میں ایسی آتش تھی جس نے زوار جیسے شخص کو بھی لرزا دیا۔

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''تمہیں ڈھونڈنے کے لئے جو جو کوششیں کی ہیں ان کی تفصیل میں جاؤں گا تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ مختصر یہ سمجھو کہ دو دفعہ پولیس سے ٹاکرا ہو چکا ہے اور دو ہی دفعہ نارپور کے بلی ماروں سے مارا ماری ہوئی ہے۔ بلی ماروں سے آخری جھگڑا کوئی تین ہفتے پہلے نارپور کے قریبی گاؤں سلطان پورہ میں ہوا ہے۔ دو بندے ان کے زخمی ہوئے تھے، دو ہمارے۔ یہ دیکھو تمہارے پیار کی ایک نشانی۔'' زوار نے پنڈلی پر سے پتلون اٹھا کر رستم کو گولی کا زخم دکھایا۔ گولی ایک طرف سے گوشت کو چھیدتی ہوئی گزر گئی تھی۔ زخم ابھی کچا تھا پوری طرح بھرا نہیں تھا۔

رستم نے ایک سرد آہ بھری۔ ''میرا خیال چھوڑ دے زارے! بس مجھے میرے حال پر رہنے دے۔''

''میں بھائی اکرام کی طرح بے خبر نہیں ہوں رستم! میں جانتا ہوں تم یہ بات کیوں کہہ رہے ہو۔ ویسے تو بھائی اکرام کو بھی تھوڑا بہت شک ہو چکا ہے۔ انہوں نے فون کر کے مجھے اور شیری کو اسی لئے یہاں بلایا تھا کہ ہم تم سے اندر کی بات معلوم کریں۔''

''کون سی اندر کی بات؟''

زوار کے چہرے پر دکھ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ اس نے اپنی پتلون کی جیب سے ایک روز پہلے کا مڑا تڑا اخبار برآمد کیا۔ اخبار کے اندر کے صفحے پر ڈیک نالے کے کنارے قتل ہونے والے پولیس اہلکاروں کی خبر نمایاں سُرخی کے ساتھ موجود تھی۔ خبر کا متن کچھ اس طرح تھا۔

''کٹھولی گاؤں کے میلے میں ایک دیہاتی کو قتل کر کے فرار ہونے کے بعد رستم سیال نے ایک اور خونی واردات کی ہے۔ رستم اور اس کے ساتھیوں نے مبینہ بستی کے قریب ڈیک نالے کے کنارے چار افراد کو بے دردی سے قتل کر دیا ہے۔ ان میں سے تین حاضر سروس پولیس اہلکار ہیں۔ اس طرح اب تک رستم کے ہاتھوں جان گنوانے والے پولیس ملازمین کی کُل تعداد پانچ ہو چکی ہے۔ اس تازہ کارروائی کے بعد رستم کو زندہ یا مُردہ پکڑنے کے لئے ''پولیس کارروائیاں'' تیز تر ہوگئی ہیں۔ ڈاکوؤں کی سرکوبی کے حوالے سے شہرت پانے والے ڈی ایس پی ریاض کو رستم کی گرفتاری کا مشن سونپا گیا ہے۔ آج گوجرانوالہ میں ایک پریس کانفرنس کے دوران میں ڈی آئی جی صاحب نے اس بارے میں تفصیلات بتائی ہیں۔ دریں اثناء اطلاع ملی ہے کہ مبینہ طور پر رستم کی منظورِ نظر شہناز بی بی (شانی) نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔ شہناز بی بی کے وکیل معروف ایڈووکیٹ ہمدانی کا کہنا ہے کہ میری مؤکلہ

شہناز بی بی چوہدری کا رستم سیال سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس بارے میں جو کچھ بھی کہا جارہا ہے وہ الزام تراشی کے زُمرے میں آتا ہے اور یہ الزام تراشیاں شہناز بی بی کے سابقہ سسرالیوں کی طرف سے کی جارہی ہیں.....''

رستم خبر دیکھ چکا تو زوار نے پوچھا۔ ''کیا شانی بی بی واقعی پولیس کے پاس ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ بی بی کے پاس اس کے سوا کوئی رستہ بھی تو نہیں تھا۔''

''خیال ہے..... سے کیا مطلب ہے؟ کیا آخر میں بی بی سے تمہاری بات نہیں ہوئی؟''

''نہیں۔'' رستم نے کہا۔

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ بی بی نے جو کچھ کیا اپنے طور پر کیا۔ تمہیں اعتماد میں نہیں لیا؟''

''وہ اپنے بارے میں اپنے طور پر فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہیں زوار! وہ کوئی ہماری باندھی ہوئی تو نہیں ہیں۔''

''یار! یہ کیسی بات کررہے ہو۔ تمہاری اچھی بھلی زندگی ایک بار پھر تباہی کے رخ پر مڑ گئی ہے اور یہ سب کچھ صرف بی بی کو بچانے کے چکر میں ہوا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس وقت بی بی تمہارے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہوتیں لیکن اگر ایسا نہیں بھی ہوا تو پھر بھی..... یہ تو ہونا چاہئے تھا کہ بی بی جو کرتیں مشورے سے کرتیں۔''

''مشورہ کیا کرنا تھا؟ انہوں نے جو کیا وہی مناسب رستہ تھا زارے۔''

''لیکن کیا آخر میں ملاقات بھی نہیں ہوئی تمہاری۔ پرسوں تک تم دونوں ساتھ تھے۔''

''بی بی کے آنے سے پہلے میں خود ہی وہاں سے نکل آیا تھا۔''

زوار نے رستم کی آنکھوں میں جھانک کر تفتیشی انداز میں سر ہلایا۔ ''شاید تمہیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ بی بی کا فیصلہ تمہارے بارے میں کیا ہونا ہے۔''

رستم کے چہرے پر ایک دم خون کی سُرخی دوڑ گئی۔ ''نہیں زارے! دوست ہو کر زخم مت لگاؤ۔ میں بی بی کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ ایک لفظ بھی نہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا ہے، اچھا کیا ہے۔ آئندہ بھی وہ جو کریں گی اچھا کریں گی۔ تم نہیں جانتے زارے، بی بی کے تو احسان ہی احسان ہیں۔ مہربانیاں ہی مہربانیاں ہیں۔ یہ زندگی..... یہ زندگی انہی کی دی ہوئی ہے زارے! پیدا کرنے والے کی قسم، ایسی سوزندگیاں ان پر قربان۔ تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہئے..... اگر.....'' رستم کی آواز بھرا گئی۔ بات ادھوری چھوڑ کر اس نے سر گھٹنوں پر جھکا لیا۔

زوار نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے بس یہ کہا تھا رستم کہ بی بی کو تم سے

آئندہ کے بارے میں مشورہ کرنا چاہئے تھا۔''

''پھر وہی بے وقوفوں والی بات کررہے ہو۔'' رستم بولا۔ ''وہ بی بی کی زندگی ہے۔ اس کے بارے میں سوچنے کا انہیں پورا حق ہے۔ میں ان کی زندگی میں دخل دینے والا کون ہوتا ہوں۔ میرے لئے ان کا مقام بہت اونچا ہے زارے! تم اس بات کو نہیں سمجھ سکتے، نہیں سمجھ سکتے۔''

زوار عجیب نظروں سے رستم کو دیکھ رہا تھا۔ رستم کے لہجے کا کرب اور گہرائی کو محسوس کر کے وہ اندر تک لرز گیا تھا۔ اسے یوں لگنے لگا جیسے رستم کسی اور دنیا کا بندہ ہے۔ وہ جس رستم کو جانتا تھا وہ دھیرے دھیرے ایک انوکھے جذبے کی وسعتوں میں کہیں گم ہوگیا ہے۔ وہ ایک ایسے شخص سے مخاطب ہے جو بس عشق کھاتا ہے، عشق پہنتا ہے، عشق اوڑھتا اور عشق میں ہی سانس لیتا ہے۔

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''رستم! ٹھیک ہے۔ میں اس بارے میں بات نہیں کرتا لیکن یہ تو پوچھ سکتا ہوں کہ اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟''

''اب کوئی ارادے نہیں ہیں زارے! جدھر یہ طوفان لے جائے گا اس طرف چلا جاؤں گا۔''

''ایک بات بھول نہ جانا رستم!'' زوار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہر بندے کا اپنا اپنا طوفان ہوتا ہے لیکن ہم دونوں کا طوفان ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور آئندہ بھی ایک ہی رہے گا۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''تمہیں یاد ہوگا رستم! جب تم بی بی کے لئے بدلے..... تو تم نے اپنے ساتھ مجھے بھی بدل لیا۔ مجھے کھینچ کھینچ کر اور گھسیٹ گھسیٹ کر اسی راستے پر لے آئے جس پر تم خود تھے..... اور میں آ گیا۔ ساری دشمنیاں، سارے حساب کتاب اور جنگ سے بھلا دیئے میں نے۔ ہر جرم سے ہاتھ کھینچ لیا اور اب ایک بار پھر تم بدل رہے ہو اور اس بار بھی تم اکیلے نہیں بدلو گے۔ اگر بدلیں گے تو دونوں ساتھ بدلیں گے۔''

رستم نے اپنی آتشیں نگاہیں اٹھا کر زوار کو گھورا۔ ''نہیں زوار! میں ایسا نہیں کرنے دوں گا تمہیں۔ اب تم اکیلے نہیں ہو۔ تمہارا گھر ہے، تمہارا ہونے والا بچہ ہے۔ تمہاری ایک زندگی ہے۔ میں اس زندگی کو کسی صورت تباہ نہیں ہونے دوں گا۔''

''میری زندگی میں تم بھی شامل ہو رستم! اگر تم تباہ ہو رہے ہو تو پھر میں تباہی سے بچ

نہیں سکتا۔''

''نہیں زارے!'' رستم نے زوار کو بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ ''ایسا مت سوچو۔''

اس کمرے میں تابڑ توڑ بارش کے دوران میں وہ کمبلوں میں لپٹے بیٹھے رہے۔ ان کے سامنے سگریٹوں کے ٹکڑے گرتے رہے اور ان کی طویل بحث مختلف نشیب و فراز طے کرتی رہی۔ ایک لمبی اور تکلیف دہ کوشش کے بعد رستم زوار کا ابال کم کرنے میں کامیاب رہا۔ کم از کم وقتی طور پر تو یہی لگا کہ اس نے زوار کو نیم قائل کر لیا ہے۔ رستم نے زوار سے بحث کرتے ہوئے اس نکتے پر زور دیا کہ اس کے ساتھ مل کر پولیس کے آگے آگے بھاگنے سے بہتر ہے کہ زوار خود کو یکسر علیحدہ رکھے اور اپنے ڈھنگ سے حاجی حیات خان کے ساتھ مل کر رستم کی مدد کی کوشش کرے۔

بحث کے آخر میں جیسے رستم کو اچانک کوئی بات یاد آئی ہو اور اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے ساتھ وہ لڑکی کون آئی ہے؟''

زوار نے نیا سگریٹ سلگا کر کہا۔ ''میرے جواب سے تمہاری پوشل پر پھر پاؤں آ جائے گا۔ آگ بگولہ ہو جاؤ گے۔''

''اچھا نہیں ہوں گا آگ بگولہ۔''

''وہ نادیہ ہے۔'' زوار نے انکشاف کیا۔ ''ہر صورت ہمارے ساتھ آنا چاہتی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ ہم اسے زیادہ سختی سے روک نہیں سکے۔''

کچھ دیر کے لئے رستم گم صم ہو گیا۔ نادیہ کی آمد کی اطلاع اس کے لئے واقعی پریشان کن تھی۔

کمرے کی فضا گھمبیر تر ہو گئی۔ زوار نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں معلوم نہیں تمہارے بعد اس کی کیا حالت رہی ہے رستم۔ بچ میں ایسے لگنے لگا تھا کہ ختم ہی ہو جائے گی۔ سخت بیمار ہو گئی تھی۔ اب بھی پوری طرح سنبھلی نہیں۔ رنگ زرد ہے۔ وزن کم ہو گیا ہے۔ بیٹھے بیٹھے ہاتھ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ نیم بے ہوش ہونے لگتی ہے۔''

رستم سر پکڑ کر بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر کیا کہے..... زوار بولا۔ ''ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس نے اپنے دل پر بہت اثر لیا ہے۔ اس کا واحد علاج یہی ہے کہ یہ اس اثر سے نکلے اور خوش رہے۔ اب یہ بات تو ہم ہی جانتے ہیں کہ یہ کیسے خوش رہ سکتی ہے..... یا پھر تم جانتے ہو۔''

''یار! تمہیں اسے یہاں نہیں لانا چاہئے تھا۔'' رستم بجھے بجھے لہجے میں بولا۔

''میں نے نہیں لانا تھا لیکن شیری سے اس کی حالت دیکھی نہیں گئی۔ بالکل ہلدی ہو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ ابھی گر جائے گی۔ دونوں رونے لگیں۔ ماسی زینب نے مجھے جھڑکا کہ اگر اسے ایسے ہی رُلانا ہے تو گلا گھونٹ کر ختم کر دو۔''

قریباً دس منٹ بعد نادیہ کسی قصور وار کی طرح سر جھکائے رستم کے سامنے بیٹھی تھی۔ زوار اسے چھوڑ کر باہر جا چکا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ دبلی ہو گئی تھی لیکن بیمار نظر نہیں آتی تھی۔ شاید زوار نے اس کے بارے میں کچھ بڑھا چڑھا کر بیان کیا تھا۔ اس نے قدرے کھلے گلے کی قمیص پہن رکھی تھی۔ ہنسلی کی ہڈیاں ابھری دکھائی دیتی تھیں۔ دبلا لیکن ہیجان خیز بدن گردن سے نیچے آگے تک نظر آتا تھا۔

''میرا آنا بہت بُرا لگا ہو گا۔'' وہ نظر جھکائے جھکائے بولی۔

''نہیں۔ میں نہال ہو گیا ہوں خوشی سے۔'' رستم کے لہجے میں کاٹ تھی۔

''تمہیں اس حالت میں دیکھ کر جان نکل گئی ہے رستم! اتنی چوٹیں، اتنے زخم! یہ سب کیسے ہوا؟''

''میں یہ سب کچھ زوار کو بتا چکا ہوں۔ اس سے پوچھ لینا۔''

وہ کتنی ہی دیر تک شکوہ کناں نظروں سے رستم کا چہرہ دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''اتنے عرصے بعد ملے ہو۔ یہ بھی نہیں پوچھو گے کہ میں کیسی ہوں؟''

''اچھی بھلی میرے سامنے بیٹھی ہو۔''

اس کی کٹورہ آنکھوں میں پانی بھر گیا۔ دل فگار آواز میں بولی۔ ''مرتے مرتے بچی ہوں۔ سمجھو جو کچھ تمہیں نظر آ رہا ہے۔ بت ہی بت ہے۔ اندر سے بالکل خالی ہوں اور لگتا ہے کسی دن یہ بت بھی نہیں رہے گا۔''

''میں نے کہا تھا ناں تم بہت اچھی اداکارہ ہو۔ اپنا وہ کام جاری رکھو تو زیادہ بہتر ہے۔''

''رستم! گھبراؤ مت۔ میں اب تم سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ میں جان گئی ہوں کہ تمہارے پاس مجھے دینے کے لئے کچھ ہے ہی نہیں۔ مجھے..... مجھے تمہارے اور شانی کے بارے میں سب معلوم ہو چکا ہے۔''

رستم کراہ کر بولا۔ ''بہتر ہے کہ تم اپنی زبان پر بی بی کا نام مت لاؤ۔'' اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر کہنے لگی۔ ''ٹھیک ہے نہیں لاؤں گی لیکن دل میں ان کے لئے جو نیک خواہشات ہیں ان پر تو تم پابندی نہیں لگا سکتے ناں۔''

''فلمی باتیں مت کرو اور نہ میرے سامنے اداکاری کی ضرورت ہے۔'' رستم نے زچ ہو کر کہا۔ بولتے ہوئے اس کے گلے کی رگیں اب بھی پھولتی تھیں اور آواز بیٹھ جاتی تھی۔

رستم نے کندھوں پر چادر درست کرنے کے لئے پلو کو حرکت دی تو قریب رکھا ہوا کپ الٹ گیا اور ٹھنڈی چائے فرش پر گر گئی۔ پاس ہی رستم کی جوتی پڑی تھی، کچھ چائے جوتی کے اندر چلی گئی۔ نادیہ نے بے ساختہ جوتی اٹھائی اور اپنی رنگین اوڑھنی کے پلو کو جوتی کے اندر گھسا کر اسے صاف کرنے لگی۔

رستم نے جوتی اس سے واپس لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا کرتی ہو؟''

''کیوں، اس میں کیا برائی ہے۔ تمہاری جوتی ہے، کسی غیر کی تو نہیں۔'' وہ بے حد لگاوٹ سے بولی۔

''میں کون ہوتا ہوں تمہارا۔'' وہ بھنا کر بولا۔

نادیہ نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم میرے بادشاہ ہو۔'' وہ والہانہ انداز میں کہہ گئی۔

''دیکھو میرے پاس بے کار کی باتوں کے لئے وقت نہیں۔'' رستم نے جھنجھلا کر اس کے ہاتھوں سے جوتی چھینی۔

وہ اطمینان سے بولی۔ ''بادشاہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ من مرضی کرنے والے۔ چاہے تو بے وجہ خوش ہو جائیں، چاہے تو جوتیوں میں بیٹھنے والے خدمت گاروں کو بھی دھتکار دیں۔''

''تم چاہتی کیا ہو؟''

اس کی آنکھیں نیم باز ہو گئیں۔ اس نے آگے جھک کر رستم کی جوتیوں کو سیدھا کر کے رکھا تو گریبان میں سے اس کا چمکیلا جسم دور تک نظر آنے لگا۔ دیگر خطوط بھی واضح تر ہو گئے یوں لگتا تھا وہ اپنے چنگھاڑتے، دہاڑتے جسم کے خطوط کو فطری انداز میں نمایاں کرنے کا فن بڑی اچھی طرح جانتی ہے۔ رستم کے سوال کے جواب میں وہ بولی۔ ''جان کی امان پاؤں تو بتا دوں، کیا چاہتی ہوں؟''

رستم خاموش رہا۔ وہ ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد بولی۔ ''بادشاہ کی ایک ملکہ ہوتی ہے جس سے وہ بے حد پیار کرتا ہے۔ وہ اس کے سر پر عزت کا تاج رکھتا ہے۔ تخت پر اسے اپنے پہلو میں جگہ دیتا ہے۔ وہ اس کے لئے تخت و تاج کا وارث پیدا کرتی ہے۔ اس کے شہزادے، شہزادیوں کی ماں بنتی ہے۔ کہانی میں شروع سے آخر تک وہ چھائی ہوئی نظر آتی ہے لیکن اس کہانی میں ایک اور کردار بھی ہوتا ہے۔ ایک کنیز کا، ایک زر خرید لونڈی کا۔ وہ محل کی کسی غلام

گردش کے کسی کونے میں چپ چاپ زندگی بسر کرتی ہے۔ اپنے سارے شباب اور خوبصورتی کے ساتھ وہ بادشاہ کے کسی اشارے کی منتظر ہوتی ہے۔ اس کا دل اور جسم بادشاہ کی ملکیت ہوتا ہے۔ جب کبھی لونڈی کی قسمت جاگتی ہے، بادشاہ شب کی تاریکی میں کسی خواجہ سرا کو بھیجتا ہے اور اسے اپنی خلوت میں بلا لیتا ہے۔ وہ شاد ماں آتی ہے اور بڑی محبت سے خود کو بادشاہ کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ اپنی پوری جوانی میں لونڈی کو ایسی چالیس پچاس راتیں بھی مل جائیں تو وہ اسے بہت بڑی خوش قسمتی سمجھتی ہے۔''

''تم یہ فضول بکواس بند کرو تو اچھا ہے۔'' رستم پھنکارا۔

وہ بدستور خواب ناک لہجے میں بولی۔ ''تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے رستم؟ میں اپنے لئے ملکہ کا نہیں لونڈی کا کردار چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں ملکہ کا کردار تم کسی اور کو دے چکے ہو۔''

رستم تیزی سے اٹھا اور جوتی پہن کر چادر جھٹکتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

باورچی خانے میں شیری، زوار، زاہدہ اور بھائیا اکرام بیٹھے تھے۔ زاہدہ اصل صورتِ حال سے یکسر بے خبر تھی اس لئے وہ خوشگوار موڈ میں باتیں کر رہی تھی۔ وہ زوار کی طرف اشارہ کر کے شیری سے کہہ رہی تھی۔ ''اس کو جلدی سے ایک بچے کا باپ بنا دو پھر اس کے لڑائی جھگڑے ایک دم ختم ہو جائیں گے۔ بالکل اچھا بچہ بن جائے گا۔''

''ہماری گورنمنٹ اپنے تجربے کی بات کر رہی ہے۔'' بھائیا اکرام نے ہولے سے کہا۔

''ہمارے تجربے آپ لوگوں کی ہوشیاری کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔'' شیری نے منہ بنا کر کہا۔ ''کسی نے سچ کہا ہے، مرد حضرات گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں اور گھوے کی طرح خود کو اپنے اندر چھپائے رکھتے ہیں۔''

''ہر بُری مثال کے لئے مذکر کا صیغہ کیوں استعمال کرتی ہو؟ کچھوا ہی تو نہیں چھپاتا، کچھوی بھی تو خود کو چھپاتی ہے۔'' زوار نے بے دلی سے فقرہ کسا۔

''لو جی، ایک اور کچھوے صاحب آ گئے ہیں۔'' آپو زاہدہ نے رستم کو آتے دیکھ کر کہا۔

باقی سب خاموش رہے۔ آپو زاہدہ خود ہی سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو بھئی اسے گود میں کھلا رہی ہوں۔ بچپن میں اسے گڈا بنا کر اس کے چہرے پر سہرا سجاتی رہی ہوں۔ اب اصلی سہرا سجانے کا وقت آیا ہے تو یہ کوئی ڈھنگ کی بات ہی نہیں کرتا۔''

بھائیا اکرام نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''سہرا باندھنے کا وقت آیا نہیں، گزرا جا رہا ہے۔''

''اور نہیں تو کیا۔'' آپو نے تائید کی۔ ''اس کی عمر کے تین تین بچوں کے باپ ہیں۔''

رستم کے چہرے پر مسکراہٹ کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ کچھ یہی کیفیت زوار کی تھی۔ زوار رستم کو لے کر چھت پر چلا گیا۔ سطح مرتفع پر قصبے کے نشیب و فراز نظر آ رہے تھے نیچی چھت والے گھروں میں بلب اور ٹیوب لائٹس کی روشنی تھی۔ جہاں روشنیاں ختم ہوتی تھیں وہاں سے آگے گہری تاریکی تھی۔ رستم کی آنکھیں اس تاریکی میں دیکھنے سے قاصر تھیں۔ تاہم وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس تاریکی میں خطروں کے سانپ منڈلا رہے ہیں۔ بے شمار قاتل آنکھیں اسے ڈھونڈنے کے لئے شہر شہر، گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ پھیلی ہوئی ہیں۔ کچھ لوگوں نے، کچھ نہایت مؤثر لوگوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اب رستم کو تادیر زندہ نہیں رہنے دیں گے۔

''اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟'' زوار نے بے حد گھمبیر لہجے میں پوچھا۔

''تمہیں بتا تو چکا ہوں سب کچھ..... آج صبح سویرے نکل جاؤں گا۔''

''شیرے کے پاس جاؤ گے؟'' زوار نے رستم کے ایک پرانے ساتھی کا نام لیا۔

''دیکھوں گا، شاید وہی مل جائے۔'' رستم نے مبہم انداز میں جواب دیا۔

''میں کیا کروں؟'' زوار نے بے حد دکھی لہجے میں کہا۔

''کچھ عرصہ کے لئے کہیں روپوش ہو جاؤ۔ جن دوستوں سے رابطہ ہو ان کو بھی پوری طرح ہوشیار کر دو۔ پولیس انہیں تنگ کرنے کی کوشش کرے گی۔ جو ایک دو نام میں نے تمہیں بتائے ہیں، ان کے لئے تو زیادہ خطرہ ہے۔ انہیں تو ایک دو ماہ تک بالکل نظر نہیں آنا چاہئے۔ اگر پھر بھی کوئی مسئلہ ہو تو سامنے آئے بغیر فون کے ذریعے حاجی حیات سے رابطہ کرنا..... وہ پوری طرح چوکس ہے۔''

''اپنی بی بی جی کی طرف سے تو اطمینان ہے تمہیں؟'' زوار نے پوچھا۔

''اطمینان نہ ہوتا تو انہیں چھوڑ کر کیوں آتا۔ وہ اپنے وارثوں میں پہنچ چکی ہے۔ انہیں قانونی چکروں سے نکالنے کے لئے بڑے اچھے وکیلوں کا انتظام کر لیا جائے گا۔ اس کے علاوہ حاجی بھی ہر وقت ان کی طرف سے باخبر رہے گا۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''اور میں بھی بے خبر نہیں رہوں گا۔''

''لیکن تمہاری طرف سے کون باخبر رہے گا؟'' زوار نے آزردہ لہجے میں کہا۔

''میری طرف سے باخبر رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' رستم نے عجیب روکھے لہجے میں کہا۔ ''بہتر ہے کہ مجھے آہستہ آہستہ بھولنے کی کوشش کرو۔ میں جس راستے پر چل نکلا ہوں اس پر میرا اکیلے رہنا ہی بہتر ہے۔ ویسے بھی یہ راستہ زیادہ لمبا نہیں ہے۔''

''میں تمہیں گولی مار دوں گا رستم۔'' زوار نے دکھ سے لبریز لہجے میں کہا۔

وہ زخمی انداز میں مسکرایا۔ ''گولی تو اب کہانی ہی ہے۔ تم نہ مارو گے تو پولیس مار دے گی۔''

''یہ خیال دل سے نکال دو رستم! ایسا موقع آیا تو میں تم سے پہلے مرنے کی کوشش کروں گا۔''

''اچھا چھوڑو، یہ دکھ دینے والی باتیں۔ میں نے بھائیا اکرام اور آپو کو کچھ نہیں بتایا۔ تم نے بھی نہیں بتانا۔ خاص طور سے آپو کے کان میں تو بھنک بھی نہیں پڑنی چاہئے..... اسے یہی معلوم رہنا چاہئے کہ میں آفندی کے پاس واپس لاہور گیا ہوں۔ وہاں کام کی مصروفیت کچھ ایسی ہے کہ جلدی واپس نہیں آ سکتا۔ بھائیا اکرام کو بھی میں سختی سے کہہ جاؤں گا کہ وہ اس آبادی سے باہر نکل کر اپنے اور اپنے بچوں کے لئے جان کا خطرہ مول نہ لے..... بھائیا اکرام کو یہاں سے باہر نکلنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں نے سارا انتظام کر رکھا ہے۔ اسے کھاد اور بیج وغیرہ کے لئے بھی یہاں خود نکلنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔''

''نادیہ کا کیا کرنا ہے؟'' زوار نے بے حد بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''تم یا میں اس کے ذمے دار نہیں ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے جا سکتی ہے۔ وہ خواہ مخواہ اپنی زندگی برباد کر رہی ہے۔ اب بھی اس کے لاکھوں چاہنے والے ہوں گے۔ اس کا اصل ٹھکانہ فلمی دنیا ہی ہے۔ پیسہ، شہرت، ترقی سب کچھ اسے وہاں سے مل سکتا ہے۔''

''لیکن وہ تو کہتی ہے.....''

''خدا کے لئے زارے۔'' رستم نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''اس لڑکی کا ذکر میرے سامنے مت کرو۔ میں جو جو کچھ چھوڑ کر جا رہا ہوں اس کے سامنے اس فلم ایکٹریس کی حیثیت کھمبی کے پرجتنی بھی نہیں۔''

کچھ دیر تک دونوں چھت کی تاریکی میں خاموش کھڑے رہے۔ درد کی ایک نادیدہ لہر سی ان دونوں کے درمیان چل رہی تھی۔ رستم اپنے دوست کے دکھ کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس نے گزرے مہینوں میں بہت سے خطرے مول لے کر دیوانوں کی طرح رستم کو تلاش کیا تھا۔ اب رستم ملا تھا..... لیکن بچھڑ جانے کے لئے..... اور یہ ایسا دوچھوڑا تھا جو امیدیں چھین رہا تھا اور انتظار بھی۔ اچانک زوار آگے بڑھا اور اس نے جذباتی انداز میں رستم کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ دونوں دوست کتنی ہی دیر تک ایک دوجے سے بغل گیر رہے۔ ایک دوسرے کی دھڑکنیں سنتے رہے۔ ''اپنا خیال رکھنا یار۔'' زوار نے آنسوؤں سے بوجھل آواز میں کہا۔

''اور تم بھی۔'' رستم نے کہا۔ ''کبھی کبھی آپو کے بارے میں معلوم کرتے رہنا اور شیری کو بھی خوش رکھنا۔''

زوار نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے جاؤ گے کس طرح؟''

''تمہاری کیا رائے ہے؟''

''چھ سات میل تک تو راستہ ایسا ہے کہ چھوٹی گاڑی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تم زخمی بھی ہو یار۔ میری رائے تو یہ ہے کہ تم میری والی گاڑی پر نکلو۔ جہاں تک گاڑی لے جا سکو وہاں تک لے جاؤ۔ اس کے بعد اسے چھوڑ کر پیدل آگے بڑھ جانا۔''

''اور گاڑی کا کیا ہوگا؟''

''میں اسے کسی طرح منگوا لوں گا۔ یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں نے اس بارے میں سوچ لیا ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ تمہیں پتا ہے میری گاڑیاں بے شناخت ہوتی ہیں۔''

دونوں دوست الوداعی انداز میں بغل گیر ہونے کے بعد بھی دیر تک چھت پر رہے اور باتیں کرتے رہے۔

☆======☆======☆

رات کے اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہوتی جا رہی تھی لیکن سویرا ابھی تک شب کے حصار سے نکلا نہیں تھا۔ رستم ایک سفید کار ڈرائیو کرتا ہوا اونچے نیچے راستے پر جا رہا تھا۔ وہ بھائیا اکرام کے لباس میں تھا۔ سر پر ایک جالی دار ٹوپی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ایک شال نے اس کے بالائی جسم کو چھپا رکھا تھا۔ پوٹھوہار کی ٹھنڈی ہوا کھڑکیوں کے راستے گاڑی میں داخل ہوتی تھی اور اس کی ریشمی داڑھی میں سرسراتی تھی۔

رستم کی منزل پوٹھوہار کی لامتناہی گھاٹیاں اور کھائیاں تھیں۔ وادیِ سون ایک اسرار کی طرح اس کے اردگرد حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ مشرق کی طرف دریائے جہلم اس کی حد بندی کرتا تھا اور مغرب کی طرف دریائے سندھ۔ اس کے شمال کی جانب کالا چیتا پہاڑ اور مارگلہ کی بلند پہاڑیاں تھیں۔ یہ گھاٹیوں، کھائیوں، سرنگوں، کھوہ نما غاروں اور چھوٹی بڑی جھیلوں والی بے آباد وادی تھی جو ہمیشہ سے مفروروں، مجرموں اور تاریک الدنیا افراد کو اپنی پُر پیچ وسعتوں میں پناہ دیتی رہی ہے۔

جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ راستہ دشوار گزار ہو رہا تھا۔ نشیب و فراز بڑھتے جا رہے تھے۔ چیڑ کے چھوٹے بڑے پودے، خودرو گھاس اور نیم پہاڑی پودے جگہ جگہ راستے کو گنجلک

کر رہے تھے۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے زوردار جھٹکا لگا۔ جسم کے کئی حصوں سے ناقابلِ برداشت ٹیسیں اٹھیں۔ دائیں جانب پسلیوں کے زخم سے خون رسنے لگا۔ خون کی نمی اور حرکت رستم نے اپنی جلد پر محسوس کی۔ کس بات پر اسے بی بی یاد نہیں آتی تھی؟ اس بات پر بھی آئی۔ بی بی نے کہا تھا۔ ''یہ زخم گہرا ہے۔ پسلی تک چلا گیا ہے، اس کی زیادہ احتیاط کرنا۔''

''ہاں..... کس بات پر بی بی یاد نہیں آتی تھی؟''

ایک اور موڑ سامنے آیا۔ رستم نے رفتار آہستہ کر دی پھر بھی ایک دو جھٹکے لگے۔ رستم کو یوں لگا جیسے گاڑی کی ڈی ٹھیک سے بند نہیں ہوئی۔ اس نے ایک بھربھرے سے ٹیلے کے پاس گاڑی روک لی۔ پرندوں کی ڈاریں چہکارتی ہوئی سر پر سے گزر گئیں۔ دور دور تک کسی متنفس کا نشان نہیں تھا۔ اس نے چابی لگا کر ڈی کی کھولی اور سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا رہ گیا۔ ٹویوٹا کی کشادہ ڈی خالی نہیں تھی۔ اس میں کوئی موجود تھا۔ یہ نادیہ تھی۔ وہ پہلو کے بل گٹھڑی سی بنی پڑی تھی اور آنکھیں پٹ پٹا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی ہلکی گلابی شلوار پر موبل آئل کے دھبے تھے اور گلابی پھولوں والی سفید قمیص فالتو ٹائر کے کیچڑ سے آلودہ ہو رہی تھی۔ دوپٹہ اس کے پہلو میں پڑا تھا۔

''یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟'' رستم از حد حیرت اور غصے سے بولا۔

وہ خوفزدہ انداز میں اٹھ بیٹھی پھر ہمت کر کے بولی۔ ''میں نے تمہارے ساتھ جانا ہے رستم۔'' اس کے لہجے میں پختہ ارادہ تھا۔

رستم نے اس کے بالوں پر ہاتھ ڈالا اور کھینچ کر ڈی سے باہر کھڑا کر دیا۔ اس کی ایک سینڈل ڈی کے اندر رہ گئی تھی۔ وہ اس نے نکال کر اپنے دودھیا پاؤں میں پہن لی۔ ''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے شاید۔'' رستم نے بے حد زہریلے لہجے میں کہا۔

''چلو، یہی سمجھ لو لیکن میں تمہارے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔ میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی، کچھ نہیں مانگوں گی۔ کوئی پریشانی نہیں دوں گی تمہیں لیکن مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ پلیز رستم خدا کے لئے۔'' اس نے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں۔'' رستم پھنکارا اور گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نادیہ کار کی ڈی میں کیسے پہنچی۔ جب وہ بھائیا اکرام، آپو اور زوار سے رخصت ہو کر گھر سے نکلا تو شیری اور نادیہ چارپائیوں پر سوئی ہوئی تھیں۔

بڑی جھلاہٹ کے عالم میں رستم نے کار کا دروازہ بند کیا اور اپنا بایاں ہاتھ گیئر لیور کی طرف بڑھایا۔ نادیہ نے آگے بڑھ کر اسٹیئرنگ تھام لیا۔ ''نہیں رستم! تم مجھے یوں چھوڑ کر نہیں

جا سکتے۔ ایسا مت کرو۔''

رستم کی جھنجھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ نادیہ کسی صورت اسٹیئرنگ نہیں چھوڑ رہی اور گاڑی کے ساتھ جونک کی طرح چمٹ گئی ہے تو اس نے بھنا کر اسے زوردار دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑائی اور ہلکی سی خوفزدہ چیخ کے ساتھ ایک چار پانچ فٹ گہرے کھڈ میں گر گئی۔ اس کی پشت نکیلے پتھروں سے ٹکرائی تھی۔ رستم نے اس کے چہرے پر کرب کے آثار دیکھے۔

''دفع ہو جاؤ۔'' رستم دہاڑا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

اس کے دماغ میں جیسے شہد کی مکھیاں ڈنک مار رہی تھیں اور پورے جسم میں انگارے بھر گئے تھے۔ قریباً ایک فرلانگ تک وہ ایسے ہی گاڑی چلاتا چلا گیا۔ پھر اچانک اس کے ذہن کا زہریلا ابال کم ہونا شروع ہوا۔ وہ قدرے منطقی انداز میں سوچنے لگا۔ وہ اس کو ایک کھائی میں دھکا دے کر چھوڑ آیا تھا۔ ممکن تھا وہ زخمی ہو گئی ہو۔ ویسے بھی یہ ایک لق دق ویرانہ تھا۔ جوان اکیلی لڑکی کا تو سایہ بھی اس کا دشمن ہوتا ہے۔ یہاں کوئی آوارہ گرد اسے مل جاتا تو کیا ہوتا؟

پتا نہیں کیوں اپنی بی بی جی کے الفاظ رستم کے کانوں میں گونجنے لگے۔ انہوں نے ایک مرتبہ کہا تھا۔ ''رستم! نادیہ کو دکھ نہ دینا۔ تمہاری وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آتے ہیں تو لگتا ہے، میں گناہ گار ہوں۔''

وہ یہ الفاظ کیسے بھول سکتا تھا اور بات صرف ان الفاظ ہی کی نہیں تھی۔ ہر وہ لفظ جو بی بی کی زبان سے نکلا تھا، اس کے کانوں تک پہنچا تھا..... اس کے دل و دماغ پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو چکا تھا۔

بی بی کے الفاظ کا خیال آتے ہی اس کے وحشی، پتھریلے دل میں عجیب سی نرمی نمودار ہو گئی۔ تنے ہوئے عضلات ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے بریک پیڈل دبایا اور گاڑی ایک ڈھلوان پر رک گئی۔ چند لمحے وہ شدید کشمکش و پیچ کی کیفیت میں رہا۔ پھر گاڑی دھیرے دھیرے ریورس ہونے لگی۔ ایک فرلانگ کا فاصلہ گاڑی نے تقریباً چار منٹ میں طے کیا اور اس کھڈے کے کنارے پہنچ گئی جہاں نادیہ گری تھی۔ نادیہ اب وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ ذرا دور ایک پتھر پر بیٹھی تھی اور چہرہ گھٹنوں میں چھپائے رو رہی تھی۔ اس کی دونوں کہنیاں بُری طرح چھلی ہوئی تھیں۔ دائیں کان سے بہنے والا خون اس کے کندھے تک پہنچ رہا تھا۔

گاڑی کی آواز سننے کے باوجود اس نے چہرہ گھٹنوں میں چھپائے رکھا۔ رستم گاڑی سے اُتر کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ ''کیا چاہتی ہو تم؟''

نادیہ نے آنسوؤں سے تر بتر آنکھوں کے ساتھ رستم کو دیکھا پھر ایک دم اٹھ کر اس کی

ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ ''اپنی نوکرانی بنا کر مجھے اپنے ساتھ رکھ لو رستم! میں کچھ نہیں مانگوں گی تم سے..... کچھ نہیں کہوں گی۔'' اس نے اپنے گھٹنے پتھریلی زمین پر ٹیک رکھے تھے۔

اس کا ہیجان خیز جسم رستم کو اپنی بے پناہ موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ رستم نے اپنی ٹانگوں کو اس کی گرفت سے آزاد کرانا چاہا مگر وہ جونک کی طرف چمٹ گئی تھی۔

''اچھا ٹانگیں چھوڑو میری۔'' رستم نے ذرا نرم پڑتے ہوئے کہا۔

اس نے ٹانگیں چھوڑ دیں اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ رستم گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آئی۔ کچھ دیر تذبذب میں کھڑی رہی جیسے سوچ رہی ہو کہ آگے بیٹھے یا پیچھے۔ پھر رستم کا موڈ دیکھتے ہوئے وہ پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ رستم نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس کے سر پر چوٹ لگی تھی۔ وہاں سے بہنے والا خون ہی اس کے کان کو رنگین کر رہا تھا۔ وقتِ رخصت زوار نے ایک بڑا سفری تھیلا گاڑی میں رکھ دیا تھا۔ اس میں ضروری استعمال کی کئی چیزیں موجود تھیں۔ روئی اور کاٹن کی پٹی بھی تھی۔ رستم نے روئی اور کاٹن کی پٹی نادیہ کی طرف بڑھائیں۔ اس نے لرزاں ہاتھ سے یہ چیزیں پکڑ لیں اور خود ہی اپنے سر سے رستا ہوا خون روکنے میں مصروف ہو گئی۔ رستم نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ رستم کا ذہن مسلسل اس سوال میں اُلجھا ہوا تھا کہ نادیہ آپو کے گھر کے اندر سے کار کی ڈکی میں کیسے پہنچ گئی۔ پچھلے آٹھ دس ماہ میں اس نے اس لڑکی سے جتنی جان چھڑانا چاہی تھی، یہ اتنی ہی اس کے گلے پڑی تھی۔ اب وہ ایک ایسے مقام پر اس کے ساتھ تھی جہاں سے وہ اسے پیچھے دھکیل سکتا تھا اور نہ اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔

قریباً ڈھائی کلومیٹر مزید سفر کرنے کے بعد رستم ایک جگہ رک گیا۔ درحقیقت اس سے آگے گاڑی چلانا ممکن ہی نہیں تھا۔ ایک سُرخی مائل نیم پتھریلے ٹیلے کے دامن میں خودرو جھاڑیوں کا ایک جھنڈ تھا۔ رستم گاڑی کو اس جھنڈ کے نیچے لے گیا۔ انجن بند کر کے اس نے دروازے لاک کئے اور باہر نکل آیا۔ نادیہ بھی نکل آئی..... خستہ حالت میں بھی وہ تو بہ شکن نظر آتی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر گرد تھی مگر چال ڈھال وہی تھی جو کیمرے کے سامنے ہوتی تھی۔

یہ بالکل سنسان جگہ تھی۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی اونچے نیچے سُرخی مائل ٹیلے نظر آتے تھے۔ پتھوہار کی یہ وسیع و عریض سطح مرتفع اپنے سارے رنگوں، دلچسپ زاویوں اور انوکھے نشیب و فراز کے ساتھ اس کے سامنے تھی۔ کوئی ہوا کی آواز پر کان دھرتا تو وہ اس سے پانچ لاکھ سال پرانی تہذیب کی سرگوشیاں سن سکتا تھا۔

ایک کانٹے دار جھاڑی کے نیچے ایک خار پشت کا پنجر پڑا تھا۔ ایک نیولا اس پنجر کے اردگرد گھوم رہا تھا۔ نادیہ ڈر کر پتھروں سے ذرا دور ہٹ گئی۔ وہ ہٹی تو جنگلی گھاس کے اندر سے ایک اور نیولا نکل کر بڑی سرعت سے پتھروں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔

رستم نے جس مقام پر گاڑی کھڑی کی تھی وہ اس کے لئے نیا نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی زوار اور وہ دو چار مرتبہ یہاں آ چکے تھے۔ رستم نے گاڑی کی چابی گاڑی کی عقبی نمبر پلیٹ کے پیچھے گھسا دی۔ اگر زوار یا اس کا کوئی ساتھی گاڑی لینے یہاں پہنچتا تو یقیناً یہ بات ان کے علم میں ہونا تھی کہ چابی نمبر پلیٹ کے پیچھے موجود ہے۔ گاڑی چھوڑنے سے پہلے رستم نے اپنی انگلیوں کے نشان گاڑی کے اسٹیئرنگ اور ہینڈلوں وغیرہ سے صاف کر دیئے تھے۔

اس طرف سے تسلی ہونے کے بعد اس نے سفری بیگ کندھے سے لٹکایا اور دشوار گزار راستے پر سفر شروع کر دیا۔ نادیہ بلا توقف اس کے پیچھے چل دی۔ گاہے بگاہے جب اس کا پاؤں کہیں الٹا سیدھا پڑتا تو اس کی کراہ سی نکل جاتی۔ بہرحال وہ چلتی چلی گئی..... رستم بے حد خشک لہجے میں بولا۔ ”جو کچھ تم کر رہی ہو اچھا نہیں کر رہی۔ ذلیل ہو کر مرو گی۔“

”میں نے تمہیں بہت پہلے ہی کہہ دیا تھا رستم کہ تمہارا ساتھ ہو تو مجھے سب کچھ قبول ہے۔“

”تم فلمی عورت ہو۔ فلموں اور کہانیوں کی باتیں کرتی ہو۔ مرنا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا تم سمجھتی ہو اور ان جنگلوں میں، میں نے ایسی عورتیں دیکھی ہیں جو بلک بلک کر مرنے کی دعائیں مانگتی ہیں۔“

”میں سب کچھ جانتی ہوں۔“

”تم کچھ نہیں جانتی ہو۔ تمہیں پتا ہے اس علاقے میں کیسے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑ سکتا ہے اور نہ تمہیں پولیس کی بے رحمی کا کچھ اندازہ ہے۔ تمہاری جیسی لڑکی جب اس علاقے سے پولیس کے ہتھے چڑھتی ہے تو پھر اس کی بربادی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔“

”وقت پڑا تو سب کچھ جھیل لوں گی۔“

رستم چلتا جا رہا تھا۔ اس کے پاس رکنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جتنی جلدی، جتنا دور چلا جائے گا اتنا ہی پولیس سے محفوظ ہو گا۔ پوٹھوہار کی گہرائی اور اس گہرائی کے دور افتادہ نشیب و فراز اس کی سلامتی کے ضامن تھے۔ اسے رہ رہ کر نادیہ پر بے پناہ طیش آ رہا تھا۔ کسی وقت تو اس کا دل چاہتا کہ اپنی چادر کے نیچے سے ماؤزر نکالے اور اس کی ایک گولی سیدھی نادیہ کی پیشانی پر داغ دے لیکن پھر کسی وقت وہ مختلف انداز میں سوچنے لگتا۔ وہ

زبردستی آ رہی تھی اور اسے واپس بھیجنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور اس نے واپس جانا بھی نہیں تھا تو پھر کیا ہو سکتا تھا؟ بی بی نے ایک دفعہ کہا تھا۔ ”رستم میری بات مان لو۔ نادیہ تم پر ہزار جان سے فدا ہے۔ اپنی محبت کے خراج میں وہ تمہیں بہت کچھ دے سکتی ہے۔ جو کچھ وہ بے حد عاجزی سے دے رہی ہے، اسے قبول کر لو۔“

گزرے دنوں میں بی بی کے یہ فقرے ہزاروں مرتبہ اس کانوں میں گونجے تھے اور اب بھی گونج رہے تھے۔ اسے لگتا تھا کہ وہ بی بی کے حکم سے سرتابی کر کے ایک بہت بڑا گناہ کر رہا ہے۔ اب جب کہ وہ بی بی سے اور بی بی کی دنیا سے رخ موڑ کر ایک نئی جگہ پر جا رہا تھا اور شاید اس کے پاس زندگی کے دن بھی گنے چنے تھے تو کیا وہ بی بی کی خواہش پوری کر سکتا تھا۔ کیا اس فلم ایکٹرس کو بی بی کی خاطر اپنے ساتھ رکھ سکتا تھا؟ یہ بڑا کٹھن سوال تھا۔ بہت ہی کٹھن۔ اس سوال کا فی الحال کوئی جواب رستم کے پاس نہیں تھا۔

چمکتے سورج کے نیچے، سُرخی مائل ٹیلوں کے درمیان وہ چلتا جا رہا تھا..... اور نادیہ اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ وہ جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے فضا غیر مانوس ہوتی جا رہی تھی اور ماحول الگ تھلگ ہوتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ زمین و آسمان کے درمیان اونچی نیچی گھاٹیوں، ٹیلوں اور خودرو نباتات کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ وہ ایک کھوہ نما راستے میں سے گزر رہے تھے جب اچانک پاس ہی کہیں آہٹ سنائی دی۔ شاید کوئی جانور تھا۔ چادر کے اندر رستم کا ہاتھ ماؤزر کے دستے پر مضبوط ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد یہ آہٹ دوبارہ ہوئی۔ رستم کو اندازہ ہوا کہ یہ کوئی جانور نہیں ہے۔ اچانک دو افراد مخروطی ٹیلوں کے عقب سے یوں نمودار ہوئے جیسے زمین سے اُگ آئے ہیں۔ ان میں سے ایک شلوار قمیص اور دوسرا پتلون قمیص میں تھا۔ دونوں کے لباس خستہ اور چہرے گرد آلود تھے۔ وہ شکلوں سے ہی خطرناک نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ٹرپل نو رائفل تھی۔ گولیوں والی بیلٹ (بیلٹ اسٹریپ) اس کے کندھے پر تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں پیپسی کی نصف بھری ہوئی بوتل تھی۔ وہ دونوں رستم اور نادیہ کو دلچسپ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ”کون ہو بھئی اِدھر کہاں بھٹک رہے ہو؟“ رائفل والے نے چونکے ہوئے لہجے میں رستم سے پوچھا۔

”یہی بات میں تم سے پوچھوں تو؟“ رستم نے کہا۔

رائفل والے کی گرفت رائفل پر مضبوط ہو گئی۔ ”زیادہ ٹرٹر نہ کرو۔ سیدھی طرح بتاؤ کون ہو؟“ وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تم کون ہو؟''

''ہم پولیس کے بندے ہیں۔'' پیپسی والا بولا۔

اس کے ساتھ ہی رائفل والا ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس نے رائفل رستم کی طرف سیدھی کرلی۔ شاید اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ چادر کے نیچے رستم کے پاس اسلحہ موجود ہے۔ ''ہاتھ کھڑے کرو۔'' وہ گرجا۔ ''دونوں ہاتھ کھڑے کرو۔''

اس سے پہلے کہ صورتِ حال کوئی اور رخ اختیار کرتی، رستم کے دائیں پہلو سے ایک لحیم شحیم شخص برآمد ہوا۔ وہ خاکی شلوار قمیص میں تھا۔ اس نے دھیان سے رستم کو دیکھا پھر دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔ ''اوئے لالے دی جان! تم یہاں! پیدا کرنے والے دی قسم، مجھے تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔''

اس نے رستم سے علیحدہ ہوکر اسے پھر غور سے دیکھا اور ایک بار پھر لپٹ گیا۔ اس کے لپٹنے سے رستم کی کئی چونوں میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ تاہم اس نے خود پر ضبط کیا۔ تب نو وارد کی نگاہ ان دو افراد پر پڑی جو رستم کے سامنے تن کر کھڑے تھے۔ اس نے رائفل بردار کو جھڑکتے ہوئے کہا۔ ''اوئے دلاور! کُتے دے پُتر! یہ کیا کر رہے ہو۔ نیچے کرو اس بندوقی کو۔ جانتے نہیں یہ کون ہیں؟ یہی رستم ہیں..... رستم سیال.....''

ٹرپل ٹو رائفل والے نے دیدے پھاڑ کر رستم کی طرف دیکھا۔ دوسرے شخص کا بھی یہی حال تھا پھر وہ دونوں رستم کی طرف آئے۔ دونوں نے تقریباً ایک ساتھ ہاتھ ماتھے پر لے جاکر رستم کو سلام کیا جیسے وہ کوئی بڑا پولیس افسر ہو اور دو سنتری اسے سیلوٹ پیش کر رہے ہوں۔

رائفل بردار نے کہا۔ ''مم..... میں بڑا شرمندہ ہوں جی۔ مجھے پتا نہیں تھا مم..... میں نے.....''

''اوئے کیا بکری کی طرح مم..... مم..... مم..... کر رہا ہے۔ معافی مانگ سیال جی سے۔''

''نہیں، کوئی بات نہیں۔'' رستم بولا۔

''معاف کردیں جی! آپ تو پیر و مرشد ہیں۔ مائی باپ ہیں۔ ہم تو آپ کو دیکھے بغیر آپ کے شاگرد ہیں۔ تابعدار ہیں۔''

دوسرے شخص نے بھی لڑتے کانپتے لہجے میں معذرت پیش کی پھر دونوں سر جھکا کر ایک طرف کھڑے ہوگئے جیسے انہیں ڈر ہو کہ ان کی نظر رستم کی ساتھی لڑکی پر پڑ جائے گی اور یوں وہ معافی مانگنے کے فوراً بعد دوسرے جرم کے مرتکب ہو جائیں گے۔

لمبے تڑنگے شخص نے نادیہ کی طرف مؤدب نظروں سے دیکھ کر سلام کیا پھر وہ رستم کے

چہرے کی چوٹوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''لالے دی جان! تم تو چنگے بھلے زخمی ہو۔ لگتا ہے کہیں لمبا چوڑا ٹاکرا ہوا ہے۔''

''ایسے ہی سمجھ لو۔''

''کوئی اور تو نہیں ہے ساتھ؟''

''نہیں۔'' رستم نے جواب دیا۔

''چلو آؤ پھر اگلے ڈیرے پر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' لمبے تڑنگے شخص نے کہا اور رستم سے زبردستی اس کا سفری بیگ لے لیا۔

پانچوں آہستہ آہستہ تنگ پہاڑی گزرگاہ میں ایک ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ رائفل بردار اور اس کا ساتھی سب سے پیچھے تھے اور رستم کے پیچھے یوں چل رہے تھے جیسے دو غلام اپنے آقا کے پیچھے چل رہے ہوں۔ رستم نے لمبے تڑنگے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''گوہر ے! مجھے اس بات کی امید نہیں تھی۔''

''کس بات کی؟''

''یہی کہ تم سے یا تمہارے کسی ساتھی سے اتنی جلدی ملاقات ہوجائے گی۔ میرا اندازہ تھا کہ اگلے ڈیرے پر کوئی نہیں ہوگا اور ہمیں ابھی دس بارہ کلومیٹر اکیلے ہی چلنا پڑے گا۔''

''بس سمجھو کہ تمہاری قسمت اچھی تھی اور ہماری تم سے زیادہ اچھی تھی کہ یہاں ملاقات ہوگئی۔ بس ہم بھی کسی چکر میں یہاں آئے ہوئے تھے۔'' گوہر نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

''کیسا چکر؟''

''ابھی بتاتا ہوں لالے دی جان! ویسے تم دس پندرہ منٹ اور یہاں نہ آتے تو سمجھو ہم یہاں سے چل (جا) چکے تھے۔'' گوہر نے ایک پتھر پھلانگتے ہوئے کہا۔

نادیہ کو پھلانگنے میں دشواری ہوئی تو اس نے امداد طلب نظروں سے رستم کی طرف دیکھا۔ اگر اس کی تمنا تھی کہ رستم اس کی طرف ہاتھ بڑھائے گا تو یہ پوری نہیں ہوئی۔ اسے چھوتے ہوئے بھی رستم کو کراہیت محسوس ہوتی تھی۔ اس نے خود ہی جیسے تیسے وہ رکاوٹ پار کی۔ گوہر نے سرگوشی میں رستم سے پوچھا۔ ''یہ میڈم کون ہے؟ اس کی شکل کچھ جانی پہچانی لگ رہی ہے۔ یہ کہیں..... ٹی وی شی وی میں تو نہیں آتی؟''

''نہیں، فلموں میں کام کرتی ہے۔'' رستم کے لہجے میں بے زاری تھی۔

گوہر کے ہونٹ سکڑ گئے۔ وہ اپنے موٹے دیدے گھما کر بولا۔ ''اوہو، ان کا نام تو شاید نادیہ ہے۔ بڑی مشہور ہیں یہ..... لیکن لالے دی جان! یہ تیرے ساتھ کیسے؟''

''بس ہے یہ بھی کوئی مسئلہ۔''

''بڑا خوبصورت مسئلہ ہے۔'' گوہر نے بے ساختہ کہا پھر ذرا گھبرا کر رستم کی طرف دیکھا جیسے یہ جاننا چاہتا ہو کہ رستم نے بُرا تو نہیں منایا۔

قریباً ایک فرلانگ مزید چلنے کے بعد وہ سُرخ ٹیلوں میں گھری ہوئی ایک ناہموار جگہ پہ پہنچے۔ ایک طرف بارش کے پانی کا قدرتی تالاب تھا۔ تالاب کے کنارے تین برقع پوش عورتیں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے گول ٹوپی والے دیسی برقعے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے قریب ہی تین آدمی اور دو خچر تھے۔ آدمی اور خچر حلیے کے لحاظ سے مقامی آدمی نظر آتے تھے۔ خچروں پر لکڑیاں اور المونیم کے برتن وغیرہ لدے تھے۔

''یہ کیا ہے بھئی؟'' رستم نے اس مختصر سے قافلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''دل پشوری۔'' گوہر نے مختصراً جواب دیا۔

رستم جانتا تھا، گوہر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ چھوٹا سا قافلہ نہیں تھا، چھوٹا سا طائفہ تھا۔ اس قسم کے طائفے پہلے بھی کئی باران پہاڑیوں میں آچکے تھے اور انہوں نے آتے ہی رہنا تھا۔ مرد کی تماش بین نگاہ اور عورت کے تھرکتے جسم کا رشتہ نہ جانے کب سے قائم ہے اور کب تک قائم رہنا ہے۔ رستم جانتا تھا۔ ان دیسی برقعوں میں تین عورتیں نہیں، تین تڑپتی پھڑکتی رقاصائیں ہوں گی۔ ان کے ساتھ ان کے تین مرد نہیں تھے۔ تین سازندے تھے۔ خچروں پر سامان کے نیچے طبلے، سارنگی اور ہارمونیم وغیرہ ہوں گے۔ عین ممکن تھا کہ پاکستانی یا انڈین شراب کی چار چھ بوتلیں بھی ان خچروں کے بوجھ میں شامل ہوں۔ پولیس کے مخبروں کی مٹھی گرم کرنے کا حوصلہ ہو تو ایسے قافلے ان پہاڑیوں میں تو کیا کسی بھی جگہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

''یہ رنگ بازی کس سلسلے میں ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''یہ تو تمہیں وڈے ڈیرے پر جا کر بتاؤں گا۔'' وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔

وڈا ڈیرا یا ڈیرہ جس جگہ کو کہا جاتا وہ پوٹھوہار کی مزید گہرائی میں واقع ہے۔ اگلے ڈیرے سے اس کا فاصلہ کم وبیش ڈھائی دن کی مسافت پر تھا۔ رستم خاموش رہا۔ گوہر کا خیال تھا کہ رستم زیادہ اصرار کرے گا تو وہ بتا دے گا۔ رستم کی خاموشی پر وہ بھی خاموش ہو گیا۔

''یہ ناچیاں یہاں کیسے پہنچی ہیں؟'' رستم نے پوچھا۔

''جس طرح پہلے پہنچا کرتی ہیں۔ تراب دادا خود چھوڑ کر گیا ہے۔ بیس ہزار ایڈوانس لیا ہے، باقی کا ساٹھ ہزار اور لڑکیاں چار دن بعد ''رتو موڑ'' سے آ کر لے جائے گا۔''

''اس نے تو ایک بار کہا تھا اب ناچیاں لے کر آؤں تو اپنی بہنوں کو لے کر آؤں۔''

''دیکھ لالے دی جان! اب پھر لے کر آ جاتا ہے۔ منہ بھر کر سؤر کھانے کو ملتا ہے نا اور یہی حال ان ناچیوں کا ہے۔ سارے خطروں کا پتا ہے ان کو پھر بھی آ جاتی ہیں۔ جتنا دس راتوں میں پسینہ بہانے کے بعد کماتی ہیں اتنا ایک رات میں مل جاتا ہے اور پھر تحفے تحائف بھی ہوتے ہیں۔'' گوہر نے ایک بار پھر آنکھ دبائی۔

نادیہ ایک جانب پتھر پر بیٹھ گئی۔ رستم دیکھ رہا تھا یہاں موجود تقریباً ہر مرد و زن نادیہ کو کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ یقیناً ایک ایکٹریس کی حیثیت سے وہ اسے پہچانتے تھے یا پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ برقع پوش ناچیاں بھی آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ انہوں نے اب اپنے برقعے چہروں سے ہٹا لئے تھے۔ ان میں سے ایک جو دبلی پتلی تھی بالکل نوخیز معلوم ہوتی تھی۔ باقی دونوں کی عمریں بیس چوبیس سال کے درمیان نظر آتی تھیں......

رستم نے پوچھا۔ ''ناچیاں اور ان کے سازندے یہاں کیوں کھڑے ہیں؟''

گوہر بولا۔ ''ہم اگلے ڈیرے کی طرف جا رہے تھے۔ ناچیاں ناچ بھی ساتھ تھے۔ دلاور اور کاٹھیا کو شبہ ہوا کہ کوئی آسے پاسے موجود ہے۔ ہم سارے یہاں ٹھہر گئے اور یہ دونوں تمہاری طرف جل گئے۔ (چلے گئے) تھوڑی دیر بعد میں بھی ان کے پیچھے گیا۔ وہاں جا کر جو کچھ دیکھا وہ تمہیں معلوم ہی ہے۔''

کچھ دیر بعد ایک مرتبہ پھر دشوار گزار راستے پر سفر شروع ہوا۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ اترائی چڑھائی کے سبب گرمی محسوس ہونے لگی۔ رقاصاؤں نے اپنے برقعے اُتار کر کندھوں پر ڈال لئے۔ وہ نادیہ کے ساتھ ساتھ رستم کو بھی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ شاید دلاور وغیرہ نے انہیں بتا دیا تھا کہ رستم کون ہے۔

گوہرے نے اپنے ساتھ ساتھ چلنے والی طوائف سے کہا۔ ''چاندی! کوئی گانا شانا ہی سنا دے ہمیں۔ سفر آسانی سے کٹ جائے گا۔''

وہ بولی۔ ''آپ لوگ گانا سنتے کب ہو۔ آپ تو گانا دیکھتے ہو۔''

''پر تیرے پنڈے کے ساتھ ساتھ تیری آواز بھی بڑی میٹھی ہے، چاندی بائی۔ آواز اچھی ہو تو پھر گانا سنا بھی جا سکتا ہے۔''

''چڑھائی چڑھ چڑھ کے سانس تو چڑھا ہوا ہے۔ آواز کیا نکلے گی گوہرا جی۔''

رستم کو دیکھ کر بولی۔ ''ان کو تو دیکھ کر میری آواز ویسے ہی بند ہونے لگی ہے۔''

''پہلے جانتی ہو انہیں؟''

''کافی پرانی بات ہے۔ ایک دفعہ کوئی سندھی سائیں ڈیرے پر مہمان آیا تھا۔ میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ مجرے کے لئے گئی تھی۔ وہاں دیکھا تھا ان کو پھر تو یہ بہت دن نظر ہی نہیں آئے۔''

''اب آیا کریں گے نظر...... تُو بے فکر رہ۔'' گوہرے نے معنی خیز لہجے میں کہا پھر وہ چونک کر بولا۔ ''اوئے تُو بڑی پھاپھا کٹنی ہے۔ مجھے باتوں میں لگا کر اصل بات بھلا رہی ہے، چل چلتے چلتے کوئی اچھا سا گانا سنا دے۔''

''وہی بارش والا استاد جی۔'' عقب سے دلاور نے ہولے سے لقمہ دیا۔

''چل وہی سنا دے۔ دیکھ رستم سیال صاحب خود یہاں موجود ہیں تیرا گانا سننے کے لئے۔''

''یہ تو بہت بڑے لوگ ہیں جی۔ ہماری حقیقت ہی کیا ہے ان کے سامنے اور رستم صاحب کے ساتھ جو میڈم ہیں یہ بھی بڑے اونچے درجے کی فنکارہ ہیں۔ ایک دنیا مانتی ہے ان کو۔ ان کے سامنے گاؤں گی تو یہ چھتر ماریں گے مجھے۔''

نادیہ کافی پیچھے آ رہی تھی۔ اس لئے یہ باتیں اس کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ گوہرا بولا۔ ''ہم چھتر نہیں پڑنے دیں گے تجھے۔ چل گا شاباش!''

رستم نے بے زاری سے کہا۔ ''یار! کیوں مجبور کر رہے ہو اسے۔ کہیں جا کر بیٹھنے تو دو۔''

گوہرا مسکرایا۔ ''لالے دی جان! میٹر چل رہا ہے ان تینوں ٹیکسیوں کا۔ چلو ان پر سفر نہیں کرتے لیکن ان میں بیٹھ کر ٹیپ شیپ تو چلا سکتے ہیں نا؟''

رستم نے ایک بار پھر بے زاری سے سر ہلایا۔ گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ راستہ دشوار تھا لیکن وہ کہیں رک کر سانس بھی نہیں لے سکتے تھے۔ تمازت کی وجہ سے رقاصاؤں کے رخسار تمتما رہے تھے۔ سازندوں میں ایک نوجوان لڑکا تھا۔ وہ بھی خاصا تھکا ہوا نظر آتا تھا۔ نادیہ کی حالت بھی پتلی تھی لیکن وہ اُف کئے بغیر ٹیڑھے میڑھے راستے پر چلتی چلی جا رہی تھی۔ سطح مرتفع کی خودرو جھاڑیاں جگہ جگہ راستہ روک لیتی تھیں۔ ایک جگہ انہیں جنگلی سور کی مختصر جھلک نظر آئی پھر ایک جگہ میلا کچیلا سا خرگوش بڑی پھرتی سے بھاگتا ہوا ان کے سامنے سے گزر گیا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہے تھے مخروطی ٹیلوں کی بلندی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ قریباً پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد اچانک دھوپ غائب ہوئی اور بادل چھا گئے۔ ایک سرنگ نما راستے سے گزر کر جب وہ ایک چھوٹی سی پیالہ نما جگہ پر پہنچے تو دن میں ہی گہرا اندھیرا محسوس ہونے لگا۔ یہی جگہ

''اگلا ڈیرہ'' کہلاتی تھی۔ سنگریزوں سے اَٹی ہوئی ایک پہاڑی کے اندر ایک قدرتی ہال سا بن گیا تھا کچھ عرصہ پہلے تک وادی سون میں پناہ لینے والے اشتہاری ڈاکو اور قاتل اس جگہ کو ایک بہت محفوظ ٹھکانہ تصور کرتے تھے۔ یہاں بارش کے پانی کا ایک قدرتی تالاب بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ یہاں سے اردگرد کے علاقے پر دور تک نظر رکھی جا سکتی تھی مگر پھر آہستہ آہستہ یہ جگہ پہلے کی طرح محفوظ نہ رہی۔ یہاں دو تین پولیس مقابلے بھی ہوئے۔ اس کے بعد یہاں پناہ لینے والے ''پناہ گزین'' اس جگہ کو چھوڑ گئے اور پوٹھوہار کی پُراسرار گہرائیوں میں کچھ اور آگے نکل گئے۔

کم و بیش تین دن کی مسافت پر یہ دوسری جگہ رتو ڈیرہ یا صرف ڈیرہ کہلاتی تھی۔ متروکہ ڈیرے کو اگلا ڈیرہ کہا جاتا ہے۔ (یہ رتو ڈیرے سے ''آباد دنیا'' کی طرف آتے ہوئے اگلا ڈیرہ تھا) بہرحال ابھی یہ ڈیرہ پوری طرح ویران نہیں ہوا تھا۔ گاہے بگاہے ''پناہ گزین'' اسے آباد کرتے رہتے تھے۔ جیسے یہ آج آباد ہوا تھا۔ رستم نے طائرانہ نظروں سے ڈیرے کے اندرونی منظر کا جائزہ لیا۔ اس ہال نما غار کی دیواریں نیم گول سنگریزوں سے اَٹی ہوئی تھیں۔ انہیں پنجابی میں ''گی ٹے'' کہا جاتا ہے...... دیواروں کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ برسوں تک یہاں لوگ قیام کرتے رہے ہیں۔ آگ جلائے جانے کی وجہ سے چھت سیاہ تھی اور خورد و نوش کی نشانیاں چکنائی کے دھبوں کی صورت میں یہاں موجود تھیں۔ دیواروں پر معاشرے سے بھاگے ہوئے دل جلوں نے مختلف اشعار اور عبارتیں لکھ رکھی تھیں۔ مارکر وغیرہ سے بے ڈھنگی تصویریں بھی بنی ہوئی تھیں اور گمنام فون نمبر وغیرہ لکھے گئے تھے۔ یہ سب کچھ لکھنے والے نہ جانے اب کہاں تھے۔ پولیس مقابلوں میں مر چکے تھے؟ پھانسی پا چکے تھے؟ جیلوں میں سڑ رہے تھے؟ یا پھر رستم، گوہرا اور دلاور وغیرہ کی طرح [illegible] حال [illegible] اور زندگی کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

رستم ایک مدت بعد اس جگہ آیا تھا پھر بھی اسے ہر چیز مانوس لگ رہی تھی، دہانے پر گولیوں کے نشان، تالاب کے کنارے دو گمنام ڈاکوؤں کی قبریں۔ بارش کے پانی کا بیضوی تالاب اور وہ برجی نما بھربھری چٹان جہاں سے تاوان کے لئے اغوا کر کے لائی جانے والی ایک گوجری نے کود کر خودکشی کی تھی۔ اس چٹان کے ساتھ ہی ایک دوسرا ٹیلہ بھی رستم کو کچھ یاد آ رہا تھا۔ اس ٹیلے کو اردگرد نگاہ رکھنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ جن دنوں زوار اور رستم یہاں آیا کرتے تھے اور نادر کاکا نامی ڈکیت یہاں کا کرتا دھرتا تھا، ایک نگران ہمہ وقت ایک فوجی دوربین لے کر اس ٹیلے پر بیٹھا رہتا تھا...... پوٹھوہار کی چھوٹی چھوٹی سیاہ ابابیلیں اس

کے سر پر چکرایا کرتی تھیں۔

''کس سوچ میں کھو گئے لالے دی جان! دیکھو موسم کتنا رنگ دار ہو رہا ہے کچھ کھاؤ پیو۔''

''نہیں گوہرے! اس وقت دل کچھ نہیں کر رہا۔''

''میڈم صاحبہ سے پوچھ لو۔'' گوہرے نے کہا۔

رستم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی نادیہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس دوران ہی اچانک زور سے بادل گرجا اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ یوں لگا جیسے نیم تاریکی میں آسمان سے زمین تک پانی کی چادر سی تن گئی ہے۔ بارش کی آواز کا انسان کے مزاج سے پُراسرار تعلق ہوتا ہے۔ جوں جوں پانی کی لے تیز ہوتی ہے، دلوں کے اندر رقص کی سی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ بارش کے ہنگامے نے زور پکڑا تو گوہرے اور اس کے ساتھیوں کی ترنگ میں بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ موج مستی کرنا چاہ رہے تھے مگر رستم کی موجودگی انہیں مؤدب رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔

بالآخر گوہرے نے اپنے ساتھیوں کی سفارش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''لالے دی جان! اپنا موڈ ذرا ٹھیک کر لے۔ تیری صورت دیکھ کر میرے بندوں کا خون خشک ہو رہا ہے۔''

''میں نے کسی کو منع نہیں کیا ہے۔ جو جی چاہے کرو۔'' رستم گھمبیر لہجے میں بولا۔

''جو جی چاہے..... میں تو بہت کچھ آجاتا ہے لالے دی جان۔ فی الحال تو یہ لوگ پیاسے ہو رہے ہیں۔ ذرا ہونٹ تر کرنا چاہتے ہوں گے۔''

''تو کر لو ہونٹ تر۔'' رستم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اس صریح بات نہیں بنے گی۔ تیری بڑی دہشت ہے ان لوگوں پر۔ تُو تھوڑی سی نرمی دکھائے گا تو پھر ان کی جان میں بھی جان آجائے گی۔''

''کیا کروں میں؟''

گوہرا تھوڑی دیر تک تجربہ کار نظروں سے رستم کو دیکھتا رہا پھر اپنے چھ ساتھیوں میں سے ایک سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''او کاٹھیا! جا خچر پر سے اُتار کر لا ایک لال پری.....''

کاٹھیا کے کالے چہرے پر رونق آگئی۔ ''اچھا گوہرا جی۔''

اس نے ساتھیوں کو سنانے کے لئے زور سے کہا اور تیزی سے خچروں کی طرف گیا۔ بڑی شتابی سے اس نے ایک خچر پر سے کچھ سامان نیچے اُتارا اور نیچے سے انڈین شراب کی

ایک بوتل لے کر بھاگم بھاگ گوہرا کے پاس آگیا۔ کاٹھیا کی ایک آنکھ کانی فوکس گوجرانوالہ پولیس کی بے رحمانہ مار پیٹ کی وجہ سے خراب ہو چکا تھا۔

گوہرا نے بوتل کی سیل توڑی اور دو گلاسوں میں تھوڑی تھوڑی شراب ڈال کر اس میں پانی ملا دیا۔ پھر ایک گلاس رستم کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے بارش پر ایک نظر ڈالی اور آنکھیں بند کر کے بولا۔ ''چل لالے دی جان! ایک اس ''گھر والی'' کے نام جو ہم جیسے ڈاکوؤں کی زندگی میں کبھی بھی نہیں آتی..... کبھی نہیں۔''

اس نے گلاس زبردستی رستم کے ہاتھ میں تھما دیا۔ آج بہت عرصے بعد رستم نے گلاس تھاما تھا۔ جب سے بی بی اس کی زندگی میں آئی تھی اس بدبودار شے سے کراہیت محسوس ہونے لگی تھی اور اس جیسی بہت سی دوسری اشیاء بھی اس کی زندگی سے نکل گئی تھیں لیکن اب..... اب پتا نہیں دل کے موسم میں کیسی تبدیلیاں آئی تھیں، کیسے طوفانی جھکڑ چلے تھے۔ جسم اور روح میں سب کچھ تہہ و بالا ہو گیا تھا کسی وقت تو اسے یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے کچھ بدلا ہی نہیں تھا۔ وہ سب جاگتی آنکھوں کا خواب تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے ٹوٹ گیا ہے۔

وہ کتنی ہی دیر تک شدید کشمکش میں رہا۔ آنسوؤں کا ایک آبشار سا اس کے حلق کے اندر گرتا رہا۔ بی بی کے لئے کیا کچھ چھوڑا تھا اور یہ سب کچھ چھوڑ کر دل میں کیسی کیسی آسیں پالی تھیں۔ اسے لگا جیسے بی بی اسے دیکھ رہی ہے۔ بھیگی آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی ہے۔ ''تم نے تو ایک رات چناب کے کنارے بڑا اونچا دعویٰ کیا تھا۔ اتنی جلدی ہار گئے؟ بس اتنی ہی ہمت تھی؟''

''ہاں بی بی جی! اتنی ہی ہمت تھی۔ اپنے لئے سو بار بھی موت قبول ہے۔ آپ کے پاؤں میں کانٹے کی چبھن بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ بس اتنی ہی ہمت تھی۔'' اس نے تصور میں جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی بدبودار سیال اس کے ہونٹوں سے لگا اور حلق سے نیچے اُترتا چلا گیا۔

''اوئے خوش کر دیا لالے دی جان۔'' گوہرے نے نعرہ لگایا اور ایک ہی سانس میں سارا پیگ چڑھا گیا۔

رستم نے دیوار سے ٹیک لگا کر خود کو نیم دراز کیا اور اپنی چادر سر تک تان لی۔ اس کے یوں ''اوجھل'' ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد محفل رنگ پر آگئی۔ بارش بھی شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ابھی سورج ڈوبنے میں بہت دیر تھی مگر اندھیرا چھایا محسوس ہوتا تھا۔ گوہرے نے اوپر تلے کئی جام چڑھائے اور ترنگ میں آگیا۔ اس کے ساتھیوں میں سے دو تین مستی میں

آ گئے اور اٹھ کر رقص کرنے لگے۔ خاص طور سے دلاور بڑے موڈ میں تھا۔ اس نے ہانک لگائی۔ ''استاد جی! وہی بارش والا۔'' استاد جی یعنی گوہرے کو بھی یہ تجویز پسند آئی۔ وہ جھومتے ہوئے اٹھا اور رقاصہ چاندی کو پکار کر کہنے لگا۔ ''اوئے لالے دی جان چاندی! دیکھ لے موسم بھی تیرے گانے جیسا ہوگیا ہے، اب تُو ذرا ناچ کے دکھا ہی دے۔''

''ہاں ہاں۔ اب تو دکھا ہی دے۔'' دو تین آوازوں نے گوہرے کا ساتھ دیا۔

دلاور دوڑ کر گیا اور دوسرے خچر کے سامان کو الٹ پلٹ کر کے اس میں سے ہارمونیم نکال لیا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے افراد بھی ساز وغیرہ نکال لائے۔ اسی دوران میں گوہرے نے چاندی کو قائل کرلیا کہ وہ بارش کا گانا، بارش میں ہی گائے گی۔

تھوڑی ہی دیر بعد جنگل میں منگل کا سماں نظر آنے لگا۔ بادل گرج رہے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی، چھوٹے چھوٹے تیز رفتار نالوں کا شور تھا۔ بارش کی بوچھاڑ کے اندر چاندی بارش کا گانا گا رہی تھی۔ پھر دلاور مست ہوکر کھوہ میں سے نکل آیا اور چاندی کے ساتھ ساتھ رقص کرنے لگا۔ باقی سب کھوہ کے اندر تھے اور تالیاں بجا رہے تھے۔ آوازے کس رہے تھے۔ عجیب افسانوی سا منظر تھا۔

''آجاؤ۔ تم سب بھی آجاؤ۔'' دلاور نے ہانک لگائی۔

اس کے دو تین اور ساتھی بھی اس جشنِ برسات میں شریک ہوگئے۔ طبلے کی تھاپ پر تھرکنے لگے، مچلنے لگے۔ کسی نے الاؤ جلا دیا۔ کوئی مارخور کے گوشت کے خشک ٹکڑے لے آیا اور چبانے لگا۔ شراب کام دکھا رہی تھی۔ ہنگامہ بڑھ رہا تھا پھر یوں ہوا کہ گوہرا خود بھی باہر نکل گیا اور ساتھیوں کے ساتھ موسلا دھار بارش میں بھیگنے اور ناچنے لگا۔ وہ سب سے لمبا تڑنگا تھا اور ناچتے ہوئے دیو کی طرح لگتا تھا۔ کسی نے ٹپے کی طرز پر تان لگائی۔

نی توں کنیں کانٹے پائے ہوئے نے
ساڈے نالوں بُن چنگے جیہڑے سینے نال لائے ہوئے نے

اب تین سازندوں کے علاوہ صرف رستم اور نادیہ ہی کھوہ کے اندر رہ گئے تھے۔ رستم نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ شاید نادیہ پر بھی یہ سہانا موسم اور مستی بھرا ماحول تھوڑا بہت اثر انداز ہو رہا تھا۔ وہ دلچسپی سے ناچتے گاتے مرد وزن کو دیکھ رہی تھی۔ پوٹھوہار کے ویران نشیب وفراز کا یہ نیا منظر نامہ اس کے لئے بھی انوکھا تھا۔ گوہرے نے نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میڈم جی! آپ بھی آجائیں۔ ذرا بھیگ کر دیکھیں۔ مزہ نہ آئے تو پیسے واپس۔''

پھر شاید گوہرے نے ہی چاندی کو اشارہ کیا تھا۔ وہ ناچتی ناچتی آئی اور بڑی ادا سے

نادیہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اسے بھی اپنے ساتھ آنے اور ناچنے کی دعوت دے رہی تھی۔

نادیہ انکار کرتی رہی مگر چاندی اور دیگر افراد کا مستی بھرا اصرار بڑھتا رہا۔ آخر وہ رستم کی طرف ترچھی نظر سے دیکھ کر بولی۔ ''پتا نہیں، میرا ناچنا بادشاہ سلامت کو اچھا لگے یا نہیں۔''

''کون بادشاہ سلامت؟'' چاندی نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہاں پاس ہی تو بیٹھا ہے۔'' نادیہ نے کہا۔

چاندی نے نادیہ کی نگاہوں کا رخ دیکھ کر جان لیا کہ وہ کسے بادشاہ کہہ رہی ہے، مسکراتے ہوئے بولی۔ ''وہ بادشاہ ہیں تو پھر آپ ملکہ ہوئیں۔ اتنے پیارے موسم میں آپ اپنی مرضی چلا سکتی ہیں۔''

''میں ملکہ نہیں کنیز ہوں۔'' وہ رستم کو سنانے کے لئے قدرے بلند آواز میں بولی۔ رستم بے حرکت بیٹھا رہا۔ ناچنے گانے والی ٹولی کا اصرار اور جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ گوہرے کے اشارے پر چاندی نے جیسے کھینچ کر نادیہ کو اٹھا لیا۔

نادیہ کچھ دیر تو پس وپیش سے کام لیتی رہی، اپنے سر کی چوٹ کا بہانہ بناتی رہی پھر چاندی کے ساتھ محوِ رقص ہوگئی۔ نادیہ کے پاؤں حرکت میں آئے تو مست ٹولی کا جوش وخروش اور بڑھ گیا۔ سازوں نے آہنگ بدلا۔ طبلے پر زوردار تھاپ پڑنے لگی۔ ہارمونیم کومل سُروں سے اونچے سُروں پر آگیا۔ ''ہائے ہائے یہ مجبوری، یہ موسم اور یہ دوری۔ تیری دو ٹکیاں دی نوکری میں میرا لاکھوں کا ساون جائے۔''

گوہرا، دلاور، کاٹھیا اور دیگر افراد ناچنے کے دوران میں شراب خانہ خراب کے گھونٹ بھی بھر رہے تھے۔

رستم کی نگاہ نادیہ پر پڑی۔ اس کا جسم عام موسم میں بھی قیامت تھا۔ آج تو آسمان سے چھاجوں پانی برس رہا تھا اور بجلی جیسے کڑک کڑک کر ٹیلوں کی سیاہی مائل چوٹیوں کو چُھونا چاہتی تھی۔ وہ دھیمے انداز میں لیکن پیشہ وارانہ مہارت کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ اس کے رقص کے سامنے دیگر رقاصاؤں کا رقص ماند پڑ گیا تھا پھر وہ ناچتے ناچتے کھوہ کے اندر آگئی۔ بڑے والہانہ انداز میں رستم کے اردگرد ناچنے لگی۔ جیسے وہ رستم کو شمع اور خود کو پروانہ سمجھ رہی ہو۔ اس کے توبہ شکن جسم میں ایک خاموش اور مؤدب دعوت تھی۔ اس کے بالوں سے اُڑنے والے چھینٹے رستم کی چادر پر گر رہے تھے۔

اس دوران میں بدمست گوہرے نے چاندی کو اپنی بانہوں میں اٹھا لیا اور اسے اٹھائے

اٹھائے رقص کرنے لگا۔ شراب، موسم اور شباب کے ساتھ مل کر سہ آتشہ ہوگئی تھی اور اس کی آگ جسموں میں پھیلتی جارہی تھی۔ گوہرا چاندی کو اٹھائے اٹھائے کھوہ کے اندر آیا اور اسے تاریک ترین گوشے میں لے گیا لیکن یہ تاریک ترین گوشہ بھی اتنا تاریک ہرگز نہیں تھا کہ انہیں دوسروں کی نگاہوں سے چھپا سکتا۔

گوہرے کے ارادے واضح ہونے لگے تو نادیہ نے رقص روک دیا۔ دیگر رقاصائیں اور سازندے بھی بے چین نظر آنے لگے۔ رستم یہ ساری صورتِ حال ناخوشگوار احساس کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور گوہرے کو آواز دے کر بولا۔ ''میری بات سنو گوہرے۔'' رستم کی دوسری آواز گوہرے کے کانوں تک پہنچ پائی۔ اس نے چاندی کو گود سے اُتارا اور رستم کی طرف پلٹا۔

''کیا بات ہے لالے دی جان.....'' اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔'' رستم نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''اوئے میرے جگر دے ٹکڑے۔ یہ ٹیکسی ہے اس کا میٹر.....''

''یہ عورت ہے۔'' رستم نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''اور جو دوسرے یہاں نظر آرہے ہیں۔ وہ بھی ٹیکسیاں اور رکشے نہیں ہیں، بندے ہیں۔''

''تو پھر کیا کروں میرے جگر۔'' اس نے شرابیوں کی طرح ہاتھ نچایا۔

''یہ رنگ رلیاں کسی اور وقت کے لئے چھوڑو..... یہ موقع ٹھیک نہیں ہے۔''

گوہرے کے ماتھے پر ناگواری کی شکن نظر آئی لیکن پھر وہ سنبھل گیا۔ ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''اوئے لالے دی جان! تیرے لئے تو ہم دنیا چھوڑ سکتے ہیں، تُو رنگ رلیوں کی بات کررہا ہے.....'' پھر وہ زور سے آواز دے کر بولا۔ ''اور نگ رلی! آجاواپس۔ آجا شاباش۔''

چاندی اپنا لباس درست کرتی ہوئی واپس سازندوں کے پاس جابیٹھی۔ وہ خود بھی ہلکے سے نشے میں تھی یا پھر شاید موسم ہی کا خمار تھا۔ گوہرا اپنے ہونٹ رستم کے کان کے قریب کرتے ہوئے بولا۔ ''ویسے ایک بات بتاؤ جگر! زندگی جو ہے ناں شہد کے چھتے کی طرح ہے۔ مکھیوں کو دائیں بائیں کرکے جتنا شہد نچوڑا جاسکے، نچوڑ لینا چاہئے اور پھر ہم کون سے زندہ لوگ ہیں۔ نادر کاکا کہا کرتے تھا، ہم تو ان مرغیوں کی طرح ہیں جن کی گردن قانون کی چھری نے کاٹ کر علیحدہ کردی ہو پر وہ پھر بھی اِدھر اُدھر پھدکتے پھر رہی ہوں۔ کتنی دیر پھدک لیں گے۔ دو تین ہفتے، دو تین مہینے یا پھر ایک دو سال۔ آخر تو شاں شاں کرتی گولیاں ہوتی ہیں یا پھانسی کا رسہ۔''

''لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تُو جہاں چاہے ننگا ہوکر ناچنے لگے۔''

گوہرے نے ایک بہکا ہوا قہقہہ لگایا اور چھوٹی بوتل سے ایک بڑا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ ''تجھ سے ایک پتے کی بات کہوں لالے دی جان۔''

رستم سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ''اگر تیرے دل میں کوئی عشق وشق کی بات اب بھی ہے ناں تو اسے خلاص کردے۔ بالکل خلاص۔''

''کیا مطلب؟'' رستم کی تیوری چڑھ گئی۔

''میں کافی کچھ جانتا ہوں لالے دی جان! باہر کی ساری خبریں ہم سے اوجھل تو نہیں ہوتی ناں۔ میرے پاس تو ایک دو اخبار بھی پڑے ہیں جن میں تیرا اور تیری معشوق کا ذکر ہے۔''

''گوہرے، میں فضول باتیں سننا نہیں چاہتا۔'' رستم کے لہجے میں ایک مدھم دہاڑ تھی۔ گوہرا اس کے لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''وہ چھوٹی ناچی دیکھر ہے ہو ناں جو بال نچوڑ رہی ہے۔ اس کا نام شبانہ ہے گجرات کی ہے۔ وہی سوہنی مہینوال والا پنڈ۔ دو سال پہلے اس کو بھی کسی مہینوال سے عشق ہوگیا تھا بلکہ یوں کہو کہ عشق چڑھ گیا تھا۔ بس وہی ہوا جو ہوتا ہے۔ اس پر شرافت کا بھوت سوار ہوگیا۔ کہنے لگی گھر بساؤں گی، میرا میاں کلرکی کرے گا۔ میں اس کے لئے آلو مٹر پکاؤں گی اور اس کے بچوں کو دودھ پلاؤں گی، یوں قیمیں اونچی کرکے۔'' گوہرے نے باقاعدہ اپنی قمیص اونچی کرکے اسٹائل بنانے کی کوشش کی۔

پھر نشے میں سر جھٹک کے بولا۔ ''لیکن کیا ہوا۔ وہی جو پہلے پاکستان اور انڈیا کی سات آٹھ سو فلموں میں ہوچکا ہے۔ ماں اور نانی کے بہت منع کرنے کے باوجود بھی اس نے شادی رچائی اور کنجر خانے سے چلی گئی۔ طوائف کنجر خانے کو چھوڑتی ہے لیکن کنجر خانہ تو اسے نہیں چھوڑتا ناں۔ یہ بس ایک سال ہی شریفوں میں رہی پھر شوہر کی طرف سے مار پیٹ کا سلسلہ شروع ہوا..... مار اسے ہی نہیں پڑتی تھی، اس بچے کو بھی پڑتی تھی جو ابھی پیٹ میں تھا۔ پچھلی چھوٹی عید کو بچہ ضائع کرا کے اور چہرے پر بہت سے نیل لے کر اپنے کنجر خانے میں واپس آگئی۔ اب یہ پھر یہاں مجل ہورہی ہے۔ پیسے کی خاطر ناچے گی، سب کچھ کرے گی.....''

''تم یہ سب کچھ مجھے کیوں سنا رہے ہو؟'' رستم نے کڑے لہجے میں کہا۔

''اس لئے جگر! کہ ہماری اور ان طوائفوں کی کہانی ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔ ہمیں بھی کوئی ''بی بی'' مل جاتی ہے۔ اس کے چکر میں آکر ہم سب کچھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اپنے سگی

ساتھیوں کو ''رب راکھا'' کہہ دیتے ہیں۔ ایک نئی زندگی شروع کرنے کی قسمیں وعدے کر لیتے ہیں لیکن بیمیاں تو پھر بیمیاں ہوتی ہیں جگر..... وہ زیادہ دیر تک ڈاکوؤں کے ساتھ نہیں چل سکتیں۔ وہ کنارہ کر لیتی ہیں، دھتکار دیتی ہیں، یا پھر مروا دیتی ہیں۔ شرافت آباد میں جس طرح طوائفوں کے لئے جگہ نہیں ہوتی اسی طرح ڈاکوؤں کے لئے بھی نہیں ہوتی۔ دونوں کو اپنے اپنے کنجر خانے میں واپس آنا پڑتا ہے۔''

رستم ساکت تھا۔ اس کی آنکھوں میں انگارے سے دہک اٹھے تھے۔ گوہرا رستم کی کیفیت سے بے خبر اپنی ترنگ میں بولتا چلا گیا۔ ''ہاں، یہ بیمیاں ایسی ہی ہوتی ہیں اور تیری ''بی بی'' تو کچھ زیادہ ہی شرافت کی ماری ہوئی تھی۔ وہ تجھے لٹکاتی رہی، بھٹکاتی رہی اور ساتھ ساتھ فائدے بھی اٹھاتی رہی۔ جب ساتھ دینے کا وقت آیا تو کم ذات کھوتی کی طرح دولتی جھاڑ دی اس نے..... اب دیکھا لینا کچھ ہی دیر بعد وہ کسی چوہدری، چیمے، راجپوت، ملک یا نوانے کے ساتھ بیاہ رچائے گی اور ہنس ہنس کر آلومٹر پکائے گی۔''

اچانک جیسے بجلی سی چمک گئی۔ کسی کو کچھ پتا ہی نہیں چلا کہ کیا ہوا ہے اور مخمور گوہرے کو تو بالکل ہی نہیں چلا۔ دیکھنے والوں نے بس یہی دیکھا کہ رستم کے ہاتھ گوہرے کے گریبان پر آئے۔ پھر بے پناہ طیش اور رفتار سے گوہرے کو دھکیلتا ہوا وہ سنگی دیوار سے ٹکرایا۔ گوہرے کے منہ سے کرب ناک چیخ نکل گئی۔

☆======☆======☆

اس کی پشت بہت زوردار طریقے سے سنگلاخ چٹان سے ٹکرائی تھی۔ ٹکرانے کے بعد وہ بُری طرح ڈگمگایا۔ اس کے ہاتھ میں تھمی ہوئی بوتل چکنا چور ہو گئی۔ آنکھوں میں بے پناہ حیرت لئے اس نے رستم کی طرف دیکھا۔ رستم پر جنون سوار تھا۔ اس کے سر کی خوفناک ٹکر گوہرا کی پیشانی پر لگی پھر اس نے گوہرا کو گھما کر دوسری چٹان سے دے مارا۔

دو تین شدید چوٹیں سہنے کے بعد گوہرا ذرا سنبھل گیا۔ وہ بے حد مضبوط جسم کا مالک اور ان لوگوں میں سے تھا جن کو شراب عارضی طور پر مزید طاقت ور اور پھرتیلا بنا دیتی ہے۔ اس نے رستم کے طوفانی مکوں کو ہاتھوں سے روکنے کی کوشش کی لیکن جب کامیاب نہیں ہوا تو وہ بھی بھنا گیا۔ اس نے ایک دبی دبی چنگھاڑ کے ساتھ رستم کے سینے پر سر سے ٹکر رسید کی اور اسے سر سے ہی دھکیلتے ہوئے زمین پر گرانا چاہا۔

مزاحمت کی یہ کوشش گرانڈیل گوہرا کو خاصی مہنگی پڑی۔ وہ رستم کو گرانے میں تو کامیاب ہوا لیکن اس پر غالب نہ آ سکا۔ معاملہ اس کی سوچ کے برعکس ہوا، رستم اس کے اوپر تھا اور رستم میں حیوانی طاقت پیدا ہو چکی تھی۔ اس نے وحشیانہ انداز میں گھونسوں اور لاتوں سے گوہرا کو دھنک کر رکھ دیا۔

کھوہ کے اندر موجود ہر فرد سکتے میں تھا۔ رقاصاؤں کے منہ سے ہلکی ہلکی چیخیں نکل رہی تھیں۔ گوہرا کے قریبی ساتھی دم بخود کھڑے تھے۔ وہ اپنے سردار کے بُرے حال کو دیکھ رہے تھے، مگر ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ آگے بڑھ کر اس کی مدد کریں کیونکہ ان کا سردار کسی اور سے نہیں رستم سیال سے برسرِ پیکار تھا اور رستم سیال کے مدمقابل آنے کا ان میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ رستم کی وحشیانہ ضربوں سے بچنے کے لئے آخری کوشش کے طور پر گوہرا نے ایک قریب پڑی کلہاڑی پکڑ لی۔ چھوٹے دستے کی یہ کلہاڑی لکڑیاں چیرنے کے لئے

یہاں رکھی گئی تھی۔ گوہرا کا ایک اچٹتا ہوا وار رستم کے کندھے پر لگا۔ دوسرا اس نے تیزی سے جھک کر بچایا۔ پھر گوہرا کا کلہاڑی والا ہاتھ رستم کی گرفت میں آ گیا۔ گوہرا نے ایک جھٹکے سے کلہاڑی کھینچنی چاہی دونوں ہاتھوں کی گرفت تھی۔ رستم کا گھٹنا حرکت میں آیا۔ ضرب گوہرا کی کلائی اور کہنی کے درمیان لگی، گوہرا کی دردناک کراہ تو سب نے سنی لیکن اس کڑاکے کی آواز شاید کسی تک نہ گئی ہو جو ہڈی ٹوٹنے سے پیدا ہوئی تھی۔ کلہاڑی پکے ہوئے پھل کی طرح گوہرا کے ہاتھ سے جدا ہوگئی۔ اگلے لمحات گوہرا کے لئے قیامت کے تھے۔ رستم نے اس قوی ہیکل ڈکیت کو اتنا مارا کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ الاؤ میں گرنے سے گوہرا کے بال جھلس گئے۔ اس کے ناک، منہ اور کانوں سے خون جاری ہوگیا۔ اس کی کراہیں کھوہ کے در و دیوار کو لرزانے لگیں، اس وقت یہی محسوس ہوتا تھا کہ رستم اسے جان سے مارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

سب سے پہلے گوہرا کے ساتھی دلاور نے ہمت کی۔ وہ تیزی سے آگے آیا اور اس نے اپنے سردار کو رستم سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اس نے رستم اور گوہرا کے درمیان آتے ہوئے کہا۔ ''سیال صاحب! چھوڑ دیں۔ خدا کے لئے چھوڑ دیں...... بس کریں۔''

رستم نے اپنا الٹا ہاتھ اتنی وحشت سے گھمایا کہ اس کی ضرب نے دلاور کو کئی فٹ پیچھے گرا دیا۔

گوہرا کے سر کے جھلسے ہوئے بال رستم کی مٹھی میں تھے۔ وہ اس کے چہرے کو سنگلاخ زمین پر رگڑتے ہوئے بولا۔ ''معافی مانگ...... حرامزادے معافی مانگ، نہیں تو تیری جان لے لوں گا۔'' اس کی آواز میں وہی کڑک تھی جو کھوہ سے باہر تاریک آسمان پر لپکنے والی بجلی میں تھی۔ یہ آواز سننے والے کے رگ و پے میں سرایت کرتی اور جسم کے ایک ایک ریشے کو لرزاتی تھی۔

دلاور چوٹ کھا کر گر گیا تھا۔ پھر نادیہ نے ہمت کی۔ نیم بے ہوش گوہرا کو رستم کے جان لیوا شکنجے سے نکالنے کے لئے وہ آگے بڑھی اور ان دونوں کے درمیان آ گئی۔ ''رستم! یہ مر جائے گا چھوڑ دو اسے...... خدا کے لئے چھوڑ دو اسے۔''

نادیہ کو دیکھ کر دلاور نے دوبارہ ہمت کی اور نادیہ کے ساتھ مل کر کٹے پھٹے گوہرا کو رستم کی وحشیانہ زد سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ ان کو دیکھ کر گوہرا کے ساتھی کاٹھیا اور جیدا وغیرہ بھی آگے بڑھے اور رستم کو گوہرا سے جدا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ کھوہ میں کہرام سا مچ گیا۔

رستم کربناک انداز میں چیخ رہا تھا۔ ''معافی مانگ...... کتے، میری بی بی سے معافی مانگ

نہیں تو میں چیر ڈالوں گا تجھے۔''

رستم کی گرفت اتنی سخت تھی کہ پانچ چھ افراد بھی مل کر اس گرفت کو ختم نہیں کر پا رہے تھے۔ اس گرفت میں اور اس منظر میں کھولی گاؤں کے میلے والے خونی ہنگامے کا رنگ تھا۔

دلاور نے رستم کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''سیال صاحب! سردار کے بدلے ہم معافی مانگتے ہیں، ہم سب مانگتے ہیں۔ اسے چھوڑیں۔ یہ مر جائے گا۔''

اور گوہرا واقعی قریب المرگ تھا۔ وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کا ٹوٹا ہوا بازو خوفناک طریقے سے مڑا ہوا تھا۔ بال جھلس گئے تھے۔ چہرہ لہو سے تربتر تھا اور لگتا تھا کہ ایک آنکھ ضائع ہوگئی ہے۔

رستم نے جب دیکھا کہ وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا ہے تو اس کی پسلیوں میں ایک زوردار ٹھوکر رسید کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ نادیہ سمیت کئی افراد نے رستم کو تھاما ہوا تھا اور سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے...... کھوہ سے باہر بارش اب بھی ہو رہی تھی لیکن پہلے سے دھیمی تھی۔

گوہرا کو چھوڑنے کے بعد رستم آنکھوں میں آتشیں آنسو لئے کھوہ سے باہر نکل آیا اور دہانے کے پاس ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس کے کندھے پر کلہاڑی کا اچٹتا ہوا بلیڈ لگا تھا۔ یہاں سے قمیص پھٹ گئی تھی اور جلد پر کٹ لگنے سے خون رسنے لگا تھا لیکن اسے کسی طرح کی تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اصل تکلیف تو دل میں تھی، بی بی کے بارے میں گوہرا کی زبان سے بیہودہ الفاظ سننے کے بعد اس کے کانوں میں جو زہر گھلا تھا اس کی تلخی شاید کئی دنوں تک برقرار رہنی تھی۔

کھوہ کے اندر شور مچا ہوا تھا۔

''پانی پلاؤ۔'' کوئی کہہ رہا تھا۔

''جسم ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ آگ کے قریب لے جاؤ۔'' کسی دوسرے نے کہا۔

''پہلے خون تو بند کر لو۔'' کسی تیسری آواز نے مشورہ دیا۔

کھوہ میں موجود مرد و زن گوہرا کو ہوش میں لانے میں کوششیں کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ اس کی مرہم بھی۔

رستم کچھ دیر دہانے کے سامنے بیٹھا رہا۔ بارش تواتر سے اس کے تپتے ہوئے جسم پر گر رہی تھی اور اس کی رگوں میں دوڑتی آگ کی تپش کو دھیرے دھیرے کم کرنے لگی۔ وہ اٹھا اور تھکے قدموں سے چلتا اس اونچے ٹیلے پر جا بیٹھا جہاں سے پوٹھوہار کے اس علاقے کو دور دور

تک دیکھا جا سکتا تھا۔ تاہم اس وقت کچھ زیادہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بادلوں کی شامِ کاذب کے بعد اب شام صادق بھی نشیب و فراز پر اُتر آئی تھی۔ ہر طرف تاریکی کی چادر کھلتی جا رہی تھی۔ بارش میں بھیگتی ہوئی چوٹیاں اور کھائیاں اس تاریکی میں روپوش ہو رہی تھیں۔

رستم کا سارا لباس شرابور ہو گیا تھا۔ لمبے بال بھیگ کر گردن اور چہرے سے چپک گئے۔ وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھا رہا۔ پوستین میں لپٹا ہوا ماؤزر اس کی قمیص کے نیچے تھا اور سر کنڈے کاٹنے والا وہ چھرا بھی جو مہتم بستی سے ساتھ لے کر چلا تھا۔ مہتم بستی چھوڑنے کے کچھ ہی دیر بعد وہ اس چھرے اور ماؤزر سے چار جیتے جاگتے انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار چکا تھا، ان میں سے تین پولیس اہلکار اور ایک نارہ پوری چوہدریوں کا کارندہ تھا۔ شاید اس وقت زیادہ راحت، اسے اے ایس آئی کو قتل کر کے ہوئی تھی۔ یہی شخص تھا جس کی نگرانی میں چوہدری حشام کی حویلی میں اس پر رستم کے پہاڑ توڑے گئے تھے۔

اچانک ایک آواز نے رستم کو خیالوں سے چونکایا۔ ''سیال صاحب؟''

اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ چاندنی تھی۔ بارش اسے تر بتر کر رہی تھی۔ وہ ہاتھ میں مرہم پٹی کا سامان لئے کھڑی تھی۔ یہ سامان اسے نادیہ نے رستم ہی کے سفری بیگ سے نکال کر دیا تھا۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ چاندنی کو نادیہ ہی نے بھیجا ہے۔ یقیناً رستم کے موڈ کو دیکھتے ہوئے وہ خود آنے سے کترا رہی تھی۔

''کیا ہے یہ؟'' رستم پھنکارا۔

''پٹی کر لیں۔ آپ کا کندھا زخمی ہے۔''

''کرلوں گا..... اسے اندر لے جاؤ۔''

''اگر آپ کہیں تو میں کر دوں؟'' وہ ہکلائی۔

''میں نے کہا ہے ناں، ابھی مجھے ضرورت نہیں۔''

وہ چند لمحے خاموش کھڑی رہی پھر جیسے ہمت کر کے بولی۔ ''میڈم نادیہ نے کہا ہے۔ اگر آپ نے کھانا.....''

''میں نے کچھ نہیں کھانا۔'' وہ گرجا۔ ''اب جاؤ یہاں سے..... جاؤ۔''

وہ لرز کر واپس مڑی۔ تیلے سے اُترتے ہوئے اسے پاؤں جما کر رکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ تین چار میٹر نیچے گئی ہو گی کہ رستم نے اسے آواز دی۔ ''سنو۔''

''جی۔'' وہ ڈگمگا کر رہ گئی۔

''وہ ہوش میں آ گیا ہے؟''

''ہاں جی..... نہیں جی..... لیکن اب کچھ ٹھیک ہے۔''

''کیا مطلب؟ ہوش میں ہے کہ نہیں؟'' رستم کی آواز میں زہر تھا۔

''ہاں جی، کچھ کچھ ہوش میں ہے۔'' وہ بوکھلائی ہوئی سی آواز میں بولی۔

اس کے جانے کے بعد رستم نے اپنا سر ایک بار پھر گھٹنوں میں دیا۔ بارش دھیمی مگر مسلسل ہو رہی تھی۔ اس کے خیالوں کا سلسلہ وہیں سے جڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ تاؤ حشام کی حویلی میں گزرے ہوئے روز و شب اس کے ذہن میں انگاروں کی طرح پیوست تھے۔ وہ گذرے ہوئے دنوں کے بارے میں سوچنے لگا..... لاہور میں جب وہ چوہدری بشیر کی کوٹھی سے نکلنے کے لئے انکسی سے باہر آیا تھا تو اسے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس کی محبوب ترین ہستی نے اسے دشمنوں کے مقابل پہنچنے سے پہلے ہی نہتا کر دیا ہے۔ کوٹھی کے احاطے میں چوہدری کے خونخوار کارندوں سے گھمسان کی لڑائی لڑتے ہوئے جب اس نے رکھوالی کے کُتے پر فائر کیا تو اسے پتا چلا کہ پسٹل خالی ہے۔ بعد ازاں وہ اپنے دفاع میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ایک دم ہی اس کی ہمت جیسے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔ اسے پکڑ کر دو تین جگہ رکھا گیا پھر تاؤ حشام کی دور دراز حویلی میں پہنچا دیا گیا۔ اس حویلی کی کوٹھری میں رستم نے اپنے بچپن کے دوست آفندی کی دردناک موت کا دکھ جھیلا۔ جس وقت آفندی مر رہا تھا، رستم کوٹھری کے ٹھنڈے فرش پر زخموں سے چور پڑا تھا اور اس کے جسم پر لباس کے نام پر ایک دھاگا تک نہیں تھا۔ آفندی کے مرنے کے دو دن بعد اسے جوتی میں پانی پیش کیا گیا اور جانور کو دینے والے انداز میں روٹی اس کے سامنے زمین پر ڈالی گئی۔ یہ پانی اور روٹی چار روز تک اسی طرح پڑے رہے، حشام کے کارندوں اور اے ایس آئی مظہر کی ضد تھی کہ رستم کو اسی طرح کھلائیں اور پلائیں گے۔ وہ اس ضد کے سامنے سر کیسے جھکا سکتا تھا۔ کئی دن پہلے ہی زندگی اور موت کا فرق اس کے لئے تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ پانچویں روز اے ایس آئی مظہر نے تازہ روٹی اور پانی اس کے سامنے رکھوائے تھے۔ رستم کے ہاتھ پشت پر بندھے رہتے تھے۔ اس نے رستم کے سر پر ٹھوکر مار کر کہا تھا۔ ''ماں کے..... زندہ رہنا ہے تو یہی کھانا اور پینا پڑے گا۔ ورنہ لاش بن کر قبر میں اُتر جاؤ گے۔'' رستم نے دل ہی دل میں اس کی نادانی پر لعنت بھیجی تھی۔ لاش بننا اور قبر میں اُترنا اس کے لئے کون سا مشکل تھا۔ وہ لاتعداد مرتبہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا چکا تھا اور یہ موت تو پھر بی بی کی چاہ اور بی بی کی راہ میں آ رہی تھی۔ وہ جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے اس بدترین طریقے سے کھانے پینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا..... اور پھر تین دن مزید گزر گئے۔ رستم کے منہ میں پانی کا ایک قطرہ اور اناج کا ایک دانہ نہیں گیا تھا۔ زخموں سے

چُور اس کی زندگی تیزی سے موت کے اندھے غار کی طرف بڑھ رہی تھی، وہ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں کوٹھڑی کے ٹھنڈے فرش پر پڑا رہتا تھا۔ نظر دھندلا گئی تھی اور اردگرد کی آوازیں اسے بہت دور سے آتی محسوس ہوتی تھیں۔ دھیرے دھیرے موت کی طرف جا رہا تھا لیکن دکھی نہیں تھا۔ اس کے دل میں اطمینان تھا۔ یہ بی بی کی راہ اور بی بی کی چاہ تھی۔

لیکن ایک دن جب وہ کھوٹھڑی کے فرش پر پڑا تھا اور سانس اس کے سینے میں اٹک رہی تھی، ایک عجیب خیال نے اس کا اطمینان غارت کر دیا۔ یہ زندگی اور یہ جسم اس کے کہاں تھے؟ یہ تو اس کی بی بی کے تھے، بی بی کی اجازت کے بغیر وہ انہیں کیسے ختم کر سکتا تھا۔ حشر کے دن بی بی اس کا گریبان پکڑ کر پوچھ سکتی تھی۔ وہ سب کچھ تو میری امانت تھا۔ تم نے اپنی انا کی خاطر وہ سب کچھ ختم کیوں کیا؟ اسے لگا کہ وہ کم ہمتی اور بزدلی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اس ڈر سے کہ اس زندگی اور اس جسم کو عشق کے مزید ستم نہ سہنا پڑیں، وہ قبر میں اُتر رہا ہے۔ خود کو اپنی لاش میں چھپا رہا ہے۔

اسی دن وہ گھسٹتا ہوا اس جوتی کی طرف گیا تھا جس میں تین دن کا باسی پانی پڑا تھا۔ اس کے ہونٹ تر ہوئے تھے۔ اس کے سوکھے گلے میں زندگی کی نمی داخل ہوئی تھی اور ایسا کرتے ہوئے اسے بالکل ندامت نہیں ہوئی۔ اسے یہی لگا کہ وہ بی بی کی خواہش اور مرضی کے مطابق ایسا کر رہا ہے۔ جب ایک بار اس نے اپنا آپ ''عشق کی رضا'' میں مار لیا تو پھر بعد کے مرحلے بھی اس کے لئے آسان ثابت ہوئے تھے۔ اسے تازہ روٹی فراہم کی گئی جو اس نے جانوروں کی طرح گھٹنوں کے بل جھک کر اور دانتوں سے اٹھا کر کھائی۔ اس کے اندر ایک جذب کا موسم تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے بی بی کی رضا اور خوشی کے لئے کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ بی بی کرا رہی ہے اور جب بی بی کرا رہی تھی تو پھر شرم کیسی، ذلت کیسی؟

کنجری بنیاں میری شان نہ گھٹ دی
مینوں نچ کے یار مناون دے

اسے یاد تھا، بی بی کے عشق میں گرفتار ہونے کے بعد وہ گھنٹوں اور پہروں شاہ جی کے مزار پر سرنیہوڑائے ایک نیم تاریک گوشے میں بیٹھا رہتا تھا۔ وہاں ٹائیلوں کے ڈبی دار فرش پر ایک بزرگ، سبز چغہ پہنے آنکھیں بند کئے مسلسل رقص کیا کرتے تھے اس وقت تک جب تک تھک کر گر نہ جاتے۔

پھر ایک دن حشام کی حویلی میں نیم بے ہوش اور زخموں سے چُور رستم پر بھی ایک ایسا ہی

مرحلہ آیا تھا۔ وہ شدید ترین بخار میں پھنکتے ہوئے فرش پر پڑا تھا۔ وہ اب برہنہ نہیں تھا۔ دو دن پہلے اس کے جسم پر زنانہ لباس چڑھا دیا گیا تھا۔ حشام کے کارندوں نے اس کے پاؤں میں گھنگھرو باندھے اور اسے ناچنے کا حکم دیا۔ اس دن کئی چھوٹے بڑے چوہدری اس کی کوٹھڑی کے سامنے تماشائی کی حیثیت سے موجود تھے۔

رستم کے غنودگی سے بھرے ہوئے ذہن میں مزار کا ایک واقعہ تازہ ہو گیا۔ ایک انگلینڈ پلٹ پاکستانی سیٹھ لاہور سے سفر کر کے شاہ جی کے مزار پر پہنچا تھا۔ تین دن کے بعد اس کے اکلوتے بیٹے کو میانوالی جیل میں پھانسی ہونی تھی سیٹھ اور سیٹھانی رو رو کر مزار پر دعا مانگتے رہے۔ پھر کسی مقامی شخص نے اپنے عقیدے کے مطابق کہہ دیا۔ ''سیٹھ جی! نچ کے یار مناؤ۔'' اور نیم تاریک گوشے میں بیٹھے ہوئے رستم نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا تھا۔ سوٹڈ بوٹڈ سیٹھ نے کوٹ اُتارا تھا۔ سفید قمیص، پتلون سے باہر نکالی تھی اور سفید ریش بزرگ کے ساتھ مل کر دھمال ڈالنے لگا تھا۔ وہ بہت تنومند تھا۔ اس کی توند ہل رہی تھی، مونچھیں لرز رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسو دھاروں کی صورت بہہ رہے تھے۔

اس روز اچانک رستم کی سمجھ میں آیا تھا کہ بات ناچنے یا نہ ناچنے کی نہیں، بات تو اپنی انا، اپنی شان اور ظاہری ہیئت کو کسی کی رضا کی خاطر ملیامیٹ کرنے کی ہے۔ قطرے کی طرح اپنی ہستی کو مٹانا اور کسی عظیم پانی کا حصہ بن جانا۔

رانجھا رانجھا کردی نی، میں آپے رانجھا ہوئی
رانجھن ماہی آکھو مینوں ہیر نہ آکھو کوئی

رستم کو معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ سیٹھ اپنے بیٹے کو بچا پایا یا نہیں لیکن اسے یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ قدرت، راہِ محبت کے مسافروں سے آن بان کی قربانی کس طرح وصول کرتی ہے۔ اس واقعے کے ذہن میں تازہ ہوتے ہی رستم کے لئے عشق کا یہ امتحان بھی آسان ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے، اس نے اپنی آنکھیں جذب سے بند کر لی تھیں اور اس کے زخمی پاؤں حرکت کرتے چلے گئے تھے۔ اسے عجیب کیف محسوس ہوا تھا۔ وہ نارپوری کتوں کے سامنے نہیں اپنی بی بی کے سامنے ناچ رہا تھا۔ وہ ایک اونچی مسند پر بڑی شان سے بیٹھی تھی۔ اس کے یاقوتی ہونٹ باہم ملے ہوئے تھے، اس کے رخساروں پر دنیا کے حسین ترین گلاب کھلے تھے، اس کی آنکھوں میں سچے موتیوں کی چمک تھی، وہ اپنے دیوانے کی اطاعت گزاری کو مخمور نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، خوبرو ماتھے پر ایک ہلکی سی شکن تھی جیسے سوچ رہی ہو اپنے اس دیوانے کو اس ''جاں سوزی'' کا کیا صلہ دے؟ اور وہ اپنے پاؤں کو حرکت دیتا چلا گیا

تھا۔

اچانک ایک آواز نے رستم کو دوبارہ خیالوں سے چونکا دیا۔ اس مرتبہ نادیہ خود تھی۔ بارش اب تھم گئی تھی اور ٹھنڈی ہوا جسم پر کپکپی طاری کر رہی تھی۔ نادیہ نے اپنے جسم کو ایک چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ وہ چند فٹ کی دوری پر کھڑی ہوگئی۔

''کیا بات ہے؟'' رستم نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''دلاور اور کاظمیا وغیرہ کے پاس ایک وائرلیس سیٹ ہے۔ وہ اس پر کسی لالہ سے بات کر رہے تھے۔ اس کو تمہارے بارے میں اور گوہرا کے زخمی ہونے کے بارے میں بتا رہے تھے۔'' نادیہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

''میں جانتا ہوں وائرلیس کے بارے میں..... اور لالہ کے بارے میں بھی۔ پریشانی کی بات نہیں۔ تم جاؤ۔''

وہ خاموش کھڑی رہی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ خاموشی طویل ہوتی جا رہی ہے تو کہنے لگی۔ ''گوہرا بہت زخمی ہے۔ اس کے زخموں کا خون بڑی مشکل سے بند ہوا ہے اس کی بائیں آنکھ بھی بُری طرح زخمی ہوئی ہے۔ ماتھے کے ایک حصے کی کھال اُتر کر آنکھ کے اوپر لٹک رہی ہے۔ یہ لوگ اسے چھری سے کاٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''کرنے دو جو کرتے ہیں۔'' رستم نے بے زاری سے کہا۔

''دلاور اور کاظمیا کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ لوگ صبح سویرے یہ جگہ چھوڑ دینا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں۔''

''وہ ٹھیک سوچ رہے ہیں۔''

''لیکن اس زخمی گوہرے کا کیا ہوگا؟''

''اس فکر میں تمہیں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کرلیں گے کچھ نہ کچھ۔'' رستم کے لہجے میں دباؤ کا رنگ تھا۔ نادیہ جیسے سہم کر سکڑ گئی۔

وہ کچھ دیر تذبذب میں کھڑی رہی۔ پھر پاؤں جما جما کر نشیب میں اُتر گئی۔ کھوہ کے اندر الاؤ کی روشنی تھی اور کچھ سائے حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔

اگلے روز صبح سویرے یہ قافلہ رتو ڈیرے یا وڈے ڈیرے کی طرف روانہ ہوگیا۔ رات ہی میں دلاور، کاظمیا اور جیدے وغیرہ نے کافی کام کیا تھا۔ ایک خچر کا پالان اُکھاڑ کر اس کی چار لکڑیوں کو دو کر کے جوڑا گیا تھا پھر ان لمبی لکڑیوں کے ساتھ ایک ترپال کو اس طرح منسلک کیا گیا تھا کہ اسٹریچر کی شکل بن گئی تھی۔ اسی اسٹریچر پر زخمی گوہرا کو لیٹا کر اس پر چادر ڈال دی

گئی تھی۔ گوہرا نیم بے ہوشی میں ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ اس کا منہ سوج کر کپا ہوگیا تھا۔ بائیں آنکھ پر روئی رکھ کر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ ٹوٹے ہوئے بازو کے گرد بھی لکڑیاں جوڑ کر پٹی باندھی گئی تھی۔

آج موسم خوشگوار تھا۔ انہوں نے گھاٹیوں اور سطح مرتفع کی تنگ گزرگاہوں پر اپنا سفر تیزی سے شروع کیا۔ رستم آگے تھا۔ اس کے ساتھ کاظمیا تھا۔ نادیہ، رستم کے پیچھے چل رہی تھی۔ اس سے پیچھے گوہرا کا اسٹریچر اور رقاصائیں تھیں۔ گروہ کے باقی افراد سب سے آخر میں تھے۔

بے حد تھکن کے باوجود انہوں نے رات نو بجے تک مسلسل سفر کیا اور دوسرے پڑاؤ میں پہنچ گئے۔ یہ ٹیلوں کے درمیان گھری ہوئی ایک نیم ہموار جگہ تھی۔ رات آرام کرنے کے بعد صبح سویرے وہ لوگ پھر روانہ ہوگئے۔ جوں جوں وہ وادی سون کی گہرائیوں میں اُترتے جا رہے تھے، گرد و پیش کے مناظر عجیب تر اور راستے دشوار ہو رہے تھے۔ رستم ان راستوں سے کئی بار گزر چکا تھا لیکن یہ ایسی بھول بھلیاں تھیں کہ ہر بار حافظے پر زور دے کر آگے بڑھنا پڑتا تھا۔ پرسوں شام والے سنگین واقعے کے بعد بے تکلفی اور تفریح کا ماحول یکسر ختم ہوگیا تھا۔ رستم کے موڈ کے پیشِ نظر سب گم صم اور کسی حد تک سہمے ہوئے تھے۔ صرف نادیہ ہی تھی جو گاہے بگاہے اس سے بات کرنے کی جرأت کر لیتی تھی۔ اس سفر میں ایک جگہ ایسی بھی آئی جہاں رقاصاؤں اور سازندوں کی آنکھوں پر کالی پٹیاں باندھ دی گئیں۔ ایک پُر پیچ راستے پر انہوں نے تقریباً ایک گھنٹہ اسی طرح سفر کیا۔ بعد ازاں یہ پٹیاں کھول دی گئیں۔ گوہرا کو شدید بخار تھا اور اسی بخار کی غنودگی میں وہ ہولے ہولے کراہتا اور بڑبڑاتا رہتا تھا۔ اس کا ٹوٹا ہوا ہاتھ بھی بُری طرح سوج گیا تھا۔ سہ پہر کے وقت انہوں نے نشیب میں کچھ جھگیوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کی جھلک دیکھی۔ اس جھلک نے نادیہ کو دلاسا دیا اور وہ جو پہلے ہی اس سفر کی طوالت سے پریشان تھی اور پریشان نظر آنے لگی۔

شام سے ذرا پہلے رقاصاؤں اور سازندوں کی آنکھوں پر پھر سے پٹیاں باندھ دی گئیں وہ وڈے ڈیرے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جن کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئی تھیں وہ ایک دوسرے کے سہارے سے چلنے لگے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ وڈے ڈیرے کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ وڈھائی دن کا سفر انہوں نے چھتیس گھنٹوں میں مکمل کر لیا تھا۔

یہ ڈیرہ تین چار چھوٹے چھوٹے کھوہ نما غاروں پر مشتمل تھا۔ ایک سائبان نما پتھر کے نیچے بھی چھوٹے چھوٹے پتھروں سے دیواریں کھڑی کر کے تین چار کمرے بنائے گئے تھے

لیکن ڈیرے کی اصل گنجائش وہ قدرتی سرنگ تھی جو ڈھلوان کی شکل میں دس بیس فٹ گہرائی تک چلی گئی تھی۔ اتنی گہرائی میں جانے کے بعد یہ سرنگ کم از کم پانچ چھ شاخوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ کچھ شاخیں تو دو تین سو میٹر آگے جا کر بند ہو جاتی تھیں یا اتنی تنگ ہو جاتی تھیں کہ بے کار ہی ہو کر رہ جاتی تھیں لیکن دو شاخیں بہت آگے تک نکل جاتی تھیں۔ یہ آگے جا کر مزید تقسیم ہو جاتی تھیں اور بھول بھلیوں کی طرح سطح مرتفع کے نیچے گھومتی تھیں۔ ان سرنگوں کے دوسرے دہانے ڈیرے سے ڈھائی تین کلومیٹر کی دوری تک تھے۔ ان سرنگوں کی دیواریں بھربھرے پتھروں اور سنگریزوں سے بنی ہوئی تھیں۔ ایک دو جگہ ان سنگریزوں میں سے تھوڑا تھوڑا پانی بھی رستا تھا جسے ضرورت کے لئے جمع کر لیا جاتا تھا۔ سرنگوں کے جو حصے استعمال میں نہیں تھے اور تاریک تھے، وہاں ہر طرح کے حشرات الارض پائے جاتے تھے اور ایک خاص قسم کی بُو باس تھی جو برسات میں بڑھ جاتی تھی۔

رستم یہ جگہ درجنوں بار دیکھ چکا تھا۔ وہ یہاں کے تمام نشیب و فراز سے واقف تھا..... ایک ایک ٹیلہ، ایک ایک جھاڑی اس کے حافظے پر نقش تھی، شام کے جھٹپٹے میں وہ قرب و جوار کو شناسا نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ڈیرے سے تقریباً تین سو میٹر کے فاصلے پر خودرو جھاڑیوں کے درمیان ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔ دس بارہ قبریں تھیں۔ رستم ہر قبر میں رہنے والے کو جانتا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں یہاں دو تین قبریں مزید بنی تھیں۔ ایک قبر بالکل نئی تھی۔ رستم کو قبر پر چند مرجھائے ہوئے پھول بھی نظر آئے۔

قبروں سے آگے ڈیرے کا کنواں تھا، کنوئیں سے آگے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ چٹائی سائبان تلے بنے ہوئے کمرے اسی جھنڈ سے متصل تھے۔ یہاں پہنچنے سے ذرا پہلے ہی رقاصاؤں اور سازندوں کی آنکھوں سے پٹیاں کھول دی گئی تھیں اور گوہرا کے اسٹریچر کو چار تازہ دم افراد نے سنبھال لیا تھا۔ کھوہ نما مقامات کو حجرے کہا جاتا تھا۔ سرنگوں کو کھوندریں اور سائبان تلے بنے ہوئے کمروں کو ''چھپا'' کہا جاتا تھا۔

رستم کو کھوندروں کی طرف سے ہلکی روشنی دکھائی دی اور اس کے ساتھ موسیقی کی مدھم آواز بھی آئی۔ پکوان کی خوشبو بھی قرب و جوار میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف کچھ جھنڈیاں سی لگی دکھائی دیں۔ یہ جھنڈیاں کپڑے کے رنگ برنگے ٹکڑوں اور کاغذوں سے مقامی طور پر ہی تیار کی گئی تھیں۔ مزید آرائش کے لئے ویڈیو کیسٹوں کے فیتوں کو کاٹ کاٹ کر جھالروں کی صورت میں آویزاں کیا گیا تھا۔ رستم کو محسوس ہوا کہ یہاں کوئی تقریب یا چھوٹا موٹا جشن ہے۔ رستم اور دیگر افراد کی آمد کو محسوس کر کے ڈیرے کے مکینوں میں ہلچل نظر آنے لگی۔ جلد ہی

بہت سے افراد ان کے گرد جمع ہو گئے۔ یہ سب کے سب گرد آلود بالوں اور بے ترتیب داڑھیوں والے خستہ حال افراد تھے ہر ایک کے پاس چھوٹا موٹا ہتھیار ضرور دکھائی دیتا تھا۔ رستم ان میں سے بہت سوں کو پہلے سے جانتا تھا۔ تاہم کئی ایک نئے چہرے بھی تھے۔ جن کو رستم جانتا تھا، وہ بے حد حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ جیسے انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو کہ رستم پھران کے درمیان موجود ہے۔

زخمی گوہرا کو فوراً حجروں کی طرف لے جایا گیا۔ باقی افراد کھوندروں کی طرف چلے گئے۔ چند افراد نے رستم کے ساتھ پُر جوش معانقہ کیا۔ ان میں سے ایک بوسیدہ پینٹ شرٹ والا نوجوان بھی تھا۔ پھر وہ لوگ اسے تجھے کی طرف لے گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد رستم تجھے کے آرام دہ کمرے میں موجود تھا۔ یہاں فرش پر ایک بڑی دری بچھی ہوئی تھی۔ دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگے تھے۔ لکڑی کی الماری، ٹی وی، پنکھا اور بہت سی دیگر سہولتیں یہاں موجود تھیں۔ ایک طرف دیوار پر دوسری جنگ عظیم کی خوفناک مشین گن M6-42 آویزاں تھی۔ اس کے ساتھ ہی دو ٹرپل نور رائفلیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس دیوار پر ایک شیلف بھی تھا جس پر شراب کی بوتلیں اہتمام سے سجائی گئی تھیں۔ اس کمرے میں رستم کے سامنے جو شخص بیٹھا تھا اس کا نام لالہ فرید تھا اور نادر کاکا کے بعد یہی شخص یہاں کا کرتا دھرتا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے لالہ فرید نے رستم کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے معانقہ کیا تھا اور اس کا حال احوال پوچھا تھا۔ اب وہ دونوں تفصیلی گفتگو کی طرف بڑھ رہے تھے۔

لالہ فرید ملیشیا رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔ اس نے گرم شال کے نیچے اپنے چوڑے چکلے کندھوں کو ایک بے قرار سی جنبش دی اور پاٹ دار آواز میں بولا۔ ''پرسوں رات دلاور نے وائرلیس پر تمہارے بارے میں بتایا تو مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہوا۔ میں نے اس سے کہا میری بات کراؤ رستم سے۔ وہ بولا کہ تم قریب نہیں ہو پھر اس نے گوہرا کے زخمی ہونے کے بارے میں بتایا۔ پریشانی تو بہت ہوئی لیکن یہ یقین تھا کہ اگر تم نے گوہرا کو مارا ہے تو اس کی کوئی وجہ بھی تمہارے پاس ضرور ہو گی۔''

''چھوٹی موٹی وجہ نہیں تھی۔'' رستم گمبھیر لہجے میں بولا۔

رستم کے لہجے کی گھمبیرتا کو محسوس کر کے فرید نے کہا۔ ''چلو، اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ ابھی تم یہ بتاؤ کہ تم نے مہاریں کیسے موڑیں ہم تو تمہارا رستہ دیکھ دیکھ کر تھک گئے تھے۔''

''انجان نہ بنو، تمہیں بہت کچھ پتا ہے۔''

''لیکن..... بہت کچھ نہیں بھی پتا۔''

''تو تم پوری تفتیش کرنا چاہتے ہو؟'' رستم کے لہجے میں ہلکی سی گرج آ گئی۔

''نہیں یار! تم سے تفتیش کروں گا بھلا؟ میں تو جاننا چاہ رہا تھا کہ.....''

''تم جو کچھ جاننا چاہتے ہو، سب بتا دوں گا لیکن ابھی اس بارے میں کوئی بات نہ کرو۔''

''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔''

''میرے ساتھ ایک لڑکی ہے۔ اس کی رہائش تمہاری بیوی کے ساتھ ہو تو بہتر ہے۔ مجھے جہاں کہو گے، وہیں پڑ جاؤں گا۔''

''کیسی بات کرتے ہو رستم! اس ڈیرے پر جتنا حق میرا ہے اتنا ہی تمہارا ہے۔ تم جہاں کہو، تمہارے آرام کا انتظام کر دیتا ہوں۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ تم بھی یہیں رہو۔ میں ساتھ والا کمرہ تمہارے لئے خالی کرا لیتا ہوں۔ ہاں یہی زیادہ مناسب ہے۔''

اسی دوران میں کاٹھیا اندر آیا، اس نے جھک کر سلام کیا اور ادب سے بولا۔ ''لالہ! ناصر نے گوہرا بھائی کی مرہم پٹی کر دی ہے۔ ایک دو ٹیکے بھی لگا دیئے ہیں۔ اگر کچھ اور کرنا ہے تو آپ آ کر دیکھ لیں۔''

لالہ فرید نے رستم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آؤ دونوں چلتے ہیں۔''

''نہیں، تم اکیلے ہو آؤ۔ میں ابھی اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔'' رستم کے لہجے میں زہر تھا۔

فرید طویل سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے اس نے کاٹھیا سے کہا۔ ''رستم کے ساتھ آنے والی میڈم صاحبہ کو اندر اپنی بھرجائی کے پاس لے جاؤ۔ ان دونوں کے لئے چائے پانی کا انتظام علیحدہ سے کرواؤ۔''

کاٹھیا نے ایک بار پھر سر جھکایا اور باہر چلا گیا۔

رستم دری پر چت لیٹ گیا۔ اس کا سر گاؤ تکیے پر تھا۔ بہت تھکا دینے والا سفر تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی۔ رستم کو خاص تھکاوٹ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اسے کچھ محسوس ہی نہیں ہو رہا۔ تھکاوٹ، نہ تکلیف، نہ دکھ۔ وہ بالکل پتھر ا چکا تھا آج کم و بیش ڈھائی برس بعد ڈیرے پر آیا تھا۔ یہاں بہت کچھ بدل گیا تھا لیکن بہت کچھ جانا پہچانا بھی تھا۔ ابھی ذرا دیر پہلے فرید نے ناصر کا ذکر کیا تھا۔ ناصر بھی رستم کے لئے جانا پہچانا نام تھا۔ یہ ایک نوجوان ڈاکو تھا اور رستم یہ تھا کہ میڈیکل کے آخری سال میں ایک ٹریفک سارجنٹ کو قتل کرنے کے الزام

میں یہ قانون کے شکنجے میں پھنسا اور پھر پھنستا ہی چلا گیا۔ وہ اپنی سوزوکی کار پر امتحانی سینٹر پیپر دینے جا رہا تھا۔ وقت محدود تھا۔ وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ ایک اشارے پر وہ ایک سیکنڈ یا اس سے بھی کم وقت کے لئے لیٹ ہوا۔ سارجنٹ نے اشارہ توڑنے کے الزام میں اسے روک لیا۔ اس نے بہت منت سماجت کی۔ سارجنٹ کو بتایا کہ اس کا کیریئر داؤ پر ہے۔ وہ لیٹ ہو گیا تو امتحان نہ دے پائے گا۔ سارجنٹ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ ہر صورت گاڑی بند کرنے کے درپے تھا۔ ناصر نے گاڑی بھگا دی۔ سارجنٹ نے موٹر سائیکل پر اس کا جارحانہ تعاقب کیا اور گاڑی کو روکنے کی کوشش کی۔ ناصر نے بھی نہ رکنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ آخر ایک جگہ اس نے زوردار طریقے سے موٹر سائیکل کو گاڑی کی سائیڈ ماری۔ سارجنٹ پھسلتا ہوا ایک وین سے ٹکرایا اور اس کے نیچے کچلا گیا اور اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر ناصر کی ہنستی بستی زندگی بھی کچلی گئی۔ وہ فرار ہو گیا۔ بعد ازاں اس کے ہاتھوں پولیس کا ایک ٹاؤٹ قتل ہوا اور وہ اشتہاری ہو کر اپنی ماں اور دو بہنوں کو روتا چھوڑ کر ان خرابوں میں آ بسا، کبھی واپس نہ جانے کے لئے۔ یہ ویرانہ ایسی ہی اَن گنت کہانیوں سے اٹا ہوا تھا۔ بے شک کچھ لوگ فطرتاً بھی جرائم پیشہ تھے لیکن زیادہ تر ایسے ہی تھے جنہیں بے انصاف معاشرے نے مجرم بنایا تھا۔ رستم خود بھی تو ان دوسری قسم کے لوگوں میں شامل تھا۔ کئی برس بیت چکے تھے لیکن اپنے بوڑھے باپ کا خون آلود جسم جیسے آج بھی اس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ لرز رہا تھا، ہچکیاں لے رہا تھا اور بہ زبانِ خاموشی کہہ رہا تھا۔ ''رستم تیری آپو بڑی کمزور ہے۔ اس کی طاقت بن جانا۔ اسے زندہ درگور نہ ہونے دینا۔'' اور وہ بن گیا تھا طاقت۔ اس نے اپنی آپو کو حالات کی قاتل لہروں سے صاف نکال لیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے نکالتے نکالتے وہ خود کناروں سے بہت دور چلا گیا تھا۔

دس پندرہ منٹ بعد فرید لوٹ آیا۔ اس کے چہرے پر تردد تھا۔ مخملی گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے لمبی سانس لی اور بولا۔ ''گوہرا کو کافی چوٹیں آئی ہیں۔ یہ تو شکر ہے کہ ناصر جیسا بندہ ہمارے پاس موجود ہے۔ ورنہ جان کے لالے پڑ سکتے تھے۔ اب بھی آنکھ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دو تین دن بعد اندازہ ہو گا کہ روشنی بچ سکتی ہے یا نہیں۔''

رستم خاموش رہا۔ چہرے پر گہرا کرب تھا۔ فرید نے چند لمحے انتظار کیا جیسے چاہ رہا ہو کہ رستم بھی اس بارے میں بات کرے۔ رستم نے بات نہیں کی تو وہ سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔

کھوندر یعنی سرنگ سے گانے بجانے کی آوازیں کمرے تک پہنچ رہی تھیں۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ دو چار رقاصائیں یہاں پہلے سے بھی موجود تھیں۔ شاید انہیں کہیں اور سے لایا

گیا تھا۔ ناچ گانا ہو رہا تھا اور فرید کے ساتھیوں کے مخمور آوازے گھاٹیوں میں گونج رہے تھے۔

رستم نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھولی تو آوازیں مزید واضح ہوگئیں۔ کسی ٹھیٹ پنجابی شخص نے پنے کی طرز پر تان لگائی۔

''اٹھ آنے دوانی دے

متھے اُتے چگدے لگدے، تیرے کنڈل جوانی دے۔''

ایک اردو بولنے والے نے کہا۔

''بدلی کی چھایا ہے۔

او، پتلی کمر والی، دل تجھ پر آیا ہے۔''

کسی نے سرائیکی میں بول اٹھائے۔ پھر ایک دم بہت سے افراد آواز بلند کرنے لگے۔

رستم نے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا تماشا ہے؟''

فرید کی گھنی مونچھوں کے نیچے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اپنے بالوں سے بھرے سینے پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''کچھ نہیں یار! بڑے دنوں سے یہ لوگ بور ہو رہے تھے۔ میں نے کہا، تھوڑی سی دل پشوری کرلیں۔''

''اور دل پشوری کے لئے تم شہر سے رقاصاؤں کو اکٹھا کر کے لے آئے ہو۔''

''یار کوئی زبردستی اٹھا کر تو نہیں لایا۔ سودا کر کے لائے ہیں۔ ایڈوانس دیا ہے باقی کی بھی ایک ایک پائی ادا کریں گے اور انہیں رتو موڑ تک واپس چھوڑ کر آئیں گے اور یہ آئی بھی اپنی خوشی سے ہیں یار۔''

''لگتا ہے تم نادر کاکا کی باتیں بھولتے جا رہے ہو۔ وہ کیا کہا کرتا تھا..... عورت اپنے ساتھ بہت سی مصیبتیں لے کر آتی ہے اور وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ مفرور کے لئے عورت کے بازو پھانسی کا پھندا ہوتے ہیں۔''

''مجھے سب یاد ہے رستم! پر وقت کے ساتھ بہت کچھ بھولتا بھی تو ہے۔ زندگی بہت کچھ سکھاتی ہے اور بہت کچھ بھلاتی ہے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ پچھلے دو ڈھائی برسوں میں تم نے سیکھا کم ہے اور بھلایا زیادہ ہے۔''

وہ گہرا کش لے کر بولا۔ ''تمہارے ساتھ بھی تو عورت آئی ہے۔''

''مجھے پتا تھا تم یہ بات ضرور کہو گے۔ اس کا جواب بھی ہے میرے پاس۔ اس لڑکی کو

میں نہیں لایا، یہ زبردستی آئی ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں اور نہ ہوسکتا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اسے جلد سے جلد یہاں سے کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دوں۔''

''عورت آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی اور وہ جتنی خوبصورت اور جوان ہوتی ہے، اس سے پیچھا بھی اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔''

''میرے بارے میں سب جانتے ہو، پھر بھی یہ بات کہہ رہے ہو؟''

''میرا خیال تھا کہ میں اور نادر کاکا تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں لیکن یہ خیال بالکل غلط نکلا۔ ایک دم غلط۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم اس طرح راستہ بدلو گے۔''

رستم کی آنکھیں جل اٹھیں۔ ''دیکھو فرید! بات اسی رخ پر جا رہی ہے، جس رخ پر جانے سے گوہرا کے ساتھ میری لڑائی ہوئی ہے۔''

فرید کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پہلے لگا کہ وہ کوئی سخت بات کہے گا لیکن پھر اس نے تحمل کا ثبوت دیتے ہوئے ارادہ بدل دیا۔ مسکرا کر بولا۔ ''چلو چھوڑو ان باتوں کو۔'' پھر وہ شیلف کی طرف بڑھا۔ ایک چمکتی دمکتی بوتل پر اس نے بڑی ''شفقت'' سے ہاتھ پھیر کر کہا۔ ''کیا خیال ہے، ذرا ہونٹ گیلے کرلیں؟''

رستم نے نفی میں سر ہلایا۔ ''فی الحال میں لیٹنا چاہتا ہوں۔''

رستم کے لیٹنے کا انتظام کرنے کے لئے فرید باہر چلا گیا۔ کھوندر یعنی سرنگ میں ہنگامہ ہائے ہُو جاری تھا۔

فرید کے اصرار پر تھوڑا سا پلاؤ کھانے کے بعد رستم چھجے کے ایک چھوٹے کمرے میں رات بھر سوتا رہا۔ یہ کمرہ اس کے جانے کے بعد بنا تھا۔ رات کو غنودگی کی کیفیت میں اسے کئی بار احساس ہوا کہ کھڑکیوں سے باہر شور وغل بپا ہے۔ ساز بج رہے ہیں۔ ناچ گانا ہو رہا ہے اور سریلی چیخیں سنائی دے رہی ہیں۔ کسی وقت کئی افراد مل کر آوازے لگانے لگے تھے یا پھر نعرے بلند کرتے تھے۔ ایک دو بار ہوائی فائرنگ بھی کی گئی۔

صبح رستم کی آنکھ کھلی تو سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ چاروں طرف گہری خاموشی تھی۔ رستم کے پاؤں اور کندھے کی چوٹیں کچھ تکلیف دے رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر بیٹھا رہا پھر اس نے کھڑکی کھولی۔ یوں لگتا تھا کہ ڈیرے میں موجود ہر فرد محوِ خواب ہے۔ چھجے اور حجروں کے درمیانی احاطے میں اجالا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ یہاں کھانے پینے کے بہت سے برتن الٹے سیدھے پڑے تھے۔ چچوڑی ہوئی ہڈیاں، ضائع ہوجانے والے چاول، شراب کی دو چار بوتلیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ احاطے کے درمیان رات کو کافی بڑا الاؤ

روشن کیا گیا تھا۔ اس الاؤ کے آثار اب راکھ اور ادھ بجھے انگاروں کی صورت میں موجود تھے۔ ڈیرے کے چند افراد الاؤ کے ارد گرد نیم پتھریلی زمین پر ہی سو رہے تھے۔ رات کو رقاصاؤں پر جو نوٹ نچھاور کئے گئے تھے ان میں سے کچھ اب بھی یہاں وہاں پڑے تھے۔ دو تین رائفلیں اور کلہاڑیاں بھی سونے والوں کے قریب ہی پڑی تھیں۔ صبحِ نو کی ان اولین گھڑیوں میں جیسے یہ ہتھیار بھی سو رہے تھے۔

اچانک ایک منظر نے رستم کو بُری طرح چونکا دیا۔ کھوندر کے دہانے کے پاس بھی ایک چھوٹے الاؤ کے آثار موجود تھے۔ یہاں ایک ٹنڈ منڈ بیری کے پاس ایک عورت اور مرد کمبل لپیٹے زمین پر بے خبر پڑے تھے۔ نیند میں کمبل مرد پر سے کھسک گیا تھا۔ وہ مادر زاد برہنہ تھا۔ عورت کا بالائی جسم بھی کمبل سے باہر تھا اور برہنہ تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایک گوری چٹی ٹانگ بھی پاؤں سے پنڈلی تک کمبل سے نکلی ہوئی تھی۔ وہ شکل سے جواں سال طوائف نظر آتی تھی، مرد کے سرہانے کی طرف کوئی چمکتی ہوئی شے نظر آئی۔ غور سے دیکھنے پر رستم کو پتا چلا کہ یہ شراب کی بوتل ہے۔

کھلے آسمان کے نیچے یہ واہیات منظر دیکھ کر رستم کی آنکھیں جل اٹھیں۔ وہ کھڑکی بند کرنے جا ہی رہا تھا کہ ایک دم رک گیا۔ اسے ایک متحرک جسم دکھائی دیا۔ یہ ایک چار پانچ سالہ بچہ تھا۔ اس کا رنگ بالکل سفید اور گھونگھریالے بال قدرے سنہری تھے۔ رستم سمجھ گیا کہ یہ فرید کا بیٹا ٹیپو ہے۔ جب رستم یہاں سے گیا تو ٹیپو فقط دو ڈھائی سال کا تھا۔ آج رستم نے مدت بعد اسے دیکھا تھا اور ایک ایسی جگہ دیکھا تھا کہ اعصاب سن ہو کر رہ گئے تھے۔ بے شک وہ ٹیپو ہی تھا۔ غالباً وہ رات کو جلدی سو گیا تھا اور اب صبح سویرے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یقیناً اس کی ماں سو رہی تھی ورنہ وہ اسے اس جانب کہاں آنے دیتی۔ وہ ملیشیا رنگ کا کرتہ پاجامہ پہنے ہوئے تھا اس کے ہاتھ میں شہتوت کی ایک ڈالی تھی۔ شہتوت کے سبز پتوں کے عقب سے وہ حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس مٹیالے کمبل کو دیکھ رہا تھا جس کے نیچے مرد اور عورت برہنہ پڑے تھے۔ وہ دس پندرہ سیکنڈ تک بے حد تجسس سے یہ منظر دیکھتا رہا پھر درخت کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔

رستم نے عمیق سانس لے کر کھڑکی بند کر دی۔

وہ کافی دیر تک اپنی جگہ گم صم پڑا رہا۔ ڈیرے کے ماحول میں اسے ایک ناگوار تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اسے قدموں کی مدھم آہٹ سنائی دی۔ پھر دروازہ کھلا اور وہی چار پانچ سالہ بچہ اندر آ گیا جسے رستم نے کچھ دیر پہلے شہتوت کے درخت کے پاس

دیکھا تھا۔ ''سلام چاچا'' اس نے توتلی زبان میں کہا۔

''وعلیکم السلام'' رستم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ماتھا چوما۔ ''تم ٹیپو ہی ہو ناں؟''

بچے نے شرما کر سر ہلایا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ رستم نے کپ لے لیا۔ دروازے کے پیچھے سے نسوانی آواز ابھری۔ ''رستم بھائی! آپ کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہوں بھرجائی۔'' رستم کا جواب مختصر تھا۔

''ہم آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔''

''میں بھی بھولا نہیں تھا۔''

دوسری طرف خاموشی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ پردے کے پیچھے سے بولنے والی عورت رستم سے مزید بات کی توقع کر رہی ہے لیکن رستم یکسر خاموش تھا۔ اس پر وہی گھمبیر موڈ طاری تھا۔ جس نے پچھلے کئی دنوں سے اسے اپنے نرغے میں لیا ہوا تھا۔ خاموشی کے طویل وقفے کے بعد رستم نے عورت سے پوچھا۔ ''فرید سویا ہوا ہے کیا؟''

''نہیں، جاگ گئے ہیں۔ بلاؤں انہیں۔''

''ہاں......''

کچھ دیر بعد فرید تولیے سے منہ پونچھتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کے چہرے کی نمایاں خصوصیت اس کی نہایت گھنی مونچھیں اور بہت بڑی بڑی آنکھیں تھیں، جسم مضبوط اور قد دراز تھا۔ لگتا تھا کہ رات کو اس نے بھی خوب مے نوشی کی ہے۔ چہرے پر تمتماہٹ ابھی تک موجود تھی۔ رستم نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ دو افراد احاطے میں بکھرے ہوئے سامان کو سمیٹ رہے تھے۔ ایک پوٹھوہاری بلی ہڈیوں کے گرد منڈلا رہی تھی۔ الاؤ کے گرد سونے والے اب جا چکے تھے۔ کھوندر کے قریب مٹیالے کمبل کے نیچے برہنہ جوڑا اب موجود نہیں تھا۔ رستم نے کھڑکی بند کر دی۔

فرید نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

''کافی بڑا ہو گیا ہے۔'' رستم نے کہا۔

''تم بھی جلدی تو نہیں لوٹے ناں۔''

''ایک ہی ہے یا......؟''

''نہیں۔ بس یہی جیتا جاگتا رہے۔''

رستم نے بچے سے کہا۔ ''جاؤ بیٹا...... باہر کھیلو۔''

وہ فوراً اٹھ کر چلا گیا۔ رستم نے فرید سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یاد ہے، جب

میں یہاں تھا تو یہ دو ڈھائی سال کا ہوگا۔ تم کہا کرتے تھے، اسے اپنے ساتھ یہاں اس دوزخ میں نہیں رکھوں گا۔ نہیں دور بھیج دوں گا۔''

''میرا پکا پروگرام تھا لیکن..... مسئلہ یہ تھا کہ تمہاری بھرجائی مہناز بھی جاتی تھی۔ میں ایک دوراہے میں پھنس گیا تھا۔ ٹیپو کو یہاں سے بھیجنا چاہتا تھا اور مہناز کو ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ سچی بات پوچھتے ہو تو مہناز کے بغیر زندگی بے کار محسوس ہوتی ہے..... اور اب بھی یہی صورتِ حال ہے۔''

''تو پھر اس کو پیدا کیوں کیا تھا؟''

''بس ہوگئی غلطی لیکن اب اس غلطی کو درست کرنے کے بارے میں سوچ لیا ہے۔ پکا پکا ارادہ کرلیا ہے کہ ٹیپو کو اس کے ماموں کے پاس کراچی بھیج دوں گا۔ وہاں سے یہ ماموں کے ساتھ قطر چلا جائے گا۔ مہناز بھی راضی ہوگئی ہے۔''

''ماں اور بیٹے کو جدا کرو گے؟''

''باپ اور بیٹا بھی تو جدا ہوں گے۔ تم جانتے ہی ہو، ایسی جدائیاں سون میں پناہ لینے والوں کا نصیب ہوتی ہیں اور ان کے لئے ہم سب کو تیار رہنا پڑتا ہے۔''

رستم نے گہری سانس لی۔ ''مجھے لگتا ہے جب تک تم اس معصوم کو اس دوزخ سے روانہ کرو گے تب تک اس کی معصومیت ختم ہو چکی ہوگی۔''

''کیا مطلب؟''

رستم نے کڑی نظروں سے فرید کو گھورا۔ ''میں تمہیں بہت مضبوط سمجھتا تھا فرید! لیکن مجھے لگتا ہے کہ تم دن بدن کمزور پڑتے جارہے ہو۔''

''کیا کمزوری دیکھی ہے تم نے؟''

''یہ جو رات بھر یہاں ہوتا رہا ہے، کمزوری نہیں تو اور کیا ہے؟ شراب پی کر ناچ گانا کرتے رہے ہو تم سب۔ کیا نادر کاکا کے ہوتے ہوئے تم یہ سب کر سکتے تھے؟''

فرید کا چہرہ تمتما گیا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ کئی معاملوں میں نادر کاکا بھی غلط تھا۔''

''کئی معاملوں میں نہیں، وہ تھا ہی غلط۔ اس نے تمہیں ڈیرے پر جگہ دی، تمہیں ذمے دار بنایا۔ تمہیں صلاح مشورے میں شریک کیا اور پھر آخری وقت میں تمہیں سرداری کا رتبہ دیا۔''

''سرداری کا رتبہ تو تمہیں بھی مل رہا تھا لیکن تب تک تمہارے ارادے کچھ اور ہو چکے تھے۔ تم شریف آباد جا کر شریفوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چاہتے تھے۔'' فرید نے کہا۔

''یہ ایک علیحدہ بات ہے۔ میں بات کر رہا ہوں اس گندگی جو تم یہاں گھول رہے ہو اور بیوی بچے کے سامنے گھول رہے ہو۔''

''یہ گندگی نہیں ہے، چھوٹی موٹی خوشی ہے اور ایسی خوشیاں منانے کا حق ہے ان لوگوں کو۔ کچھ بھی ہے ابھی یہ لوگ زندہ ہیں، سانس لے رہے ہیں، باقی رہی بات بیوی ..... کی تو میں نے انہیں اس ماحول سے بالکل الگ تھلگ رکھا ہوا ہے۔''

''تم نے جو الگ رکھا ہوا ہے وہ ابھی میں نے تھوڑی دیر بعد دیکھا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''ابھی جب تم سب گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے میں نے کھڑکی کھول کر اس ..... طے میں دیکھا تھا۔ تمہارے ساتھی مدہوش پڑے تھے اور ان میں سے ایک رقاصہ بھی تھی۔ ایک بندے کے ساتھ ایک ہی کمبل کے نیچے پڑی تھی۔ اور یہ نظارہ صرف میں نے ہی نہیں، میرے ساتھ تمہارے بیٹے ٹیپو نے بھی کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس سے پہلے بھی ایسے تماشے دیکھتا رہا ہوگا۔''

فرید حیرت سے رستم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رستم نے ایک جھٹکے سے کھڑکی کھولتے ہوئے کہا۔ ''وہ شہتوت دیکھ رہے ہو ناں، اس کے پیچھے کھڑا تھا ٹیپو اور وہ طوائف وہاں کھوندر کے پاس پڑی تھی، اپنے عارضی خصم کے ساتھ۔''

فرید چند لمحے خاموش رہا۔ یوں لگا جیسے اسے جواب نہیں سوجھ رہا۔ کبھی کبھی بندے کا لاجواب ہونا ہی اسے بھڑکا دیتا ہے۔ فرید کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ تپ کر بولا۔ ''رستم کیا بات ہے؟ تم جب سے آئے ہو اکھڑی اکھڑی باتیں ہی کر رہے ہو۔ مجھے لگتا ہی نہیں کہ میں اس رستم سے مل رہا ہوں جسے میں جانتا ہوں۔ یار! کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ اگر تمہارے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہوئی ہے تو اس میں دوسروں کا کیا گناہ ہے۔ تم نے آتے ساتھ ہی سب کو ذرا سہما کر رکھ دیا ہے۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کر رہے ہو۔ گوہرا کو مار مار کر الگ بے حال کر دیا ہے.....''

''تم اصل بات سے ہٹ رہے ہو فرید! میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ تم اپنے آلے دوالے اتنا گند کیوں بکھیر رہے ہو۔ کہاں گئے تمہارے اصول اور تمہارے اونچے ارادے.....''

''تم تو مجھ سے یہاں کا سارا حساب کتاب مانگو گے۔ پلسیوں کی طرح مجھ سے پوچھ گچھ کرو گے اور اگر میں نہ بتاؤں تو پھر میرے ساتھ بھی مار ماری کرو گے۔ میری کھلوڑی ادھیڑ

دو گے۔''

''میں تمہیں مارنے والا کون ہوتا ہوں۔ تم یہاں کے کرتا دھرتا ہو، مالک ہو۔ الٹا تم مجھے یہاں سے دھکا مار کر نکال سکتے ہو اور نکالے جانے سے اچھا ہوتا ہے کہ بندہ خود نکل جائے۔''

''تم خواہ مخواہ بات کو بڑھا رہے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارا دماغ چکرایا ہوا ہے۔ پہلے اپنے دماغ کے چکر اتارو۔ خود کو اور دوسروں کو عذاب میں نہ ڈالو۔'' فرید نے کہا اور بھنایا ہوا باہر نکل گیا۔

رستم اٹھ کر کمرے کی مختصر جگہ میں ٹہلنے لگا۔ اس کے سینے میں کرب کا دھواں تھا...... بہرحال فرید اور رستم کی یہ تلخی زیادہ دیر برقرار نہیں رہی۔ بمشکل پانچ منٹ بعد فرید واپس آ گیا۔ اب اس کے چہرے پر تمتماہٹ نہیں تھی۔ اعصاب کا تناؤ بھی کم نظر آ رہا تھا۔ وہ سگریٹ کے گہرے کش لیتا رستم کے قریب ہی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے رستم کو سگریٹ پیش کی۔ رستم نے سر کو نفی میں جنبش دی۔ پانچ دس سیکنڈ تک خاموشی رہی۔ پھر فرید نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''رستم تمہیں یہاں آ کر کچھ باتیں بُری لگی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ایسا ہوا ہے لیکن اس کے پیچھے ایک وجہ ہے۔''

رستم نے اپنے سینے کی تپش کو جھیلتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری طرح میں بھی جانتا ہوں کہ نادر کاکا نے یہاں کچھ اصول بنائے تھے۔ ہمارے یہاں کے رہن سہن میں عورت کا دخل بہت کم تھا اور یہ معاملہ اب سے تین چار مہینے پہلے تک ویسے ہی چل رہا تھا لیکن تین چار مہینے پہلے ایک ایسی بات ہوئی جس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔''

اس نے توقف کر کے نیا سگریٹ لگایا اور بولا۔ ''شاید یہاں آتے ہوئے تمہاری نظر قبروں پر پڑی ہو۔ وہاں تمہیں ایک نئی قبر نظر آئی ہوگی۔ دائیں طرف جنتر کے پاس..... نظر پڑی تھی تمہاری؟''

''ہاں، تم آگے بات کرو۔''

''پتا ہے یہ قبر کس کی ہے؟ یہ میرے بھانجے ابا گیر کی ہے۔ جن دنوں تم یہاں سے گئے انہی دنوں اس کے یہاں آنے کے اسباب پیدا ہوئے تھے۔ گجرات کے موضع جمالی میں دس ایکڑ اراضی کے تنازعے میں ابا گیر نے اپنے ایک تایازاد پر گولی چلائی جس سے اس کی ٹانگ ضائع ہوگئی۔ ابا گیر کا چھوٹا بھائی بھی زخمی ہوا۔ ابا گیر کا تایا اثر و رسوخ والا تھا۔ پولیس میں اس

کی جان پہچان بھی تھی۔ اس نے ابا گیر پر کئی کیس بنوا دیئے۔ اس کا ارادہ ابا گیر کو پولیس مقابلے میں مروانے کا تھا۔ ابا گیر کو کسی نے بتا دیا کہ وہ جب بھی پکڑا گیا اسے مار دیا جائے گا...... وہ بھاگ کر یہاں میرے پاس آ گیا۔ بالکل جوان تھا وہ...... جب یہاں آیا مشکل سے انیس بیس سال کا ہوگا۔ یہ دیکھو اس کی تصویر۔''

فرید نے ایک رنگین تصویر رستم کو دکھائی۔ یہ گھونگھریالے بالوں والے ایک نہایت صحت مند لڑکے کی تصویر تھی۔

رستم کو فرید کی آنکھوں میں گہرے دکھ کے آثار نظر آئے۔ وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ ''ابا گیر ہمارے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم میں سے بہت سوں کو گولی مار دینے کا آرڈر ہے۔ ہمارے سروں کی قیمتیں مقرر ہیں۔ وہ ایک معمولی جرم کر کے ہمارے بڑے جرموں میں حصے دار بننا کیوں چاہتا ہے لیکن شاید وہ پولیس سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ خاص طور پر ڈی ایس پی ریاض سے۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ اس کا کیس ڈی ایس پی ریاض کے سپرد ہو گیا ہے اور یہ بھی وہ جانتا تھا کہ ریاض بندے کو مکھی کی طرح مار دیتا ہے۔ وہ یہاں سے واپس نہیں گیا اور ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ اب پچھلے دو ڈھائی سال سے وہ یہیں تھا۔ وہ بڑا ہنس مکھ اور زندہ دل تھا۔ جہاں بیٹھتا تھا رونق لگا دیتا تھا۔ اس کی موت نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے فرید کی آواز غم سے لبریز ہو گئی۔

''کیا ہوا تھا اسے؟''

''ہونا کیا تھا۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے گولی ماری۔'' فرید نے کہا اور گم صم ہو گیا۔

تقریباً نصف منٹ بعد اس نے خود ہی اس خاموشی کو توڑا اور بولا۔ ''وہ پچھلے ڈھائی سال میں دس بارہ دفعہ ہمارے ساتھ کام (ڈکیتی) پر گیا۔ وہ ان سارے اصولوں پہ چلتا تھا جو ہم نے نادر کاکا کے ساتھ مل کر بنائے تھے لیکن ایک اصول ایسا بھی تھا جس پر چلنا اس کے لئے مشکل تھا۔ وہ جوان تھا۔ ابھی زندگی میں اس نے کچھ دیکھا نہیں تھا کہ اس ویرانے میں آ پھنسا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کے اندر عورت کے لئے تجسس تھا۔ ایک دو مرتبہ اس سے غلطی ہوئی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ نادر کاکا اس بارے میں کتنے سخت ہیں۔ نادر کاکا ان دنوں بہت بیمار تھے لیکن گروہ کے کاموں پر ان کی کڑی نظر رہتی تھی۔ میرے کہنے پر ابا گیر سنبھل گیا۔ اس کے بعد اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ نادر کاکا کے مرنے کے بعد بھی وہ سنبھلا ہی رہا، لیکن اس کے اندر ہلچل شاید وہیں پر رہی۔ وہ ہمارے گروپ میں سب سے کم

عمر تھا اور ابھی تک عورت اس کے لئے اَن دیکھی شے تھی۔ کوئی چار مہینے پہلے اس سے ایک سنگین غلطی ہوئی۔ واقعہ اس طرح ہوا کہ جہلم میں پولیس کے ایک مخبر سیٹھ خلیق خان نے ہمارے مراد گروپ کے دو بندوں کو دھوکے سے اپنے ٹرک اڈے پر بلایا اور پولیس مقابلے میں مروا دیا۔ اس واقعے کی خبر اخباروں میں بھی سرخیوں سے چھپی تھی۔ اس دھوکے کا بدلہ لینے کے لئے مراد گروپ نے سیٹھ خلیق کے گھر پر چڑھائی کی۔ سیٹھ خلیق تو ہاتھ نہیں آیا لیکن اتفاق سے اس کی بیوی ہاتھ لگ گئی۔ یہ اس کی تین بیویوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ مراد کے ساتھی اسے اٹھا لائے۔ اس لڑکی کا نام ثنا تھا۔ ہم نے اس لڑکی کی واپسی کے لئے خلیق سے دو کروڑ کا مطالبہ کیا۔ ہمیں پتا تھا کہ ایک ڈیڑھ کروڑ تو وہ دے ہی سکتا ہے۔ خلیق سے بات چیت چل رہی تھی۔ لڑکی کو ہمیں دوسرے حجرے میں رکھا گیا تھا۔ ہم ہر طرح اس کی حفاظت کر رہے تھے اور معاملہ طے ہونے پر اسے حفاظت سے واپس پہنچانے کا ارادہ بھی رکھتے تھے مگر ایک دن ابا گیر کی وجہ سے سب کچھ الٹ پلٹ ہوگیا۔ ابا گیر نے رات کو اکیلے بیٹھ کر شراب پی اور اس کے حجرے میں گھس گیا۔ اس نے لڑکی کے کپڑے پھاڑے اور اس سے زیادتی کی کوشش کرنے لگا۔ یہ رات دس گیارہ بجے کا عمل تھا۔ ہم لوگ موقع پر پہنچ گئے۔ لڑکی چلا رہی تھی اور مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ ابا گیر نے حجرے کا دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ میں نے دروازہ پیٹا اور اسے آوازیں دیں کہ وہ دروازہ کھول دے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ نشے اور لڑکی کی قربت کی وجہ سے وہ بالکل اندھا ہو رہا تھا۔ میں نے کاٹھیا اور جیدے کو دروازہ توڑنے کا حکم دیا۔ انہوں نے ایک وزنی پتھر مار مار کر دروازے کی کنڈیاں توڑ دیں۔ میرے پاس سیون ایم ایم رائفل تھی۔ میں حجرے میں گھسا، ابا گیر وہاں نہیں تھا۔ وہ لڑکی کو لے کر پچھلے دروازے سے تین نمبر کھوندر (سرنگ) میں چلا گیا تھا۔ فرش پر بس لڑکی ثنا کے پھٹے ہوئے کپڑے پڑے تھے۔

میں ان دونوں کے پیچھے کھوندر میں گیا۔ لڑکی کے رونے چلانے کی آوازیں کھوندر کے درمیان سے آ رہی تھیں میں نے پھر ابا گیر سے کہا کہ وہ لڑکی چھوڑ دے۔ یہ ہمارے پاس امانت ہے۔ اس نے جواب میں کہا ''ماموں! چلا جا میں نے ابھی اسے نہیں چھوڑنا'' اس کی آواز نشے کی وجہ سے پہچانی نہیں جا رہی تھی۔

میں آگے بڑھا تو اس نے گولی چلا دی۔ اس کے پاس AK56 رائفل تھی اور تمہیں پتا ہی ہے کہ وہ کیا بلا ہوتی ہے۔ میں نے اسے دو تین بار سمجھایا لیکن اس نے ایک نہیں سنی، مجبوراً مجھے بھی گولی چلانا پڑی۔ لڑکی کی آوازیں آنا بند ہوگئی تھیں۔ بعد میں پتا چلا وہ بے ہوش ہوگئی

تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے پر فائر کئے۔ وہ مجھے لڑکی سے دور رکھنے کے لئے گولی چلا رہا تھا اور میں اس لئے چلا رہا تھا کہ وہ لڑکی کو چھوڑ کر آگے نکل جائے۔ اسی دوران میں وہ مجھے نظر آ گیا۔ وہ بھاگ کر ایک پتھر کے پیچھے پوزیشن لے رہا تھا۔ میں نے اسے زخمی کرنے کے لئے اس کی ٹانگوں میں گولی ماری لیکن شاید اس کے سانس پورے ہو چکے تھے۔ گولی اس کی ناف میں لگی۔ وہ وہیں گرا اور پانچ دس منٹ کے اندر ختم ہوگیا۔ یہ نئی قبر..... میرے اسی بائیس سنال کے کنوارے بھانجے کی ہے'' آخری الفاظ کہتے کہتے فرید کی آواز بھرا گئی اور بڑی بڑی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

رستم بڑی خاموشی سے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اس نے گولڈ لیف کی ڈبیا سے سگریٹ لیا اور اسے سلگاتے ہوئے بولا ''اور وہ لڑکی؟''

''اسے بعد میں صرف پندرہ لاکھ کے بدلے ہمیں چھوڑنا پڑا۔''

دونوں خاموش ہو گئے۔ اپنی اپنی جگہ گہری سوچ میں کھوئے رہے۔ چھجے کے اس کمرے سے باہر جنریٹر کی مدھم ''گھوں گھوں'' سنائی دیتی رہی اور ٹیلی ویژن چلنے کی آواز آتی رہی۔ رات کے جشن کے بعد تھک ہار کر سو جانے والے اب آہستہ آہستہ بیدار ہو رہے تھے اور روزمرہ کے کاموں کی طرف توجہ دے رہے تھے۔ ساتھ والے کمرے سے ناشتے کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ غالباً پراٹھے اور حلوہ وغیرہ تیار ہو رہا تھا۔

لالہ فرید گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اور سرخی ایک ساتھ دکھائی دے رہی تھی۔ جواں سال بھانجے کی تصویر کا اوپری کنارہ اس کی قمیص کی جیب سے جھانک رہا تھا۔ وہ ایک گہری اور بوجھل سانس لے کر بولا ''ابا گیر مر گیا لیکن میرے دماغ میں کئی سوال چھوڑ گیا۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے کہ یہاں آنے والے لوگ یہاں کیوں پہنچے..... اور انہیں یہاں آنا چاہئے تھا یا نہیں..... بہرحال یہ بات صاف ہے کہ وہ لوگ بھی بندے بشر ہیں۔ ان میں بھی وہ ساری سوجھیں اور ضرورتیں موجود ہیں جو عام لوگوں میں ہوتی ہیں۔ یہ پولیس کے ہاتھوں مرنے یا پھانسی چڑھنے سے پہلے برسوں تک اس ویرانے میں اکیلے بھٹکتے ہیں۔ بہت سی دوسری حسرتوں کی طرح ان کے دل میں عورت کی حسرت بھی ہوتی ہے اور اس حسرت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ میں نہیں کر سکتا، تم بھی نہیں کر سکتے، نادر کاکا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تم جانتے ہی ہو مارگلہ میں نادر کاکا کی رکھیل تھی جس سے ملنے کے لئے وہ تڑپتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار جان پر کھیل کر وہ اس سے ملنے جاتا بھی تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ناں؟''

رستم خاموش رہا۔

فرید بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ابا گیر کے مرنے کے بعد میرے دل پر بہت زیادہ بوجھ پڑ گیا۔ مجھے لگا ابا گیر کی جگہ مجھے مرنا چاہئے تھا۔ میں نے تو دنیا دیکھی ہے، برتی ہے، اب ان پہاڑوں میں بھی بیوی کے ساتھ رہتا ہوں۔ اپنے بچے کا منہ چومتا ہوں۔ ابا گیر کی جگہ مجھے مرنا چاہئے تھا۔ میں کئی دن تک انہی سوچوں میں غرق رہا۔ ایک دفعہ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ کچھ ملکوں میں اب حکومتیں یہ انتظام کر رہی ہیں کہ کبھی کبھی قیدیوں کو بھی اپنی بیویوں سے ملنے کا موقع دیا جائے۔ مطلب یہ کہ انسان قید ہو کر رہتا تو انسان ہی ہے۔ اگر ہمیں ان پہاڑیوں کا قیدی سمجھ لیا جائے تو پھر ہمارے لئے بھی اسی طرح کی رعایت ہونا ضروری ہے۔ ہر ہفتے نہ سہی، ہر مہینے نہ سہی، سال میں دو چار بار ہی سہی، کبھی کبھار ہی سہی۔ ان پہاڑوں کے قیدیوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ان میں سے بہت موں کی بیویاں ہی نہیں ہیں۔ جن کی تھیں سب مہناز کی طرح اس قتل گاہ میں آنے کی ہمت نہیں کر سکتیں۔ تو پھر ان سے کون ملنے آئے گا، کون ان کے ادھورے پن کو دور کرے گا؟ یہ سوال بار بار مچھ کی طرح میرے دماغ میں گڑ جاتا تھا۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں وہی کچھ کروں گا جو نادر کاکا کے دور کے شروع شروع کے سالوں میں ہوتا رہا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ یہ سب کچھ ایک حد کے اندر ہوگا۔ وہ افراتفری نہیں ہوگی جو ان دنوں میں مچا کرتی تھی اور جس کی وجہ سے ہمیں اگلا ڈیرہ چھوڑنا پڑا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اب پھر رنگ برنگی طوائفیں اور کسبیاں ڈیرے والوں کا رانجھا راضی کرنے کے لئے یہاں کے دورے کیا کریں گی؟''

''میں نے کہا ہے ناں رستم! یہ سب کچھ طریقے کے مطابق ہوگا اور ایک حد کے اندر ہوگا۔ تمہیں پتا ہی ہے، میں ان معاملوں میں کتنا سخت ہو جاتا ہوں۔ یار! تم سے زیادہ کون جانتا ہوگا مجھے اگر تم بھی ایسی باتیں کرو گے تو مجھے دکھ ہوگا۔'' فرید کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی آ گئی۔

رستم نے فرید کے پیکٹ سے دوسرا سگریٹ لیا اور قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ''لیکن ان قسموں وعدوں کا کیا ہوگا جو تم سب نے نادر کاکا کے ساتھ کئے تھے اور جن میں تم سب سے آگے آگے تھے۔''

''ان قسموں وعدوں میں سب سے بڑا وعدہ یہی تھا کہ کام (ڈکیتی) کے دوران میں کسی عورت پر ہاتھ نہیں ڈالا جائے گا۔ اس کی عزت سے نہیں کھیلا جائے گا۔ یہی وعدہ تھا ناں.....؟

اور میں سمجھتا ہوں رستم! کہ اگر ہم اس سب سے بڑے اور ضروری وعدے کو توڑنا نہیں چاہتے تو پھر ہمیں تھوڑی سی نرمی برتنا پڑے گی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں، اس سب سے خاص ''وعدے'' کو بچانے کے لئے کر رہا ہوں۔ جو کچھ ابا گیر کے ساتھ ہوا وہ ہم سب کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔ ذرا سوچ، میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں اور اگر غلط ہے بھی تو حالات کی مجبوریاں اور ہماری بدقسمتیاں یہ غلطی کرنے پر مجبور کر رہی ہیں۔''

رستم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تاہم اس کے تاثرات فرید کو بتا رہے تھے کہ وہ اس سے مزید بحث نہیں کرنا چاہتا۔

اتنے میں پردے کے پیچھے سے ناشتے کی خوشبو اور مہناز کی آواز ایک ساتھ ابھری۔ مہناز، فرید سے کہہ رہی تھی کہ وہ ناشتے کی ٹرے پکڑ لے۔

رات کو پھر جشن ہوا لیکن آج یہ سلسلہ ایک نمبر کھوندر کے اندر تھا۔ آگ وغیرہ بھی اندر ہی جلائی گئی تھی۔ گانے بجانے کی آوازیں باہر تک آ رہی تھیں لیکن بہت مدھم تھیں۔ رقاصہ چاندی ڈیرے کے چھوروں کو وہی بارش والا مقبول گانا سنا رہی تھی اور زبردست داد پا رہی تھی۔

لالہ فرید اس جشن میں شریک نہیں ہوا تھا اور آج چھجے کے کمرے میں رستم کو کمپنی دے رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے دونوں ناصر سے مل کر آئے تھے۔ ناصر پچھلے ڈھائی سالوں میں پہلے سے کچھ سانولا ہو گیا تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ یہاں ڈیرے پر اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتے ہوئے وہ مضروب گوہرا کی دیکھ بھال کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے دو نمبر سرنگ میں اپنا ایک چھوٹا سا کلینک بنا لیا تھا۔ یہ کلینک لکڑی کی دو الماریوں اور ایک چھوٹی تپائی پر مشتمل تھا۔ یہیں پر ایک لکڑی کے تخت پر گدیا بچھا کر گوہرا کو لٹایا گیا تھا۔ اس کے ٹوٹے بازو پر ناصر نے باقاعدہ پلاستر کیا تھا اور آنکھ کے اردگرد کچھ ٹانکے لگائے تھے۔ ساتھ ہی یہ امید ظاہر کی تھی کہ گوہرا کی آنکھ بچ جائے گی۔

دو دن پہلے ہونے والی بارش کے سبب ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ پوشوہار کے مخروطی ٹیلے ایک سرد تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ نادیہ ایک ٹرے میں چائے اور ابلے ہوئے انڈے لے کر اندر آئی۔ اس کے سر پر ابھی تک پٹی موجود تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا کہ وہ یہاں فرید کی بیوی کے ساتھ مطمئن ہے۔

اس کی موجودگی میں فرید نے نظریں جھکائے رکھیں، جیسے وہ ڈکیت نہ ہو کسی درس گاہ میں بیٹھا ہوا واعظ ہو۔ وہ چلی گئی تو فرید نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم برا نہ مانو تو

''ایک بات پوچھوں رستم؟''

''پوچھو۔''

''بی بی اب کہاں ہے؟''

''اپنے گھر والوں کے پاس۔''

''بی بی کو تو پولیس سے کوئی ڈر نہیں؟''

''ڈر تو ہے لیکن زیادہ نہیں، بی بی کے وارث اس معاملے کو بڑی اچھی طرح سنبھال سکتے ہیں۔''

چند لمحے بعد فرید نے جیسے ہمت کر کے کہا۔''اس کا مطلب ہے بی بی شانی سے تمہارا راستہ جدا ہو گیا ہے۔''

''شاید۔''

''ہمیشہ کے لئے؟''

''ہاں۔'' یہ ایک لفظ کہتے ہوئے رستم کو آگ کے ایک سمندر میں سے گزرنا پڑا۔

دونوں خاموش ہو گئے۔ رستم کی چائے اس کے سامنے پڑی ٹھنڈی ہوتی رہی۔ کافی دیر بعد فرید نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔''رستم، تمہیں ایک مشورہ دوں۔ چاہے تو مان لینا چاہے نہ ماننا، لیکن بُرا نہ منانا۔''

''کہو۔''

''اگر بی بی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ آئے ہو تو پھر اس لڑکی سے شادی کر لو جو تمہارے ساتھ آئی ہے۔ یہ لڑکی تمہیں بہت چاہتی ہے اور شاید تم بھی اسے ناپسند نہیں کرتے۔ اگر ناپسند کرتے تو تمہارے ساتھ یہاں نہ ہوتی۔''

رستم کیسے بتاتا۔ اس کی اپنی پسند اور ناپسند تو ختم ہو چکی ہے اور جو کچھ تھا وہ بی بی کی مرضی میں غرق ہو چکا تھا اور یہ ایکٹرس بھی بی بی کی مرضی کی وجہ سے یہاں نظر آ رہی ہے۔ وہ بی بی کے ساتھ تعلق میں بہت آگے جا چکا تھا۔ اب تو اسے اپنے جسم سے بھی بی بی کی خوشبو آتی تھی۔ اپنے اردگرد کی ہر خوبصورت شے میں بی بی کا عکس دکھائی دیتا تھا۔ اس کے سینے میں اگر دھڑکن تھی تو بی بی کے لئے تھی اور اگر وہ سانس لیتا تھا تو یہ بھی بی بی کے لئے لیتا تھا۔

کچھ ہوش نہیں رہتا، کچھ دھیان نہیں رہتا
انسان محبت میں انسان نہیں رہتا

سات آٹھ دن مزید گزر گئے۔ رستم کے زخم تیزی سے مندمل ہو رہے تھے۔ اس کی آواز

اب بھی بھرائی ہوئی تھی تاہم پہلے سے صاف تھی، ویسے بھی وہ بہت کم بولتا تھا۔ ٹانگ کے ایک زخم کی وجہ سے چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ اب بھی موجود تھی۔ سینے میں مسلسل روشن رہنے والی آگ کے سبب اس کی آنکھیں ہر وقت جلتی رہتی تھیں اور چہرہ ایک گھمبیر خاموشی کی زد میں رہتا تھا...... اس کے تیور دیکھ کر کسی کو اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی صرف فرید، اس کی بیوی یا نادیہ ہی ضرورت کے وقت اس سے بات کرنے کی ہمت کرتے تھے۔ نادیہ، فرید کی بیوی مہناز اور بچے ٹیپو کے ساتھ ایک کمرے میں رہ رہی تھی۔ فرید بھی رستم کے ساتھ سو جاتا تھا۔ کبھی ساتھ والے کمرے میں۔

رقاصائیں صرف تین چار دن کے لئے یہاں آئی تھیں لیکن پھر ان کا قیام بڑھ گیا۔ وہ آٹھویں روز ڈیرے سے روانہ ہوئیں۔ وہ تحفوں اور نوٹوں سے لدی پھندی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد ڈیرے پر معمول کی زندگی لوٹ آئی۔ ڈیرے پر بکریوں کے تین چھوٹے ریوڑ موجود تھے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے مرغیاں بھی پال رکھی تھیں۔ اناج باہر سے ہی آتا تھا۔ ڈیرے پر ڈاکوؤں اور مفروروں کے تین گروہ موجود تھے۔ ایک کو نادر کا گروپ کہا جاتا تھا۔ دوسرے کو مراد گروپ اور تیسرا گجراتی گروپ۔ ان تینوں گروپوں کا سردار فرید ہی تھا۔ نادر کا گروپ اور گجراتی گروپ تو یہاں پہلے سے موجود تھے لیکن مراد گروپ رستم کے جانے کے بعد وارد ہوا تھا۔ ان تینوں گروپوں کے کل افراد [illegible] تھے لیکن ان میں عورتیں صرف چار ہی تھیں۔ ایک فرید کی بیوی مہناز جسے [illegible] بڑے سب بھرجائی کہتے تھے۔ ایک حسینے گجراتی کی بیوی شاہدہ اور ایک ادھیڑ عمر عورت حنیفاں، جو چند سال پہلے اکٹھے تین قتل کر کے یہاں آئی تھی اور اسی ماحول کا حصہ بن چکی تھی۔ چوتھی عورت نادیہ تھی جو سات آٹھ دن پہلے رستم کے ساتھ یہاں پہنچی تھی۔

یہاں ڈیرے پر دو جنریٹرز موجود تھے جن سے ٹی وی اور وی سی آر وغیرہ چلائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ دو چار خاص خاص جگہوں پر بلب بھی روشن کئے جاتے تھے۔ یہاں موجود لوگوں کے پاس جدید ترین اسلحہ، ہینڈ گرینیڈ اور راکٹ تک موجود تھے۔ ڈیرے تک آنے والے راستے دو ہی تھے اور یہ خاصے دشوار گزار تھے۔ مزید احتیاط کے طور پر یہاں بارودی سرنگیں بھی بچھا دی گئی تھیں۔ ڈیرے پر دو طاقتور وائرلیس سیٹ موجود تھے۔ ایک بالکل جدید ماڈل کا جرمن سیٹ تھا اور اس کی رینج 80 کلومیٹر سے زائد تھی۔ اس وائرلیس سیٹ کو خاص تکنیک کے ذریعے تقریباً تیس کلومیٹر دور ایک دوسرے لانگ رینج وائرلیس سے لنک کیا جاتا تھا اور گوجر خان کے ایک قریبی گاؤں میں بات چیت کی جاتی تھی۔ جگ وال نامی اس

گاؤں سے لالہ فرید کے دو مخبر اسے آباد دنیا کی تازہ ترین خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔

رات دس بجے کا وقت تھا۔ رستم کمرے میں دری پر چت لیٹا تھا۔ اس کا سر گاؤ تکیے پر تھا۔ گریبان ادھ کھلا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ گریبان کے اندر تھا اور وہ بے خیالی میں آہستہ آہستہ اپنے بالوں بھرے سینے کو سہلا رہا تھا۔ سینے پر کئی جگہ "B" کا حرف گدا ہوا تھا۔ جن دنوں وہ رنگ والی کی حویلی میں بی بی کی خاطر بطور مالی کام کر رہا تھا اور ایک سروٹ کوارٹر میں رہتا تھا اس کے دل کی حالت عجیب ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ ایک سترہ اٹھارہ سالہ عاشق لڑکے کی طرح سوچنے لگتا تھا۔ انہی دنوں اس نے برف توڑنے والے ایک چھوٹے سوئے کی مدد سے اپنے سینے کو لہولہان کیا تھا اور کئی جگہ بی بی کے نام کا پہلا حرف "B" اپنے سینے میں گودا تھا۔ آج بھی وہ ان حروف پر اپنی پوریں گھماتا تھا تو اسے وہی لذت ملتی تھی جو ان حروف کو کندہ کرتے ہوئے ملی تھی۔

اچانک ایک آواز نے اسے چونکایا۔ فرید لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں چائے کے دو کپ تھے۔ وہ آلتی پالتی مار کر رستم کے سامنے بیٹھ گیا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے سیٹ (وائرلیس) پر نظام سے میری بات ہوئی ہے۔" اس نے اطلاع دی۔

نظام اس پیامبر کا نام تھا جو جگ والی گاؤں سے اسے ارد گرد کی خبریں پہنچاتا تھا۔

رستم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے فرید کا چہرہ دیکھنے لگا۔

فرید نے چسکی لیتے ہوئے کہا۔ "پولیس کملوں جھلوں کی طرح تمہیں ہر جگہ تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ گوجرانوالہ، گجرات، جہلم کے ضلعوں میں یہ لوگ چپہ چپہ چھان رہے ہیں۔ امید ہے کہ ایک دو ہفتے میں تمہارے سر کی قیمت بھی مقرر ہو جائے گی۔ اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی ہے کہ لاہور کے اعلیٰ افسروں نے تمہاری تلاش کا کام اسی حرامزادے قصائی ڈپٹی ریاض کے سپرد کیا ہے۔ وہ اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ گوجرانوالہ میں موجود ہے اور ہر طرف اپنے شکاری کتے چھوڑ رہا ہے۔" رستم کے چوڑے سینے میں ایک لہر سی نمودار ہو کر اوجھل ہو گئی۔ وہ ریاض کو اس وقت سے جانتا تھا جب وہ انسپکٹر تھا۔ اس کی دہشت بے مثال تھی۔ اسے جرائم پیشہ حلقوں میں ہٹلر کا خطاب دیا جاتا تھا۔ اب یہ ہٹلر پچھلے دو ڈھائی سالوں میں مزید زہریلا اور ہلاکت خیز ہو گیا تھا۔ رستم کم از کم تین ایسے افراد کو جانتا تھا جنہوں نے ریاض ہٹلر کے ہاتھوں گرفتاری کے خوف سے اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لی۔ صرف دو سال پہلے رستم کے جگری دوست زوار کا ایک دوست، ریاض سے بچنے کے لئے ایک پلازہ کی پانچویں منزل سے کود اور ہلاک ہوا تھا۔

فرید کی آواز نے رستم کو خیالوں سے چونکایا۔ "ایک اطلاع تمہارے مطلب کی بھی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"نظام نے شانی بی بی کے بارے میں بھی کچھ باتیں معلوم کی ہیں۔"

رستم کے چہرے پر عجیب چمک نمودار ہوئی۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ فرید نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا دوست حاجی حیات خان دوستی کا حق ادا کر رہا ہے۔ ورنہ حالات جتنے خراب ہیں شانی بی بی نے بڑی سخت مصیبت میں گرفتار ہو جانا تھا۔ بہرحال وہ گرفتار تو اب بھی ہے لیکن اسے سپیشل پروٹوکول مل رہا ہے۔ اس کا صرف تین روزہ ریمانڈ دیا گیا تھا۔ لیڈیز پولیس کی نگرانی میں اس سے معمول کی پوچھ گچھ ہو گئی۔ اب وہ جوڈیشل ریمانڈ پر ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں ہے۔ پانچ دن پہلے اسے میڈیکل بیس پر ہسپتال منتقل کر دیا گیا ہے جہاں وہ مکمل آرام سے ہے۔ عدالت میں جو چالان پیش کیا گیا ہے، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی مزید کیس سامنے نہ آیا تو وہ چار پیشیوں میں بی بی کی ضمانت ہو جائے گی۔"

فرید نے اس حوالے سے رستم کو کچھ مزید تفصیلات بتائیں جنہیں رستم نے بے حد دھیان سے سنا پھر اس نے فرید سے پوچھا۔ "چوہدریوں کے بارے میں کوئی اطلاع ہے؟"

"بالکل ہے۔ وہ زخمی سانپ کی طرح پھنکارتے پھر رہے ہیں کہ تم ان کے ہاتھ سے نکل گئے ہو۔ فی الحال وہ بی بی کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اب ان کا سارا غصہ عارف کمبوہ اور دراج مہتم پر اتر رہا ہے لیکن وہ دونوں بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے ہیں۔ عارف کمبوہ تو ابھی ویسے ہی موقع سے غائب ہے۔ وہ مناسب وقت پر سامنے آئے گا۔ پیچھے ہٹنے والا نہیں ہے وہ..... بڑا جی دار اور جوشیلا بندہ ہے۔ اس نے نارپور کے چوہدریوں کے خلاف کمبوہ برادری میں ایسی لہر پیدا کر دی ہے جسے اب آسانی سے روکا نہیں جا سکتا۔ بلکہ اس معاملے میں اب کئی اور برادریاں بھی عارف کا ساتھ دے رہی ہیں۔ خاص طور سے جب سے وہ لڑکی والا معاملہ ہوا ہے۔"

"کون سی لڑکی؟"

"صفیہ نام کی ایک لڑکی چوہدریوں کی کسی حویلی میں کام کرتی تھی۔ چوہدری کے ایک کم عمر نشئی لڑکے نے اس پر بُری نظر ڈالی اور کئی مہینے تک اس کی عزت سے کھیلتا رہا۔ لڑکی حاملہ ہو گئی تو اس کا بچہ ضائع کرا دیا گیا۔ اسی چکر میں لڑکی کی جان چلی گئی۔ یہ سراسر قتل کا کیس کا

تھا۔اب لڑکی کے وارث قبر کشائی کر کے لڑکی کے پوسٹ مارٹم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔''

رستم نے اپنے لمبے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیچھے کی طرف گرایا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ ان میں کچھ جل رہا ہے۔ وہ بولا۔''عارف کمبوہ اور دراج مہتم کے بارے میں پوری خبر رکھو۔انہوں نے بڑے مشکل وقت میں میری اور بی بی کی مدد کی ہے۔ میں بھی انہیں مشکل میں اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا۔''

''تم نے کہہ دیا۔سمجھو میرے لئے فرض ہو گیا۔''فرید بولا۔

''ایک خاص بات اور ہے فرید! میں بی بی جی کے بارے میں ہر وقت باخبر رہنا چاہتا ہوں۔آج میں تم سے خود اسی بارے میں بات کرنے والا تھا۔میرا خیال تھا کہ ہم اس کام کے لئے سیٹ (وائرلیس) استعمال کریں، اچھا ہوا تم نے خود کر لیا۔تم نظام سے سیٹ پر کب بات کرتے ہو؟''

''مہینے میں دو بار کبھی کبھی تین بار بھی ہوتی ہے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ ہفتے میں کم از کم ایک بار ہمارا رابطہ نظام سے ضرور ہو۔ میں نظام کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ذمے دار بندہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ جو ذمے داری ہم اسے دیں گے وہ ضرور پوری کرے گا۔''

''اس میں کوئی شک نہیں۔''

''لیکن ایک بات کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ ہماری باخبری کے بارے میں بی بی جی کو بھنک نہ پڑے۔''

''بے فکر رہو، میں اس بارے میں نظام کو اچھی طرح سمجھا دوں گا۔''

کچھ دیر بعد رستم سونے کے لئے لیٹ گیا۔فرید زخمی گوہرا کی مزاج پرسی کے لئے دو نمبر کھوندر کی طرف چلا گیا۔ گوہرا اب پہلے سے کافی بہتر تھا۔ رستم نے ابھی تک اس کی عیادت نہیں کی تھی لیکن اب وہ عیادت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ رستم کو لیٹے ہوئے آدھ پون گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ اسے کہیں پاس سے شور سنائی دیا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا ہاتھ سیدھا اپنے ماؤزر کی طرف گیا۔ ماؤزر قمیص کے نیچے گھسا کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ کھوندر نمبر دو کے سامنے لالہ فرید کسی سے لڑ رہا تھا۔لڑنے والا شاید مراد گروپ کا کوئی بندہ تھا۔ رستم کے دیکھتے ہی دیکھتے فرید نے اسے زوردار تھپڑ مارا۔اس کی ٹوپی اچھل کر دور جا گری۔ پھر فرید نے بڑی وحشت کے عالم میں اسے گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ ساتھ ساتھ وہ طیش سے چیخ رہا تھا۔''حرامزادے! تیری یہ ہمت! اپنی حیثیت دیکھ.....اپنی اوقات دیکھ کتے!''

رستم دوڑتا ہوا موقع پر پہنچا۔ اسی دوران میں رستم نے دیکھا کہ تنومند حلیے کا ایک نوجوان جس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی، تیزی سے موقع کی طرف بڑھا..... رستم نے پہچان لیا، یہ مراد گروپ کا لیڈر مراد تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح جوگرز پہن رکھے تھے اور سر کے پچھلے حصے پر گول ٹوپی اٹکائی ہوئی تھی۔ مراد ماضی میں نامی گرامی باکسر رہا تھا۔ اس کا تعلق کراچی کے علاقے لیاری سے تھا۔ مراد کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ گہرے نشے میں ہے۔ اس نے پہلے یہ کوشش کی کہ فرید اس کے ساتھی کو مارنا بند کر دے لیکن پھر فوراً ہی خود بھی بھڑک گیا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے فرید کا گریبان پکڑا اور دایاں مکا تان کر چلایا۔''چھوڑ دے لالہ.....چھوڑ دے!''

فرید نے اسے دھکا دیا تو وہ مقناطیس کی طرح دوبارہ فرید کی طرف آیا لیکن اس سے پہلے کہ اس کا طوفانی مکا فرید کے چہرے پر لگتا۔ رستم آڑے آ گیا۔ اس نے مراد کا فولادی مکا اپنے بازو پر روکا اور جواب میں اس کے سینے پر زوردار لات رسید کی۔ مراد لڑکھڑایا اور پھر شعلہ جوالا بن گیا۔ رستم نے سنا تھا کہ اس بندے کے مکوں میں جناتی طاقت ہے اور واقعی وہ اپنے اسٹائل سے ایک وحشی نیگرو باکسر ہی لگتا تھا۔ شاید رستم کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کا اولین مکا کھا کر ہی لمبا لیٹ جاتا لیکن وہ رستم تھا۔ وہ اپنی ساری پرانی دشمنیوں کے ساتھ مجسم قہر تھا۔ جان لیوا غموں کی آگ نے اس کی رگوں میں لہو کی جگہ لاوا دوڑا رکھا تھا۔ اس نے جھکائی دے کر مراد کے دو تین خوفناک مکے خالی دیئے پھر ایک ایسی زوردار ٹکر اس کی پیشانی پر ماری کہ وہ حجرے کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ رستم نے پلک جھپکتے میں قمیص کے نیچے سے ماؤزر نکالا اور اس کی سرد نال مراد کی شہ رگ پر رکھ دی۔

یہ منظر دیکھا تو فرید تڑپ کر آگے بڑھا اور اس نے رستم کا ماؤزر والا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ ''نہیں رستم.....نہیں۔ یہ نشے میں ہے، پیچھے ہٹ جاؤ۔''

ایک دم کئی افراد بیچ میں کود پڑے اور مراد اور رستم کو ایک دوسرے سے دور ہٹا دیا۔ پانچ دس منٹ کے بعد یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ڈگمگاتا ہوا مراد اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کھوندر کی طرف چلا گیا۔ رستم، فرید اور دلاور وغیرہ کے ساتھ چھجے کی طرف آ گئے۔ کمرے میں پہنچ کر رستم نے فرید سے پوچھا۔''کس بات پر جھگڑا ہوا تھا۔ بندے کو کیوں مار رہے تھے تم؟''

فرید چند سیکنڈ تک خاموش رہا پھر ڈبیا سے سگریٹ نکالتے ہوئے بولا۔''رستم! اگر مجھے دوست سمجھتے ہو تو میری ایک بات مان لو، نادیہ سے شادی کر لو اور اگر خود نہیں کر سکتے تو پھر.....کسی اور سے کرا دو۔''

''کیا بکواس ہے۔ اس لڑائی کا نادیہ سے کیا تعلق ہے؟''

''اسی سے ہے۔'' فرید نے گہرا کش لیا اور دھواں نیم وا کھڑکی کی طرف چھوڑا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''مراد کے جس بندے کی پٹائی کی ہے میں نے اس کا نام ماجد ہے۔ چکوال میں ایک لڑکی ہے جس سے پیار کرتا ہے یہ...... پرسوں مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اسے اپنی معشوق کو یہاں اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت دی جائے۔ میں نے پوچھا، کیوں؟ کہنے لگا، اگر دوسرے رکھ سکتے ہیں تو وہ بھی رکھ سکتا ہے۔ اس کا اشارہ تمہاری طرف تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میڈم نادیہ رستم کی بیاہتا بیوی ہے۔ مجبوری کے تحت اس کے ساتھ آئی ہے۔ اس وقت تو وہ چپ ہوگیا لیکن شاید اسے کسی نے بھڑکایا۔ آج پھر مجھ سے وہی تکرار شروع کردی۔ کہہ رہا تھا کہ ہم سے اندر کی باتیں چھپائی جاتی ہیں۔ میڈم، رستم صاحب کی بیوی نہیں اگر بیوی ہوتی تو ان کے ساتھ رہتی۔ وہ علیحدہ رہ رہی ہے۔''

رستم خاموشی سے فرید کی باتیں سنتا رہا۔ آخر بولا۔ ''تم چاہتے کیا ہو فرید؟''

فرید تدبر سے بولا۔ ''یہاں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میڈم نادیہ تمہاری منکوحہ بیوی ہے اور مجبوری کے تحت تمہارے ساتھ آئی ہے لیکن کچھ ماجد کی طرح شک کا شکار ہیں۔ مجھ سے زیادہ تم ان معاملات کو سمجھ سکتے ہو رستم۔ اس طرح کے شک ٹھیک نہیں ہوتے...... نااتفاقی پیدا کرتے ہیں، دلوں میں فاصلے پیدا کرتے ہیں۔ میں تم پر کوئی بات ٹھونس نہیں سکتا، صرف مشورہ دے سکتا ہوں اور مشورہ یہی ہے کہ تم نادیہ سے نکاح کرلو اور اس کے ساتھ رہو اور اگر کسی وجہ سے ایسا نہیں کرسکتے تو پھر کسی اور سے اس کا نکاح کرادو لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوسکے گا۔ وہ اس بات کو کسی صورت پسند نہیں کرے گی۔''

رستم خاموش رہا۔ فرید بھی خاموشی سے کچھ سوچتا رہا۔ کچھ دیر بعد فرید بولا۔ ''ایک طریقہ اور ہے۔ تم نادیہ کو بظاہر بیوی بنالو۔ اس کے ساتھ ایک کمرے میں رہنا شروع کردو۔ شک کرنے والوں کا شک دور ہوجائے گا اور جن کی نظر میلی ہے، وہ بھی صاف ہوجائے گی۔ مہناز کو سب بھرجائی کہتے ہیں، تمہاری میڈم کو چھوٹی بھرجائی کہنے لگیں گے۔ ٹنٹا ختم ہوجائے گا۔''

رستم کے چہرے پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔ ''لیکن اس کے ساتھ ایک کمرے میں رہنا اور بیوی نہ ہوتے ہوئے بھی اسے بیوی کہنا......'' وہ تذبذب کے عالم میں بولا۔

''یار! تمہاری اتنی باتیں مانی ہیں۔ میری خاطر ایک بات نہیں مان سکتے تم...... مجھے

تمہاری مدد کی ضرورت ہے یار اور یہ مدد کرنے میں تمہارا کچھ بگڑتا بھی نہیں۔ میڈم نادیہ تو تمہاری بے دام کی غلام ہے تم جس طرح کہو گے وہ اسی طرح رہے گی تمہارے ساتھ۔ چون و چرا نہیں کرے گی۔''

رستم اور فرید کے درمیان اس موضوع پر ڈیڑھ دو گھنٹے بات ہوئی۔ آخر رستم نیم رضامند نظر آنے لگا۔ اس کی نیم رضامندی کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے ڈیرے پر آنے کے بعد فرید اپنے بیوی بچے سے دور ہوگیا ہے۔ نادیہ چونکہ مہناز اور ٹیپو کے ساتھ رہتی تھی اس لئے فرید کو علیحدہ کمرے میں رہنا اور سونا پڑ رہا تھا۔

دو دن بعد نادیہ، رستم کے کمرے میں آگئی۔ اس نے ادھر اُدھر بکھری ہوئی چیزیں بڑے سلیقے سے لکڑی کی الماری میں رکھیں۔ کمرے کی خوب صفائی ستھرائی کی اور کچھ پھول لاکر شراب کی ایک خالی بوتل میں سجائے۔ کھانا معمول کے مطابق ایک ہی کچن میں پکا تاہم رستم اور نادیہ نے اپنے کمرے میں کھانا کھایا۔

نادیہ، مہناز کے فراہم کردہ کپڑوں میں تھی۔ یہ کپڑے اسے کھلے تھے پھر بھی اس کا سیماب بدن لباس کے اندر مچلتا، بل کھاتا محسوس ہوتا تھا۔ رات کو جب لالٹین کی لو مدھم کرکے وہ چٹائی پر سونے لگے تو رستم نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ''میری ایک بات بہت دھیان سے سن لو، مجھے یہ سب کچھ سخت مجبوری کی وجہ سے کرنا پڑا ہے۔ اپنے دل میں کسی طرح کی غلط فہمی کو جگہ مت دینا۔ نہ اب نہ آئندہ کبھی۔''

''میں دوسروں کو اپنے اور تمہارے بارے میں کیا بتاؤں؟''

''وہی جو تمہیں فرید نے بتایا ہے۔ ہم دونوں شادی شدہ ہیں، لیکن ایک بار پھر تمہیں بتا دیتا ہوں، نہ مجھ سے کوئی توقع رکھنا، نہ کسی طرح کی بھونڈی حرکت کرنا اور وہ جو بادشاہ اور لونڈی والی بات تم بار بار دہراتی ہو، اسے دہرانے کی ضرورت بھی نہیں۔''

''اتنے بے حس نہ بنو رستم، مجھے اس چھوٹی سی خوشی سے تو محروم نہ کرو۔ یقین کرو میں کوئی طنز نہیں کرتی ہوں۔ جب خود کو تمہاری لونڈی کہتی ہوں اور تمہیں ایک بادشاہ کی طرح دیکھتی ہوں تو ایک عجیب سا سکون ملتا ہے مجھے۔ لگتا ہے کہ کچھ نہ ملتے ہوئے بھی بہت کچھ مل گیا ہے۔''

''پھر وہی بک بک؟'' رستم نے تپ کر کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ فی الحال میں کچھ نہیں کہتی۔'' وہ کانپ کر بولی اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

''اس کمرے میں تمہیں اسی طرح رہنا ہوگا جیسے ایک عورت غیرمحرم کے سامنے رہتی ہے۔''

''مم...... میں سمجھی نہیں۔''

''یہ چادر لو اپنے اوپر اور چہرہ اور سر بھی ڈھک کر رکھو۔'' رستم بے حد بے زاری سے بولا۔ نادیہ نے فوراً عمل کیا لیکن رات کے پچھلے پہر جب رستم پانی پینے کے لئے اٹھا تو اس نے لالٹین کی مدھم روشنی میں دیکھا وہ بے خبر سو رہی تھی۔ بے ترتیب اور آڑی ترچھی۔ اس کا ہیجان خیز جسم نگاہوں کو چکا چوند کر رہا تھا۔ رستم کی پیشانی پر ناگواری کی گہری شکنیں ابھریں۔ اس نے ایک طرف پڑا کمبل دور ہی سے اس پر پھینک دیا۔

اگلے روز شام کو مراد خود رستم کے پاس پہنچا۔ اس نے گزشتہ رات ہونے والے واقعے پر رستم سے معافی مانگی اور بتایا کہ وہ نشے میں تھا۔ اسی دوران میں فرید بھی آ گیا۔ تینوں کھل مل کر باتیں کرتے رہے۔ مراد کے جانے کے بعد فرید نے رستم کو بتایا۔ ''آج میں نے کھل کر اعلان کر دیا ہے۔''

''کس بات کا؟'' رستم نے پوچھا۔

''یہی کہ تم اور نادیہ میاں بیوی ہو۔ وہ ساری چہ میگوئیاں ختم ہو گئی ہیں جو اب تک ہو رہی تھیں۔ یہ ہم سب کے لئے بہت اچھا ہوا ہے۔ تمہیں یاد ہے، نادر کاکا کہا کرتے تھے کہ پوٹھوہار کے یہ ٹیلے پولیس کی گولیوں سے تو نجات دے دیتے ہیں لیکن آپس کی نااتفاقی پولیس کی گولیوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔''

رستم خاموش رہا۔ اس کے لمبے بال ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے اس کی پیشانی پر جھولتے رہے۔

فرید نے کہا۔ ''گوہرا کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے، میرا خیال ہے اب تمہیں بھی جا کر اس کا حال پوچھ لینا چاہئے۔''

''کہاں ہے وہ؟''

''ابھی ناصر کے دواخانے میں ہی ہے۔''

اسی روز رستم، فرید کے ساتھ گوہرا کے پاس گیا اور اس کی خیر خیریت دریافت کی۔ گوہرا نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میری وجہ سے تمہیں دکھ پہنچا۔ اس کے لئے میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔''

''معافی تو مجھے بھی مانگنی چاہئے۔ میں اس وقت اپنے ہوش میں نہیں تھا۔'' رستم نے

گوہرا کا زخمی ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں لالے دی جان۔ تو آ گیا ہے میرے لئے یہی بہت ہے۔ تیرے سر کی قسم، دل شیشے کی طرح صاف ہو گیا ہے میرا۔'' گوہرا نے جوش سے کہا۔

مختصر سے شکوے شکایت کے بعد دونوں بالکل نارمل ہو گئے۔

اتنے میں مراد اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ گجراتی گروپ کا حسنا گجراتی تھا۔ حسنے کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی میں کچھ بال سفید بھی تھے۔ یہ درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا شخص تھا۔ اسلحہ شناس اور ماہر نشانہ باز بھی تھا۔ جب سے رستم ڈیرے پر آیا تھا حسنا بہت خوش اور پُرجوش نظر آتا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں کینوس کا ایک لمبوترا بیگ تھا۔ بالکل ویسا جیسا کرکٹ کے کھلاڑیوں کے پاس ہوتا ہے۔ اس نے یہ بیگ گوہرا اور رستم کے درمیان فرش پر رکھا اور اس کی لمبی زپ کھول دی۔ بیگ کے اندر اسلحہ تھا۔ ایک پرانی مگر صاف ستھری لشکارے مارتی ہوئی ایل ایم جی تھی اور اس کے کوئی دو سو راؤنڈ تھے، ایک سیون ایم ایم رائفل تھی، ایک 30 انچ کی ایم ون کاربین، ایک معروف کولٹ 45 امریکن پسٹل اس کے راؤنڈز اور سائیلنسر وغیرہ تھے۔

''یہ سب تمہارے لئے ہے رستم بھائی۔'' حسنے نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

رستم نے بیگ سے سیون ایم ایم نکال لی۔ اسے دھیان سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو وہی ہے جو میرے پاس تھی۔''

''ہاں...... دیکھ لو اب تک سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ ہر مہینے اسے صاف کر دیتا ہوں۔ تیل دیتا رہا ہوں اور تمہارا نام لے کر تین چار فائر کر دیتا ہوں۔'' حسنے نے سینہ پھلا کر کہا۔

رستم نے عجیب جذب کے عالم میں اس رائفل پر ہاتھ پھیرا۔ اسے لگا جیسے اس کے ہاتھوں کو کوئی کھوئی ہوئی شے واپس مل گئی ہے۔

''چلا کر دیکھو رستم بھائی۔'' حسنے نے کہا۔

''ہاں ہاں، چلا دَ لالے دی جان۔'' گوہرا نے کہا۔

رستم اٹھا اور فرید، مراد، حسنے وغیرہ کے ساتھ سرنگ سے باہر آ گیا۔ یہ چاندنی رات تھی۔ مدھم ہوا جھاڑیوں میں سرسرا رہی تھی۔ پوٹھوہار کے ٹیلے حدِ نگاہ تک چمکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ رستم نے 20 گولیوں والا میگزین رائفل سے اٹیچ کیا۔ اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور رائفل کو سنگل شاٹ پر سیٹ کر کے یکے بعد دیگرے چار فائر کئے۔ رائفل سے شعلے نکلے اور دور ایک ٹیلے پر

ایک چھوٹی سی کانٹے دار جھاڑی، جڑوں سے کٹ کر نشیب میں جا گری۔

رستم کے تینوں ساتھیوں کی آنکھوں میں دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ رستم کی آمد نے انہیں بے حد تقویت بخشی تھی۔ ان کے دل گواہی دے رہے تھے کہ نادر کا کا والا ترنگ آمیز دور واپس آ رہا ہے۔ فرید نے وہسکی کی ایک بوتل کی سیل توڑی اور اسے خاص انداز سے رستم کی طرف بڑھایا۔ رستم چند لمحے ساکت کھڑا رہا...... پھر اس نے بوتل پکڑی اور ایک جھٹکے سے کئی تیز ابی گھونٹ اپنے حلقے سے نیچے اُتار لئے۔ جس طرح باری باری حقے کا کش لیا جاتا ہے اسی طرح ان چاروں نے باری باری بوتل کو ہونٹوں سے لگایا۔

کہیں پاس ہی سرنگ کے کسی حصے میں ٹیپ ریکارڈر پر یہ گانا بج رہا تھا۔

تیری محفل سے یہ دیوانہ چلا جائے گا
شمع جلتی رہے پروانہ چلا جائے گا

یہ تیسرے چوتھے روز کی بات ہے۔ رستم اپنے کمرے میں تھا۔ نادیہ کھانا پکانے مہناز کے پاس گئی ہوئی تھی۔ چھریرے جسم کا ناصر جسے ڈاکٹر ناصر بھی کہا جاتا تھا، رستم کے پاس بیٹھا تھا اور بڑی توجہ سے اس کے پاؤں کے زخم پر بینڈ تج کر رہا تھا۔ اسی دوران میں لالہ فرید تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس نے اطلاع دی کہ آج پھر ''سیٹ'' پر نظام سے بات ہوئی ہے۔

رستم ہمہ تن گوش ہو گیا۔ فرید نے بتایا۔ ''تین پولیسوں کی اکٹھی موت نے بڑا سیاپا ڈالا ہوا ہے۔ اخباروں میں بھی خبریں آ رہی ہیں۔ پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ کئی بے گناہوں کو پکڑا گیا ہے اور شاید کئی ابھی پکڑے جائیں گے۔ زوار کی تلاش بھی بڑے زور و شور سے ہو رہی ہے۔ وہ اپنے پنڈی والے گھر سے بھی کہیں روپوش ہو گیا ہے۔''

''بی بی کا کیا حال ہے؟''

''وہ جیل کے ہسپتال میں ہے، حاجی حیات خان اپنے وعدے کا پاس پورا کر رہا ہے۔ اس نے ابھی تک بی بی یا اس کے وارثوں کو کوئی معمولی تکلیف بھی نہیں ہونے دی لیکن اس کی ہنرمندی یہ ہے کہ وہ خود سامنے نہیں آ رہا۔ سارا کام خفیہ ہاتھوں سے کروا رہا ہے۔ آخر وہ پولیس والا ہے۔ اپنے محکمے کے سارے اچھے بُرے ہتھکنڈوں کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔''

''عارف یا دراج کے بارے میں کچھ پتا چلا؟''

''نہیں، ان کے بارے میں تو بات نہیں ہوئی، ہاں رنگ والی کے بارے میں وہ بتا رہا تھا۔ اس کا کہنا [illegible] کہ نارپور کے چوہ[illegible] ہوا [illegible] اور رنگ والی کے لوگوں کے درمیان تصادم کا

خطرہ تھا۔ پولیس نے دونوں طرف کے کچھ بندے پکڑے ہیں اور اسلحہ وغیرہ بھی قبضے میں لیا ہے۔''

''ڈی ایس پی ریاض کے بارے میں کوئی اطلاع؟''

''ہاں...... ریاض ہٹلر بھی رنگ والی کے اردگرد منڈلا رہا ہے۔ نظام بتا رہا تھا کہ اس نے رنگ والی میں مخبر چھوڑے ہوئے ہیں۔ ایک بندہ ڈاک خانے میں بھی ہے۔ چوہدری ارشاد کی حویلی میں آنے والا ہر خط پولیس کی نظر سے گزرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ٹیلی فون چیک کرنے کے لئے بھی کوئی انتظام کیا گیا ہو۔ ریاض ہٹلر کی وجہ سے مقامی پولیس بھی ایک دم چوکس ہو گئی ہے۔ راہ چلتوں کو پکڑ پکڑ کر پوچھ گچھ کر رہی ہے۔''

اس رات رستم کمرے سے نکل کر ٹیلوں کی طرف چلا گیا۔ پوری رات کا چاند دھیرے دھیرے مشرق سے بلند ہو کر آسمان کے وسط کی طرف جا رہا تھا۔ کہیں کسی کھوہ میں کوئی نامعلوم پرندہ مسلسل بولتا چلا جا رہا تھا۔ ایک چکور رستم کے سر پر سے پرواز کرتا ہوا چاند کی سمت چلا گیا۔ وہ الگ تھلگ ٹیلے پر بیٹھا رہا۔ ہوا اس کے سینے میں جلنے والی آگ کو بھڑکاتی رہی...... اس کی آنکھوں کے کنارے جلتے رہے۔ بی بی کی صورت نگاہوں میں پھرتی رہی۔ بڑی دیر بعد وہ ایک طویل سانس لے کر اٹھا اور بوجھل قدموں سے چلتا کمرے میں آ گیا۔ نادیہ کندھوں تک کمبل اوڑھے سو رہی تھی۔ اس نے لالٹین کی لَو مدھم کر رکھی تھی۔ رستم نے لالٹین کی لو ذرا اونچی کی پھر الماری سے ایک کاغذ اور قلم نکال لیا۔ آج دوپہر رنگ والی کے حوالے سے فرید کی باتیں سن کر رستم کے ذہن میں ایک نیا خیال آیا تھا۔ اب وہ اسی خیال پر عمل درآمد کرنے جا رہا تھا۔

اس نے بڑے کرب کے عالم میں لکھنا شروع کیا۔ اس کا یہ خط شانی کے تایا معصوم کے نام تھا۔ تایا معصوم جن سے رستم کی آخری ملاقات مہتم بستی میں ہوئی تھی۔ اس مختصر ملاقات کے بعد ہی رستم نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بی بی کو مہتم بستی میں اس کے وارثوں کے پاس چھوڑ کر چپ چاپ نکل جائے گا۔

رستم نے لکھنا شروع کیا۔ ''حیران ہوں تمہارا نام معصوم ہے۔ تم رنگ والی کی مسجد میں امامت کراتے ہو، لوگ تمہیں عالم دین سمجھتے ہیں لیکن تمہاری سمجھ بھی وہی ہے جو رنگ والی کے کسی جاہل سے جاہل شخص کی ہوسکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں تم نے اور تمہاری بھتیجی نے [illegible] ایسے شخص کو واپس جرم اور گناہ کی دلدل میں دھکیلا ہے جو بڑی [illegible] سے نکلا تھا۔ تم نے کوئی نئی بات نہیں کی ہے معصوم علی اور نہ تمہاری بھتیجی نے۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا

ہے۔تم جھوٹی شرافت کی پگڑیاں سر پر سجانے والے لوگ ہو۔تم لوگ باتیں سنا سکتے ہو عمل نہیں کر سکتے۔ میں نے کیا کچھ نہ کیا تم لوگوں کے لئے۔ بی بی بے رحم دشمنوں کے گھیرے میں تھی۔تم لوگ تو کیا تمہاری ہوا بھی وہاں نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں نے جان پر کھیل کر اسے ڈھونڈا اور اسے بچانے کی کوشش میں خود نارپوریوں کے ظلم کا شکار ہوا۔ میرے جسم کے ایک ایک حصے پر تمہاری بھتیجی کے نام کے زخم ہیں۔ میرے دوستوں کی جان قربان ہوئی ہے، تم لوگوں کی آن بچانے کے لئے۔ پورے پنجاب کی پولیس پھانسی کا پھندا لے کر میرے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ اپنے پرائے سب میرے لئے ختم ہو گئے ہیں اور یہ سب کچھ تمہاری بھتیجی کی خاطر ہوا۔

اگر تمہارے دل میں رتی بھر بھی انصاف ہوتا تو وہ نہ کرتے جو ہتھم بستی میں تم نے کیا۔ اگر بی بی کسی وجہ سے ڈانواں ڈول بھی تھی تو تم اس کو حوصلہ دیتے۔ اسے سمجھاتے کہ جس نے تمہاری خاطر پوری دنیا کو ٹھکرایا ہے اسے نہ ٹھکراؤ۔ اس سے بڑھ کر پیار تمہیں کوئی نہیں دے سکتا۔ آنکھیں بند کر کے اس کا ہاتھ تھام لو اور ڈور خدا پر چھوڑ دو۔

لیکن تم نے اس کے الٹ کیا۔ وہ تو پہلے ہی بے وفائی کی ہوا میں ڈول رہی تھی۔ تم نے اس کے پاؤں ہی زمین سے اکھاڑ دیئے۔ اسے زندگی کی طرف کھینچ کر مجھے موت کی طرف دھکا دے دیا لیکن موت تو اپنے وقت پر آتی ہے مولوی معصوم علی اور زندگی بھی ہمیشہ ویسی نہیں ہوتی جیسی ہم چاہتے ہیں۔ میں نے ماضی کو ناپاک کپڑے کی طرح لپیٹ کر تمہارے شرافت آباد کے گندے نالے میں پھینک دیا ہے۔ اب میں تم لوگوں کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ جو ناانصافی تم لوگوں نے کی ہے، اس کا صلہ تمہیں ضرور ملے گا۔ میں اس ناانصافی کو بھولوں گا نہیں۔ بے شک ابھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے، لیکن وقت کبھی بھی ہمیشہ کسی کے ہاتھ میں نہیں رہا۔''

رستم نے خط ختم کیا تو اس کی آنکھوں سے آتشی آنسو بہہ رہے تھے۔ خط تہہ کر کے اس نے قلم دور پھینک دیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر اپنا سر گھٹنوں پر جھکایا۔ گرم آنسو اس کی داڑھی میں جذب ہونے لگے۔ یہ آنسو بہ زبان خاموشی پکار پکار کر کہہ رہے تھے۔ ''بی بی جی، یہ سب جھوٹ ہے۔ جو لکھا ہے سب جھوٹ ہے، میری مجبوریوں کو معاف کر دینا بی بی۔ میری خطاؤں کو بخش دینا۔''

دو دن بعد رستم نے یہ خط دلاور اور کاٹھیا کے حوالے کر دیا۔ وہ اپنے کسی کام سے مارگلہ کی طرف جا رہے تھے۔ لفافے پر رنگ والی کی حویلی کا ایڈریس تھا۔ رستم نے انہیں سمجھا دیا

کہ یہ خط کہاں سے اور کیسے پوسٹ کرنا ہے۔ رستم جانتا تھا کہ یہ خط حویلی پہنچنے سے پہلے پولیس کے پاس پہنچے گا اسے امید تھی کہ ایسا ہی ہوگا اور وہ چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ جس راہ پر جا رہا تھا اس میں بہتر یہی تھا کہ بی بی کی راہ سے علیحدہ رہے۔

☆======☆======☆

یہ تقریباً دو ماہ بعد کا ذکر ہے۔ اپریل کی آخری تاریخیں تھیں۔ ہوا میں ہلکی سی تمازت محسوس ہوتی تھی۔ شامیں کچھ طویل ہو گئی تھیں۔ شانی کی قید کا آج آخری دن تھا۔ اس کی ضمانت ہو چکی تھی۔ کل وہ رہا ہو رہی تھی۔ جیل کے ہسپتال کے چوکور کمرے میں وہ نیم سفید بستر پر نیم دراز تھی۔ اس کے ریشمی بال اس کے بائیں کندھے سے ایک آبشار کی طرح گرتے ہوئے اس کے ہموار پیٹ تک چلے گئے تھے۔ سامنے ایک خاتون وارڈن سٹول پر بیٹھی کروشیا کا کام کر رہی تھی۔ ادھیڑ عمر نرس کی آواز سامنے ڈاکٹر کے کمرے سے آ رہی تھی۔ شانی کے دل و دماغ میں ایک جنگ جاری تھی۔ اس کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک رنگ والی اس کی حویلی کی طرف جاتا تھا۔ دوسرا عارف کمبوہ اور کمبوہ بستی کی طرف۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرف کا رخ کرے۔ کل بھی خالو اعجاز، عارف کمبوہ، وکیل ہمدانی صاحب اور دیگر افراد سے اس کی بات چیت ہوئی تھی مگر وہ کسی نتیجے تک نہیں پہنچ پائی تھی۔

فطری طور پر اس کی خواہش رنگ والی واپس جانے کی تھی۔ وہ اپنی جنم بھومی اپنی حویلی کو دیکھنا چاہتی تھی، اپنی سہیلیوں سے ملنا چاہتی تھی۔ رنگ والی کے ہر گلی کوچے میں پیادہ گھومنا چاہتی تھی۔ مگر ''عقل'' ایک دوسرا فیصلہ دے رہی تھی..... خالو اعجاز اور دیگر افراد سے اسے رنگ والی کے جو حالات معلوم ہوئے وہ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھے۔ شانی کو معلوم ہوا تھا کہ وہاں بے حد تناؤ ہے۔ نارپور کے چوہدریوں اور شانی کے وارثوں میں کئی بار تصادم کی نوبت آئی ہے اور دو چار بار تو تصادم ہو بھی چکا ہے۔ اس ٹکراؤ میں اب تک دونوں طرف کے چھ سات بندے مارے جا چکے ہیں۔ درجنوں زخمی ہوئے ہیں۔ طاقت اور اثر و رسوخ کے معاملے میں نارپور کے چوہدریوں کو رنگ والی پر واضح برتری حاصل تھی۔ تعداد میں بھی یہ زیادہ تھے۔ شانی کے اباجی کی وفات اور چاچا مشتاق کے قتل کے بعد حویلی کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور آپس میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ بہت سی زمین گروی پڑی تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ اگر وہ رنگ والی واپس گئی تو نارپوری چوہدری مزید بپھر جائیں گے۔ وہ شانی کو اب بھی بڑے چوہدری مہر کی قاتلہ سمجھتے تھے اور اس کو بدترین سزا دینا چاہتے تھے۔ یہ امر بالکل واضح تھا کہ شانی کے رنگ والی جانے کے بعد تصادم میں شدت آئے گی اور یہ تصادم رنگ والی کے لئے جتنا

نقصان دہ تھا وہ صرف شانی ہی سمجھ سکتی تھی۔ وہ اپنے میکے کو اپنے سابقہ سسرالیوں کے ہاتھوں برباد ہوتے دیکھنے کو تیار نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ کہانی بہت مختلف ہوتی۔ شانی اپنے غالب اور سخت گیر شوہر کے ساتھ سر جھکا کر واپس اپنے سسرال گئی تھی تو اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے خونی رشتوں کو معاشی اور سماجی جبر سے بچانا چاہتی تھی۔ وہ حویلی کو اور اس کے ساتھ رنگ والی کو قانونی شکنجوں میں جکڑے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے بڑی خندہ پیشانی اور محبت سے خود ایک شکنجے میں جکڑی گئی تھی۔

ان باتوں کے علاوہ ایک خاص سوچ بھی بار بار شانی کے ذہن کو تہہ و بالا کرتی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے لگتا تھا کہ اب وہ رنگ والی جا کر خوش نہیں رہ سکے گی۔ ابھی وہ رنگ والی گئی نہیں تھی لیکن اس کا تصور اسے سب کچھ دکھا رہا تھا۔ وہ چہکتی مہکتی بارونق حویلی اب بھائیں بھائیں کرتی تھی۔ امی، ابا جی، چاچا مشتاق، بھائی عادل...... چاچا رئیس، اب ان میں سے کوئی وہاں نہیں تھا۔ نہ کسی کی صورت نہ آواز، نہ قدموں کی چاپ۔ اب وہ وہاں جا کر کس کے سینے پر سر رکھے گی۔ کس بھائی کے ساتھ دھینگا مشتی کرے گی۔ اب کون ہے وہاں جو اس کے ساتھ صبح دم گھاس پر ننگے پاؤں ٹہلے گا اور اس کے لطیفوں پر ہنس ہنس کر دہرا ہوگا؟ کوئی نہیں تھا کوئی بھی نہیں تھا......اور تو اور اب وہ بھی نہیں رہا جو اس کی محبت کی ڈور میں بندھ کر بڑی خاموشی کے ساتھ حویلی میں آیا تھا۔ مالی کے روپ میں پودوں کو پانی دیتا تھا۔ ایک محافظ کی طرح اس کے اردگرد منڈلاتا تھا......اور...... چاندنی راتوں میں گھاس پر جائے نماز بچھا کر بڑے جذب سے نماز پڑھا کرتا تھا۔ اب کوئی نہیں تھا وہاں۔ اس کے کانوں میں ایک بھولا بسرا گیت گونجنے لگا۔

عجیب ہے یہ زندگی کبھی ہے غم کبھی خوشی
وہاں ہیں اب ویرانیاں، جہاں تھیں رونقیں کبھی

شانی کی زندگی کا دوسرا راستہ کمبوہ بستی کی طرف جا رہا تھا۔ علاقے میں کمبوہ ایک طاقت ور برادری تھی۔ ان کا سب سے بڑا دیہہ جوہر آباد تھا۔ عارف بھی یہیں کا رہنے والا تھا۔ عارف کمبوہ اپنے باپ اور بیوی جمیلہ کے ساتھ تین مرتبہ شانی سے ملنے یہاں آ چکا تھا ان کا اصرار تھا کہ حالات کے پیشِ نظر شانی کا رنگ والی میں جانا ٹھیک نہیں۔ وہ جوہر آباد آ جائے، یہاں وہ ہر طرح محفوظ رہے گی اور تسلی سے آئندہ کی منصوبہ بندی کر سکے گی۔ شانی کے خالو اعجاز بھی اسی حق میں تھے۔ پہلی بیوی کی وفات کے بعد خالو اعجاز نے دوسری شادی کی تھی۔ یہ شادی کمبوہ برادری میں ہوئی تھی اور ان کی سسرال اس دور دراز بستی جوہر آباد میں ہی تھی۔

اسے خالو اعجاز سے پتا چلا کہ ان کی بیوی اور عارف کی بیوی آپس میں کزن ہیں۔ ان کا ایک دوسرے کے گھر میں آزادانہ آنا جانا بھی ہے۔

سات آٹھ دن پہلے شانی کو وکیل ہمدانی صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ رنگ والی کے بجائے فی الحال جوہر آباد چلی جائے۔ ہمدانی صاحب کے اس مشورے کے پیچھے شانی کو اے ایس پی حاجی حیات خان کی رائے بھی نظر آئی تھی۔ وہ سخت شش و پنج میں تھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ عارف کمبوہ شانی کو بڑے اخلاص سے بہن کہہ کر بلاتا تھا۔ وہ ایک نہایت پُر جوش شخص تھا۔ وہ علاقے میں چوہدری قادر اور تاؤ حشام جیسے جابروں کا مقابلہ بڑی جرأت سے کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ پیر قدرت اللہ جیسے بااثر شعبدہ باز کے خلاف بھی خم ٹھونک کر میدان میں اُتر آیا تھا۔ مہتم بستی کی طرح جوہر آباد میں بھی اَن پڑھ توہم پرستوں کی کمی نہیں تھی۔ وہاں بھی ایسے لوگ تھے جو قدرت اللہ کو پہنچی ہوئی ہستی سمجھتے تھے اور اس کی نافرمانی کرنے والے کو عذابِ الٰہی سے ڈراتے تھے۔ عارف بڑی جرأت کے ساتھ ایسے لوگوں سے برسرِ پیکار تھا۔ وہ صفیہ والے معاملے کو عدالت میں لے کر گیا تھا اور وہاں اس کی بھرپور پیروی کر رہا تھا۔ اس نے نہ صرف مہتم بستی کے جلے ہوئے کلینک کی جگہ نیا کلینک بنوایا تھا بلکہ اپنی بستی کے اجاڑ ہسپتال کو بھی نئے سرے سے بنانے سنوارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ شانی کو بھی ان کاموں میں شریک کرنے کا خواہش مند تھا۔

اچانک کچھ آہٹیں ابھریں اور شانی چونک گئی۔ کوئی کمرے کے دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ یہ وارڈن عورت نہیں تھی (جسے یہاں مقدم بھی کہا جاتا تھا) موٹی بھدی نرس بھی نہیں تھی اور شاید عارف کمبوہ یا تایا معصوم بھی نہیں تھے۔ تایا معصوم تو آج کل ویسے بھی بیمار تھے۔ یہ کوئی اور تھا اور پھر وہ اندر آ گیا۔ شانی ششدر رہ گئی۔ وہ اس نورانی چہرے والے شخص کو جانتی تھی۔ وہ اسے کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ اسے تب بھولتی اگر وہ لاہور میں چوہدری بشیر کی کوٹھی اور شیلا کے گھر کے درمیان بیتنے والی اس خوف ناک رات کو بھولتی جب ایک بجے، جنگل میں وہ بابر کے رحم و کرم پر تھی۔ سفید براق داڑھی والے پیر بابا نے اسے قیامت سے بچایا تھا۔ پھر وہ اسے اپنی جھونپڑا بستی میں لے کر گئے تھے......اور اس کے دل اور جسم کے زخموں پر اپنی مہربان انگلیوں سے مرہم رکھا تھا۔ آج وہی پیر بابا سفید دھوتی، سفید لمبا کرتہ اور بیٹھی ہوئی پگڑی پہنے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سرمے کی خوش نما سیاہی اور ہونٹوں پر وجدانی مسکراہٹ تھی۔ ان کے ساتھ ان کا سوکھے سڑے جسم والا مرید سرمد تھا۔ وہ پیر بابا سے ایک قدم پیچھے کھڑا تھا۔

شانی نے اپنے سر پر اوڑھنی درست کی اور جلدی سے اٹھ کر ''سلام بابا'' کہا۔

پیر بابا نے اپنا استخوانی ہاتھ بڑھا کر شانی کو پیار دیا اور منہ میں کوئی دعا پڑھی۔

شانی لرزتی آواز میں بولی۔ ''پیر بابا! اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔ آپ یہاں.....؟''

''ہاں میرا بچہ.....'' وہ مخصوص لہجے میں بولے۔ ''صبح سویرے سے آیا ہوا ہوں۔ بڑی مشکل سے یہاں پہنچ سکا ہوں۔ گیٹ پر وہ لال ٹوپی والا سنتری بڑا سخت ہے، اخروٹ کی طرح لیکن اندر سے تو اخروٹ بھی نرم ہوتا ہے ناں۔ بس بات بن ہی گئی۔''

شانی نے کرسی کو اپنی اوڑھنی کے پلو سے صاف کیا اور پیر بابا سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ بیٹھ گئے۔

مرید سر مدادب سے بولا۔ ''پیر بادشاہ، آپ کہیں تو میں باہر بیٹھوں؟''

''جہاں جی چاہے بیٹھ جاؤ بھائی۔'' پیر بابا کسی ریڈیو آرٹسٹ کی سی گونجدار آواز میں بولے۔

مرید باہر چلا گیا۔ ہسپتال کے سفید ٹائلوں والے کمرے میں کچھ دیر تک بس وال کلاک کی ٹک ٹک گونجتی رہی۔

''آ.....آپ کے لئے کیا منگواؤں؟'' شانی نے پوچھا۔

انہوں نے ہاتھ اٹھایا۔ ''کچھ نہیں اور میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں۔ بس دو چار باتیں کروں گا تم سے۔ پھر مجھے جانا ہے۔'' ان کا لہجہ حتمی تھا۔

شانی کے ذہن میں کئی سوال کلبلا رہے تھے۔ بابا جی کو اس کے بارے میں پتا کیسے چلا؟ وہ یہاں کیسے پہنچے؟ وہ اندر کیسے چلے آئے۔ ان سوالوں کو ذہن سے جھٹک کر وہ ان کی طرف متوجہ ہوگئی۔

پیر بابا نے کاغذ میں لپٹا ہوا ایک قیمتی پتھر نکالا۔ یہ ایک نگینہ تھا اور شانی اسے پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ پیر بابا بولے۔ ''تمہیں یاد ہوگا، میں نے تم سے پوچھا تھا، یہ کیا ہے؟ تم نے کہا تھا شاید ہیرا ہے۔ میں نے کہا تھا، ہاں ہیرا ہی ہے لیکن آج سے لاکھوں سال پہلے یہ ایک پتھر تھا۔ میں نے کہا تھا ناں؟''

شانی آنکھوں میں نمی لے کر بولی۔ ''ہاں بابا۔''

پیر بابا کی نگاہیں نگینے پر مرکوز تھیں وہ بولے۔ ''پتھر کا ہیرا بننا ایک انہونی ہے لیکن اس انہونی تک پہنچنے کے لئے اس پتھر کو ایک طویل آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ زمین کی اتھاہ

گہرائیوں میں لاکھوں سال تک دبا رہتا ہے۔ زمین کی حرکت کرتی ہوئی پرتوں میں بے حد و حساب وزن اور گرمی برداشت کرتا ہے۔ ہر طرح کی موسمی سختیاں جھیلتا ہے اور تب جا کر ہیرا بنتا ہے۔ ہیرے ایسے ہی بنتے ہیں۔ کندن بھی ایسے ہی بنتے ہیں اور سیپوں میں موتی بھی ایسے ہی پروان چڑھتے ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ اس جنبش سے دو موتی اس کی آنکھوں سے نکل کر ریشمی رخساروں پر پھسل گئے۔

پیر بابا نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ شانی کے سر پر پھیرا۔ شانی کو لگا سر کے بالوں سے پاؤں کے تلووں تک سکون کی ایک ناقابلِ بیان لہر دوڑ گئی ہے۔ پیر بابا نے حقیقت شناس لہجے میں کہا۔ ''میرا بچہ! ہمت نہیں ہارنی۔ رستہ کیسا بھی مشکل ہو مگر چلتے رہنا ہے۔ منزل کی پرواہ بھی نہیں کرنی۔ منزل کیا ہے، یہ تو ہم خود بھی نہیں جانتے۔ اوپر والا چاہے تو راستے کو منزل بنا دے، چاہے تو منزل بھی منزل نہ رہے اور میں جانتا ہوں تُو منزل کی پرواہ کئے بغیر چل سکتی ہے۔ میں نے تیری پیشانی پر ایک ایسا ستارہ دیکھا ہے جو بہت بلندی پر چمکتا ہے۔ ہاں میرا بچہ میں غلط نہیں کہہ رہا۔''

وہ چپ رہی۔ اس کا دل چاہا وقت کی گردش تھم جائے۔ بابا کا ہاتھ کبھی اس کے سر پر سے نہ اٹھے جو بابا اس کے سامنے تھا وہ ماضی کا خوبرو ایکٹر وارثی تھا..... آج کا منڈھے ہوئے سر، لمبی داڑھی اور مدقوق چہرے والا پیر بابا۔ وہ دلگیر آواز میں بولی۔ ''میں کیا کروں بابا! میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا، میں کس طرف جاؤں؟''

وہ کچھ دیر لب بستہ رہے پھر رمزیہ لہجے میں بولے۔ ''تجھے آگے بڑھنا چاہئے دھی رانی! پیچھے مڑ کر دیکھنے سے کوئی فائدہ نہیں اور ابھی پیچھے ویرانی کے سوا کچھ ہے بھی نہیں۔ جب ویرانیاں نہیں رہیں گی تو پھر دیکھ لینا پیچھے بھی.....'' وہ چونک کر بابا کا چہرہ تکنے لگی۔

اسے لگا جیسے یہ رہنما صرف اس کے سوال کا جواب دینے کے لئے ہی یہاں آیا تھا، فقط اسے راستہ دکھانے کے لئے۔ شانی کتنی ہی دیر گم صم بیٹھی رہی۔ اس کی پلکیں جھکی رہیں۔ پیر بابا نے بھی کچھ نہیں کہا۔ پھر شانی بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں فی الحال..... اپنی حویلی کے بجائے جوہر آباد جانا چاہتی ہوں۔ میں ان لوگوں کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہوں جو نار پور کے چوہدریوں اور قدرت اللہ جیسے لوگوں کے خلاف لڑائی لڑ رہے ہیں۔ میں نے.....''

اچانک شانی کو محسوس ہوا کہ وہ اکیلی بیٹھی ہے۔ اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ وہاں پیر بابا نہیں تھے۔ وہ اٹھی اور لپک کر دروازے تک پہنچی۔ اس نے پہلے بائیں اور پھر دائیں

طرف دیکھا چالیس پچاس قدم دور اس کو بس سرمد کی ایک جھلک دکھائی دی، وہ پیر بابا کے پیچھے چلتا ہوا ایک موڑ پر اوجھل ہو رہا تھا۔

☆======☆======☆

ایک روز بعد شانی کبوہ بستی جو ہر آباد میں موجود تھی۔ یہ خاصی بڑی بستی تھی۔ یہاں میٹرک تک سکول موجود تھا۔ ایک چھوٹا سا ہسپتال اور ڈاک خانہ بھی تھا۔ ساتھ فیصد مکان کچے تھے یعنی گارے مٹی سے بنائے گئے تھے۔ چالیس فیصد پختہ اور نیم پختہ تھے۔ شانی کے خالو اعجاز بھی شانی کی چھوٹی خالہ کے ساتھ جوہر آباد آئے تھے۔ شانی نے خالو کی سسرال میں قیام کیا۔ یہ چار پانچ کمرے کا مکان تھا۔ صحن کچا تھا، چھت بھی لکڑی کی تھی۔ دیواریں اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں لیکن ان پر پلاستر نہیں تھا۔ صحن میں نیم کے دو درختوں تلے ہینڈ پمپ لگا تھا اور پانی کے گھڑے پڑے تھے۔ یہاں خالو اعجاز کے بوڑھے سسر کے علاوہ ایک بیٹا اور بہو رہتے تھے۔ عارف کبوہ کا گھر بھی اسی گلی میں بس دو مکان چھوڑ کر تھا۔

شانی دوپہر کے وقت کبوہ بستی میں پہنچی۔ اس کی آمد نے لوگوں میں ہلچل پیدا کر دی۔ کھڑکیوں اور دروازوں کی اوٹ سے اسے دیکھا جانے لگا۔ کچھ چہروں پر دلچسپی کے آثار تھے اور کچھ پر ناگواری کی شکنیں تھیں۔ ملا جلا ردِعمل تھا۔ شانی جانتی تھی یہاں مہتم بستی کی طرح پیر قدرت اللہ کے لئے اندھی عقیدت نہیں ہے، کچھ لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جو اسے فریبی اور دھوکے باز قرار دیتے ہیں۔ جو لوگ اسے دھوکے باز سمجھتے تھے ان کے لئے شانی ایک باحوصلہ اور دلیر چوہدرانی تھی، جس نے چھوٹی سی عمر میں بڑا کام کیا تھا۔ قدرت اللہ کی چیرہ دستیوں کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ اس کے اثر و رسوخ کو للکارا تھا۔ شانی کے ہاتھوں قدرت اللہ کی بیبیوں کی پٹائی اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی لیکن وہ لوگ جو قدرت اللہ کی شعبدہ بازیوں کا شکار تھے یقیناً شانی کو گمراہ اور گناہ گار قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ نحوست کا چلتا پھرتا پیکر تھی اور یہ نحوست کسی بھی وقت کسی پر بھی اثر انداز ہو سکتی تھی۔

سہ پہر کو عارف اور اس کی بیوی جمیلہ آئے اور شانی کو اپنے ساتھ بستی میں گھمانے لے گئے۔ سکول کی عمارت کے ساتھ ہی عارف نے کچھ زمین مقامی لوگوں کے چندے سے حاصل کی تھی۔ یہاں وہ بچوں کے کھیل کود کے لئے چھوٹا سا میدان بنوا رہا تھا۔ اس میدان کے گرد چار دیواری بنائی گئی تھی اور لوگوں کے بیٹھنے کے لئے سٹیڈیم کی طرز پر چار پانچ کچی سیڑھیاں تعمیر کی گئی تھیں۔

پھر عارف اور جمیلہ اسے بستی کا ہسپتال دکھانے لے گئے۔ اس خستہ حال عمارت کی دیواروں سے اُپلے اکھاڑ کر رنگ و روغن کرنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ دو کمروں کی ٹوٹی ہوئی چھتیں بھی مرمت کے مرحلے سے گزر رہی تھیں۔ یہ مٹی دیواروں اور محرابی دروازوں والی عمارت انگریزوں کے دور کی تھی۔ نانک چندی اینٹوں نے اس مختصر عمارت کو آثارِ قدیمہ کا سا رنگ دے دیا تھا۔

شام کے وقت عارف کسی ضروری کام سے چلا گیا۔ شانی خالو اعجاز اور خالہ کے پاس واپس آ گئی۔ دیہی علاقوں میں رات کا کھانا جلد ہی کھا لیا جاتا ہے۔ آٹھ بجے تک وہ لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ خالو اعجاز لالٹین لے کر وسیع صحن کے آخری سرے پر گئے اور ایک لمبے چوڑے شخص کو لئے اندر آ گئے۔ اس شخص کو گھر کے بیٹھک نما کمرے میں بٹھایا گیا۔

دو چار منٹ بعد خالو اعجاز شانی کے پاس آئے اور بتایا۔ ''یہاں کا ایس ایچ او آیا ہے۔ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

''کیا مسئلہ ہے؟'' شانی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''نہیں، کوئی ایسی بات نہیں لیکن تم اس سے مل لو۔''

شانی خالو اعجاز کے ہمراہ بیٹھک نما کمرے میں پہنچی۔ بٹے کٹے دیہاتی تھانیدار نے کھڑے ہو کر شانی کو سلام کیا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا اور اس کی قمیص کے نیچے پستول کی موجودگی محسوس کی جا سکتی تھی۔ رسمی کلمات کے بعد تھانیدار نواز بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''بی بی جی! آپ میرے علاقے میں آئی ہیں۔ آپ کی حفاظت میری ذمے داری بنتی ہے۔ گوجرانوالہ کے وڈے آفس سے بھی پیغام آیا ہے کہ آپ کا خاص خیال رکھا جائے۔''

''مجھے کسی حفاظت کی ضرورت نہیں۔'' شانی نے روکھے لہجے میں کہا۔

''پر ہمیں تو آپ کی خدمت کرنے کی ضرورت ہے جی۔ ہم تنخواہیں کس کام کی لیتے ہیں۔ آپ آزادی سے بستی میں گھوم پھر رہی ہیں۔ اللہ نہ کرے..... اللہ نہ کرے کوئی ابی نبی ہو جائے تو ہم کسی کو کیا منہ دکھائیں گے۔''

''ایسی کیا آفت آ گئی ہے؟''

''آپ سب جانتی ہیں بی بی۔ بلکہ ہم تو آپ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔''

''تھانیدار صاحب! کھل کر بات کریں۔ پہیلیاں نہ بوجھوائیں۔'' شانی نے کہا۔

وہ کھنکھار کر بولا۔ ''دیکھیں جی! اب یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ رستم سیال پھر

اپنے پرانے گروہ سے جا کر مل گیا ہے۔ آج سے صرف آٹھ دن پہلے..... پچھلی جمعرات کو اسی گروہ کے بندوں نے یہاں سے پندرہ بیس میل دور پرانی روڈ کے قریب واردات کی ہے۔ ایک زرعی بینک کی گڈی سے کیش لوٹا ہے اور ایک بندہ قتل کیا ہے۔ دو بندے شدید زخمی ہوئے ہیں۔ اصل بات کا پتا تو بعد میں چلے گا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ واردات میں رستم خود بھی شامل تھا۔''

''تم اس بات سے کیا مطلب نکالنا چاہتے ہو نواز صاحب!'' خالو اعجاز نے کہا۔

''دیکھیں جی! میری بات کا بُرا نہ منائیں۔ بی بی جی اور سیال کے بارے میں سب کچھ اخباروں میں چھپ چکا ہے۔ یہ باتیں جھوٹی یا سچی تو ہو سکتی ہیں لیکن ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ رستم سیال کے سر پر اس وقت خون سوار ہے۔ وہ بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ وڈے آفیسر سے جو پیغام آیا ہے اس میں بھی کہا گیا ہے کہ رستم کی طرف سے خطرہ ہے۔ خاص طور سے جس علاقے میں آپ لوگ آ گئے ہیں یہاں خطرہ زیادہ ہے۔''

''خبردار کرنے کا بہت شکریہ۔'' شانی نے کہا۔

''میری درخواست ہے کہ آپ زیادہ آزادی سے نہ گھومیں پھریں۔ اس سے ہماری مشکلیں بڑھ جائیں گی۔''

''آپ نے کچھ اور کہنا ہے یا اب ہمیں اجازت ہے؟'' شانی نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''اجازت تو آپ مجھے دیں، نوکر ہم ہیں۔ آپ تو نہیں ہیں۔'' تھانیدار نواز نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

واپس اپنے کمرے میں آ کر شانی تا دیر بستر پر لیٹی رہی۔ رستم کا نام بے پناہ شدت سے اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ یہ نام تو اب جیسے ہر سانس کے ساتھ اس کے سینے میں داخل ہوتا تھا۔ اس کے لہو میں سرایت کرتا تھا اور سانس کے ساتھ باہر آتا تھا، کیسا شخص تھا وہ.....؟ کتنا پیار الیکن کتنا ظالم۔ وہ بظاہر بے ضرر تھا اس کے ہونٹوں پر چپ کی مہر رہتی تھی۔ اس کی نگاہیں جھکی رہتی تھیں لیکن شانی کے دل و دماغ پر اس کا تسلط کہاں تک تھا، یہ صرف شانی ہی جانتی تھی۔ وہ اپنے نادیدہ ہاتھوں سے ہر روز ایک نئی زنجیر کو حرکت دیتا تھا اور شانی کو اس میں جکڑ لیتا تھا۔ وہ اب تک ایسی لاتعداد زنجیروں میں جکڑی جا چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ ان زنجیروں کو کیسے توڑے.....؟

لوگوں میں ایک عام تاثر یہ تھا کہ پولیس نے اب رستم سیال کو کسی قیمت پر زندہ نہیں

چھوڑنا۔ جب وہ ایسی بات سنتی تھی تو اسے لگتا تھا جیسے رستم کی نہیں، خود اس کی اپنی موت کی بات ہو رہی ہے۔

شانی کے ذہن میں ڈیڑھ دو ماہ پہلے کے مناظر گھومنے لگے۔ ان دنوں وہ حوالاتی کی حیثیت سے ڈسٹرکٹ جیل میں تھی۔ ایک دن خاتون پہرے دار کے ساتھ جو پولیس افسر شانی کے کمرے میں داخل ہوا تھا اس کی دہشت تھانوں سے لے کر اخباروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ شانی نے پہلے بھی کئی بار اس کا نام سنا تھا لیکن اس دن پہلی بار اس نے ڈی ایس پی ریاض کی شکل دیکھی تھی۔ وہ شکل سے ہی بے رحم قصائی نظر آتا تھا۔ کانوں کے نیچے گوشت پھولا ہوا، جبڑے چوڑے، ناک موٹی اور کانٹے دار مونچھوں تلے ہونٹ سانولے سے۔ اس شخص کو دیکھ کر شانی کے جسم میں ایک سرد لہری دوڑی۔ جو سب سے پہلا احساس اسے ہوا وہ یہ تھا کہ یہ شخص ذرا سی بات پر آتش فشاں کی طرح پھٹ سکتا ہے اور بہت کچھ خاکستر کر سکتا ہے۔

اس روز ڈی ایس پی ریاض نے شانی کو ایک خط دکھایا تھا۔ شانی ہینڈ رائٹنگ پہچانتی تھی۔ یہ رستم کی تھی۔ شانی کو خط پڑھوانے سے پہلے ریاض نے اسے بتایا تھا کہ یہ خط رنگ والی کے ڈاک خانے سے پولیس کے ہاتھ کیسے لگا۔ اس کے بعد ریاض نے خط شانی کے ہاتھ میں تھما دیا..... رستم کا یہ مبینہ خط شانی کے تایا معصوم کے نام تھا، خط یوں شروع ہوا تھا۔ ''میں حیران ہوں تمہارا نام معصوم ہے۔ تم رنگ والی کی مسجد میں امامت کراتے ہو۔ لوگ تمہیں عالم دین سمجھتے ہیں لیکن تمہاری سمجھ بھی وہی ہے جو رنگ والی کے کسی جاہل سے جاہل شخص کی ہو سکتی ہے.....''

اس آتشی خط کا اختتام ان الفاظ پر تھا..... ''ایک بات یاد رکھنا۔ جو ناانصافی تم لوگوں نے کی ہے اس کا صلہ تمہیں ضرور ملے گا۔ میں اس ناانصافی کو بھولوں گا نہیں۔ بے شک ابھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے لیکن وقت کبھی بھی ہمیشہ کسی کے ہاتھ میں نہیں رہا۔''

اس خط کو پڑھنے کے بعد شانی کو شدید ترین شاک محسوس ہوا لیکن پھر فوراً ہی وہ اس شاک سے نکل بھی آئی تھی۔ اچانک اس کے دل نے گواہی دی تھی کہ یہ خط رستم کا نہیں..... اور اگر رستم کا ہے تو اس نے اپنے ہوش و حواس میں نہیں لکھا اور اگر اپنے ہوش و حواس میں لکھا ہے تو پھر اس کا وہ مقصد نہیں جو بظاہر نظر آ رہا ہے۔ یہ اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ملنے والی گواہی تھی کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن رستم سیال اس قسم کے رویے کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ جب دل کی گہرائیوں سے گواہی مل گئی تو شانی بھی رنج کے بحرِ بیکراں سے نکل آئی تھی۔

قصاب صورت ریاض نے کہا۔ ''دیکھ لے مسماۃ شانی! تُو اس بھگوڑے کو کیا سمجھتی رہی

ہے اور وہ کیا نکلا ہے۔ اگر تیرے دل میں اس خط کے بارے میں کوئی شک ہے تو میں بڑے سے بڑا حلف اٹھانے کو تیار ہوں کہ یہ اسی بھگوڑے کا خط ہے اور ہوسکتا ہے کہ آگے چل کر تجھے اور تیرے وارثوں کو اس طرح کے اور بھی ''محبت نامے'' ملیں۔''

''آ..... آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' شانی نے پوچھا تھا۔

''چاہنے کی بات چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم دے کیا سکتی ہو۔'' ڈی ایس پی ریاض کا لہجہ اس کی شکل سے بڑھ کر زہریلا تھا پھر اس نے ایک دم نرم لہجے میں کہا۔ ''قانون کے ہاتھ مضبوط کرو گی تو اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ نہیں تو یہ لیٹرا کسی وقت کچھ بھی کر جائے گا تم لوگوں کے ساتھ۔ ہوسکتا ہے کہ تمہاری تھوڑی بہت شرم کرے گا مگر تمہارے والی وارثوں کا جینا تو حرام کرسکتا ہے ناں.....''

اس روز ڈی ایس پی ریاض نے شانی کے ساتھ طویل گفتگو کی تھی۔ کبھی ڈرا دھمکا کر کبھی نرمی سے، کبھی چالبازی سے اس نے شانی کے ہونٹوں کے تالے کھولنے چاہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ شانی رستم کا کوئی سراغ بتائے تاکہ اسے جلد از جلد قانون کی گرفت میں لایا جاسکے۔ اس کی باتوں سے شانی کو اندازہ ہوا کہ رستم کی واحد قریبی عزیز اس کی ایک بہن ہے۔ بہن اور بہنوئی کا کھوج لگ جائے تو رستم تک پہنچنا آسان ہوجائے گا۔ ریاض کی پوچھ گچھ کا سارا زور اس بات پر تھا کہ شانی اسے رستم کے بارے میں نہیں بتاسکتی تو اس کی بہن کے بارے میں ہی کوئی سراغ دے۔

شانی اس بارے میں بھی کچھ نہیں جانتی تھی اور اگر جانتی ہوتی تو بھی اس نے کچھ نہیں بتانا تھا، ناکام ہوکر ریاض نے شانی کو ننگی گالیاں دی تھیں۔ شاید وہ اس سے آگے بڑھ کر اس سے مار پیٹ بھی کرتا لیکن وہ جانتا تھا نادیدہ ہاتھ شانی کے پیچھے ہیں۔ اگر وہ ایک حد سے آگے بڑھا تو یہ ہاتھ حرکت میں آجائیں گے۔

جیل میں پیش آنے والے یہ سارے واقعات ایک دو منٹ کے اندر شانی کے ذہن سے گزر گئے۔ وہ بستر پر لیٹی رہی اور سوچتی رہی کہ رستم اس وقت کہاں ہوگا؟ کیا کر رہا ہوگا؟ کیا سوچ رہا ہوگا؟ رستم کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کا دل ندامت اور دکھ سے بھر جاتا تھا۔ وہ جاں گسل لمحے ذہن میں تازہ ہوجاتے تھے جب وہ رستم کے بہت نزدیک آتے آتے بہت دور چلی گئی تھی۔ مہتم بستی میں کمرے کی کھڑکی میں سردار کی بیوی ماکھو پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکری رکھ گئی تھی۔ شرم کے مارے اس ٹوکری کے پھول شانی نے اپنی اوڑھنی میں نہیں ڈالے تھے لیکن اس کی مرضی تو وہی تھی جو ماکھو چاہتی تھی اور ساری بستی چاہتی تھی۔ وہ کئی

راتوں کی جاں گسل کشمکش کے بعد رستم کا ہاتھ تھامنے پر آمادہ ہوگئی تھی۔ وہ صبح اس کی زندگی کی حسین صبح بنی اور پھر کچھ ہی دیر بعد تاریک ترین صبح بن گئی۔ رستم اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ ہاں وہ چلا گیا۔ ہمیشہ کی طرح کوئی بھی شکوہ زبان پر لائے بغیر، ایک بھی آنسو بہائے بغیر..... اور وہ اشک بار آنکھوں کے ساتھ دہلیز پر کھڑی سوچتی رہ گئی۔ وہ اس سے بات تو کرسکتی ایک بار، صرف ایک بار اسے بتا تو سکتی کہ کچھ دیر پہلے اس نے کتنا حسین فیصلہ کیا تھا۔ رستم کے چلے جانے کے بعد اس نے اتنی شدید حسرت محسوس کی تھی کہ اسے اپنی جان کی ہر ہر رگ ٹوٹتی محسوس ہوئی تھی لیکن اب، جب تین ماہ گزرنے کے بعد وہ اس بارے میں سوچتی تو اسے لگتا تھا کہ شاید جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ زندگی کا وہ شدید ترین جذباتی موڑ کوئی شدید نقصان پہنچائے بغیر گزر گیا۔ اگر اس دن تایا معصوم اور حاجی حیات کی آمد سے کچھ دیر پہلے وہ رستم کو اس دل نواز فیصلے سے آگاہ کردیتی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد یہ دل نواز فیصلہ اندوہناک جدائی میں بدلتا تو پھر یہ جانکاہ اذیت کئی گنا بڑھ جاتی اور اب جو حالات سامنے آرہے تھے ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید اس فیصلے کا شانی کے لبوں تک نہ آنا ہی بہتر تھا۔

پچھلے چند مہینوں میں جس دوسرے خیال نے دن رات شانی کے ذہن کو جکڑے رکھا تھا، وہ مُنے کا خیال تھا۔ مُنے کا خیال آتے ہی اس کے سینے میں جیسے ایک سیال محبت بلکورے لینے لگتی تھی اور اس کی خوشبو پورے جسم میں پھیل جاتی تھی۔ وہ ہر وقت سوچتی تھی۔ وہ کہاں ہوگا؟ کیا کر رہا ہوگا؟ اسے کیسے یاد کرتا ہوگا؟ بھابو کے الوداعی الفاظ تو جیسے ہر وقت شانی کی سماعت میں گونجتے رہتے تھے۔ ''مُنے کو سنبھال لوگی ناں.....؟''

اب تک کی زندگی میں شانی کی آنکھوں نے جو حسین ترین سپنا دیکھا تھا، وہ ایک ہی تھا..... اس سنہری سپنے میں شانی کے ساتھ دو ہنستے مسکراتے چہرے اور تھے۔ ایک مُنے کا، دوسرا رستم کا۔ کسی سرسبز ڈھلوان پر، پھولوں سے لدے ہوئے چھوٹے سے گھر میں عفت رنگ شام جھروکوں سے جھانکتی تھی اور آنگن میں اُترتی تھی۔ مُنا شانی کی بانہوں میں مچلتا تھا اور شانی..... رستم کی بانہوں کا سہارا پاتی تھی۔

شانی کی اب تک کی معلومات کے مطابق مُنا لاہور میں چوہدری بشیر کے پاس ہی تھا۔ چوہدری بشیر خوفناک جلدی بیماری سے حال ہی میں صحت یاب ہوا تھا۔ اپنے بھائی بندوں سے اس کی صلح ہوچکی تھی۔ تاہم قادرا اور تاؤ حشام سے اَن بن اب بھی موجود تھی۔ ڈیڑھ دو ماہ پہلے شانی نے اپنے وکیل ہمدانی صاحب کے ذریعے چوہدری بشیر کو پیغام بھجوایا تھا کہ وہ ایک بار مُنے کو دیکھنا چاہتی ہے۔ اس پیغام کا جواب منفی صورت میں ملا تھا۔ چوہدری بشیر نے مُنے کو

لانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا میرا بچہ پہلے ہی مریض ہو چکا ہے، میں اس کی بیماری میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔

اچانک کچھ آوازوں نے شانی کو خیالوں سے چونکایا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں گونجی تھیں اس کے ساتھ ہی عارف کی موٹر سائیکل کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ شانی نے کھڑکی سے جھانکا۔ کشادہ صحن میں آگے ایک تانگہ کھڑا تھا اور دو تین گھوڑے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ تانگے میں دو شہری لڑکیاں اور ایک ٹی شرٹ والا نوجوان موجود تھے۔ ان کے ہاتھوں میں سفری بیگ تھے۔ عارف بہت خوش دکھائی دیا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آیا اور بولا۔ ''شانی بہن.....! تمہارا آنا مبارک ثابت ہوا ہے۔ ایک معاملہ کئی ہفتوں سے اٹکا ہوا تھا، آج ٹھیک ہو گیا ہے۔''

''کون لوگ ہیں یہ؟''

''ڈاکٹر.....دونوں لیڈی ڈاکٹرز گوجرانولہ کی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لاہور سے آئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ایک دو دن تک ہم ہسپتال میں علاج معالجہ شروع کر دیں گے۔''

اسی دوران میں کچھ اور لوگ بھی اکٹھے ہو گئے۔ یہ سب کے سب عارف کے ہم خیال تھے۔ تینوں ڈاکٹرز کا استقبال پھولوں کے ہار ڈال کر کیا گیا۔ عارف کا ایک پُرجوش ساتھی کہیں سے ڈھول اٹھا لایا، کچھ نوجوان ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑا ڈالنے لگے۔ دو افراد نے ٹرپل ٹو رائفل سے ہوائی فائر کر کے خوشی کا اظہار کیا۔

اب شانی کو معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر پہلے عارف خاموشی کے ساتھ جس کام کے لئے گیا تھا وہ یہی ڈاکٹر کو لانے والا کام تھا۔ عارف کی بیوی جمیلہ سرگوشی کے انداز میں شانی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''عارف کی کئی مہینوں کی محنت رنگ لائی ہے۔ ایسے دور دراز علاقے میں کوئی ڈاکٹر آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ویسے بھی چوہدریوں کے خوف نے ہر کسی کو ذرا سہما رکھا ہے۔''

''یہ ڈاکٹر کہاں سے آ رہے ہیں؟'' شانی نے پوچھا۔

''بیچارے کل سے سفر میں ہیں۔ آج انہوں نے تقریباً آٹھ گھنٹے تک کچے میں تانگے پر سفر کیا ہوگا۔ آپ دیکھ ہی رہی ہیں ان کی حالت کیسی ہو رہی ہے۔''

ڈاکٹروں نے عارف کے گھر میں قیام کیا۔ اگلے روز ہسپتال کو تیار کرنے کے لئے مزید تیزی سے کام کیا گیا۔ مرمت طلب چھتوں کا کام کل ہی مکمل ہو گیا تھا۔ چھوٹی سی لیبارٹری بھی تیار تھی۔ ایک خستہ حال ایکسرے مشین یہاں موجود تھی تاہم اسے ورکنگ پوزیشن میں لانے

کے لئے بہت محنت درکار تھی۔ ڈسپنسری، عمارت کی ڈیوڑھی میں بنائی گئی۔ عارف اور اس کے ساتھی پتا نہیں کہاں کہاں سے ایلو پیتھک دوائیں اکٹھی کر کے یہاں لائے تھے۔ ایک لمبوترے کمرے میں بان کی چارپائیاں ڈال کر اسے وارڈ کی شکل دے دی گئی تھی۔ دونوں لیڈی ڈاکٹرز خود بھی بڑھ چڑھ کر اس کام میں حصہ لے رہی تھیں۔ ڈاکٹر کا نام نعمان تھا اور وہ بھی فلاحی جذبے سے معمور نظر آتا تھا۔

سہ پہر کے وقت بستی کا چوہدری نواب دین موقع پر پہنچا۔ وہ سفید دھوتی، کُرتے اور سفید پگڑی والا ایک دانا کمبوہ تھا۔ اس کی عمر 70 سال کے لگ بھگ تھی۔ شانی بھی اس وقت ہسپتال کی عمارت میں لیڈی ڈاکٹرز فرحین اور شائستہ کے ساتھ موجود تھی۔ چوہدری نواب دین عارف کو ایک طرف لے جا کر باتوں میں مصروف ہو گیا۔ دونوں کے جملے شانی کے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔

نواب دین نے مدبرانہ لہجے میں کہا۔ ''دیکھو پتر! جو کچھ بھی کرو عقل مندی اور پیار سے کرو۔ ہم نے پنڈ میں لڑائی نہیں ڈالنی اور نہ کسی سے مقابلہ کرنا ہے۔ میرے لئے تم میں اور شاہی میں کوئی پھرک (فرق) نہیں ہے۔ جیسے تم اس پنڈ کے پتر ہو، وہ بھی ہے۔''

''اب کیا بات ہوئی ہے چاچا؟'' عارف نے پوچھا۔

''کوئی کھاص بات نہیں۔ پر ایک بات تو ہے ناں۔ شاہی اور اس کے یاروں کو ہسپتال کا دکھ ہے۔ ابھی شاہی کا چھوٹا بھائی میرے پاس آیا تھا۔ کہہ رہا تھا عارف پھ کے یار دوست ہمارے گاہکوں کو کھراب کر رہے ہیں۔ استانے (آستانے) پر آ آ کر لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ جھاڑ پھونک چھوڑو، اپنی جنڈ گیاں برباد نہ کرو۔ ڈاکٹری الاج کراؤ۔ شہر سے وڈے ڈاکٹر آ گئے ہیں۔''

''بکواس کر رہا ہے وہ۔ میں نے کسی کو آستانے پر نہیں بھیجا اور نہ کسی نے کوئی ایسی بات کی ہے۔ وہ اُلو کا پٹھا شاہی جان بوجھ کر فساد کرنا چاہتا ہے۔''

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ شاید ایک دو بندے یہاں سے استانے کی طرح پھ گئے ہیں۔ انہوں نے استانے پر کھڑے مریجوں (مریضوں) سے بات بھی کی ہے۔ میں نے کھد دیکھا ہے۔''

''چلیں آپ کہتے ہیں تو مان لیتا ہوں۔ میں ساروں سے کہہ دیتا ہوں کہ خیال رکھیں۔ شاہی کی دُم پر کسی کا پاؤں نہ آئے۔''

دو چار باتیں کرنے کے بعد چوہدری نواب دین وہاں سے چلا گیا۔ شانی نے عارف

سے پوچھا۔ ''یہ شاہی کون ہے؟''

''اسی فراڈیے قدرت اللہ کا خفیہ چیچہ ہے حرامزادہ۔ یہاں جھاڑ پھونک کرتا ہے۔ لوگوں کو الٹی سیدھی دیسی دوائیاں بھی دیتا ہے۔ گاؤں میں وہ سب کچھ کرتا ہے جو قدرت اللہ دوسرے علاقوں میں ذرا وسیع پیمانے پر کر رہا ہے۔ قدرت اللہ نے مختلف دیہات اور علاقوں میں اپنے ایسے کئی مقامی چوہے چھوڑ رکھے ہیں۔ کئی علی الاعلان قدرت اللہ کے شیطانی ہاتھ پر بیعت ہیں، کئی ناجائز اولاد کی طرح ''چوری چھپے کے شاگرد'' ہیں اور اس کا کام آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ کُتے کا تخم بھی ان میں سے ایک ہے۔''

''آستانہ کیا ہے؟''

''بڑے کی ماں کا سر ہے۔'' عارف نے جل کر کہا۔ ''بس ایک دو کمرے ہیں شاہ دین والے کنویں کے پاس۔ وہاں شاہی نے رنگ برنگے جھنڈے لگائے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو ڈرانے اور پھسلانے کے لئے عجیب عجیب چیزیں جمع کر رکھی ہیں۔ صبح اور شام کے وقت وہاں پھکڑا مار کر بیٹھتا ہے اور تعویذ گنڈا کرتا ہے۔ قدرت اللہ کو پیروں کا پیر اور کرامات کا شہنشاہ مانتا ہے۔''

''لوگ جاتے ہیں اس کے پاس؟''

''ان اَن پڑھ لوگوں کی کیا بات کرتی ہو شانی بہن! یہ تو اس مداری کے گرد بھی اکٹھے ہو جاتے ہیں جو رسی سے نیولا باندھ کر صرف آدھ گھنٹہ تک تقریر جھاڑتا ہے اور آخر میں پانچ سو کے تعویذ بیچ کر چمپت ہو جاتا ہے۔ پانچ چھ مہینے پہلے تک اس کی طرف لوگوں کی زیادہ توجہ نہیں تھی لیکن پھر وہ خارش کی بیماری والا شوشہ اُڑا اور لوگوں میں یہ مشہور ہوا کہ یہ بیماری بس ان لوگوں کو ہی ہوئی ہے جنہوں نے لاہور میں قدرت اللہ کے ساتھ بدتمیزی کی یا پھر اس بدتمیزی کی حمایت کی۔ ایسی باتیں ان سادہ لوح دیہاتیوں میں بڑی تیزی سے پھیلتی ہیں اور ان کے دلوں میں پختہ ہو جاتی ہیں۔ اس بات کے پھیلنے کے بعد سے صرف شاہی کا کام ہی نہیں بڑھا، اس جیسے دوسرے سارے چوہے بھی دُم پر کھڑے ہو کر ناچ رہے ہیں۔''

اگلے روز پانچ کمروں، ایک برآمدے اور ایک ڈیوڑھی والے اس مختصر سے ہسپتال میں کام شروع ہو گیا۔ تینوں ڈاکٹرز نے اپنی ڈیوٹیاں سنبھال لیں۔ عارف نے یہاں دو کمپاؤنڈر بھی مہیا کر دیئے تھے۔ خود عارف کی بیوی جمیلہ نرس کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ ہسپتال میں علاج کے آغاز کے حوالے سے دو تین بینرز بھی جوہر آباد کو آنے والے راستوں پر لگا دیئے گئے تھے۔ دو تین قریبی دیہات میں ہیضے کے اثرات پائے جا رہے تھے۔ عارف اور

اس کے ساتھیوں کو توقع تھی کہ پہلے دن ہی کافی لوگ ہسپتال کا رخ کریں گے۔

دوپہر تک یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ شانی اور اس کے خالو اعجاز گھر کی چھت پر کھڑے تھے۔ منڈیر کے جھروکوں سے ہسپتال کا منظر واضح نظر آتا تھا۔ دوپہر تک زیادہ سے زیادہ چھ سات مریضوں نے ہی ہسپتال کا رخ کیا تھا۔

''لگتا ہے کہ مقامی لوگوں کا رجحان تعویذ گنڈے کی طرف زیادہ ہے۔'' شانی نے خیال آرائی کی۔

خالو اعجاز بولے۔ ''اصل میں ہسپتال کے بند ہونے سے بھی اثر پڑا ہے۔ آج تقریباً تین مہینے بعد ڈاکٹر یہاں آئے ہیں اور ہسپتال کے دروازے کھلے ہیں۔ آہستہ آہستہ لوگ متوجہ ہو جائیں گے لیکن شرط یہی ہے کہ ڈاکٹرز یہاں ٹکے رہیں اور عارف دوائیوں کی کمی نہ ہونے دے۔''

اتنے میں خالو اعجاز کا سالا جمشید بھی چھت پر چلا آیا۔ یہ ایف اے پاس تھا اور یہاں بستی میں ڈیزل کی ایجنسی چلاتا تھا۔ اس کا شمار بھی عارف کے نوجوان ساتھیوں میں ہوتا تھا۔ اس نے بتایا کہ شاہی کے آستانے پر کافی رش لگا ہوا ہے۔ مریضوں کے علاوہ بہت سے تماشائی بھی موجود ہیں۔''

''کیا کوئی خاص بات ہے؟'' خالو اعجاز نے پوچھا۔

''خاص بات کیا ہونی ہے بس ڈرامے ہی ہیں بھا جی! چوہدری حشام کے پنڈ سے جونکیں آئی ہیں۔ کئی دنوں سے ان جونکوں کا انتظار ہو رہا تھا۔ اب اگلے تین چار دن آستانے پر لوگوں کو جونکیں لگیں گی اور دوسرے لوگ تماشا دیکھیں گے۔'' پھر جمشید شانی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''باجی جی! آپ کو پتا ہے جونکوں کا؟''

شانی کے ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ جونکوں سے جمشید کی کیا مراد ہے۔ وہ جونکوں کے بارے میں جانتی تھی بلکہ تاؤ حشام کی حویلی میں ان کو بھگت بھی چکی تھی۔ اس کے ذہن میں گہری سانولی رنگت والے وہی جڑواں بھائی آ گئے جنہوں نے کئی بار بڑی رغبت سے اس کا خون پیا تھا اور قدرت اللہ کے کسی سفلی علم کی تکمیل کی تھی۔

جمشید نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے باجی! آپ جانتی ہیں۔''

''ہاں میں نے دیکھا ہوا ہے..... یہ دو بھائی ہیں۔ اب کہاں ہیں یہ؟''

''شاہی کے ٹھکانے پر..... آج صبح ہی یہاں پہنچے ہیں۔ لوگ انہیں دیکھنے کے لئے امڈ آئے ہیں۔ بہت سے لوگ ان سے خون چوسوانے کے لئے بے تاب ہیں۔ عجیب تماشا

ہے۔لوگ اس بات پر یقین کرتے ہیں کہ یہ انسانی جونکیں صرف گندہ اور بیمار خون ہی چوستی ہیں۔صحت مند خون مریض کے جسم کے اندر رہتا ہے۔''

اب عارف کی اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ شاہی نامی یہ عامل قدرت اللہ کا ہی چیلا چانٹا ہے۔

اگلے دو تین دن میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔صبح نو بجے سے سہ پہر پانچ تک بجے ہسپتال میں صرف آٹھ دس مریض ہی آتے تھے۔دوسری طرف شاہی کے آستانے پر رش لگا رہتا تھا۔لوگ اسے بہت مانتے تھے۔شانی کم از کم تین ایسی عورتوں سے ملی جنہوں نے شاہی کے آستانے سے علاج کروایا تھا اور صحت یاب ہوئی تھیں۔شانی نے اس بارے میں ڈاکٹر نعمان سے بات کی۔ڈاکٹر نعمان نے کہا۔''شانی صاحبہ! آپ جو کچھ بتا رہی ہیں یہ پہلے سے میرے علم میں ہے۔یہ بات آپ کو بھی پتا ہوگی کہ شاہی صرف جھاڑ پھونک نہیں کرتا، مریضوں کو پڑیاں اور چٹکیاں وغیرہ بھی دیتا ہے۔اتائیوں کی طرف سے اس طرح مریضوں کا علاج اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔یہ لوگ بڑی بے دردی سے لوگوں کو''اسٹیرائڈز'' کا استعمال کروا رہے ہیں۔تکلیف کیسی بھی ہو مریض کو وقتی طور پر افاقہ ہو جاتا ہے لیکن آگے چل کر وہ بُری طرح پچھتاتا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ شاہی بھی''اسٹیرائڈز'' استعمال کرتا ہوگا۔''

''یہاں لیبارٹری میں ٹیسٹ کی سہولت نہیں ہے ورنہ میں ابھی آپ کو ثبوت پیش کر دیتا۔آپ شاہی کی دی ہوئی چٹکی یا پڑیا کا نمونہ گوجرانوالہ یا لاہور بھجوائیں، آپ کو مکمل ثبوت مل جائے گا۔''

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں، دونوں لیڈی ڈاکٹرز فرحین اور شائستہ پاس ہی بیٹھی تھیں۔ وہ قدرے گم صم دکھائی دیتی تھیں۔ڈاکٹر نعمان میں بھی پہلے دن جیسا جوش و جذبہ نظر نہیں آ رہا تھا۔یہ لوگ تعبیری جذبے کے ساتھ یہاں آ تو گئے تھے مگر اب انہیں ایڈجسٹ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ڈاکٹر نعمان ایک مریض کو دیکھنے کھیتوں کی طرف چلا گیا تو شانی فرحین اور شائستہ کے پاس آ بیٹھی۔پہلے دنوں کے برعکس دونوں کچھ ڈری ہوئی اور مایوس سی تھیں۔ان میں شائستہ خاموش طبع تھی لیکن فرحین باتیں کرتی تھی۔اس کے والد بھی ڈاکٹر تھے اور گوجرانوالہ میں سوشل کاموں میں حصہ لیتے تھے۔

شانی نے فرحین سے اس کی خاموشی کی وجہ پوچھی تو وہ ٹالنے لگی۔بوریت کا بہانہ کرنے لگی لیکن شانی نو ہ میں لگی رہی۔آخر فرحین نے رازداری سے اسے بتایا۔آج سویرے ایک

عورت کلینک میں آئی تھی۔وہ کبڑی بھی تھی اور اس کا چہرہ بھی کچھ خوفناک سا تھا۔اس نے کچھ ایسی باتیں بتائی ہیں جو ہمیں پہلے معلوم نہیں تھیں۔

''کیا کہا ہے اس نے؟''شانی نے پوچھا۔

فرحین بولی۔''وہ کہتی ہے کہ یہ ہسپتال اس لئے اجاڑ پڑا ہے کہ یہاں''کچھ'' ہے مطلب کہ سایہ وغیرہ۔''شانی چونک کر فرحین اور شائستہ کی طرف دیکھنے لگی۔فرحین بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔''عورت کا کہنا ہے کہ یہاں کوشش کے باوجود کوئی ڈاکٹر نہیں ٹھہرتا۔ اس سے پہلے یہاں دو ڈاکٹر مارے بھی جا چکے ہیں۔ایک لاہور کا تھا، دوسرا گجرات کا۔ دوسری موت یہاں تین چار مہینے پہلے ہی ہوئی ہے۔یہ دونوں موتیں ابھی تک ایک سوال ہیں۔''

شانی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔''آپ ٹھیک کہتی ہیں، یہاں ہسپتال میں دو موتیں ہو چکی ہیں۔اس بات کا پتا مجھے ابھی دو دن پہلے ہی چلا ہے لیکن ڈاکٹر فرحین! یہ موتیں کوئی معمہ نہیں ہے۔بس اتفاق کے تحت ایسا ہو گیا ہے۔جنوری میں مرنے والا ڈاکٹر اسد پہلے سے کچھ بیمار تھا۔وہ یہاں اپنے دفتر میں ہی سو رہا تھا۔اسے شدید برین ہیمرج ہوا اور وہ جانبر نہ ہو سکا۔گجرات کے ڈاکٹر رات کو آندھی میں چھت پر سے چارپائی اتارنے گئے، ان کا پاؤں پھسلا اور وہ گر کر جاں بحق ہو گئے۔''

شائستہ نے کہا۔''لیکن یہاں کے لوگ ان دونوں واقعات کو کسی اور طریقے سے بیان کرتے ہیں؟''

''تو کیا آپ ان کے اس بیان پر یقین رکھتی ہیں؟ کیا آپ بھی یہی سمجھتی ہیں کہ اس عمارت میں بھوت پریت ہوں گے جو یہاں آنے والے ڈاکٹرز کو قتل کر دیتے ہیں۔''

''نہیں میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔میں تو مقامی لوگوں کی سوچ بتا رہی ہوں۔وہ کہتے ہیں کہ موت کے بعد ڈاکٹر اسد کی گردن پر پُراسرار نشان تھے اور ان کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ڈاکٹر رانا کے بارے میں بھی ان کا یہی کہنا ہے کہ وہ گرے نہیں تھے، رات کے وقت کسی وجہ سے وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے اور انہوں نے چھت سے کود کر خودکشی کر لی تھی۔''

''آپ لوگوں کی باتیں چھوڑیں ڈاکٹر شائستہ! آپ پڑھی لکھی باشعور ہیں، کیا آپ ان باتوں پر یقین رکھتی ہیں؟''شائستہ کی بجائے فرحین نے جواب دیا۔

''ہمیں ایسی باتوں پر یقین نہیں لیکن مقامی لوگوں کی جہالت اور توہم پرستی کا آپ کو بھی

اندازہ ہوگا۔''

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''ہوسکتا ہے اوپر تلے ہونے والی ان دونوں موتوں میں کسی کا ہاتھ ہو۔ مثلاً انہی لوگوں کا جو یہاں ہسپتال، سکول اور پلے گراؤنڈز وغیرہ کے خلاف ہیں۔ صاف نظر آرہا ہے کہ یہ طاقت ور لوگ ہیں۔ یہاں کے ماحول میں یہ لوگ اپنے مقصد کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر رانا کو چھت پر سے دھکا دیا گیا ہو۔ ڈاکٹر اسد کے ساتھ بھی کچھ اس طرح کا معاملہ ہوسکتا ہے۔''

''سوچنے کو تو پھر کچھ بھی سوچا جاسکتا ہے ڈاکٹر فرحین لیکن جو لوگ آپ کو اپنی ذمے داری پر یہاں لائے ہیں وہ آپ کی حفاظت کے اہل بھی ہیں۔ آپ اس بارے میں بالکل فکرمند نہ ہوں۔''

شانی دونوں لیڈی ڈاکٹرز کا اعتماد بحال کرنے میں مصروف ہوگئی اور کافی دیر ان کے پاس بیٹھی رہی۔

اگلے روز دوپہر کو عارف کمبوہ نے شانی کو بتایا کہ مہتم بستی سے کھیا دراج کا بھائی اور بھاوج ہسپتال میں آئے ہوئے ہیں۔ کھیا کی بھاوج سخت بیمار ہے۔ اسے چارپائی پر ڈال کر چار گھنٹے میں مہتم بستی سے یہاں لایا گیا ہے۔ شانی کھیا دراج کی بھاوج کو جانتی تھی۔ وہ اسے دیکھنے کے لئے بے چین ہوگئی۔

وہ خالو اعجاز کو بتا کر خالہ فیروزہ کے ساتھ ہسپتال کی طرف روانہ ہوئی۔ راستے میں ایک بیٹھک کے سامنے چند بوڑھے کمبوہ حقہ پی رہے تھے۔ ایک لڑکا انہیں دودن کا باسی اخبار سنا رہا تھا۔ شانی کو دیکھ کر کمبوہ بزرگوں کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نظر آئے اور جب وہ ان کے قریب سے گزری تو انہوں نے رخ پھیر لیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، یہاں جو ہر آباد میں اس قسم کی سرد مہری سے کئی بار شانی کا واسطہ پڑ چکا تھا۔ اس سرد مہری کے ڈانڈے قدرت اللہ سے جا کر ملتے تھے۔ بے شک یہی لوگ تھے جنہوں نے شانی اور رستم کو میلے میں نارپوریوں کی بے رحم یلغار سے بچایا تھا لیکن جب بات قدرت اللہ اور اس کی بیٹیوں کی ہوتی تھی تو ان میں سے بہت سے لوگ شانی کو غیر نظروں سے دیکھنے لگتے تھے۔ شانی ہسپتال میں پہنچی۔ دراج کا چھوٹا بھائی سراجا سامنے ہی موڑھے پر بیٹھا بھٹا کھا رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی ہی کی طرح چوڑا چکلا اور ٹھوس تھا۔ اس کی رنگت سیاہی مائل اور مونچھیں چمکیلی تھیں۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی طلائی بالیاں اس کی امارت کو ظاہر کرتی تھیں۔ اس نے ایک نگاہ غلط انداز میں

شانی پر ڈالی اور شانی کے سوال کا جواب بڑی مشکل سے دیا۔ اس کی بیوی زری چارپائی پر سیدھی لیٹی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر فرحین اس کے بازو میں انجکشن لگا رہی تھی۔ شانی نے زری کو دیکھا اور حیران رہ گئی۔ چند مہینے پہلے وہ ایک سانولی لیکن خوبرو اور دلکش عورت تھی۔ اس کی عمر بہ مشکل پچیس چھبیس سال تھی لیکن آج وہ بہت کمزور نظر آرہی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہوگئی تھیں اور ان پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ ہونٹ سیاہی مائل دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی پانچ چھ سالہ بچی بڑی معصومیت سے ماں کے دبلے پتلے پاؤں پر سر رکھے سو رہی تھی۔

شانی نے زری کو السلام علیکم کہا۔ اس نے بھی بس ہونٹوں کی جنبش سے جواب دیا اور نگاہ کا رخ تھوڑا سا پھیر لیا۔

شانی کی نگاہ ایک چیز پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ جواں سال زری کی دونوں کلائیوں پر پٹیاں بندھی تھیں۔ شانی ان پٹیوں کا مطلب سمجھتی تھی۔ وہ خود بھی اس تکلیف دہ مرحلے سے گزر چکی تھی۔ یقیناً یہ خون آشام توام بھائیوں کی خونخواری کے نشان تھے۔ اس کم نصیب عورت کا علاج بھی اس سے پہلے پیر قدرت اللہ کے زیر سایہ ہوتا رہا ہے۔

شانی ڈاکٹر فرحین کو ایک طرف لے گئی اور پوچھا ''کیا ہوا ہے اسے؟''

''جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔'' فرحین افسردگی سے بولی۔ ''اس کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ پہلی بچی کے بعد دو بچے مر چکے تھے۔ کسی سیاسی نے تیسرے بچے کی پیدائش کے وقت کہا اس کا ناڑو کاٹنے کی بجائے گرم لوہے سے داغ کر اتارا جائے۔ ناڑو (ماں اور نومولود بچے کی درمیانی نس) کو داغ کر علیحدہ کیا گیا جس سے ماں کے جسم میں انفیکشن ہوگیا۔ یہ معمولی انفیکشن بہ آسانی ٹھیک ہوسکتا تھا لیکن ٹوٹکوں نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ بعد میں اس بی بی کے پیٹ میں درد رہنے لگا۔ اب ہوتے ہوتے حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اس کی جان خطرے میں نظر آتی ہے..... اگر یہ لوگ اسے بچانا چاہتے ہیں تو فوراً اسے لاہور لے جائیں۔''

شانی کا دل غم سے لبریز ہوگیا۔ مہتم بستی میں اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا تھا لیکن وہ اس سلوک کے لئے کسی کو قصوروار نہیں سمجھتی تھی۔ اگر کوئی قصوروار تھا تو وہ ''جاہلیت'' اور دقیانوسیت تھی۔ وہ بے چین ہوکر زری کے پاس جا بیٹھی۔ اس کے بال اپنی انگلیوں سے سنوارنے لگی۔ اس کا حال چال پوچھنے لگی۔ وہ مہتم عورت اس سے سیدھے منہ بات نہیں کر رہی تھی لیکن وہ پھر بھی اس کی دل جوئی میں لگی رہی۔

پھر وہ دراج کے بھائی سراجے کے پاس جا بیٹھی۔ اس نے دراج اور ماکھو کا حال احوال پوچھا۔ اس نے بڑی دردمندی کے ساتھ سراجے سے گذارش کی کہ وہ اپنی جواں سال

بیوی کو مزید نہ گھسیٹے۔ اسے فوراً لاہور لے جائے اور کسی اچھے ڈاکٹر یا مستند معالج کو دکھائے۔

سراجا ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ اس کے انداز سے صاف عیاں تھا کہ وہ بیوی کی زیادہ تکلیف کی وجہ سے اسے یہاں لے تو آیا ہے مگر اس صورتِ حال سے خوش ہرگز نہیں ہے۔ اس کی سوئی وہیں جھاڑ پھونک پر اٹکی ہوئی ہے۔ اس کی کیفیت کو محسوس کر کے شانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کہا۔ ''دیکھو سراجے! اس کی عمر ابھی مرنے کی نہیں ہے۔ اسے بے موت مت مارو۔ اس پر اور اپنی بچی پر رحم کرو۔ اسے لاہور لے جاؤ۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔''

وہ کتنی ہی دیر سراجے کی منت کرتی رہی۔ آخر اس نے محسوس کیا کہ سراجے کے ماتھے پر سوچ اور تذبذب کی شکنیں نمودار ہو رہی ہیں۔ شانی کا رویہ اس کی ہٹ دھرمی میں دراڑیں پیدا کر رہا تھا۔ بعد میں جمیلہ اور عارف نے بھی سراجے کو قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ایک ٹریکٹر ٹرالی کا انتظام ہو چکا تھا اور اس کے ذریعے جواں سال زری کو گوجرانوالہ اور وہاں سے لاہور لے جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ وقتِ رخصت شانی نے زری کا ماتھا چوما اور اس کی آنکھوں کے نم گوشوں کو صاف کرتے ہوئے اسے حوصلہ دیا۔

شانی ان کے جانے کے بعد بھی ہسپتال میں رہی اور عارف کی بیوی جمیلہ کے ساتھ مل کر چھوٹے مونے کا کام کرتی رہی۔ ان کاموں میں اس کے زخمی دل کو عجیب سا سکون مل رہا تھا۔ اس کا دھیان اپنے جاں گسل دکھوں کی طرف سے ہٹ رہا تھا۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ شام سے ذرا پہلے عارف کی زبانی شانی کو یہ غم ناک خبر ملی کہ سراجے کی بیمار بیوی زری مہتم بستی میں چل بسی ہے۔ شانی نے حیران ہو کر عارف سے پوچھا۔ ''وہ لوگ! سے لاہور لے کر نہیں گئے تھے؟''

عارف نے نفی میں سر ہلایا۔ ''راستے میں ہی انہوں نے ٹرالی کا رخ مہتم بستی کی طرف موڑ دیا۔ ایک بڑے بوڑھے کے کہنے پر وہ اسے ''مٹھا پانی'' لے گئے۔ اس گاؤں میں ایک کنواں ہے جس کا پانی گرمیوں میں بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ لوگ شفا کے لئے اس پانی سے مریضوں کو کپڑوں سمیت نہلاتے ہیں۔ سراجے کی بیوی کو بھی نہلایا گیا اور واپس مہتم بستی لایا گیا۔ پر سانس کی شکایت تو اسے یہیں پر ہو گئی تھی۔ کل رات حالت اور بگڑ گئی۔ آج صبح نو دس بجے کے قریب اس نے دم دے دیا۔''

اس اطلاع نے شبلی کے علاوہ ڈاکٹرز کو بھی افسردہ کیا۔ خاص طور سے فرحین غم زدہ ہوئی، شانی اس وقت ہسپتال میں نہیں تھی۔ ہسپتال میں مایوسی کی فضا تو پچھلے چار پانچ دن سے

ہی موجود تھی، اب یہ مایوسی مزید گہری ہونے لگی۔ دونوں لیڈی ڈاکٹرز خاص طور سے اداس اور دل برداشتہ نظر آتی تھیں۔ شانی شام کے بعد بھی ان کے پاس رہی اور ان کی ہمت بندھانے کی کوشش کرتی رہی۔ عموماً شام کے وقت بجلی چلی جاتی تھی اور ہسپتال کے کمروں میں لالٹینیں جلانا پڑتی تھیں۔ تاہم عارف نے اب جنریٹر ٹھیک کروا لیا تھا اور توقع تھی کہ کل سے الیکٹرک روشنی میسر ہو گی۔ شانی، فرحین اور شائستہ کو اس بارے میں بتا رہی تھی جب کھڑکیوں سے باہر نیم تاریکی میں دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی پھر اچانک کمرے کی کھڑکی کا شیشہ زوردار چھناک سے ٹوٹا اور کوئی سیاہ چیز دھپ سے فرحین، شائستہ اور شانی کے درمیان میز پر آ گری۔ فرحین کی کرب ناک چیخ ابھری۔ لالٹین کی روشنی میں شانی نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، میز پر سیاہ رنگ کا ایک دیسی مرغ پھڑک رہا تھا۔ اس کا سر غائب تھا اور گردن سے ابلنے والے خون کے چھینٹے چاروں طرف بکھر رہے تھے۔ وہ تینوں اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگیں اور برآمدے میں جا کھڑی ہوئیں۔

اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے بھی چلانے کی آواز آئی۔ یہاں تانگے کے نیچے آنے والا ایک ادھیڑ عمر دیہاتی زیرِ علاج تھا۔ شانی اور فرحین لپک کر وہاں پہنچیں تو یہاں بھی ایک بھیانک منظر نظر آیا۔ کٹی ہوئی گردن والا ایک سیاہ مرغ زندہ مرغ کی طرح فرش پر کھڑا تھا اور پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ پھر وہ چکرا کر گرا اور اس کی گردن سے ابلنے والا خون چاروں طرف بکھرنے لگا۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ والا ادھیڑ عمر دیہاتی بھی چارپائی سے فرش پر گر گیا تھا۔

شائستہ ہذیانی انداز میں چلائی۔ ''مائی گاڈ! یہ کیا ہو رہا ہے؟''

اتنے میں کھڑکی ٹوٹنے کا ایک اور چھناکا سنائی دیا۔ ایک سرکٹا سیاہ مرغ لیبارٹری میں آ کر گرا اور پورے کمرے میں پھڑ پھڑانے لگا۔ اس مرغ کے گرنے کے ساتھ ہی شانی کو ایک نعرہ بھی سنائی دیا۔ اس نے دوڑ کر ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے چہرہ لگایا۔ نیم تاریکی میں اسے ایک گھڑسوار نظر آیا۔ ایک ڈھاٹا پوش شخص دوڑتا ہوا گیا اور جست لگا کر گھڑسوار کے پیچھے بیٹھ گیا۔ پھر ایک اور گھڑسوار نمودار ہوا اور تینوں نعرے بلند کرتے ہوئے تاریکی میں اوجھل ہو گئے۔

اس واقعے کے فوراً بعد اردگرد کے بہت سے افراد اکٹھے ہو گئے۔ تینوں سر کٹے مرغ خون کے بہت سے چھینٹے اڑانے کے بعد ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ لوگوں کے چہروں پر ہراس تھا اور وہ بتا رہے تھے کہ یہ کسی نے کوئی ٹونہ کیا ہے۔ مرغ پھینکنے اور نعرے بلند کرنے والے دونوں افراد کی صورت کوئی نہیں دیکھ پایا تھا۔ انہوں نے چہرے ڈھاٹوں میں چھپائے ہوئے

تھے۔اس واقعے کے کچھ دیر بعد عارف کمبوہ اور جمشید وغیرہ بھی موقع پر پہنچ گئے۔وہ ڈاکٹرز کو تسلی تشفی دینے لگے۔عارف کمبوہ نے اسی وقت تین رائفل برداروں کو ہسپتال کے پہرے پر مقرر کر دیا۔اس نے ڈاکٹر نعمان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔''نعمان صاحب! ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں۔آپ بے فکر رہیں۔ان کو پکڑیں گے اور آپ کے سامنے ان سے اقرار کروائیں گے۔''

عارف کے دیگر ساتھیوں نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ڈاکٹرز کا خوف کسی حد تک کم ہو گیا۔

تاہم اگلے روز دس بجے کے قریب شانی یہ نہایت مایوس کن خبر سن رہی تھی کہ دونوں لیڈی ڈاکٹرز اپنا بوریا بستر باندھ کر واپس روانہ ہو چکی تھیں۔عارف نے شانی کو یہ خبر سنائی اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''اب کیا ہو گا عارف؟'' شانی نے پوچھا۔

''ڈاکٹر نعمان بھی شاید دو چار دن میں چلا جائے گا۔ہسپتال ایک بار پھر بند ہو جائے گا۔''

''لیکن ایسا نہیں ہونا چاہئے۔یہ تو بڑا ظلم ہو گا۔لوگ ان نوسر بازوں کی وجہ سے سخت تکلیف میں ہیں۔ان کی جانیں جا رہی ہیں،زندگیاں حرام ہو رہی ہیں۔''

''جو کچھ ہمارے بس میں ہے،کر تو رہے ہیں لیکن ابھی قسمت ساتھ نہیں دے رہی۔''

عارف کے لہجے میں ہلکی سی تھکن تھی۔

تھکن کی یہ کیفیت سیدھی شانی کے دل میں لگی۔چند دن پہلے وہ کتنا پُر امید تھا۔اس کی آنکھوں میں جوش کی چمک تھی۔

شانی اور عارف کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔پھر عارف کو چوہدری نواب کا ایک کارندہ بلانے کے لئے آ گیا اور وہ اس کے ساتھ چل دیا۔

شانی اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھی سوچتی رہی۔اس کی آنکھوں میں رہ رہ کر جواں سال زری کی شکل گھوم جاتی تھی اور اس بچی کی بھی جو روتے روتے ماں کے پاؤں پر سر رکھ کر سو گئی تھی.....ایسی نہ جانے کتنی مائیں اور کتنی بچیاں ہر روز اتائیت کی بھینٹ چڑھ کر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی تھیں۔پھر شانی کے ذہن میں بھابو اور مُنے کا خیال آیا۔وہ بھی تو ایسی ہی جاہلیت کا شکار ہو کر ایک دوجے سے جدا ہوئے تھے۔اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' خالو اعجاز کی آواز نے اسے چونکایا۔

وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔''خالو! یہ کیا ہو رہا ہے۔یہ کون لوگ ہیں جو دوسروں کا بھلا نہیں

ہونے دے رہے۔''

''سب کچھ تمہارے سامنے ہے شانی بیٹا۔زمینداروں اور وڈیروں کی چوہدراہٹ اسی طرح قائم رہتی ہے کہ علاقے میں علم اور عقل کی روشنی نہ پھیلے۔پھر جب پیر قدرت اللہ جیسے لوگ بھی ان چوہدریوں کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں تو جہالت کا اندھیرا اور گہرا ہو جاتا ہے۔''

''اب ہسپتال کا کیا ہو گا؟''

''لگتا تو یہی ہے بیٹا کہ یہ ایک بار پھر بند ہو جائے گا۔''

''ہمیں کوئی حل سوچنا ہو گا خالو جی۔''

خالو اعجاز نے حسب عادت اپنے کھچڑی بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بولے۔''جہاں تک میری عقل کام کرتی ہے اس کا ایک ہی حل ہے شانی۔''

وہ چونک کر خالو کا سرخ و سپید چہرہ تکنے لگی،خالو نے اپنے قدرے فربہ جسم کو کرسی کی پشت سے ٹکاتے ہوئے کہا۔''ان لوگوں کو اس علاقے میں واپس لانا ہو گا جو یہاں سے چلے گئے ہیں۔وہ لوگ اس کام کو بہت حد تک سنبھال چکے تھے۔اپنے تجربے کے زور پر وہ آگے بھی بڑھ رہے تھے۔لوگ ان پر بھروسا کرنے لگے تھے۔''

''آپ کن کی بات کر رہے ہیں؟''

''ڈاکٹر بہروز،ڈاکٹر محسن اور زیب النساء وغیرہ۔شاید تمہیں معلوم ہوا ہی ہو گا۔ڈاکٹر محسن اور ڈاکٹر زیب النساء اردگرد کے دیہات میں بڑے بھرپور طریقے سے کام کر رہے تھے۔ان کے پاس آنے والے مریضوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی تھی۔وہ یہاں جوہر آباد کے ہسپتال میں بھی ٹائم دے رہے تھے لیکن پھر وہ عارف کی بھتیجی صفیہ والا واقعہ ہو گیا۔

چوہدری حشام کے بیٹے نے اسے اپنی حویلی میں رکھیل بنا کر رکھا اور اس سے زیادتی کرتا رہا۔بعد میں اس کا حمل گرایا گیا اور وہ قبر کے کنارے پہنچ گئی۔اس موقع پر ڈاکٹر زیب النساء نے صفیہ کی ماں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ بچی کی جان بچانے کے لئے اسے فوراً لاہور کے ہسپتال میں لے جائے۔چوہدریوں کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ کنواری لڑکی کو حاملہ کرنے والا یہ معاملہ میانہ گاؤں سے باہر جائے اسی بات پر چوہدریوں کا ڈاکٹر زیب النساء اور اس کے خاوند ڈاکٹر محسن سے شدید جھگڑا ہوا۔اس کے بعد کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا وہ دونوں خوف کے مارے ہی کہیں روپوش ہو گئے یا چوہدریوں نے دونوں کو کہیں غائب کر دیا۔جہاں تک میری اطلاع ہے ابھی تک ان کا کوئی کھوج نہیں ملا۔بہر حال عام لوگوں کا کہنا یہی ہے کہ ان کے ساتھ نارپوری چوہدریوں نے ہی کچھ کیا ہے۔''

شانی ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ اس کے پردۂ تصور پر تاؤ حشام کی حویلی میں دیکھے ہوئے مناظر ایک بار پھر گھومنے لگے۔ تاؤ کے کارندوں کا ڈاکٹر میاں بیوی کو مارتے پیٹتے ہوئے حویلی میں لانا، ان کو ننگی گالیاں دینا، ذلیل کرنا اور پھر کال کوٹھڑی میں بند کر کے چلے جانا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ خالو کو بتا دے کہ اس نے تین چار ماہ پہلے تاؤ حشام کے قید خانے میں کیا دیکھا تھا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے یہ خیال دل میں ہی دبا لیا۔

''آپ نے تیسرے کس ڈاکٹر کا نام لیا ہے؟'' شانی نے خالو سے پوچھا۔

''ڈاکٹر بہروز! وہ سینئر ڈاکٹر تھا۔ مستقل طور پر یہاں نہیں رہتا تھا مگر باقاعدگی سے آتا جاتا تھا۔ علاقے میں جتنا کام ہو رہا تھا اس پر بہروز کی گہری نظر تھی۔ مہتم بستی میں اپنی جیب سے اس نے کلینک بنوایا تھا اور بہت سے لوگوں کی مخالفت مول لی تھی۔ تمہیں معلوم ہی ہے۔ کلینک بستی والوں نے بعد میں جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ حیرانی ہوتی ہے کہ کہ شعبد بازوں کے بہکاوے میں آ کر یہ لوگ کس طرح اپنے ہاتھوں سے اپنی قبریں کھودتے ہیں۔''

''ڈاکٹر بہروز اب کہاں ہے؟''

''اس کا بھی کچھ پتا نہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ چوہدریوں کے ڈر سے بیرون ملک چلا گیا ہے۔ ڈاکٹر بہروز کا آگے پیچھے بھی کوئی نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ وہ اصل میں ہے کہاں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ چوہدریوں نے اسے اغوا کر کے مروا دیا تھا۔ اس سلسلے میں لاہور کے چند ڈاکٹروں نے ایک کیس بھی فائل کیا تھا۔ پتا نہیں اس کیس کا کیا بنا۔''

شانی کے ریشمی بالوں کی ایک لٹ اس کی خوبرو پیشانی پر جھول رہی تھی۔ خوبصورت چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

خالو اعجاز کے جانے کے بعد وہ دیر تک اس گورکھ دھندے میں الجھی رہی۔ اس کے ذہن پر یہ بدترین خدشہ یلغار کرتا رہا کہ ڈاکٹر بہروز، محسن اور زیب النساء وغیرہ نار پوریوں کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں یا ان کی قید میں ہیں۔

سہ پہر کے وقت شانی حسبِ معمول جمیلہ کے ساتھ ہسپتال کی طرف روانہ ہوئی۔ وہ چادر اوڑھ کر نکلتی تھی۔ آدھا چہرہ چادر کے پلو سے ڈھکا رہتا تھا۔ ہسپتال کی طرف جاتے ہوئے اسے دو چیزیں اکثر پریشان کرتی تھیں۔ ایک تو بیٹھک کے سامنے بیٹھ کر حقہ پیتے ہوئے بوڑھے..... دوسرے ایک شلوار قمیص والا سانولا سا شخص جو اکثر اس کے اردگرد منڈلاتا رہتا تھا۔ شانی کو شک تھا کہ یہ پولیس والا ہے۔

آج بھی وہ بیٹھک کے سامنے سے گزری تو بوڑھوں نے چہ میگوئیاں کیں۔ ان کی

زبانیں بے شک خاموش رہتی تھیں لیکن ان کے چہرے کہتے تھے..... تُو ایک شریف لڑکی نہیں ہے۔ تیرا ناتا ایک بدنام ڈاکو سے ہے۔ ہم نے کٹھولی کے میلے میں تجھے اس ڈاکو سے لپٹتے دیکھا ہے۔ اس کے حصے کی لاٹھیاں اپنے جسم پر کھاتے دیکھا ہے۔ تُو ناپاک ہے۔ تُو گمراہ ہے۔ تیری گمراہی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ تُو نے حضرت صاحب کی بیبیوں کو مارا۔ حضرت صاحب کا پاک برتن توڑا۔ اب تُو ہماری خیر خواہ بن کر اس بستی میں آ گئی ہے۔ ہم لعنت بھیجتے ہیں تیری خیر خواہی پر اور تیرے سائے سے بھی بچنا چاہتے ہیں.....

اور یہ تاثرات بیٹھک کے سامنے بیٹھے بوڑھوں کے ہی نہیں تھے بلکہ بستی کے اکثر بڑے بوڑھے شانی کو ایسی ہی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

شانی ہسپتال میں پہنچی تو وہاں آج معمول سے زیادہ اداسی نظر آئی۔ ڈاکٹر نعمان ڈیوڑھی میں سو رہا تھا۔ عارف ایک رجسٹر میں حساب کتاب دیکھ رہا تھا۔ شانی عارف کے پاس جا بیٹھی۔ ''کیا بات ہے شانی بہن! تم کچھ پریشان لگتی ہو؟''

''مجھے لگتا ہے عارف..... ایک پولیس والا میری نگرانی کرتا ہے۔''

عارف نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''ایک پولیس والا نہیں..... میرے اندازے کے مطابق دو تین پولیس والے ہوں گے۔ ایک کو تو میں اچھی طرح جانتا بھی ہوں۔ وہ پولیس ملازم نہیں ہے لیکن کام پورا پورا پولیس والا کرتا ہے۔''

''کون ہے؟''

''ابھی نہیں، بعد میں بتاؤں گا۔''

''ایسا کیوں کر رہے ہیں یہ لوگ؟''

''ان سے پوچھو گی تو یہی کہیں گے کہ تمہاری حفاظت کے لئے، کیونکہ تمہیں کئی طرف سے خطرہ ہے۔ قدرت اللہ کا کوئی سر پھرا پیروکار تمہاری جان لے سکتا ہے یا رستم سیال کوئی خطرہ بن سکتا ہے لیکن اصل بات یہ نہیں ہے۔''

''اصل بات کیا ہے؟''

''ان پلسیوں کا خیال ہے کہ شاید رستم تمہاری طرف آنے کی کوشش کرے تو وہ اس کو پکڑ سکیں لیکن وہ بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا۔ جو کچھ پولیس والے اب سوچ رہے ہیں اس نے بہت پہلے سوچ لیا ہوگا۔ وہ جانتا ہے، تین پلس والوں کے اکٹھے قتل کے بعد ریاض ہٹلر نے ہر طرف اس کے لئے شکنجے لگائے ہوئے ہیں۔''

''اب وہ کہاں ہے؟'' شانی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''مفرور ڈاکو کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس وقت کہاں ہوگا۔ وہ روپوش ضرور ہے لیکن یہ بات بھی نہیں کہ کہیں دبک کر بیٹھا ہو۔ تھانیدار نواز نے تمہیں بینک کی گاڑی لوٹنے والی واردات کے بارے میں بتایا ہوگا۔ اب پتا چلا ہے کہ اس واردات میں جو سینئر گارڈ قتل ہوا ہے وہ نارپور کا تھا اور چوہدری قادر سے کافی قریبی رشتے دار تھا۔ اس سے پہلے بھی لاپتا گھڑ سواروں کی طرف سے ہونے والی واردات میں نارپور کے دو چوہدری بال بال بچے تھے۔ علاقے میں رستم اور اس کے ساتھیوں کا خوف بڑھ رہا ہے۔''

اندھیرا ہونا شروع ہوگیا تھا۔ شانی نے عارف سے کہا۔ ''جنریٹر ٹھیک ہوگیا ہے تو اسے چلا دو۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک تو ہوگیا تھا لیکن رات کو کوئی کُتے کا بچہ اس کی ساری بڑی تاریں کاٹ گیا ہے۔ اب پھر اسے چالو کرنے میں دو تین دن لگ جائیں گے۔ مجھے نوے فیصد یقین ہے کہ یہ شاہی کے کسی بندے کا کام ہے۔ میں نے چوہدری نواب کو آخری وارننگ دی ہے کہ وہ شاہی اور اس کے چیلوں کو سنبھال لے۔ ورنہ انہیں دن میں تارے نظر آجائیں گے۔''

دو دن مزید گزرے۔ ان میں کوئی خاص واقعہ رُونما نہیں ہوا لیکن تیسرے دن صبح سویرے شانی کو اوپر تلے دو اہم خبریں ملیں۔ پہلی خبر ڈاکٹر نعمان کے بارے میں تھی۔ وہ بھی لاہور واپس چلا گیا تھا۔ کہا تو اس نے یہی تھا کہ وہ دوست کی شادی میں شرکت کر کے تین چار دن تک واپس آجائے گا لیکن اس کے ساتھ کام کرنے والی نرس کا کہنا تھا کہ وہ واپس نہیں آئے گا..... دوسری خبر زیادہ دھماکہ خیز بلکہ سکتہ زدہ کر دینے والی تھی۔

چھ بجے کے لگ بھگ شانی کو گھر سے باہر شور سنائی دیا۔ شور سن کر خالو اعجاز اور جمشید وغیرہ فوراً باہر چلے گئے۔ شانی نے وسیع صحن عبور کیا اور بیرونی دروازے پر پہنچی۔ اس نے پٹ وا کر کے باہر جھانکا اور اس کی روح تک کانپ گئی۔ وہ ایسا ہی لرزا دینے والا منظر تھا۔

ایک مشکی گھوڑ ا ہانپا ہوا اور پسینے میں تر بتر کھڑا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ بہت دور سے یہاں پہنچا ہے۔ گھوڑے کی رکاب میں گھڑسوار کا پاؤں اس بُری طرح الجھا ہوا تھا کہ بس جکڑ کر رہ گیا تھا۔ گھوڑے سے گرنے کے بعد گھڑسوار گھوڑے کے ساتھ بہت دور تک گھسٹتا رہا تھا۔ شاید کئی کلومیٹر تک۔ اس المیے نے براؤن شلوار قمیص والے گھڑسوار کے بالائی دھڑ کو خوفناک حد تک مسخ کر دیا تھا۔ اس کی کھوپڑی ٹوٹ کر خالی ہوگئی تھی۔ اونچی نیچی جگہوں سے ٹکرا ٹکرا کر کندھے اُکھڑ گئے تھے اور پسلیاں ریڑھ کی ہڈی سے علیحدہ ہو کر خوفناک منظر پیش

کر رہی تھیں۔ شانی ایک بار دیکھنے کے بعد اس لاش کو دوبارہ نہیں دیکھ سکی۔ اس نے خالہ فیروزہ اور ان کی والدہ کو بھی یہ منظر دیکھنے سے منع کر دیا۔

کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ یہ گھوڑا کہاں سے آیا ہے..... اور بدترین موت کا شکار ہونے والا گھڑسوار کون ہے۔ گھڑسوار کے سینے پر گولی کا زخم بھی ڈھونڈ لیا گیا۔ عارف کے چند نوجوان ساتھیوں کا اندازہ تھا کہ یہ گھڑسوار میانہ کا ہے۔

اسی دوران میں چند اور گھڑسوار بھی دھول اُڑاتے نمودار ہوئے۔ عارف، جمشید اور ان کے درجنوں پُرجوش ساتھی چوکس ہوگئے۔ چند ایک نے اپنی رائفلیں بھی کندھوں سے اُتار لیں۔ گھڑسوار قریب پہنچے تو یہ ثابت ہوگیا کہ وہ میانہ سے ہی ہیں۔ یہ کل چار افراد تھے ان میں دو نیلی پگڑیوں والے بھی تھے اور نیلی پگڑی تاؤ حشام کے گرگوں کا طرہ امتیاز تھی۔ ان میں سے ایک شخص کی شکل شانی کو جانی پہچانی لگی۔ پھر اس نے پہچان لیا۔ وہ اس مکروہ چہرے کو کیسے بھول سکتی تھی۔ تاؤ کی حویلی میں اس شخص نے رستم کو چمڑے کی بیلٹ سے مارا تھا۔ تاؤ اور قادرا اسے ''چیمہ'' کہہ کر بلاتے تھے۔ یہ چیمہ تیزی کے ساتھ گھوڑے سے اُترا اور سر بریدہ لاش کی طرف لپکا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ اس سے لپٹ کر رو رہا تھا۔ لپٹنے سے اس کے اپنے سارے کپڑے بھی خون آلود ہوگئے۔ وہ مرنے والے کو ''میرا بھائی'' کہہ کر مخاطب کر رہا تھا اور اس کے جسم کو چوم رہا تھا۔

عارف نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ''کیا ہوا اس بندے کو؟''

''تمہیں نظر نہیں آرہا۔'' چیمہ کراہا۔ ''یہ مر گیا ہے۔ ختم ہوگیا ہے اور اس کے ختم ہونے میں تمہارا بھی قصور ہے۔ تم سب کا قصور ہے۔ کٹھولی کے میلے میں تم اس حرامی رستم کو نہ بچاتے تو آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا..... میرا بھائی قتل ہوا ہے اور تم سب بھی اس قتل کے ذمے دار ہو۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے چیمے کی آواز بلند تر ہوگئی اور اس کی آنکھوں سے آتشی آنسو گرنے لگے۔

ایک نیلی پگڑی والے نے آگے بڑھ کر مرنے والے کا رکاب میں پھنسا ہوا پاؤں آزاد کرا دیا۔ چیمے نے کئی پھٹی لاش کو گود میں اٹھایا اور کچھ دور پڑی ایک کھری چارپائی پر ڈال دیا۔ ایک مقامی شخص نے اپنی چادر اس پر ڈال دی۔

عارف نے نیلی پگڑی والے سے پوچھا۔ ''کیا معاملہ ہے بھئی؟''

نیلی پگڑی والے کا رنگ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح متغیر تھا اور وہ ہانپا ہوا تھا۔ اس نے ناراض لہجے میں انکشاف کیا۔ ''ابھی کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے رستم سیال اور اس کے ساتھیوں نے میانہ پر حملہ کیا ہے۔ اندھا دھند گولیاں چلا کر انہوں نے کئی بندے مار دیئے ہیں۔ وہ چوہدری

حشام، چھوٹے چوہدری راجو اور ایک ملازم ساجن کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔“

عارف کمبوہ اور دیگر لوگوں نے سخت حیرت کے عالم میں یہ اطلاع سنی۔

عارف نے کہا۔ ”کیا تم نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ہے؟“

”یہ دیکھو، میرے پاؤں پر گولی لگی ہے۔“ نیلی پگڑی والے نے پنڈلی سے اپنا لاچہ اٹھاتے ہوئے عارف کو زخم دکھایا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”ہم نے رستم سیال اور اس کے ساتھیوں کا پیچھا کیا۔ کچھ نہیں تو آٹھ دس میل تک ہم ان کے پیچھے رہے۔ فائرنگ بھی ہوتی رہی لیکن پھر وہ لوگ رکھ میں پہنچ گئے اور وہاں سے ٹیلوں کی طرف نکل گئے۔ چیمہ کا بھائی بھی پیچھا کرنے والوں میں تھا۔ اسے رستم یا اس کے ساتھیوں میں سے کسی کی گولی لگی ہے۔“ نیلی پگڑی والے کے لہجے میں ناراضی کی جھلک بدستور موجود تھی۔ اس واقعے نے پورے جوہرآباد میں شدید سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ چیمہ اپنے بھائی کی موت اور تاؤ حشام کے اغوا پر مسلسل واویلا کر رہا تھا۔

عارف کے ساتھیوں میں سے ایک نے نیلی پگڑی والے کے زخمی پاؤں کا خون روکنے کی کوشش کی لیکن ایک ادھیڑ کمبوہ نے پھنکار کر کہا۔ ”پیچھے ہٹ جاؤ۔ کوئی ہمدردی کی جرورت نہیں۔ یہ ہماری صھپیہ (صفیہ) کے قاتل ہیں۔ ہم ان کے جخم (زخم) پر پیشاب بھی نہیں کریں گے۔“ جواں سال کمبوہ پیچھے ہٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ لوگ خوفناک، سربریدہ لاش لے کر واپس روانہ ہو گئے۔

ایک آدھ گھنٹے کے اندر اندر تصدیق ہو گئی کہ تقریباً تیس کلومیٹر دور میانہ گاؤں میں صبح منہ اندھیرے ایک خوفناک واردات ہو چکی ہے۔ اس واردات میں چوہدری کے پانچ بندے موقع پر ہلاک ہوئے تھے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد دوگنا تھی۔ چپے چپے پر پولیس اور رضاکاروں کی موجودگی کے باوجود رستم سیال میانہ گاؤں کی حویلی سے اپنے شکار کو اچک کر لے گیا تھا۔

اس واقعے کی جو مزید تفصیلات سامنے آئیں، ان سے معلوم ہوا کہ رستم سیال خود اس واردات میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ایک پرانے ساتھی حسنا گجراتی کے موجود ہونے کے شواہد بھی ملے ہیں۔ چند دن پہلے تک میانہ گاؤں کے اردگرد سخت پہرہ تھا۔ مقامی لوگوں کے علاوہ پولیس والے بھی رات کو نگرانی پر رہتے تھے لیکن تین چار دن پہلے ڈی ایس پی ریاض گاؤں آیا تھا۔ اس نے چوہدری حشام اور دیگر گاؤں والوں کو تسلی دی تھی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں رستم یا اس کے ساتھیوں میں سے کوئی میانہ کی طرف آنے کی جرأت نہیں کرے گا۔

آج یہ جرأت ہو گئی تھی اور بڑے سنسنی خیز انداز میں ہوئی تھی۔ میانہ کے کئی گھروں میں صفِ ماتم بچھی تھی۔ آنے والے چوہدری حشام اور اس کے بیٹے کو جانوروں کی طرح باندھ کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ تاؤ حشام کی حویلی میں کئی عورتیں اور جوان نوکرانیاں بھی موجود تھیں لیکن ڈاکوؤں نے کسی عورت کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ قتل اور زخمی بھی وہ لوگ ہوئے تھے جنہوں نے بھرپور مزاحمت کی تھی۔ معلوم ہوا کہ رستم اور اس کے ساتھی میانہ کے قریبی کھیتوں میں موجود تھے۔

صبح منہ اندھیرے وہ چھوٹے مالک راجو کی رہائش گاہ کی طرف سے حویلی میں گھسے۔ پہلے انہوں نے کتوں کو گولی ماری اور پہرے داروں پر قابو پایا۔ پھر چھوٹے مالک کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ تب وہ للکارے مارتے اور اندھا دھند فائرنگ کرتے حویلی کے بڑے حصے میں چلے گئے۔ جب تاؤ حشام پکڑا گیا تو وہ نیم برہنہ تھا اور حویلی کی انچارج نوکرانی چھیدو کے ساتھ سو رہا تھا۔ حویلی کے اس حصے میں شدید فائرنگ ہوئی۔ رستم کے ایک دو بندے بھی زخمی ہوئے حویلی کے دس بارہ افراد یہاں خاک و خون میں لوٹ گئے۔ تاؤ حشام نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ رستم بے حد وحشت کے عالم میں تھا۔ وہ دروازہ توڑ کر اندر گھس گیا۔ اس نے تاؤ کو بڑی بے دردی سے مارا اور لہولہان کر دیا۔ بتانے والے بتا رہے تھے کہ تاؤ جو پہلے ہی نیم عریاں تھا، بالکل ننگا ہو گیا۔ ڈاکو اسے اسی حالت میں حویلی سے باہر لائے۔ تاہم جب بعد میں اس کے ہاتھ پاؤں باندھے گئے تو اس کے زخمی جسم کو چادر میں لپیٹ دیا گیا۔

تاؤ اور اس کے بیٹے کی اغوا کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل گئی۔ جوہرآباد میں بھی لوگ ٹولیوں کی صورت میں جمع ہو کر تبصرے کرنے لگے۔ عارف اور نواب دین نے گاؤں کی سیکورٹی سخت کر دی۔ مسلح کمبوہ نوجوان گاؤں کی حدود پر گشت کرنے لگے۔

پتا نہیں کیوں شانی کی آنکھوں میں رہ رہ کر کھولی گاؤں کے میلے کا منظر گھوم رہا تھا۔ جب رستم کے سامنے تاؤ حشام کے بندوں نے شانی کو مارا تھا۔ شانی کے دل سے آواز آئی کہ انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ اگر رستم یہاں سے بچ گیا تو وہ ان لوگوں کو معاف نہیں کرے گا۔ وہ اس کی توہین کا بدلہ بدترین طریقے سے لے گا۔ نہ جانے کیوں اس کے دل سے آواز آ رہی تھی کہ آج جو کچھ ہوا ہے، وہ اسی میلے والے واقعے سے تعلق رکھتا ہے ...... وہ اندر تک لرز گئی اس کے دل و دماغ پر انجانے اندیشے یلغار کرنے لگے۔

اسی دوران میں عارف تیزی سے اندر آیا اس نے کہا۔ ”شانی...... میں نہیں چاہتا کہ تمہارے لئے کسی طرح کا خطرہ پیدا ہو۔ میں نے گھر سے باہر تین بندوں کا پہرہ لگا دیا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں کسی دوسرے گھر بھجوا دوں۔‘‘

’’میرے خیال میں تو اس کی ضرورت نہیں عارف۔‘‘

’’چلو...... اس بارے میں بھی دیکھ لیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ آج کسی وقت پولیس یہاں پہنچے اور ہم سے پوچھ گچھ کرے۔ اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو ہمارا جواب بالکل صاف ہونا چاہئے۔ رستم سیال اور حسنا گجراتی وغیرہ سے ہمارا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ نہ ہم ان کے قول وفعل کے ذمے دار ہیں۔ ہمیں تو خود رستم سیال کی طرف سے دھمکیاں ملتی رہی ہیں۔ پولیس اس بارے میں اچھی طرح سے جانتی ہے۔‘‘

’’تمہارا مطلب رستم کے خط سے ہے؟‘‘ شانی نے پوچھا۔

’’بالکل...... اس خط کو بنیاد بنایا جائے تو ہم پر بوجھ بہت کم ہوسکتا ہے۔‘‘

ابھی شانی اور عارف میں بات ہو ہی رہی تھی کہ جمشید تیزی سے اندر آیا۔ ’’بھائی عارف! مہتم بستی سے سردار دراج کا بندہ آیا ہے۔ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔‘‘

عارف شانی کو سمجھا بجھا کر جمشید کے ساتھ باہر نکل گیا۔ عارف کی بیوی جمیلہ اور جمشید کی بیوی تابندہ آگئیں۔ ان دونوں کے چہروں پر بھی تشویش کے آثار تھے۔

تابندہ نے سر بریدہ گھڑ سوار کی لاش دیکھی تھی۔ اب وہ بار بار کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھی۔ جمیلہ نے کہا۔ ’’کام بہت خراب ہوگیا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ ناریوری اکٹھے ہوکر کہیں ہمارے پنڈ پر نہ چڑھ دوڑیں۔‘‘

’’ہمارا پنڈ کمزور تو نہیں ہے۔‘‘ دیہاتی مزاج کی تابندہ نے سینہ تان کر کہا۔ ’’ایک ایک ناریوری کو زمین نہ چٹوائی تو ہم کمبوہ کہاں کے ہوئے۔ ابھی تو ہماری جوان کڑی کی موت کا قرضہ بھی باقی ہے ان حرامیوں پر۔‘‘

’’لیکن خون خراب بہت ہوگا اور یہ نہیں ہونا چاہئے۔‘‘ میٹرک پاس جمیلہ نے تحمل سے کہا۔

’’دہائی خدا کی۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کرے داڑھی والا پکڑا جائے مونچھوں والا۔ حشمے اور اس کے پتر کو ڈاکوؤں نے اغوا کیا ہے۔ ہمارے سر پر کیوں چڑھ رہے ہیں ناریوری؟‘‘ تابندہ تپ کر بولی۔

دھوپ چڑھ آئی تھی۔ جوہرآباد گاؤں میں روزمرہ کے کام شروع ہوگئے تھے۔ مویشی گھنٹیاں بجاتے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ کمبوہ عورتیں سروں پر گھڑے رکھے، ہاتھوں میں بالٹیاں لٹکائے پانی بھرنے جا رہی تھیں۔ کچے گھروں کے صحنوں اور برانڈوں سے چولہوں کا دھواں اٹھنا شروع ہوگیا تھا لیکن اس سب کے باوجود ایک سراسیمگی بھی گاؤں میں موجود تھی

اور ایک لہر کی طرح لوگوں کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ بڑے بوڑھے ٹولیوں کی صورت میں کھڑے قیاس آرائیاں کرنے میں مصروف تھے۔ گاؤں کے رضا کار نوجوان بندوقیں اور کلہاڑیاں اٹھائے گشت لگا رہے تھے، اچانک شور اٹھا۔ ’’پولیس آگئی...... پولیس آگئی۔‘‘

سراسیمگی کی فضا گھمبیر تر ہوگئی۔ کھڑکیاں دروازے بند ہونے لگے۔ اہلِ دیہہ چار دیواریوں کے اندر سمٹنے لگے۔ ہر چہرے پر کچھ سوالات تھے۔

پولیس کیا کرنے آئی ہے؟

کتنی تعداد میں آئی ہے؟

پولیس والے کس طرح کی پوچھ گچھ کریں گے؟ کیا ریاض ہٹلر بھی پولیس پارٹی کے ساتھ ہے؟ آخری سوال خاصا اہم اور پریشان کن تھا۔

شانی بھی یہ ساری کیفیات دیکھ رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد پولیس کی جیپ اور دو ٹرک نما نیلی گاڑیاں گاؤں میں داخل ہونے والے راستے پر نمودار ہوگئیں۔ ان کے عقب میں گاؤں کے کُتے شور مچاتے چلے آرہے تھے۔ ان گاڑیوں کے ہمراہ مقامی تھانے کی نفری بھی تھی اور یہ لوگ گھوڑوں پر سوار تھے۔ فضا میں جیسے ایک غیر مرئی آواز گونجنے لگی۔ ’’کچھ ہونے والا ہے۔‘‘

پھر خالو اعجاز دھواں دھواں چہرے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے شانی سے کہا۔ ’’پولیس آگئی ہے اور ڈپٹی ریاض بھی ساتھ ہے۔‘‘

ڈپٹی ریاض کا لفظ شانی کے کانوں میں تیر کی طرح لگا۔ اس شخص سے ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں شانی کی صرف ایک ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں کوئی ایسی خاص بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ گالیاں بکنا تو اکثر پولیس والوں کا شیوہ ہوتا ہے، پھر بھی شانی نے اس شخص کو دل کی گہرائیوں سے ناپسند کیا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا کہ آئندہ اس شخص سے کبھی ملاقات نہ ہو لیکن آج وہ پھر شانی کے آس پاس موجود تھا۔

ڈپٹی ریاض کی آمد نے ڈرے ہوئے لوگوں کو کچھ اور ڈرا دیا۔ بالکل جیسے درندے کی آمد سے جنگل سہم جاتا ہے۔

کچھ دیر بعد مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہوا۔ ’’شہر سے پولیس کے وڈے افسر ڈپٹی ریاض صاحب آئے ہیں اور چوہدری نواب کے ڈیرے پر موجود ہیں۔ وہ کچھ لوگوں سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں۔ گاؤں والوں کو اطلاع ہے کہ وہ ابھی کام کاج پر نہ جائیں۔ جو لوگ کھیتوں پر ہیں وہ بھی گھروں میں واپس آجائیں۔ اعلان ایک دفعہ پھر کیا جاتا ہے...... شہر

سے پولیس کے وڈے افسر.....''

اس اعلان نے مزید ہراس پھیلا دیا۔ شانی نے دیکھا خالو اعجاز کی بوڑھی ساس برآمدے میں مصلی بچھا کر بیٹھ گئی ہے۔ یقیناً دوسرے گھروں میں بھی اس قسم کی صورتِ حال ہوئی ہوگی۔

تقریباً دس منٹ گزرے ہوں گے کہ گلی میں کئی افراد کے بولنے کی آوازیں آئیں۔ پھر زوردار دستک ہوئی۔ خالو اعجاز دروازے پر پہنچے۔ باہر حسبِ اندیشہ پولیس موجود تھی۔ ڈپٹی ریاض ہٹلر بھی موجود تھا۔ شانی نے دیکھا وہ باوردی پولیس والوں کے درمیان بغیر وردی کے تھا۔ اس نے براؤن پینٹ اور قمیص پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں تلے دار کھسہ تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی اور آنکھوں میں شاید شراب کی سرخی تھی۔ وہ خالو اعجاز کو تقریباً دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ تین باوردی پولیس والے بھی اندر گھس آئے۔

''تمہاری بھانجی کہاں ہے؟'' اس نے چھوٹتے ہی خالو اعجاز سے سوال کیا۔

''اندر ہے۔''

''بات کراؤ اس سے۔'' ڈی ایس پی کا لہجہ دھیما تھا لیکن اس دھیمے پن کے پیچھے کرختگی چھپی ہوئی تھی۔

اس سے پہلے کہ خالو جواب میں کچھ کہتے وہ بولا۔ ''صرف بات کرنی ہے اس سے اور کچھ نہیں۔ مسجد میں لے جا کر حلف لے لو مجھ سے۔'' پھر اس کی عقابی نظر نے چق کے نیچے سے شانی کے پاؤں دیکھ لئے۔ وہ تیزی سے برآمدہ پار کر کے اندر آ گیا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے خالو اعجاز کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ''صرف دو منٹ، کچھ نہیں کہوں گا اسے۔''

خالو اعجاز کا منہ کھلا تھا۔ وہ جیسے مسمرائز ہو گئے تھے۔ جو کچھ کہنا چاہ رہے تھے، کہہ نہیں پا رہے تھے۔ ڈپٹی ریاض نے دروازہ بھیڑ کر بند کر دیا۔ ایک رائفل بردار دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ شانی کا دل اس کے سینے میں کبوتر کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ ڈپٹی ریاض کی دہشت اس پر حاوی ہو رہی تھی۔

ریاض اس کے سامنے آن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ دھیمے لہجے میں بولے گا یا آتش فشاں کی طرح پھٹ جائے گا۔ آنکھیں نشے کی وجہ سے انگارہ تھیں۔

''اپنا منہ دوسری طرف کرو۔'' وہ کرخت لیکن دھیمے لہجے میں بولا۔

''مم..... میں سمجھی نہیں۔''

''میں فارسی میں پشتو ملا کر نہیں بول رہا۔ سیدھی سادی بکواس کر رہا ہوں، اپنا منہ دیوار کی طرف کر۔''

شانی سنبھل کر بولی۔ ''آ..... آپ ہوش میں ہیں؟ کیا چاہتے ہیں آپ؟''

اس نے اپنا لہجہ تھوڑا سا نرم کر لیا۔ ''اوئے بی بی جان.....! کچھ نہیں کہوں گا تجھے۔ اپنا منہ ذرا دوسری طرف کر لے۔'' نرم ہونے کے باوجود اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ شانی اندر تک لرز گئی۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے اپنا رخ ڈپٹی ریاض کی طرف سے پھیر لیا۔

اسے زِپ کے کھلنے کی آواز آئی پھر پانی گرنے کی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ناگوار بُو شانی کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ کچھ دیر بعد شانی نے مڑ کر دیکھا۔ ڈپٹی ریاض شیشے کے ایک خوبصورت جگ میں پیشاب کرنے کے بعد بڑی بے پرواہی سے زِپ بند کر رہا تھا۔ ''بیٹھ جا اِدھر'' اس نے شانی کو اپنے سامنے موڑھے پر بیٹھنے کا حکم دیا۔

شانی ہکا بکا سی بیٹھ گئی۔ ریاض ہٹلر کا عجیب و غریب رویہ اسے ماؤف کر رہا تھا۔ اس نے گندے ہاتھوں سے ہی جیب سے ٹوتھ پک نکالی اور دانتوں میں خلال شروع کر دیا۔ گوشت کے چند ریزے دانتوں سے نکالنے کے بعد اس نے ایک گونج دار ڈکار لی اور پتلون کی جیب سے ایک ریوالور نکال لیا۔ پھر اس نے ریوالور کا چیمبر کھول کر شانی کو تین گولیاں دکھائیں اور عجیب خوفناک لہجے میں بولا۔ ''دیکھ بی بی جان! یہ تین گولیاں ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر تیرے ایک رشتے دار کا نام لکھا ہوا ہے۔ کس کس کا نام ہے، یہ میں تجھے ابھی نہیں بتاؤں گا۔''

بڑے اطمینان کے ساتھ اس نے ریوالور واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس کا سرکاری پسٹل اس کی کمر سے بندھے ہوئے سیاہ ہولسٹر میں تھا۔ شانی سکتہ زدہ تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ بندہ جو کہہ رہا ہے وہ کر سکتا ہے۔ پھر وہ اپنا بودار چہرہ شانی کے قریب لے آیا اور سانپ کی طرح پھنکارا۔ ''میری ایک بات یاد رکھنا بی بی جان! میرا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا ہے۔ حاجی حیات خان، نہ اس کا کوئی ہوتا سوتا۔ جب میں کچھ کرنا چاہوں گا ناں، تو کوئی کنگ کماٹا یا دانی خاں کا سالا مجھے روک نہیں سکے گا، یہ ریوالور جو میں نے تجھے دکھایا ہے ناں، تیرے ہی رشتے داروں کے لئے ''سیف'' پڑا رہے گا اور جس دن اسے نکالوں گا، اسی دن مسجد میں تین جنازوں کا اعلان ہو جائے گا۔ سمجھ رہی ہے ناں میری بات؟''

اس نے چند لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ کہا۔ ''اور اس دھوکے میں بھی نہ رہنا کہ میں کچھ جانتا نہیں ہوں۔ کس کے دماغ میں کتنے کیڑے ہیں، سب گنے ہوئے ہیں میں نے۔ مجھے زیادہ تنگ نہ کرنا۔ بس اتنا ہی کرنا جتنا میں سہہ سکوں..... یہ دیکھو..... میں ہاتھ

جوڑ دیتا ہوں تمہارے سامنے۔'' اس نے باقاعدہ شانی کے سامنے ہاتھ جوڑے لیکن اس عمل میں اتنا زہر تھا کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ شانی روح کی گہرائی تک کانپ گئی۔

وہ کچھ دیر تک اپنے دانت کھرچتا رہا پھر ایک اور ڈکار لے کر اچانک بولا۔ ''رستم کہاں ہے؟''

''مم...... مجھے کیا پتا......؟'' شانی ہکلائی۔

''مجھے پتا ہے...... لیکن میں وہاں جاؤں گا تو وہ کُتے کا تخم پوٹھوہاری پتھروں کے پیچھے سے پٹاخے چلائے گا۔ میرے بندے برباد کرے گا۔ اس کے لئے مجھے وہاں کسی اور کو بھیجنا پڑے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ چل اُٹھ۔'' شانی نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ وہ بولا۔ ''چل اُٹھ کا مطلب ہوتا ہے چل اُٹھ۔ میرے ساتھ چل میں تجھے گوجر خان لے جاتا ہوں۔ وہاں سے بس دو ڈھائی دن کا پیدل سفر ہے۔ اپنے حرامی یار کے پاس چلی جا۔ اسے تھوڑی سی لش پش دکھا، دو چار جھپیاں ڈال، ایک دو راتیں اور اس کے ساتھ سولے۔ پھر اس سے فرمائش کرے گی ناں تو وہ اپنی بہن کو بھی اپنے ہاتھ سے کوٹھے پر پہنچا دے گا، چوہدری حشام کی رہائی تو کوئی بات ہی نہیں مسماۃ شانی۔''

شانی کے بے پناہ خوف پر ایک دم رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی کا جلال غالب آ گیا۔ اس نے پہلی بار طیش بھری نظروں سے ریاض ہٹلر کا چہرہ دیکھا اور بولی۔ ''تم ہوش میں تو ہو......؟ جانتے ہو کیا کہہ رہے ہو؟''

شانی اور ریاض ہٹلر کی آنکھیں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ دونوں بے حد گھمبیر انداز میں خاموش رہے۔ پھر اچانک ریاض ہٹلر نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔ ''اوئے، تُو تو ایسے ڈر گئی ہے جیسے ابھی تجھے مشکی گھوڑے پر بٹھا کر تیرے یار کے پاس پارسل کر رہا ہوں۔ ابھی نہیں ابھی نہیں...... ابھی ذرا چیری تک سانس لے۔ سب کچھ ہوگا اور اگر تو چاہے گی ناں تو وہ جنازوں والا کام بھی ڈال دوں گا لیکن وقت آنے دے۔'' ریاض کے چہرے پر بشاشت تھی لیکن آنکھیں تندور کی طرح دہک رہی تھیں۔

☆======☆======☆

اسی دوران میں باہر سے شور وغل کی آوازیں بلند ہونے لگیں جیسے بہت سے افراد ایک ساتھ تند و تیز لہجے میں بول رہے تھے۔

ریاض ہٹلر نے شانی کی طرف سے توجہ ہٹا کر باہر کھڑے رائفل مین کو مخاطب کیا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''اوئے حکم دین! یہ باہر کس کی بہن کو بچہ ہو رہا ہے......؟''

حکم دین نے اٹین شین ہو کر کہا۔ ''سر! کچھ بندے اسلحہ نہیں دے رہے۔ خواہ مخواہ بحث کر رہے ہیں۔''

شانی کو وہیں چھوڑ کر ڈپٹی ریاض پھنکارتا ہوا باہر نکل گیا۔ شانی لپک کر کھڑکی پر پہنچی اور باہر کا منظر دیکھنے لگی۔ گلی میں بہت سے افراد جمع تھے۔ دو چار پائیاں گلی کے بیچوں بیچ پڑی تھیں۔ ان پر بہت سی بندوقیں، پسٹل، ریوالور اور ان کا ایمونیشن ایک ڈھیر کی صورت میں موجود تھا۔ شانی نے دیکھا جمشید ایک ہٹے کٹے پولیس والے سے الجھ رہا تھا۔ جمشید کے ساتھ ساتھ پولیس والے کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔

ڈی ایس پی ریاض دندناتا ہوا اس منظر میں داخل ہوا۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے جمشید سے پوچھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ جمشید جواب میں کچھ کہتا، ریاض کا طوفانی تھپڑ جمشید کے رخسار پر پڑا۔ چٹاخ کی آواز جیسے پورے جوہر آباد میں گونج کر رہ گئی۔ پھر ایک اور تھپڑ پھر ایک اور۔ جمشید لڑکھڑاتا ہوا دس پندرہ قدم پیچھے چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں آگ دہکنے لگی لیکن اتنی ہمت بہرحال اس کی نہیں تھی کہ وہ ریاض کا ہاتھ پکڑ سکتا یا اس پر جوابی حملہ کرتا۔ ریاض نے اپنا سرکاری پسٹل نکالا اور اس کی نال بے دریغ جمشید کے سر سے لگا دی۔ خوفناک آواز میں گرجا۔ ''کتے کے بچے! کھوپڑی توڑ کر بھیجا نالی میں بہا دوں گا۔ کوئی پوچھے گا نہیں کہ کیوں کیا

ہے میں نے ایسا.....''

شاید وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن اسی دوران میں عارف کمبوہ جیپ سے اُتر کر دوڑتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ ''کیا بات ہے صاحب؟'' اس نے ریاض کے سامنے پہنچ کر کہا۔

ریاض نے جمشید کے سر سے پستول ہٹایا اور عارف کو سرتاپا دیکھ کر بولا۔ ''تم کون ہو؟''

''میرا نام عارف ہے۔''

''اچھا اچھا۔ تم عارف ہو۔'' وہ جمشید کو چھوڑ کر پوری طرح عارف کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''کیا کرتے ہو؟''

''چھوٹا سا زمیندار ہوں جی۔''

ریاض نے ایک بار پھر عارف کو سرتاپا گھورا۔ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''زمیندارا تو چھوٹا سا ہے لیکن پنگا بہت بڑا لیتے ہو۔'' وہ اپنے بائیں ہاتھ کو دائیں کندھے پر رکھ کر بازو کی لمبائی بتاتے ہوئے بولا۔ دوسرے لفظوں میں وہ ''پنگے'' کی لمبائی بتا رہا تھا۔

''میں سمجھا نہیں صاحب۔''

''سنا ہے لیڈری شیڈری کرتے ہو۔ لوگوں کو اپنے پیچھے لگاتے ہو۔ ان سے نعرے لگواتے ہو زندہ باد..... مُردہ باد..... زندہ باد۔''

''ایسی بات نہیں ہے سر.....''

''یعنی میں بکواس کر رہا ہوں۔ ککو گھوڑا ہوں میں۔ کچھ پتا نہیں ہے مجھے!''

''نہیں سر..... میں نے یہ تو نہیں کہا۔ میرا مطلب.....''

''زیادہ مطلب کے مامے نہ بنو تم۔'' مقامی ایس ایچ او نواز احمد نے عارف کو ٹوکا۔ ''وڈے صاحب جو کہہ رہے ہیں اس کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ پنڈ کے لوگ تمہاری بات مانتے ہیں۔ ان..... کہو کہ سرکاری آرڈر کے مطابق اپنا اسلحہ لے کر یہاں آ جائیں۔ کسی کے پاس سے بعد میں کوئی چھوٹی موٹی شے بھی نکل آئی تو بڑی بُری طرح ذلیل ہو گا۔''

عارف نے گہری سانس لی اور ڈپٹی ریاض کی طرف دیکھ کر جرأت سے بولا۔ ''سر میں لیڈر نہیں ہوں اور نہ بننا چاہتا ہوں لیکن اگر پنڈ والے میری تھوڑی بہت بات مانتے ہیں تو یہ ان کی مہربانی ہے۔ اگر آپ کا آرڈر ہے کہ اسلحہ جمع ہونا چاہئے تو ضرور ہونا چاہئے کسی سے بعد میں ایک گولی بھی نہیں نکلنی چاہئے لیکن میری درخواست ہے کہ یہ آرڈر سب کے لئے ایک جیسا ہو۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' ڈپٹی ریاض پھنکارا۔

''آپ نقصِ امن کے تحت اسلحہ جمع کر رہے ہیں تو پھر دونوں فریقوں کا اسلحہ ایک ساتھ جمع ہو..... اگر آپ ہمیں تنہا کر کے چلے جائیں اور پھر پندرہ منٹ بعد میانہ کے غنڈے بندوقیں لے کر ہم پر چڑھ دوڑیں تو ہم کیا کریں گے۔''

ریاض کا چہرہ اندرونی طیش کی وجہ سے انگارہ ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا کہ وہ ایک زناٹے کا تھپڑ عارف کے چہرے پر بھی جڑ دے گا لیکن پھر پتا نہیں کیسے یہ تھپڑ ٹل گیا۔ ریاض پھنکارا۔ ''تیرا کیا خیال ہے میرے دودھ کے دانت ابھی گرے نہیں ہیں۔ میں روٹی کو توتی کہتا ہوں۔ اِدھر آ، میں دکھاؤں تجھے اِدھر آ۔'' اس نے عارف کا بازو کندھے کے قریب سے پکڑا اور اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا پولیس کے بڑے ٹرک کی طرف لے گیا۔ ٹرک کے پچھلے حصے کو ترپال نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اپنے پسٹل والے ہاتھ کے ساتھ اس نے ایک جھٹکے سے ترپال پیچھے ہٹا دی۔ ٹرک میں بہت سا اسلحہ ایک ڈھیر کی صورت میں پڑا تھا۔ ریاض ہٹلر وہیں کھڑے کھڑے تلخ لہجے میں عارف سے بولنے لگا۔ وہ گاہے بگاہے ٹرک کے اسلحے کی طرف بھی اشارہ کر رہا تھا۔

وہ دونوں کافی فاصلے پر کھڑے تھے اس لئے آوازیں شانی کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ ریاض غالباً عارف کو بتا رہا تھا کہ وہ یہ اسلحہ میانہ گاؤں سے ہی اکٹھا کر کے لایا ہے اور اس حوالے سے عارف کا اندیشہ بالکل غلط ہے۔ عارف نے دو تین بار اثبات میں سر ہلایا اور ڈپٹی ریاض کے نہایت تند و تیز رویے سے دامن چھڑا کر ان لوگوں کی طرف چلا گیا جو ایک ہجوم کی صورت میں راستے کے کنارے کھڑے تھے۔ عارف نے ان کے سامنے پہنچ کر تقریر کرنے والے انداز میں چند باتیں کہیں۔

دور ہی سے پتا چل رہا تھا کہ لوگوں پر عارف کی باتوں کا اثر ہو رہا ہے۔ لوگ منتشر ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں چارپائیوں پر اسلحے کا ڈھیر اونچا ہونے لگا، اکثر لوگ اپنے لائسنس وغیرہ بھی ساتھ دے رہے تھے۔ ایک محرر جمع ہونے والے اسلحے کی تفصیل ایک کاغذ پر درج کرتا جا رہا تھا۔ ڈی ایس پی ریاض اپنے چند باوردی ماتحتوں کے ساتھ دندناتا ہوا چوہدری نواب کی حویلی کی طرف چلا گیا۔ وہ جب تک موقع پر موجود رہا تھا ہر نگاہ بس اسی پر مرکوز رہی تھی۔

ریاض کے جانے کے بعد شانی نے اپنا رخ کھڑکی کی طرف سے موڑا۔ خالو اعجاز بھی اس کے پیچھے آن کھڑے ہوئے تھے اور کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے تھے۔ انہوں نے اپنی ناک سکوڑتے ہوئے پوچھا۔ ''شانی یہ بُو کیسی ہے؟''

شانی کا دھیان سیدھا اس جگ کی طرف چلا گیا جو تپائی کی اوٹ میں پڑا تھا۔ اس کا دل مالش کرنے لگا۔ خوبصورت آرائشی جگ میں پیشاب تھا اور جگ سے باہر ہوم سویٹ ہوم کے الفاظ انگریزی میں لکھے تھے۔

کتنا خوفناک اشارہ تھا ریاض ہٹلر کا۔ اس نے اپنی حاجت روائی کے لئے ''ہوم سویٹ ہوم'' والا جگ استعمال کیا تھا۔ شاید اس طرح ریاض نے بتایا تھا کہ اگر وہ اپنی جبلت پر اتر آئے تو کسی بھی سویٹ ہوم کو برباد کر سکتا ہے۔ اس کی ''سویٹ نیس'' کو گندگی میں لتھڑ سکتا ہے۔ خالو اعجاز اب پیشاب والے جگ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شانی جلدی سے باہر نکل آئی۔

پولیس والے گاؤں کی گلیوں میں دندنا رہے تھے۔ گا ہے بگاہے ان کے کرخت للکارے بھی گونجتے تھے۔ شانی کمرے میں تھی اور اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچی تھی۔ تاؤ حشام اور اس کے بیٹے کا اغوا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ بہت بڑا واقعہ تھا اور اس کے دور رس نتائج مرتب ہونے والے تھے۔ خاص و عام میں یہ اندوہناک اطلاع پہلے ہی گردش کر رہی تھی کہ پولیس نے اب رستم اور اس کے چند قریبی ساتھیوں کو ٹھکانے لگانے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ اب اس تازہ ترین واقعے کے بعد تو پولیس کا رویہ مزید جارحانہ ہو جانا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ریاض ہٹلر نے ایک عجیب بات کہی تھی۔ اس نے شانی کو اشارہ دیا تھا کہ وہ مفویوں کی بازیابی کے لئے اسے رستم کی طرف بھیج سکتا ہے بعد میں اس نے خود ہی اس بات کو مذاق میں ٹال بھی دیا تھا۔ اب یہ بات تو وہی جانتا تھا کہ درحقیقت اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ وہ جتنا خطرناک تھا اتنا ہی شاطر بھی لگتا تھا۔ وہ ابھی تک گاؤں میں تھا۔ شانی کو ڈر لگ رہا تھا کہ وہ کہیں پھر نہ آن دھمکے۔ اس کا تصور شانی کے جسم پر عجیب سی کپکپی طاری کر دیتا تھا۔

گیارہ بجے کے بعد گاؤں میں گھر گھر کی تلاشی ہوئی۔ پولیس والے تین تین چار چار کی ٹولیوں میں آتے تھے۔ گھر کے مکینوں کو گھر سے باہر کھڑا کر دیتے تھے۔ گھر کے اندر گھس کر ہر شے کو الٹ پلٹ دیتے تھے۔ مشکوک افراد کو چوہدری نواب کی حویلی میں لے جایا جاتا تھا وہاں ریاض ہٹلر خود ان سے پوچھ گچھ کرتا تھا۔ پتا چلا کہ چند افراد کو مار پیٹ بھی گیا ہے اور کچھ کو مسجد میں لے جا کر ان سے حلف لیا گیا ہے۔ پورے جوہر آباد میں سراسیمگی کی کیفیت تھی۔ پولیس والوں کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جوہر آباد والوں پر رستم کو پناہ دینے کا شک بھی کر رہے ہیں۔

اگلے دن ظہر سے تھوڑی دیر پہلے پولیس اپنے خوفناک ڈی ایس پی ریاض ہٹلر سمیت

جوہر آباد سے واپس چلی گئی۔ لوگوں کی جان میں جان آئی۔ وہ جیسے ایک نہایت سخت شکنجے سے آزاد ہوئے تھے۔ تاہم خطرے کی تلوار بدستور سر پر لٹک رہی تھی۔ یقینی بات تھی کہ اگلے چند دن بلکہ چند ہفتوں تک پولیس کا یہاں آنا جانا لگا رہے گا۔

وہ رات عجیب سے تناؤ میں گزری۔ گاؤں کی فضا میں عجیب سی بے چینی پائی جاتی تھی۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ گھر کے بیرونی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ شانی کے ذہن میں پہلا خیال پولیس کا ہی آیا لیکن جب خالو اعجاز نے دروازہ کھولا تو عارف ہیجانی انداز میں اندر داخل ہوا تو شانی کو اندازا ہوا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔

عارف نے اندر آتے ہی پوچھا۔ ''جمشید کہاں ہے؟'' اسی دوران میں جمشید بھی آنکھیں ملتا پہنچ گیا۔ ''کیا ہوا عارف بھائی؟'' اس نے پوچھا۔

تاؤ حشام کے پنڈ سے بندوں سے بھری ہوئی پانچ ٹرالیاں آئی ہیں۔ وہ لوگ قبرستان کے ساتھ والے میدان میں کھڑے ہیں..... اور للکارے مار رہے ہیں۔ پندرہ بیس گھڑسوار بھی ان کے ساتھ ہیں۔ بلکہ شاید اس سے زیادہ ہوں گے۔''

ابھی عارف کی بات منہ میں ہی تھی کہ گلی میں شور اٹھا۔ چند گھڑسواروں کے سرشانی کو چار دیواری کے اوپر نظر آئے۔ عارف اپنی بات ادھوری چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ جمشید بھی ایک لاٹھی سونت کر اس کے پیچھے گیا۔ گھڑسوار یقیناً چوہدری حشام کے کارندے تھے۔ ان میں سے دو تین نے نیلی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ گلی میں عارف اور حشام کے کارندوں میں زوردار مکالمہ ہوا۔

حشام کا کارندہ کرخت آواز میں چلایا۔ ''چوہدری قادر نے سناں (پیغام) بھیجا ہے۔ پولیس کو درمیان میں کیوں لا رہے ہو۔ ہمت ہے تو کھلے میدان میں آؤ..... دو دو ہاتھ کرو۔ پتا چل جائے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔''

''پولیس کو ہم درمیان میں نہیں لائے۔ تم لائے ہو۔ ایسے کام نیچرے کرتے ہیں مرد نہیں۔'' عارف کا ایک ساتھی گرج کر بولا۔

''تو آجاؤ پھر کھلے میدان میں۔ ابھی پتا چل جائے گا..... کس نے ماں کا کتنا دودھ پیا ہوا ہے۔''

تند و تیز مکالمہ جاری رہا۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ غیظ و غضب کی یہ نئی لہر کل سویرے ہونے والے واقعے کی وجہ سے اٹھی ہے۔ پھٹے ہوئے سر کی لاش گھوڑے کے ساتھ گھسٹتی ہوئی یہاں پہنچی تھی۔ اس موقع پر حشام کے کارندوں اور مقامی کبوہوں میں تلخ کلامی ہوئی

تھی۔ایک بوڑھے کمبوہ نے کہا تھا کہ ہم میانہ والوں کے زخموں پر پیشاب بھی نہیں کریں گے اس کے بعد گالم گلوچ تک نوبت چلی گئی تھی۔

نیلی پگڑیوں والے گھڑ سوار جس طرح بپھرے ہوئے آئے تھے، اسی طرح دندناتے اور پھنکارتے ہوئے واپس چلے گئے۔ان کے جاتے ہی گاؤں میں ہنگامی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔نوجوانوں کے چہرے تمتمانے لگے۔بوڑھوں کے جسم تن گئے۔بیشتر عورتوں کی آنکھوں میں بھی غیظ وغضب کی چنگاریاں نظر آنے لگیں۔

عارف کی بیوی جمیلہ اسے روکتی ہی رہ گئی لیکن وہ ایک چمک دار لاٹھی لے کر تیزی سے باہر نکل گیا۔اُدھر جمشید نے ایک کلہاڑی پکڑ لی۔اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور وہ سرتاپا قہر نظر آرہا تھا۔اس کی بیوی تابندہ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔یوں لگ رہا تھا کہ وہ خود بھی کوئی ہتھیار تھام کر جمشید کے ساتھ نکلنے کو تیار ہے۔جمشید لمبے ڈگ بھرتا دروازے کی طرف بڑھا تو تابندہ نے چلا کر کہا۔''ٹھہر جاؤ جی.....ایک سیکنڈ کے لئے رکو۔''

وہ لپک کر اندر کمرے میں گئی اور ایک بڑی صافا نما چادر لے آئی۔اس نے ایک چکلا اٹھایا۔لکڑی کا گول چکلا اس نے بڑی مہارت سے خاوند کے سر پر رکھا اور اوپر صافے کو پگڑی کی طرح اس طریقے سے لپیٹ دیا کہ چکلا اس میں چھپ کر رہ گیا۔پگڑی کے دو تین بل اس نے جمشید کی ٹھوڑی کے نیچے سے بھی گزار دیئے۔یہ سر کے لئے ایک بڑا مضبوط سا سیفٹی گارڈ بن گیا۔جمشید کلہاڑی سنبھالتا ہوا چیتے کی طرح رقتدیں بھرتا باہر نکل گیا۔

شانی کو یوں لگ رہا تھا کہ بستی کے لوگ اس طرح کی لڑائیوں میں ماہر ہیں۔دو تین منٹ کے اندر درجنوں پیدل اور گھڑ سوار ''لڑاکے'' تیار ہو چکے تھے۔اکثر کے سروں پر بڑی بڑی پگڑیاں تھیں۔چمکتی ہوئی میخوں والی لاٹھیاں، کلہاڑیاں، ڈنڈے، سریئے غرض جس کے ہاتھ میں جو شے لگی تھی وہ لے کر نکل آیا تھا۔شانی کو چند ہاتھوں میں رائفلیں بھی نظر آئیں۔ یقیناً یہ چند رائفلیں اسلحہ جمع کرنے کے موقع پر چھپائی گئی تھیں۔کمبوہ بستی کے مکینوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔عورتیں اور بچے اس لڑائی کا نظارہ دیکھنے کے لئے چھتوں پر چڑھ گئے۔جو زیادہ دلیر تھے وہ میدان کی طرف جا رہے تھے۔

شانی نے بے چین ہو کر خالو اعجاز سے کہا۔''انہیں کوئی روکتا کیوں نہیں۔یہ کیوں خون خرابے کی طرف جا رہے ہیں۔پولیس کہاں ہے؟''

''پولیس کے پانچ چھ سپاہی صبح نظر آئے تھے۔اب تو وہ بھی نہیں ہیں۔شاید خطرہ دیکھ کر اِدھر اُدھر کھسک گئے ہیں۔''

''یہ لوگ کیا کریں گے؟ایک دوسرے کو ماریں گے۔ایک دوسرے کی جان لیں گے۔ اس سے کون سا مسئلہ حل ہوگا۔کون سی خوشی ملے گی ان لوگوں کو؟''

''بس ان دور دراز دیہاتوں میں یہی کچھ ہوتا ہے۔پہلے خون پسینہ ایک کر کے فصلیں اُگاتے ہیں۔پھر لڑتے ہیں، مرتے ہیں اور فصلوں کی کمائی مقدموں میں اجاڑتے ہیں۔''

''لیکن رنگ والی میں تو ایسی بدامنی نہیں تھی خالو۔مجھے تو لگ رہا ہے میں کسی پرانے دور میں پہنچ گئی ہوں۔''

وہ خالو اعجاز اور جمیلہ کے ساتھ چھت پر آگئی۔مشرق سے سورج طلوع ہو رہا تھا لیکن سورج کا چہرہ گرد وغبار کے دبیز بادل کے عقب میں تھا۔قبرستان کے ساتھ ایک وسیع کلری میدان تھا۔کم وبیش چار ایکڑ سے زائد رقبہ ہوگا۔اس میدان میں بہت سی ٹریکٹر ٹرالیاں، گھوڑے اور تانگے وغیرہ نظر آرہے تھے۔ٹرالیوں پر سے مسلح افراد چھلانگیں لگا لگا کر نیچے اُتر رہے تھے۔دوسری طرف گاؤں سے باہر نکلنے والے افراد دو قطاروں میں میدان کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے، ان کی لاٹھیوں کے کوکے اور کلہاڑیوں کے پھل چڑھتے سورج کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ایک عجیب طرح کا وحشی جوش تھا جو چاروں طرف لہریں لے رہا تھا۔شانی کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔چھوٹی موٹی لڑائیاں تو اس کے میکے رنگ والی میں بھی ہوتی رہتی تھیں لیکن اتنے وسیع پیمانے پر دنگے فساد کا منظر اس نے نہیں دیکھا تھا۔

دو چار منٹ کے اندر وسیع میدان میں کم وبیش پانچ سو افراد جمع ہو چکے تھے۔ابھی مزید لڑاکے اور تماشائی بھی میدان کی طرف جا رہے تھے۔کچھ ہی دیر بعد دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کے سامنے یوں صف آراء ہوگئیں جیسے پرانے زمانے میں دو لشکر خم ٹھونک کر میدان میں اُتر آتے تھے۔دونوں پارٹیوں کے درمیان تقریباً سو قدموں کا فاصلہ تھا۔

پھر شانی نے ایک اور حیرت انگیز منظر دیکھا۔نارپوری چوہدریوں کی طرف سے پانچ بندے ہاتھوں میں لاٹھیاں سونت کر آگے بڑھے۔یہ سب کے سب ہٹے کٹے اور جوان تھے۔ وہ میدان کے درمیان پہنچ کر کھڑے ہوگئے۔اس کے بعد انہوں نے ایک ٹانگ پر اُچھل اُچھل کر للکارے مارنے اور منہ پر ہاتھ رکھ کر بکرے جیسی آوازیں بلند کیں۔یہ ایک طرح سے دعوتِ مبارزت تھی۔''یہ کیا ہو رہا ہے خالو؟''شانی نے بڑے اضطراب سے دریافت کیا۔

لیکن اس نے مڑ کر دیکھا تو خالو وہاں موجود نہیں تھے۔وہ بھی میدان کی طرف جا چکے تھے۔بس تابندہ اور جمیلہ کھڑی تھیں۔تابندہ کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔وہ شانی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی۔''نارپوریوں نے ہم سے پانچ جوان منڈے مانگے ہیں۔ڈانگ

سوٹے کے لئے..... اب دیکھیں کون کون نکلتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے جمشید تو جرور نکلے گا۔''

شانی نے دیکھا کہ چند سیکنڈ کے لئے کمبوہوں کی طرف سے بھی پانچ بندے نکل کر آگے آ گئے۔ ''دیکھا، میں نے کہا تھا نا..... جمشید جرور نکلے گا۔'' تابندہ جوش سے بولی۔

جمشید واقعی موجود تھا۔ کل اسے ڈپٹی ریاض سے تھپڑ پڑے تھے۔ غالباً آج وہ ان تھپڑوں کے داغ دھونا چاہتا تھا۔ شانی نے دیکھا کہ عارف بھی آگے بڑھ رہا ہے۔ مگر چند افراد اسے روک رہے تھے۔ ان میں چوہدری نواب بھی شامل تھا۔ یہ لوگ عارف کو سمجھا بجھا کر پیچھے ہٹانے میں کامیاب رہے۔

پانچ نارپوریوں کے مقابلے میں پانچ کمبوہ میدان کے درمیان پہنچ گئے۔ نارپوریوں کی طرف سے جولڑا کے آگے آئے تھے ان میں سے کم از کم دو کو شانی اتنی دور سے بھی پہچان سکتی تھی۔ یہ وہی لوگ تھے جو نارپور کی حویلی میں شانی کے مرحوم شوہر چوہدری فاخر کے ساتھ لٹھ بازی کی مشق کیا کرتے تھے۔ یہ اپنے فن میں یکتا لٹھ باز تھے۔ ان میں سے ایک کا نام نور احمد اور دوسرے کا شاید شوکت تھا۔

ظاہر ہے کہ جوہر آباد والوں نے بھی ان ماہر لٹھ بازوں کے مقابلے میں ماہر لٹھ باز ہی اُتارے تھے۔ جونہی یہ لٹھ باز ایک دوسرے کے مقابل پہنچے ایک ٹریکٹر ٹرالی پر کھڑے دو ڈھولچیوں نے ڈگا لگانا شروع کر دیا۔ لٹھ بازوں نے آتشیں نعرے بلند کئے اور ایک دوسرے پر پل پڑے، شانی کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ لاٹھیوں کی کھٹا کھٹ اتنے فاصلے سے بھی صاف سنائی دے رہی تھی اور اس کے ساتھ لٹھ بازوں کی چنگھاڑیں اور کراہیں بھی۔ جوڑ برابر کا تھا۔ کبھی ایک طرف کے دو تین لٹھ باز اوپر چڑھ جاتے تھے، کبھی دوسری کے۔ گرد و غبار تیزی سے پھیل رہا تھا۔

سب سے پہلے جوہر آباد کا ہی ایک لٹھ باز زمین بوس ہوا۔ وہ شاید چوٹ کھانے کے بعد بے ہوش ہو گیا تھا۔ قریب کھڑے چند کمبوہ اسے گھسیٹ کر دور لے گئے۔ اس کا مدِ مقابل نارپوری ایک ٹانگ پر اچھلنے لگا اور فاتحانہ للکارے مارنے لگا۔ تاہم اس دوران میں جمشید نے بھی اپنے حریف کو چاروں شانے چت کر دیا۔ اس نے گرے ہوئے حریف کے سر پر چند زوردار لاٹھیاں رسید کیں اور جب دیکھا کہ وہ مر گیا ہے یا بے ہوش ہو گیا ہے تو وہ بھی پیچھے ہٹ گیا اور فاتحانہ انداز میں اچھلنے لگا۔

تابندہ کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ اچھل اچھل کر اپنے شوہر کو داد دے رہی تھی۔ پھر وہ جوش سے چیخنے لگی۔ ''مارو ان کو..... ہڈیاں توڑ دو ان کتوں کی..... یہ قاتل ہیں..... بچوں کے

لٹیرے ہیں۔''

اسی دوران میں عارف کے قریبی دوست صداقت کے ہاتھ سے لاٹھی نکل گئی۔ اس کا مدِ مقابل نور احمد تھا اور وہ بہت خطرناک تھا۔ صداقت نے عقل مندی یہ کی کہ پیچھے ہٹنے کی بجائے دوڑ کر نورے سے لپٹ گیا اور گتھم گتھا ہو گیا۔ دونوں مست سانڈوں کی طرح ایک دوجے کو کاری ضربیں لگانے لگے۔

جمیلہ نے ایک طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ''وہ دیکھو حرامزادے شرابیں پی رہے ہیں۔''

شانی نے جمیلہ کے بتائے ہوئے رخ پر نگاہ دوڑائی، ایک ٹرالی پر بہت سے نارپوری جنگجو لڑائی کے لئے تیار کھڑے تھے، ان میں سے کئی ایک کے ہاتھ میں شراب کی بوتلیں تھیں اور وہ انہیں منہ لگا لگا کر یوں پی رہے تھے جیسے پانی پی رہے ہوں۔

چند سیکنڈ کے اندر ہی عام لڑائی شروع ہو گئی۔ دونوں طرف سے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے اور لٹھ باز غضب کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دوڑے اور بات صرف لاٹھیوں کی نہیں، اب بہت سے افراد کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ شانی کے دل میں موجود بدترین خدشہ یہ تھا کہ کہیں فائرنگ شروع نہ ہو جائے۔ بے شک سارے آتشیں ہتھیار کل پولیس نے جمع کر لئے تھے، اس کے باوجود شانی کو تین چار کمبوہ افراد کے پاس رائفلیں دکھائی دی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کا اندازہ تھا کہ جمشید اور عارف وغیرہ کے پاس بھی کم از کم پستول تو موجود ہوں گے۔ اسی طرح دوسرے فریق کے پاس بھی تھوڑا بہت اسلحہ موجود ہو سکتا تھا۔

دونوں طرف سے کم از کم تین سو افراد بھاگتے ہوئے آئے اور ایک دوسرے سے بھڑ گئے۔ یہ ایک بالکل جنگی منظر تھا۔ ''اب کیا ہو گا؟'' شانی نے جمیلہ سے پوچھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

جس کا ہاتھ اس نے تھاما تھا وہ خود بھی لرز رہی تھی۔ ''جمیلہ! کہیں گولی نہ چل جائے۔'' شانی نے خدشہ ظاہر کیا۔

''نہیں چلے گی گولی۔ ایسی لڑائیوں میں جو گولی چلاتا ہے وہ کم ہمتا سمجھا جاتا ہے۔''

چند سیکنڈ کے اندر بھی کچھ گرد و غبار میں چھپ گیا۔ ''یا اللہ! کرم کر۔'' شانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

اسی دوران میں تڑتڑ کی خوفناک آواز ابھری۔ فائرنگ ہو رہی تھی۔ شانی نے دہل کر کہا۔ ''دیکھا، چل گئی نا گولی!''

تابندہ چمک کر بولی۔ ''یہ ہمارے مردوں نے نہیں، نارپوریوں نے چلائی ہوگی۔''

لیکن یہ فائرنگ نارپور والوں نے نہیں کی تھی، نہ ہی جوہرآباد والوں نے، یہ فائرنگ پولیس کی طرف سے تھی۔ پولیس کی دو جیپیں اور ایک بڑا ٹرک تیزی سے میدان کی طرف آرہے تھے۔ جیپ میں موجود پولیس اہلکار دو خودکار رائفلوں سے برسٹ چلا رہے تھے۔ دھوئیں سے صاف پتا چلتا تھا کہ برسٹ اگلی جیپ سے ہی چلائے جارہے تھے۔ پھر ٹرک میں سے بھی ہوائی فائرنگ ہونے لگی، دونوں جیپیں اور اہلکاروں سے بھرا ہوا ٹرک بڑی تیزی سے دنگے کی جگہ پر پہنچ گئے۔ اگلی جیپ میں سے ڈی ایس پی ریاض جست لگا کر نیچے اُترا وہ شلوار قمیص میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے پستول سے ہوائی فائر کئے اور للکار للکار کر کچھ کہا۔

ٹرک سے کئی باوردی اہلکار چھلانگیں لگا کر نیچے اُترے۔ ان کے ہاتھوں میں موٹے بیرل والی رائفلیں تھیں۔ انہوں نے آناً فاناً بلوائیوں پر آنسوگیس کے شیل چلانا شروع کردیئے۔ یہ شیلنگ اتنی تیزی اور شدت کے ساتھ کی گئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے میدان صاف ہونا شروع ہوگیا۔ بہت سے لوگ بھاگتے ہوئے ٹریکٹر ٹرالیوں پر چڑھ گئے۔ ان میں سے کچھ افراد ایسے بھی نظر آئے جنہوں نے اپنے کندھوں پر یا ہاتھوں میں اپنے زخمی ساتھیوں کو اٹھا رکھا تھا۔ جن لوگوں کا تعلق جوہرآباد سے تھا، وہ جوہرآباد کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

میدان میں کم وبیش دو درجن افراد بے سدھ پڑے نظر آرہے تھے۔ پتا نہیں ان میں سے زخمی کتنے تھے اور کتنے ٹھنڈے ہوچکے تھے۔ اسی دوران میں ایک اور پولیس ٹرک بھاری نفری کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا۔ اس ٹرک کے پہنچتے ہی پولیس نے بلوائیوں پر چارج کیا۔ کچھ گروہ جو ابھی تک گتھم گتھا تھے، اس چارج کی زد میں آگئے۔ پولیس والوں نے انہیں پکڑنا شروع کردیا۔

شانی نے دیکھا کئی کمبوہ دو زخمیوں کو ڈنڈا ڈولی کرکے گاؤں کی طرف بھاگے آرہے تھے۔ ان کے عقب میں ایک زخمی گھوڑا بھی لنگڑاتا اور ہنہناتا ہوا چلا آرہا تھا۔ ایک گھوڑا لڑائی کے میدان میں بھی گرا پڑا تھا۔ دھول ذرا صاف ہوئی تو ہر طرف جوتیاں، لاٹھیاں، پگڑیاں اور زخمی دکھائی دیئے۔ یہ لڑائی بہ مشکل تین چار منٹ جاری رہی تھی مگر اس نے تباہی مچادی تھی۔ بلوائیوں کے منتشر ہوتے ہی پولیس والے سارے میدان میں بکھر گئے۔ جن لوگوں کو پکڑا گیا تھا، انہیں ٹرکوں پر چڑھایا جانے لگا۔ وہ ابھی تک جوش وخروش میں نعرے بلند کررہے تھے۔

نارپوریوں سے بھری ہوئی ٹریکٹر ٹرالیاں بڑی تیزی سے دور ہوتی چلی جارہی تھیں۔ گھڑسوار ٹرالیوں کے ساتھ نہیں تھے، انہوں نے اپنے لئے علیحدہ راستہ منتخب کیا تھا۔ ایک پولیس جیپ کچھ فاصلے تک ٹرالیوں کے پیچھے گئی لیکن پھر واپس پلٹ آئی۔

کچھ لوگ چارپائیاں لے کر لڑائی کی جگہ پر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے پولیس والوں کی نگرانی میں لوگوں کو زمین سے اٹھا اٹھا کر چارپائیوں پر ڈالنا شروع کردیا۔ شانی کی بے تاب نگاہیں خالو اعجاز اور عارف کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ آنسوگیس کے اثرات ہوا کے ساتھ گاؤں تک پہنچ گئے تھے۔

جلد ہی جمیلہ نے عارف کو اور شانی نے خالو اعجاز کو ڈھونڈ لیا۔ مگر تابندہ کو جمشید کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی نیچے چلی گئی۔ تقریباً بیس افراد کو چارپائیوں اور چادروں وغیرہ میں ڈال کر گاؤں کی طرف لایا جارہا تھا۔ پولیس کی نفری نے لڑائی والی جگہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

جواں سال تابندہ جمشید کو ڈھونڈ رہی تھی اور چاروں طرف چکرائی ہوئی پھر رہی تھی۔ پولیس والے اسے آگے جانے نہیں دے رہے تھے۔ ایک دم کچھ عورتوں نے ایک چارپائی کی طرف دیکھا اور کہرام مچ گیا۔ عورتیں سینہ کوبی کرنے لگیں اور ان کے واویلے سے درودیوار لرزنے لگے۔ چارپائی پر ایک جواں سال لڑکے کی لاش تھی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت پچھاڑیں کھا کھا کر زمین پر گر رہی تھی۔

جمیلہ نے غم ناک لہجے میں کہا۔ ''یہ صداقت کی ماں ہے۔''

''کیا یہ صداقت کی لاش ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

جمیلہ نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر رخساروں پر لڑھک گئے۔ کراہ کر بولی۔ ''صداقت کی ماں نے تو اس ایک بچے پر ساری زندگی قربان کی ہوئی تھی۔''

تابندہ کو ابھی تک اس کا شوہر نہیں ملا تھا۔ وہ بوکھلائی پھر رہی تھی مگر پھر اسے قرار آگیا کیونکہ اس نے جمشید کو دیکھ لیا تھا۔ وہ گرفتار ہونے والوں میں شامل تھا، وہ آٹھ دس دوسرے نوجوانوں کے ساتھ ٹرک سے نیچے اُتر رہا تھا۔ ان پکڑے جانے والوں میں دو نارپوری بھی تھے۔ ان کی نیلی پگڑیاں ان کے گلے میں پڑی تھیں۔ ان سب کے ہاتھ کن کی ایک رسی کے ساتھ بڑی مضبوطی سے باندھے گئے تھے۔ دو چار کو لوہے کی ہتھکڑی بھی لگی تھیں۔ جمشید بھی ان میں شامل تھا۔ اس کے سفید لباس پر خون کے چھینٹے تھے۔ اس کے سینے پر کندھے کے

قریب غالباً کلہاڑی کا پھل لگا تھا۔ یہاں سے قمیص پھٹ گئی تھی اور زخم سے خون رِس رہا تھا۔

دوسرے کمبوہ نوجوانوں کی طرح جمشید بھی سینہ تان کر مُڑا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ زخم کو اپنے سینے پر تمغے کی طرح سجھ رہا ہے۔ تابندہ کا چہرہ جوش سے سرخ ہو گیا تھا۔ اتنے میں ایک اور چارپائی کو دیکھ کر کچھ عورتوں نے فرطِ غم سے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اس چارپائی پر بھی لاش تھی۔

اگلے ایک گھنٹے میں جوہر آباد سخت غیر یقینی کیفیت کا شکار رہا۔ ہر چہرے پر سوال تھے۔ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ گاؤں کے لوگ تین لاشیں تو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ تینوں لاشیں کمبوہ برادری کے افراد کی تھیں۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد بھی بیس سے کم نہیں تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد شانی کے خالو اعجاز ستے ہوئے چہرے کے ساتھ چوہدری نواب کی حویلی سے واپس آئے۔ انہوں نے دل فگار آواز میں شانی کو بتایا۔ ''پانچ بندوں کی جان گئی ہے، تین ہمارے گاؤں کے ہیں..... دو میانہ کے..... میانہ والے اپنی دونوں لاشیں ٹرالی میں ڈال کر لے گئے ہیں۔''

''زخمی کتنے ہیں؟'' شانی نے پوچھا۔

''بیس پچیس بندوں کو معمولی چوٹیں آئی ہیں لیکن سات آٹھ زیادہ زخمی ہیں۔ فی الحال گاؤں کے ہسپتال میں ہی ان کا علاج ہو رہا ہے، زخمیوں میں چوہدری حشام کے دو کارندے بھی ہیں۔''

''اپنے کچھ زخمی وہ کنجر کے بی اپنے ساتھ بھی تو لے گئے ہیں۔'' ایک موٹی تازی کمبوہ عورت نے بڑی نفرت سے کہا۔

''بہرحال..... یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارا نقصان زیادہ ہوا ہے۔ وہ لوگ تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ ہم تو بے خبر پڑے ہوئے تھے۔''

خالہ فیروزہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''مجھے سب سے زیادہ دکھ صداقت کا ہو رہا ہے۔ آج صبح سویرے میں نے اسے گلی میں ہنستے کھیلتے دیکھا ہے۔ اپنی بھینس لے کر گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی ماں تو اس کے ساتھ ہی مر جائے گی۔''

دوسری عورت کی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

شانی نے پوچھا۔ ''جمشید کا کیا بنا تھا؟''

''وہ لڑتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔ ایک اور گڑبڑ یہ ہوئی ہے کہ اس کے پاس سے پستول

برآمد ہوا ہے۔ پتا نہیں اب کیا بنتا ہے اس کا۔''

بہت سی عورتیں گلی میں سے روتی ہوئی گزریں۔ ان میں سے صداقت کی کوئی چاچی، پھوپھی یا مامی صداقت کا نام لے لے کر دہائی دے رہی تھی۔ خالہ فیروزہ اور جمیلہ بھی اپنے آنسو پونچھتی ہوئی ان عورتوں کے ساتھ فوتگی والے گھر کی طرف چل دیں۔

شانی دم بخود تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کسی کمرے میں گھس جائے اور دروازہ بند کر کے پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ ان ''منحوس رسم و رواج'' کا ماتم کرے جو قاتل دشمنی کو جنم دیتے ہیں اور جوان بیٹوں اور بھائیوں کا خون پلا پلا کر اسے جوان کرتے ہیں۔ پھر رسم و رواج کی پالی ہوئی یہ قاتل دشمنی عفریت بنتی ہے اور لاتعداد صداقتوں کو ان کی بیوہ ماؤں سے جدا کرتی ہے۔

پلک جھپکتے میں کتنا بڑا سانحہ ہو گیا تھا۔ تین گھروں میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی اور دس پندرہ زخمی گاؤں کے چھوٹے سے ہسپتال میں پڑے کراہ رہے تھے۔

☆======☆======☆

تین دن مزید گزر گئے۔ لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے بعد دفنایا جا چکا تھا۔ صداقت کی بیوہ ماں نیم دیوانی سی ہو گئی تھی۔ اس نے جوان بیٹے کی لاش کو دولہے کی طرح سجایا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر مہندی لگائی تھی۔ کلائی پر گھانا باندھا تھا اور سر پر جھلمل تاروں والا سہرا سجایا تھا۔ وہ اسے دولہے کا لباس نہیں پہنا سکتی تھی۔ کیونکہ مرنے والے کا لباس تو پہلے سے طے ہوتا ہے، یعنی چند گز سفید لٹھا۔

ان مناظر نے شانی کے ذہن پر گہرا بہت گہرا اثر کیا تھا۔ اسے اپنے چہیتے بھائی عادل کا وقتِ رخصت یاد آ گیا۔ وہ بھی تو ایسا لمبا تڑنگا تھا۔ سینہ دیوار کی طرح چوڑا، چال میں شیر کا سا بانکپن۔ ابھی اس کے مرنے کے دن کہاں تھے۔ ابھی صداقت کے مرنے کے دن بھی نہیں تھے مگر دشمنی کا عفریت جوانوں کا خون ہی زیادہ رغبت سے پیتا ہے..... صداقت کے سر کے پچھلے حصے پر کلہاڑی کا پھل لگا تھا۔ وہ لڑائی کے میدان میں ہی زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ مرنے والے دیگر افراد میں ایک کو کلہاڑی کے وار لگے، دوسرے کو سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ عارف کی زبانی شانی کو معلوم ہوا کہ شدید زخمی ہونے والے پانچ افراد کو لاہور بھیجا جا چکا ہے۔ ان شدید زخمیوں میں ایک بندہ وہ بھی تھا جس کے ساتھ عام لڑائی سے پہلے جمشید نے مقابلہ کیا تھا۔ اس کے سر پر جمشید کی لاٹھیاں لگی تھیں۔ اس لڑائی کے بعد پولیس نے جوہر آباد گاؤں سے پندرہ افراد کو گرفتار کیا تھا۔ حشام کے گاؤں سے گرفتار ہونے والوں کی تعداد تیس سے زیادہ تھی۔ دونوں دیہات میں پولیس کی بھاری نفری تعینات کر دی گئی تھی۔

اب جب کہ لڑائی کو تین دن سے زیادہ گزر گئے تھے، لوگوں نے جوش کے بجائے ذرا ٹھنڈے دل سے سوچنا شروع کر دیا تھا اور اپنے اپنے نقصانات کا جائزہ لینے لگے۔ تابندہ اب کافی افسردہ نظر آتی تھی۔ دوسرے گرفتار شدگان کے ساتھ جمشید بھی تھانے پہنچ چکا تھا۔ تھانہ، جوہر آباد اور میانہ گاؤں کے درمیان ٹھیکرا نامی گاؤں میں تھا۔ جوہر آباد سے ٹھیکرا کا فاصلہ چھ کلومیٹر سے کم نہیں تھا۔

تابندہ کے ساتھ ساتھ شانی کی خالہ فیروزہ بھی بے حد پریشان تھیں۔ جمشید اگر تابندہ کا شوہر تھا تو فیروزہ کا بھائی تھا اور بھائی بھی اکلوتا۔ ڈپٹی ریاض کی دہشت اس قدر تھی کہ تمام گرفتار شدگان کے لواحقین ''ماہی بے آب'' بنے ہوئے تھے۔ سب لوگ سفارشوں کے لئے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ جمشید کے لئے کچھ کرنے کو شانی کے خالو اعجاز بھی آج صبح سویرے گوجرانوالہ روانہ ہو گئے تھے۔ تنہا تھانے جاتے ہوئے ہر شخص گھبرا رہا تھا۔ جو تین چار مرد و زن گئے وہ خوفزدہ ہو کر واپس آئے تھے۔

شانی کمرے سے باہر نکلی تو اس نے جواں سال تابندہ کو دیکھا۔ ساتھ میں اس کا چھوٹا بھائی بھی تھا۔ تابندہ نے جمشید کے کچھ کپڑے اور کھانے پینے کا سامان ایک پوٹلی میں باندھ رکھا تھا۔ وہ یہ چیزیں جمشید کو تھانے میں پہنچانا چاہتی تھی۔ سہارے کے لئے وہ بھائی کو ساتھ لے جا رہی تھی۔ بوڑھا سسرا سے جانے سے منع کر رہا تھا: ''نئیں میری دھی! جوان گڑی کا تھانے میں کوئی کام نئیں۔ میں نے تجھے نئیں جانے دینا۔''

تابندہ کی شادی چھ سات مہینے پہلے ہی ہوئی تھی۔ شوہر سے اس کی وابستگی بہت زیادہ تھی۔ جب تک بچے نہیں ہوتے، عورت اکثر بچوں کی محبت بھی شوہر کو ہی دیتی رہتی ہے۔ وہ بے تاب ہو کر بولی۔ ''پر چاچا! اس نے وہی کھون والے گندے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ پتا نہیں دو دن سے اس نے کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں۔''

سسر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''دیکھ تابی! وہ ڈپٹی بڑا سخت بندہ ہے۔ میں نے تجھے وہاں نہیں جانے دینا۔ اگر تُو نہیں مانتی تو میں آپ چلا جاتا ہوں۔'' وہ اپنی بوڑھی ہڈیوں کو کڑکڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ جوان بیٹے کا دکھ اس کی بوڑھی آنکھوں میں لہریں لے رہا تھا۔

شانی مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ ''چاچا جی..... ! میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ میں سے کوئی بھی نہ جائے۔ آپ نے جو کچھ کرنا ہے خالو جان کے آنے کے بعد کریں۔''

''اور اگر خالو آج واپس ہی نہ آئے تو؟'' تابندہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

شانی نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا۔ ''تابی! اب یہ مصیبت آ گئی ہے تو اسے

حوصلے سے جھیلنا ہوگا۔ تھوڑا سا ٹائم لگے گا لیکن سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

تابندہ سسک کر بولی۔ ''ماسٹر انیس کہہ رہے تھے۔ اس بات کا ڈر ہے کہ پولیس کہیں جمشید پر قتل کا کیس نہ ڈال دے۔''

''ایسی باتوں پر کان نہ دھر تابی۔ جب جمشید نے قتل کیا نہیں تو پھر اس پر قتل کا کیس کیوں بنے گا۔''

شانی کچھ دیر تک تابندہ کو سمجھاتی بجھاتی رہی۔ اس کام میں جمیلہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ تابندہ نے تھانے جانے کا ارادہ ترک کیا اور کمرے میں چلی گئی۔ وہ اپنے ڈیل ڈول سے دودھ مکھن میں پلی ہوئی ایک صحت مند پنجابن نظر آتی تھی۔ ہلکا پھلکا لباس اس کے جوبن کو سنبھالنے سے عاجز دکھائی دیتا تھا۔

دوپہر سے تھوڑی ہی دیر بعد ایک اور مسئلہ ہو گیا۔ گاؤں کا ایک نوجوان جو اپنے گرفتار بھائی کو کھانا دینے تھانے گیا ہوا تھا، بڑا گھبرایا ہوا واپس آیا۔ وہ سیدھا جمشید کے گھر پہنچا۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر خالو اعجاز کے بارے میں پوچھا۔ شانی نے اسے بتایا کہ وہ گوجرانوالہ گئے ہوئے ہیں۔ پھر اس نے عارف کے متعلق پوچھا۔ عارف بھی گاؤں میں نہیں تھا۔

شانی نے کہا۔ ''جو بات ہے ہمیں بتاؤ۔ کیا مسئلہ ہوا ہے؟''

وہ بولا۔ ''تھانے میں پولیس والے جمشید کو بڑی بُری طرح مار رہے ہیں۔ میں نے خود اس کے رونے چلانے کی آوازیں سنی ہیں۔ اس کا کچھ کر سکتے ہیں تو کریں ورنہ وہ اس کا حشر کر دیں گے۔''

تابندہ بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ جمشید کا باپ بے دم سا ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا دوھیا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ تابندہ نے چادر سر پر لی اور لرزتے لہجے میں بولی۔ ''میں تھانے جاؤں گی۔''

تابندہ کا انیس بیس سالہ بھائی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بظاہر دلیر نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کا رنگ بھی متغیر تھا۔

شانی چند لمحے سوچتی رہی، پھر ایک عزم کے ساتھ بولی۔ ''نہیں تابی! میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔ چل تُو اندر چل کر بیٹھ۔''

''پر جمشید کو کون بچانے جائے گا؟''

''میں جاؤں گی۔'' شانی کا لہجہ حتمی تھا۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں باجی.....'' تابندہ کے بھائی نے کہا۔

''نہیں، تم بھی یہیں رہو۔ میں اور چاچا چلیں گے لیکن اگر چاچے نے نہیں جانا تو میں کسی اور کو ساتھ لے لیتی ہوں۔''

بوڑھا دیناں لرزتا ہوا ستون سے اٹھ کھڑا ہوا..... ''مم..... میں چلتا ہوں دھی رانی۔''

خالہ فیروزہ کا چہرہ بھی شانی کو فق نظر آیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ شانی نے تابندہ سے کہا۔ ''خالہ کو لے کر اندر جاؤ..... اور پریشانی کی بات نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

تابندہ دوڑ کر اندر گئی..... چند سیکنڈ بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک رومال تھا، رومال شانی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی۔ ''باجی! اگر جمشید کو چھڑانے کے لئے کچھ دینا دلانا پڑے تو دے دینا۔''

شانی نے رومال کھول کر دیکھا۔ اس میں بہت سارے نوٹ تہہ در تہہ رکھے ہوئے تھے۔ یقیناً یہ تابندہ کی شادی پر سلامیوں کے پیسے تھے۔ چھ سات ہزار روپیہ ہوگا۔ اس کے علاوہ سونے کی چار بھاری چوڑیاں بھی تھیں۔ مصیبت میں عورت بے چاری کا دھیان کتنی جلدی اپنے زیوروں کی طرف جاتا ہے۔ باپ بیٹے اور بھائی وغیرہ کی مصیبت پر یہ زرد دھات فوراً صندوق سے نکلتی ہے اور ہتھیلی پر آجاتی ہے۔ شانی نے رومال تابندہ کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''بیوقوف مت بنو..... اسے اپنے پاس رکھو۔''

وہ بے چارگی کے عالم میں شانی کو دیکھ کر رہ گئی۔ شانی نے کپڑوں اور کھانے والی پوٹلی لی اور جمشید کے والد کے ساتھ باہر گلی میں آگئی۔ راستے میں عارف کا ایک قریبی دوست ماسٹر انیس بھی ڈرتے ڈرتے ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ گاؤں کے باہر سے وہ ایک خستہ حال دیہاتی ٹانگے پر بیٹھے اور تھانے روانہ ہو گئے۔

راستے میں شانی کے دل کی دھڑکنیں درہم برہم ہوتی رہیں لیکن جب وہ تانگے سے اتر کر تھانے کے دروازے میں داخل ہوئی تو رنگ والی کی نوجوان چوہدرانی کا اعتماد اس کے اندر عود کر آیا۔ اس کی جسمانی لرزش بھی معدوم ہو گئی۔ وہ اپنے سر پر چادر درست کرتی ہوئی سیدھا اس کمرے میں پہنچی جس کے دروازے پر ایس ایچ او کی تختی لگی تھی وہ چق اٹھا کر اندر داخل ہوئی تو سامنے ہی انسپکٹر نواز بیٹھا نظر آیا، دو ماتحت اس کے دائیں بائیں موجود تھے۔ نواز نے شانی کو پہچانا تو کولہوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''اوہو ہو..... بڑی قسمت ہے ہماری کہ آپ خود چل کر ہم نوکروں کے پاس تشریف لائی ہیں۔'' اس نے شانی کو کرسی پر بیٹھنے کا

اشارہ کیا۔

شانی بیٹھ گئی۔ چاچا دیناں اور عارف کا دوست انیس بھی ڈرتے ڈرتے عقبی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ''ہاں جی! آپ کیا پئیں گی۔ ٹھنڈا یا گرم؟''

''ڈی ایس پی صاحب کہاں ہیں؟'' شانی اس کا طنزیہ لہجہ نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''وہ ذرا تفتیش وغیرہ کر رہے ہیں۔ آجاتے ہیں ابھی تھوڑی دیر میں۔'' انسپکٹر نواز احمد نے چبھتے لہجے میں کہا۔ لہجے کے ساتھ ساتھ نواز کی نظریں بھی چبھتی ہوئی تھیں یہ نظریں جیسے اس کی بے دھیانی میں شانی کے پورے سراپا کو ٹٹول چکی تھیں۔ بڑی کمینی سی بے ساختگی اور عمومیت تھی ان نظروں میں۔

شانی کو بیٹھے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ یوں لگا جیسے دو تین تنومند بکروں کو ایک ساتھ ذبح کیا جا رہا ہو۔ خدا کی پناہ۔ یہ انسانی آوازیں تھیں۔ غالباً تین افراد تشدد کے کسی بے رحم شکنجے میں تھے اور ایک ساتھ کورس کی شکل میں چلا رہے تھے۔ ان کی کرب ناک آوازوں کو سن کر شانی اندر تک دہل گئی۔ جواں سال انیس بھی خشک لبوں پر زبان پھیرنے لگا۔ تقریباً ایک منٹ تک دیوانہ وار چلانے کے بعد بدنصیب افراد کی آوازیں کچھ دھیمی پڑ گئیں۔ وہ ہلکے لہجے میں کچھ بول رہے تھے۔ غالباً مارنے والوں کی منت سماجت کر رہے تھے۔ دہائی دے رہے تھے کہ وہ بے قصور ہیں۔ قدرے تسلی کی بات یہ تھی کہ ان میں جمشید کی آواز نہیں تھی۔

''یہ کن لوگوں کو مار پڑ رہی ہے؟'' شانی نے دردناک چیخ و پکار سے دھیان ہٹانے کے لئے کہا۔

''بس ہیں جی دو تین موٹی کھال والے۔''

''پر کون ہیں؟''

''دو آپ کے جوہر آباد کے ہیں، ایک میانے کا۔ بدھ کے دن لڑائی میں ہی پکڑے گئے تھے، ان سے ناجائز اسلحہ برآمد ہوا ہے۔''

''برآمد ہوا ہے تو ان کو عدالت میں بھیجو۔ سزا دینا تو عدالت کا کام ہے۔'' شانی نے کہا۔

''اوہو ہو..... آپ تو بڑا چنگا بولتی ہیں۔ آپ کو تو وکیل شکیل ہونا چاہئے۔ پر کچھ ہماری مجبوریاں بھی ہوتی ہیں ناں جی.....''

''کیسی مجبوریاں؟''

''ابھی ان سے کافی کچھ بکوانا ہے جی۔ مزید اسلحہ بھی برآمد کرنا ہے۔''

اسی دوران میں تینوں افراد ایک بار پھر سینے کی پوری قوت سے چلانے اور دہائیاں دینے لگے۔ انسپکٹر کے نیم ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ ایک فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''حرامزادے، فلمیں دیکھ دیکھ کر ساون اور سلطان راہی بنتے ہیں..... یہ پتا نہیں ہوتا کہ جب اصلی تھانے میں اصلی چھتر پڑتے ہیں تو کس طرح بانگیں نکلتی ہیں.....''

اسی دوران میں کسی ساتھ والے کمرے میں گھنٹی بجی۔ انسپکٹر جلدی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ تھانے کا ماحول اس قدر گھمبیر تھا کہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ایس ایچ او کے کمرے سے باہر ایک نشے باز بھکارن کو باقاعدہ ہتھکڑی لگا کر ستون سے باندھا گیا تھا۔ وہ بے سدھ پڑی تھی۔ ایک جہاز ٹائپ شخص بھی برآمدے میں پڑا تھا۔

دو تین منٹ بعد انسپکٹر اندر داخل ہوا اور بولا۔ ''چلیں جی! آپ کو صاحب نے بلایا ہے۔''

شانی اٹھی تو چاچا اور انیس بھی اٹھ گئے۔ انسپکٹر بڑی بدتمیزی سے بولا۔ ''اوئے تم دونوں ادھر رُکا پینے جا رہے ہو۔ بیٹھو یہاں..... بی بی کو جانے دو۔''

وہ ٹھٹک کر دوبارہ بیٹھ گئے شانی ایس ایچ او کے پیچھے دوسرے کمرے کی طرف چل پڑی وہ اس شخص سے جتنا دور رہنا چاہ رہی تھی اتنا ہی اس کا سامنا ہو رہا تھا۔ ایس ایچ او نے چق ہٹائی اور شانی کو ایک کشادہ کمرے میں کرسی پر بٹھا کر باہر چلا گیا۔ خطرناک صورت ریاض ہٹلر نے صرف بنیان اور ٹریک سوٹ کا دھاری دار ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ اس کے کندھوں اور بازوؤں پر نہایت گھنے بال تھے۔ وہ وائرلیس سیٹ پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ وائرلیس کے شور میں دوسری طرف کی آواز دبی دبی تھی۔ یہ بھی شاید کوئی پولیس والا ہی تھا جو کہہ رہا تھا۔

''جناب! یہ دونوں اونچی سوسائٹی کی طوائفیں ہیں۔ وزیروں مشیروں سے رابطے ہیں ان کے۔ ابھی ٹیلی فون کھڑکنے لگیں گے۔''

''اوئے کھڑکنے دو ٹیلی فون۔ بس پکڑ لاؤ دونوں کو..... اور جو اُن کے پیچھے آئے اس کُتے کے تخم کو بھی بٹھاؤ تھانے میں۔ میں دیکھ لوں گا ان رانی خان کے سالوں کو بھی، کڑاکے نہ نکال دیئے ان سب کے تو.....''

''دفعہ کون سی لگانی ہے جناب؟''

''اوئے تم اندھے ہو نذیر..... تمہیں نظر نہیں آتا یہ کیا کر رہی ہیں، ہمارے ناک کے نیچے۔'' اس کے بعد ریاض ہٹلر نے شانی کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر دونوں طوائفوں اور ان

کے طرف داروں سے کئی نازیبا رشتے جوڑے اور وائرلیس بند کر دیا۔

کچھ دیر تک جیسے وہ بے خیالی میں شانی کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر دائیں طرف والی کھڑکی تھوڑی سی کھولی اور سگریٹ سلگا کر شانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ہاں بی بی جان! کس بجن کی کھچ (کشش) یہاں کھینچ لائی ہے تمہیں؟''

''میں جمشید کے لئے آئی ہوں۔ ہمارا رشتے دار ہے وہ۔''

''تمہارا رشتے دار ہوا تو پھر ہمارا بھی ہوا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔''

''گھبرانے کی بات تو ہے ڈی ایس پی صاحب۔ اسے یہاں تھانے میں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔''

''واہ..... تشدد۔'' ریاض نے بے حد زہریلے لہجے میں کہا۔ ''یہ اچھا لفظ ملا ہوا ہے لوگوں کو، اخباروں میں دیکھو تو تشدد، ٹی وی پر دیکھو تو تشدد، ہر طرف یہ واویلا ہے۔ جس کو ٹھیک سے پیچھا دھونا نہیں آتا وہ بھی تشدد پر لیکچر جھاڑتا پھرتا ہے۔ کوئی تشدد وغیرہ یہاں نہیں ہوا بی بی جان۔ جب کروں گا تو چھپا کر نہیں کروں گا۔ سب کو پتا چل جائے گا اور یہ بھی پتا چل جائے گا کہ یہ تشدد ہوتا کیا ہے۔''

شانی نے ہمت کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں خبر ملی ہے کہ آج صبح یہاں جمشید کو بہت بُری طرح مارا پیٹا گیا ہے۔''

''بہت بُری طرح نہیں۔ بہت معمولی طرح۔ بس تشدد کی تھوڑی سی جھلکی دکھائی تھی اسے، زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ الٹا لٹکا ہوگا۔ ایک گھنٹہ کوئی ٹائم نہیں۔ اس میں تو بندے کی ناک بہنی بھی شروع نہیں ہوتی۔''

''لیکن کیوں.....؟ آپ نے کیوں کیا ایسا؟''

''یہ تو اس بدتمیزی کی تھوڑی سی سزا تھی جو اس حرامی نے گاؤں میں دکھائی تھی لوگوں سے کہا تھا کہ اسلحہ جمع نہ کراؤ۔ اس کے جو باقی جرم ہیں ان کی سزا تو ابھی شروع نہیں ہوئی۔ کل ان لڑکوں کو مجسٹریٹ کے پاس لے جا رہے ہیں ریمانڈ کے لئے..... اصل کہانی تو اس کے بعد شروع ہوگی۔''

ریاض ہٹلر کے لہجے میں جو خطرناکی پوشیدہ تھی، اس نے شانی کو اندر تک لرزا دیا۔ وہ کچھ دیر چپ رہی پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''جمشید کی رہائی کی کوئی صورت نہیں ہے؟''

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''تمہارا خالو اس حرامی کے لئے کوئی نگڑی سفارش ڈھونڈ نے تو

گیا ہے گوجرانوالہ...... دیکھو آ کر کیا توپ چلاتا ہے۔''

''مجھے پتا نہیں کہ خالو کیا کر رہے ہیں۔ میں تو آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ جمشید کے بچاؤ کی کیا صورت ہے۔''

''مجرم کو چھوڑنا میرا کام نہیں۔ یہ تو قانون اور عدالت کی ذمے داری ہے۔ باقی اس چوکھرے کا کیس معمولی نہیں ہے۔ 302 بھی لگ سکتی ہے اس میں۔''

شانی کے سینے پر گھونسا سا لگا۔ نگاہوں میں تابندہ اور خالہ فیروزہ کے دل گیر چہرے گھوم گئے۔ تابندہ تو شاید گاؤں میں یہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ جب چاچا، انیس اور شانی واپس آئیں گے تو ان کے ساتھ جمشید بھی ہوگا لیکن یہاں تو بڑی لمبی اور تکلیف دہ کہانی نظر آ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ریاض سے کچھ پوچھتی...... چق سے باہر شور سنائی دیا۔ سنتری اور دیگر اہلکار کسی عورت کو روک رہے تھے اور وہ کمرے کے اندر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی روتی بلکتی آواز بلند ہو رہی تھی۔ ''وڈے صاحب! میری فریاد سن لو۔ وڈے صاحب! میرا پتر مر جائے گا۔ وڈے صاحب! میں غریب مسکین عورت ہوں۔''

شانی نے اندازہ لگایا کہ یہ عورت ان تین بدنصیبوں میں سے کسی کی ماں ہے جو لاک اَپ میں ذبح ہونے والے بکروں کی طرح چلا رہے ہیں۔ ریاض پہلے تو خاموشی سے سنتا رہا۔ جب شور زیادہ بڑھ گیا اور عورت دروازے کے بالکل قریب پہنچ گئی تو وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ''اچھا چھوڑ دو...... آنے دو اس کو......''

اہلکاروں نے عورت کو چھوڑ دیا...... وہ درمیانی عمر کی عورت تھی۔ سر پاؤں سے ننگی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہہ رہے تھے۔ وہ لپک کر آئی اور اس نے ریاض کے پاؤں پکڑ لئے۔ ''خدا کے لئے وڈے صاحب! میرے پتر کو بچا لیں۔ اس کو پہلے ہی مرگی پڑتی ہے، وہ مر جائے گا۔ وہ مر جائے گا...'' عورت نے روتے ہوئے اپنا سر ریاض کے گھٹنوں سے لگا دیا۔ ریاض نے گہری سانس لی اور ادھیڑ عمر عورت کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ شانی کو لگا جیسے وہ اس سے تسلی کی کوئی بات کہنے جا رہا ہے لیکن یہ دیکھ کر وہ سناٹے میں رہ گئی کہ ریاض نے ایک طوفانی تھپڑ عورت کے گال پر دے مارا۔ وہ تقریباً الٹ کر دروازے کے پاس جا گری۔ ریاض کسی جنگلی جانور کی طرح اٹھا اور عورت کو بے دریغ ٹھوکریں رسید کرنے لگا۔ چند سیکنڈ کی مار پیٹ سے عورت نیم بے ہوش ہوگئی۔ اس کی قمیص پھٹ گئی اور گریبان سے سو سو کے سات آٹھ نوٹ نکل کر فرش پر بکھر گئے۔ ریاض دھاڑا۔ ''حرامی غریب ہے اور رشوت دینے کے لئے چھاتی سے نوٹ لگائے پھرتی ہے۔'' پھر وہ اپنے اے ایس آئی سے

بولا۔ ''یہ نوٹ قبضے میں لو اور اندر کرو اس کُتے کی رَن کو بھی......''

عورت نیم بے ہوش تھی۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری تھا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر ریاض کے کالے بوٹ کو چھوتے ہوئے بولی۔ ''خدا کے لئے ڈپٹی جی...... میرا پتر مر جائے گا۔''

''مر جائے گا تو اور جم لینا۔ ابھی بڑی تڑ ہے تیرے جثے میں۔ ایک کے بجائے دو تین بھی جم سکتی ہے۔''

اہلکار عورت کو بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ ایک عورت...... اور خاص طور سے ایک ماں کی یہ تذلیل شانی کی آنکھوں میں آنسو لے آئی۔ اسے لگا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ یہاں سے ایک ماں کو گھسیٹ کر نہیں لے جایا گیا تھا...... انسانیت کے جنازے کو گھسیٹ کر لے جایا گیا تھا۔ ظلم کرنے والے نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ ماں تو سب کی ماں ہوتی ہے۔ کیونکہ ماں کوئی عورت نہیں ہوتی۔ ماں ایک جذبہ ہوتا ہے، ایک نورانی جذبہ۔

عورت کے ساتھ ہی ریاض بھی باہر نکل گیا۔ وہ کسی کام سے انسپکٹر نواز کے کمرے میں گیا تھا پانچ منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کی جھلاہٹ ابھی دور نہیں ہوئی تھی۔ سر ہلا کر بولا۔ ''دماغ خراب کر دیتے ہیں یہ لوگ۔''

ادھ کھلی کھڑکی سے رونے چلانے والے تینوں حوالاتیوں کی آوازیں گاہے بگاہے ابھرنے لگتی تھیں۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ ریاض ہٹلر نے یہ کھڑکی جان بوجھ کر کھولی تھی۔ وہ اس کے اعصاب کو مکمل طور پر توڑنا چاہ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک فائل دیکھنے کے بعد اس نے سر اٹھایا اور بڑی بدتمیزی سے بولا۔ ''اب تُو کیا چاہتی ہے؟''

''میں چاہتی ہوں کہ میری خالہ کے بھائی کے ساتھ مار پیٹ بند کی جائے اور اس کے خلاف جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی نقل دی جائے۔''

''نقلیں شقلیں بھی مل جائیں گی تجھے...... پر...... یہ خالہ کا بھائی تو ماموں ہوتا ہے۔''

''ماموں ہی سمجھ لیں۔''

وہ کچھ دیر تک جگر پاش نظروں سے شانی کو گھورتا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''اچھا چل آ میرے ساتھ۔ دوسرے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ یہاں شور شرابا بہت ہے۔''

شانی ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی۔ پھر ہمت کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں تھانے کا کچا صحن پار کر کے دوسری طرف والے کمرے میں آ بیٹھے۔ یہ بھی دفتر ٹائپ ہی تھا۔ دروازے پر چق پڑی تھی۔ ایک طرف کپڑے کے تھیلوں میں رائفل کی کئی سو گولیاں پڑی تھیں۔ گتے

کے ڈبوں میں آنسو گیس کے شیل، رائفلوں کے خالی میگزین، ہتھکڑیاں اور پتا نہیں کیا کچھ رکھا تھا۔ ایک طرف الماری میں استری شدہ وردیاں تہہ در تہہ نظر آرہی تھیں۔ چونکہ اس آفس نما کمرے کی لمبائی کافی زیادہ تھی اور اس کے ایک حصے کو سٹور کے طور پر استعمال کیا جارہا تھا۔ یہاں واقعی خاموشی محسوس ہوئی۔ یہاں پہنچ کر ریاض ہٹلر کا رویہ قدرے نرم ہو گیا۔ یعنی انیس بیس کا فرق پڑ گیا۔ ''ایک دو کش لے لوں۔ تجھے بُرا تو نہیں لگے گا؟'' وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

شانی نفی میں سر ہلانے کے سوا بھلا کیا کر سکتی تھی۔

اس نے دروازے میں سے ڈیڑھ فٹ لمبی شراب کی بوتل نکال لی اور گلاس میں ڈال کر پینے لگا۔ اس شراب نوشی کو وہ ''کش'' کہہ رہا تھا۔ شانی اس کی دیدہ دلیری پر حیران رہ گئی۔ وہ تھانے کے اندر ڈیوٹی ٹائم میں ایک ''فی میل'' سائل کے سامنے دھڑلے سے پی رہا تھا۔ الکحل کی ناگوار بُو سے شانی کا دل مالش کرنے لگا۔ تاہم وہ ہونٹ بھینچے ساکت بیٹھی رہی۔

کچھ دیر بعد ریاض ہٹلر نے شانی کو تیز نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''دیکھ میں تجھ پر کسی طرح کا دباؤ نہیں ڈال رہا۔ مجھے پتا ہے تیرے پیچھے کلا مضبوط ہے۔ میں صرف اپنی رائے تجھے دے رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ بات تیرے دماغ میں آجائے گی۔''

''کیسی بات؟''

اس نے گلاس میں سے ایک اور ''کش'' لے کر کہا۔ ''تُو نے لڑائی کا نتیجہ دیکھ ہی لیا ہے ناں۔ دو چار منٹ کی مارا ماری میں پانچ لاشیں گری ہیں۔ پچاس کے قریب بندے پھٹڑ ہوئے ہیں۔ شکر کا مقام یہ ہے کہ فائرنگ نہیں ہوئی...... لیکن یہ ابھی اسٹارٹ ہے۔ آنے والے دنوں میں اور بہت سی عورتوں نے بیوہ ہونا ہے، کئی لوگوں نے ہاتھ پاؤں تڑوا کر بیٹھنا ہے، جو درجنوں مقدمے بننے ہیں اور تھانوں میں جو چھتر ولیں وغیرہ ہونی ہیں وہ علیحدہ ہیں۔ یہ بربادی کا ایک بڑا لمبا اور بندے مار قسم کا چکر ہے...... میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ سگریٹ سلگا کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ اگر تُو چاہے تو دونوں پنڈوں بلکہ اردگرد کے کئی پنڈوں کو اس خونی چکر سے نکال سکتی ہے۔ بہت کچھ برباد ہونے سے بچ جائے گا۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''یہ جو کچھ ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے وہ سب چوہدری حشام اور اس کے بیٹے کے اغوا

کی وجہ سے ہے۔ دونوں پنڈوں میں عداوت آخری حد تک پہنچ گئی ہے۔ نارپور کے چوہدری رستم سیال...... دراج اور عارف وغیرہ کو ایک ہی شے سمجھ رہے ہیں۔ کچھ کا تو اب یہ خیال ہے کہ رستم گوجر خان کی طرف جانے کی بجائے جوہر آباد میں ہے اور عارف نے اسے چھپا رکھا ہے۔ بہرحال میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟''

شانی سوالیہ نظروں سے ریاض کی طرف دیکھنے لگی۔

ریاض بولا۔ ''وہ پوٹھوہار کی طرف چلا گیا ہے۔ اپنے پرانے ٹھکانے پر......''

''مم...... میں...... کیا کر سکتی ہوں؟''

''تُو بہت کچھ کر سکتی ہے، لیکن اگر چاہے تو...... نہ چاہے تو پھر کچھ بھی نہیں۔''

''میں سمجھ نہیں پا رہی۔''

''مجھے پتا ہے رستم اور اس کے ساتھی لالہ، حسنا وغیرہ جس جگہ پر ہیں وہاں پولیس نہیں جاسکتی۔ کوئی بھی ان کی مرضی کے خلاف وہاں نہیں پہنچ سکتا۔ اگر پہنچنا چاہے گا تو پھر اسے ٹھیک ٹھاک بندے قربان کرنے پڑیں گے، ہوسکتا ہے کہ چالیس پچاس یا اس سے بھی زیادہ لاشیں اٹھانی پڑ جائیں۔ ان کُتے کے تخموں نے وہاں بارودی سرنگیں اور راکٹ لانچر تک لگا رکھے ہیں۔ فی الحال میں اس مسئلے کو چھیڑنا نہیں چاہتا۔ فی الحال میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ چوہدری اور اس کا لڑکا سلامتی سے واپس آجائیں...... اگر اس سلسلے میں وہ کوئی تاوان وغیرہ مانگتے ہیں تو نارپور والے وہ بھی دے دیں گے لیکن یہ کام کرنے کے لئے کوئی درمیان کا بندہ ضروری ہے اور میرا خیال ہے...... بلکہ میں جانتا ہوں کہ وہ درمیان کا بندہ تُو بن سکتی ہے۔''

''یہ...... کیسے ہوسکتا ہے؟''

''کیوں...... نہیں ہوسکتا......'' ریاض کے لہجے میں ہلکی سی گرج آگئی۔

''میرا کوئی تعلق نہیں ہے رستم یا اس کے ساتھیوں سے۔''

''اوہو...... واہ واہ...... کیا بات ہے، کیا ڈائیلاگ ہے۔ میرا کوئی تعلق نہیں ہے رستم سے......'' ریاض کے لہجے میں شدید طنز تھا۔ پھر وہ بے حد خطرناک آواز میں بولا۔ ''میری زبان نہ کھلوا بی بی جان نہیں تو تیری ساری ''نیک پروینی'' کا بھانڈا گوجرانوالہ کے چوک میں پھوڑ دوں گا۔ دیکھنے والوں کا اتنا رش پڑ جائے گا کہ لوگ ''میڈم باوری فلم'' بھی بھول جائیں گے...... دیکھ...... میری کھوپڑی مت گھما۔ میں سب جانتا ہوں، کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے مجھ سے۔''

''یہ غلط ہے۔ رستم سے اب میرا کوئی واسطہ نہیں۔'' اس نے بے باکی سے شانی کو

ٹھوڑی پکڑ کر اس کا سر اونچا کیا۔

''اب واسطہ نہیں، لیکن پہلے تو تھا ناں اور میں اتنا کاکا نہیں ہوں جتنا تُو سمجھ رہی ہے۔ ''واسطے'' اتنے جلدی ختم نہیں ہوتے۔ اوپر اوپر سے تُو جو مرضی کہتی رہ لیکن تیری بُکل میں چور تو چھپا ہوا ہے ناں اور وہ حرامی بھی تیرے تائے کو جتنے مرضی خط لکھتا رہے، پر دل تو اس کا تیرے لئے ہی میاؤں میاؤں کرتا ہے۔''

شانی کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

ریاض ہنٹر نے اپنا لہجہ کچھ نرم کیا۔ شانی کی ٹھوڑی چھوڑ کر اس نے تھوڑی سی ''مائع بدبو'' مزید اپنے حلق میں اتاری اور بولا۔ ''دیکھ، میں تجھ پر کوئی زبردستی نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے تجھے بس ایک راستہ دکھایا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس راستے پر چل کر تُو دونوں پنڈوں کے بہت سے لوگوں کو بربادی سے بچا سکتی ہے۔ ورنہ میں جانتا ہوں یہاں بہت خون خرابا ہونا ہے۔ یہ آگ اتنی پھیلنی ہے کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پتا ہے وہ پاگل دا پُتر کسی اور کی بات چاہے نہ مانے لیکن تیری ضرور مان لے گا۔ صرف تُو ہی اس سے چوہدری اور اس کے لڑکے کو چھڑوا سکتی ہے۔ باقی رہی وہاں جانے کی بات تو میں تجھے پہنچانے کا پورا انتظام کر دوں گا۔ جہاں تک گاڑی جائے گی تجھے لے جائیں گے۔ اس سے آگے بھی کوشش کریں گے کہ گھوڑے یا ڈولی وغیرہ پر جا سکے۔ ہوسکتا ہے چند گھنٹے یا ایک دن تجھے پیدل سفر کرنا پڑے لیکن ایک بات میں پھر کہتا ہوں اور بار بار کہوں گا، یہ سب کچھ تُو اپنی مرضی سے کرے گی۔ میری طرف سے کوئی پریشر نہیں۔''

شانی سٹپٹا گئی، وہ پریشر ڈال بھی رہا تھا اور کہہ رہا تھا، کوئی پریشر نہیں۔ ابھی چند دن پہلے اس نے ریوالور دکھایا تھا اور اسے بتایا تھا کہ اس میں تین گولیاں اس کے تین رشتہ داروں کے نام کی ہیں۔ اس نے جنازوں والی بات بھی کی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے جمشید کے حوالے سے جو دہلا دینے والی باتیں کی تھیں وہ بھی پریشر کے زُمرے میں ہی آتی تھیں اور تو اور وہ خود بھی سراپا پریشر تھا۔ وہ نرم اور سخت، دونوں طریقوں سے کام لے رہا تھا۔ شانی جانتی تھی اگر وہ اس کا کچھ لحاظ کر رہا ہے تو یہ صرف اور صرف ایس پی حاجی حیات خاں کی وجہ سے ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ حاجی حیات پوری طرح شانی کے عقب میں موجود ہے۔ اس کی عیار نظریں شانی کے سراپا پر تھیں۔ مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ تُو ایک دو دن آرام سے سوچ لے لیکن جو بھی فیصلہ کرنا یہ سوچ کر کرنا کہ تُو ایک بہت بڑا

کام کرے گی اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ کام صرف تُو ہی کر سکتی ہے اور ہاں ایک بات اور۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''اگر تیرا فیصلہ ہاں میں ہوا تو ایک کام ضرور ہونا ہے حاجی حیات نے بھاگے بھاگے تیرے پاس آنا ہے، اس نے کہنا ہے ادئے پاگلے! یہ کیا کر رہی ہے۔ کون کرا رہا ہے تجھ سے یہ سب کچھ، اگر اس وقت تُو نے میرا نام لینا ہے تو پھر ابھی بتا دے۔ اگر حاجی نے کچھ کہا اور میرا کھوپڑ گھوم گیا تو پھر بڑا سیاپا پڑ جانا ہے اور جو کچھ تم لوگوں کے ساتھ ہونا ہے وہ بھی کہنے سننے کے لائق نہیں، میری بات سمجھ رہی ہے تُو؟'' شانی نے بے ساختہ اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اس خوفناک افسر کے سامنے بالکل مسمرائز ہو رہی تھی۔ اس کا حلق خشک تھا اور جسم میں ہلکی سی لرزش تھی۔ وہی لرزش جو کبھی نارپور کی حویلی میں فاخر کے سامنے اس پر طاری ہوتی تھی۔ شاید سارے جابر لوگوں کی موجودگی ماحول پر ایک جیسا اثر چھوڑتی ہے۔ اس نے ہمت جمع کر کے کہا۔

''میں نہیں سمجھتی کہ میری بات کا رستم پر وہ اثر ہوگا جو آپ سمجھ رہے ہیں لل..... لیکن اگر ایسا ہے بھی تو اس کے لئے یہ ضروری تو نہیں کہ میں خود کسی دور دراز جگہ پر جاؤں..... یہ مقصد خط وغیرہ کے ذریعے بھی.....''

''مجھے پتا تھا تُو یہ بات کہے گی۔ مجھے پتا تھا۔'' اس نے تیزی سے شانی کی بات کاٹی۔ ''لیکن بات یہ ہے بی بی جان کہ یہ بہت بڑا اینٹا ہے۔ خط بازی سے ٹھیک ہونے والا نہیں، میں نے اس پر بہت دماغ کھپایا ہے۔ بس یہی راستہ سمجھ میں آتا ہے جو تجھے بتایا ہے۔ اگر تُو کچھ ٹھیک کرنا چاہتی ہے تو ایک بار تو تجھے وہاں جانا ہی پڑے گا۔ اپنی زبان سے اس ماں کے..... کو سمجھانا پڑے گا۔'' وہ گالی دے کر بولا۔

شانی نے محسوس کیا کہ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو رہی ہیں۔ اس شخص کے روبرو اسے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''اچھا مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیں۔''

''سوچ لے..... لیکن پھر کہتا ہوں۔ یہ بات صرف میرے اور تیرے درمیان رہنی چاہئے۔ انکار کرنا ہوگا تو مجھے ہی کرنا اور اگر اچھا فیصلہ کر کے تھوڑی سی ہمت کر لے گی تو فائدے میں رہے گی اور اوروں کا بھی فائدہ ہوگا۔''

شانی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''جمشید..... میرا مطلب ہے.....'' بات اس کے ہونٹوں میں الجھ گئی۔

''اوہ! تجھے کہا تو ہے، وہ تیرا رشتے دار ہے تو پھر ہمارا بھی ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اس

کے لئے جو سامان لائی ہے۔ سب انسپکٹر مرید احمد کو دے دے۔ وہ پہنچا دے گا۔''

''لیکن ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''فی الحال یہ تو مشکل ہے لیکن حوصلہ رکھ میں تجھے ملا بھی دوں گا اس سے۔'' ریاض کا لہجہ اٹل تھا۔

اس سے پہلے کہ شانی جمشید کے حوالے سے کچھ اور کہتی اس نے تیزی سے وائرلیس سیٹ آن کیا اور اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ کچھ اور سننا نہیں چاہتا۔ شانی باہر آ گئی۔

وہ رات آٹھ بجے کے لگ بھگ گھر واپس پہنچی۔ تابندہ دروازے میں ہی کھڑی انتظار کر رہی تھی جیسے اسے آس ہو کہ شاید جمشید ساتھ ہی آ جائے گا۔

شانی نے اسے تسلی دی اور کہا۔ ''وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں ڈی ایس پی سے بات کر کے آئی ہوں۔ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔''

''وہ گھر کب آئے گا؟''

اس کا سسر بولا۔ ''دیکھ دھی رانی! مصیبت آ تو پٹھا پھٹ جاتی ہے لیکن اسے جاتے ہوئے تھوڑی دیر لگتی ہے۔ بس تُو مولا سے کرم مانگ۔ وہ جو کرے گا اچھا کرے گا۔''

تابندہ سسکی لے کر رہ گئی۔ اس کے تو ہاتھوں کی مہندی کا رنگ بھی ابھی نہیں چھوٹا تھا۔ شانی کی خالہ فیروزہ کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

خالو اعجاز ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے گوجرانوالہ سے واپس آئے تھے۔ ان کے چہرے پر سفر اور پریشانی کی گہری تھکان تھی۔ صحن میں لگے ہینڈ پمپ پر منہ دھو کر وہ شانی کے پاس آ گئے۔ شانی نے انہیں اور دیگر گھر والوں کو ڈی ایس پی سے ملاقات کی ساری تفصیل بتائی تاہم وہ باتیں اپنے تک ہی رکھیں جنہیں ریاض نے چھپانے کے لئے کہا تھا۔ خالو اعجاز کی باتوں سے شانی کو معلوم ہوا کہ ان کا گوجرانوالہ کا دورہ تقریباً رائیگاں ہی گیا ہے۔ وہ ایک ایم این اے کی سفارش لینے گئے تھے، مگر ایم این اے اسمبلی کے اجلاس میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ اس کے سیکرٹری نے بتایا کہ ان سے رابطہ ممکن نہیں۔ خالو اعجاز نے اندازہ لگایا تھا کہ ڈپٹی ریاض کا نام سن کر ایم این اے کئی کترا گیا ہے۔ حالانکہ وہ چاہتا تو فون پر بھی کچھ نہ کچھ کوشش کر سکتا تھا یا کسی اور ذریعے سے اپنی سفارش متعلقہ اہلکاروں تک پہنچا سکتا تھا۔ اب دو روز بعد خالو اعجاز، تایا معصوم کے ساتھ لاہور جانے اور ایک صوبائی منسٹر سے رابطہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

شانی رات گئے تک سوچتی رہی اور ہولتی رہی۔ تھانے میں بہیمانہ تشدد کے مناظر اس کی سوچ کو مجروح کرتے رہے۔ اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ لوگ اپنے مسئلوں کے حل کے لئے تھانوں میں جانے سے کیوں کتراتے ہیں اور کیوں حق پر ہوتے ہوئے بھی حق حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

اگلے روز شانی ہسپتال پہنچی تو وہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ حالانکہ دو دن پہلے تک یہاں لڑائی میں زخمی ہونے والے کم و بیش دس افراد موجود تھے اور یہاں کا کمپاؤنڈر ایک لیڈی ہیلتھ ورکر کے ساتھ مل کر ان کا علاج کر رہا تھا۔ اب وہ دونوں بیٹھے مکھیاں مار رہے تھے۔ چند بچیاں ہسپتال کے احاطے میں ''کیری کاڑا'' کھیلنے میں مصروف تھیں۔ ایک بکری کمروں میں آوارہ پھر رہی تھی اور ایک بچہ ابلا ہوا بھٹا کھانے کے ساتھ ساتھ اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ ہسپتال کی یہ حالت شانی سے دیکھی نہیں گئی۔ اس نے کمپاؤنڈر سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے رمضان.....! مریض کہاں گئے؟''

''چلے گئے ہیں جی سارے۔ رات کو اس کبڑی عورت نے انہیں ڈرا دیا۔ کہنے لگے آج چاند کی دسویں ہے، دسویں سے چودھویں تک چار راتیں اس چھت کے نیچے رہنے والوں کے لئے منحوس ہوتی ہیں۔ یہاں جو کچھ ہوتا رہا ہے ان چار راتوں میں ہی ہوتا رہا ہے۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ یہ دیہاتی ایسی باتوں پر کتنی جلدی یقین کرتے ہیں۔ اتفاق سے کل ایک زخمی فدا حسین کی طبیعت بھی کچھ خراب تھی۔ بخار میں الٹی سیدھی باتیں کر رہا تھا۔ سارے مریضوں نے بستر بوریا سمیٹا اور عارف صاحب کے منع کرنے کے باوجود چلے گئے۔''

شانی تنہا ایک کمرے میں کرسی پر بیٹھ گئی، اس کے ذہن میں رہ رہ کر خالو اعجاز کی یہ بات گونجنے لگی کہ اگر اس ہسپتال کو اور علاقے کے دوسرے صحت مرکزوں کو آباد کرنا ہے تو پھر ان لوگوں کو واپس لانا ہوگا جو یہاں سے چلے گئے ہیں..... یا پھر بھیج دیئے گئے ہیں وہ کہاں ہیں؟ کس حال میں ہیں؟ وہ سوچنے لگی۔ خالو اعجاز نے ان تینوں کے نام بھی بتائے تھے لیڈی ڈاکٹر زیب النساء، اس کا شوہر ڈاکٹر محسن اور ان کا سینئر ساتھی ڈاکٹر بہروز۔ پتا نہیں کیوں شانی کے ذہن میں ایک اتھاسا ہو رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ زیب النساء اور ڈاکٹر محسن اب بھی حشام کی قید میں ہیں۔ وہ بے چین ہو اٹھی۔ ایک عجیب سا درد اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا اور پھر وہیں اس تنہا کمرے میں اس اکیلی کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک عجیب خیال اس کے ذہن میں آیا۔ عجیب اور انوکھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ کرسی سے اٹھی اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔ وہ جوں جوں سوچتی گئی اس کے جسم میں عجیب سنسناہٹ پیدا ہوتی گئی۔ وہ ان تینوں

کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کر سکتی تھی..... ضرور کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک اور بات بھی محسوس کر رہی تھی ریاض ہٹلر کی ساری باتیں غلط نہیں تھیں۔ ان میں چند ایسی بھی تھیں جن میں شانی کو وزن محسوس ہوا تھا۔ مثلاً یہ بات کہ اگر رستم نے تاؤ حشام اور اس کے بیٹے کو مار دیا تو علاقے میں دشمنی کی آگ بہت شدت سے بھڑک کے گی اور اسے بجھانا مشکل ہو جائے گا۔

اسی دوران میں شانی کی نظر خالو اعجاز پر پڑی وہ شاہی سے باتیں کرتے ہسپتال کی طرف آ رہے تھے۔ حضرت قدرت اللہ کے چیلے کی حیثیت سے شاہی یہاں خاصا مقبول تھا۔ اس کے آستانے پر ہر وقت مریضوں کا رش رہتا تھا۔ مریض یہ جانے بغیر کہ وہ نہایت نقصان دہ دوا (اسٹیرائیڈز) استعمال کر رہے ہیں، شاہی سے بہت خوش تھے۔ شاہی زیادہ عمر کا نہیں تھا۔ بہ مشکل تیس سال کا ہوگا۔ قد چھوٹا، رنگ سانولا اور بال کندھوں تک تھے۔ یہ بال تیل میں چپڑے ہوئے تھے۔ وہ حرام کی روٹیاں کھا کھا کر خوب گٹھا ہوا بھی تھا۔ وہ خالو اعجاز سے باتیں کرتا ہوا ہسپتال تک پہنچا۔ پھر خالو تو ہسپتال کے اندر آ گئے اور وہ ہسپتال کے ویران در و دیوار پر ایک طنزیہ نگاہ ڈالتا ہوا اپنے آستانے کی طرف مڑ گیا۔

لیڈی ہیلتھ ورکر چائے لے آئی۔ شانی اور خالو اعجاز آفس نما کمرے میں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ خالو اعجاز نے جیب سے ایک تہہ کیا ہوا اخبار نکالا۔ یہ دو دن پہلے کا تھا۔ ''یہ خبر دیکھو.....'' خالو اعجاز نے ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

شانی نے خبر دیکھی سرخی تھی۔ ''جہلم سے تقریباً تیس کلومیٹر آگے جنگل میں پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان اندھا دھند فائرنگ۔ ڈاکو روپوش ہو گئے۔''

خبر کا متن اس طرح تھا۔ ''چوہدری حشام اور اس کے بیٹے کے سنسنی خیز اغوا کے بعد پولیس رستم اور اس کے ساتھیوں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسی سلسلے میں کل جہلم شہر سے تقریباً بیس کلومیٹر مغرب کی طرف پولیس پارٹی اور ڈاکوؤں میں تصادم ہوا۔ کم و بیش ایک گھنٹے تک خود کار ہتھیاروں سے فائرنگ ہوتی رہی۔ اس میں دو پولیس والے بھی زخمی ہوئے تاہم کسی جانی نقصان کی اطلاع نہیں ملی۔ شام کے فوراً بعد ڈاکوؤں نے تاریکی کا فائدہ اٹھایا اور جنگل میں روپوش ہو گئے۔ آپریشن انچارج ڈی ایس پی ریاض کا کہنا ہے کہ ڈاکو وارتیں کرنے کے بعد پوٹھوہار کی گہرائی میں چلے جاتے ہیں۔ وہاں ان کی محفوظ پناہ گاہیں ہیں۔ ان پناہ گاہوں تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔''

شانی خبر پڑھ چکی تو خالو اعجاز بولے۔ ''لگتا ہے کہ پولیس کے افسر شش و پنج میں ہیں۔ انہیں پتا ہے کہ وہ ڈاکوؤں کے پیچھے زیادہ آگے تک جائیں گے تو پھر انہیں شدید جانی نقصان

اٹھانا پڑے گا۔ چوہدری اور اس کے بیٹے کی جان کا خطرہ اس کے علاوہ ہوگا۔''

وہ دونوں کچھ دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ اس دوران میں چائے ختم ہو گئی لیڈی ورکر خالی برتن لے کر چلی گئی تو شانی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میرے ذہن میں ایک بات آ رہی ہے خالو۔''

''کیسی بات؟''

''حالات میں بہت بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ ہمیں کچھ کرنا چاہئے۔''

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ کسی وقت تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں رنگ والی میں بھی فساد نہ ہو جائے۔ میں نے بلی ماروں کی یہ دھمکی بھی سنی ہے کہ وہ حشام کے بدلے میں ہماری حویلی سے کسی کو اغوا کریں گے..... لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''میرا دل چاہ رہا ہے خالو..... کہ میں خود رستم سے ملوں۔ اس سے کہوں کہ وہ ایسی آگ سے نہ کھیلے جو سب کو جلا کر راکھ کر دے۔''

خالو نے حیرت سے شانی کو دیکھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ تمہارا مطلب ہے کہ تم رستم کے پاس جاؤ گی؟''

''ہاں خالو! ہمیں ہی اس کے پاس جانا ہوگا۔ کیونکہ وہ تو اپنا کام کر کے جا چکا ہے۔ وہ تو اب یہاں آئے گا نہیں۔ پولیس کا بھی یہی خیال ہے کہ وہ چوہدری اور اس کے بیٹے کو پوٹھوہار میں بہت اندر لے گیا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ تم پہاڑوں میں رستم کے پیچھے جاؤ گی.....؟'' خالو کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اس بارے میں ڈی ایس پی ریاض سے میری بات ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کے بندے مجھے جہلم سے آگے پہاڑوں میں کافی آگے تک پہنچا سکتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ فاصلہ میں اکیلے طے کر لوں یا کسی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی لیکن ایک بات ہے خالو۔ اگر ہم نے کچھ نہ کیا اور حالات جوں کے توں رہے تو بڑا فساد پھیلنے کا ہے علاقے میں۔''

چوہدری اعجاز کے چہرے پر الجھن تھی۔ وہ بولے۔ ''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں بیٹی! لیکن جو کچھ تم بتا رہی ہو یہ ممکن نہیں۔ یہ بہت خطرناک ہے۔ ڈاکو تو پھر ڈاکو ہوتا ہے۔ اس کی نیت کا بھروسا نہیں کیا جا سکتا اور ڈاکوؤں کے گڑھ میں کس کی نیت کیا ہو، کیا پتا۔''

شانی کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس نے ہمت کی اور آنکھیں جھکا کر بولی۔ ''خالو..... رستم کو میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں..... وہ..... وہ بہت عزت کرتا ہے میری۔

مجھے یقین ہے وہ میری بات ٹالے گا نہیں۔ خود کو اور دوسروں کو اس خطرناک جنجال سے نکال لے گا۔ میں نے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کر کے ہی آپ سے بات کی ہے۔''

''شانی..... کہیں ..... ڈی ایس پی ریاض نے تو ایسا کرنے کے لئے نہیں کہا؟''

''نہیں خالو..... ! اس نے صرف بات کی تھی کہ پولیس اس موقع پر رستم کے پیچھے جانا نہیں چاہتی۔ ایسا کرنے میں پولیس اہلکاروں کی جانوں کو خطرہ ہے اور یہ خطرہ بھی ہے کہ حشام اور اس کا بیٹا ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے جائیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر یہ معاملہ بات چیت کے ذریعے حل ہو جائے تو زیادہ اچھا ہے۔''

''لیکن اس میں ڈی ایس پی کی کوئی چال بھی تو ہو سکتی ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ وہ شاطر بندہ ہے۔ اگر وہ زیادہ سختی نہیں کر رہا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ جانتا ہے، حاجی حیات ہمارے ساتھ ہے۔ ورنہ میرے خیال میں تو وہ اب تک رستم کو پھانسنے کے لئے تمہیں گرفتار کر چکا ہوتا۔''

''کیا مطلب خالو؟''

''وہ بہت بڑا خبیث ہے۔ اسے اب بھی شک ہوگا کہ اگر تم مصیبت میں پھنسو گی تو رستم تمہیں بچانے کے لئے آئے گا۔''

شانی کو اس گفتگو کے دوران عجیب سی شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اوڑھنی کے نیچے اپنے ریشمی بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑسا اور موضوع کو تھوڑا سا بدل کر بولی۔ ''مجھے لگتا ہے خالو! اگر میں نے یہ قدم اٹھا لیا تو میں اس ویران ہسپتال کے لئے کچھ کر سکوں گی۔ شاید کافی کچھ کر سکوں گی۔''

''کیا مطلب؟''

''بس، میرے ذہن میں ایک خیال سا ہے۔ ابھی اس کی کوئی واضح شکل نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں ایک بڑی تبدیلی لا سکتی ہوں۔''

''تم تو پہیلیاں بوجھوا رہی ہو۔''

''ابھی خود میں بھی ''پہیلی'' ہی بوجھ رہی ہوں۔''

خالو اعجاز نے گہری سانس لی۔ ''لیکن میں نہیں سمجھتا کہ باقی گھر والے تمہیں یہ قدم اٹھانے کی اجازت دیں گے۔ تایا معصوم، تمہاری چچی پروین اور باقی لوگوں کو بھی یہ گوارا نہیں ہوگا کہ تم نارپوریوں کی رہائی کے لئے رستم کے پیچھے جانے کا رسک لو۔''

''اسی لئے تو میں نے آپ سے بات کی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ انہیں اس پروگرام کی

خبر نہ ہو۔ کم از کم میرے یہاں سے جانے تک۔''

''شانی! تم بہت بڑی الجھن میں ڈال رہی ہو مجھے۔''

''خالو.....'' شانی نے بڑی محبت سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''اپنی بیٹی پر بھروسہ کریں۔ میں آپ کو مایوس نہیں ہونے دوں گی۔ یقین کریں میری اس کوشش سے بہت سوں کا بھلا ہوگا..... پلیز خالو۔''

وہ خاموش ہو گئے۔ ان کے چہرے پر گہرا تردد تھا۔ ہولے سے بولے۔ ''ابھی میں جمشید کی پریشانی سے نہیں نکلا تھا، تم نے ایک اور الجھن میں ڈال دیا ہے۔''

''آپ جمشید کی طرف سے بھی پریشان نہ ہوں۔ میرے جانے سے جہاں اور کئی بہتریاں آئیں گی وہاں مجھے یقین ہے کہ جمشید کی مشکلیں بھی کم ہوں گی۔ اس کے لئے بہت جلد کوئی اچھا راستہ نکل آئے گا۔''

خالو بھانجی میں چند منٹ مزید بات چیت ہوئی۔ خالو اعجاز بدستور رضامندی اور نارضامندی کے درمیان تھے۔

شانی جانتی تھی کہ خالو کسی اور کو بتائیں نہ بتائیں لیکن حاجی حیات کو ضرور اس صورتِ حال سے آگاہ کریں گے اور انہوں نے شانی کے سامنے کہہ بھی دیا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے وہی ہوا جس کی شانی کو توقع تھی۔ حاجی حیات کا ''اہلکار خاص'' سب انسپکٹر سادہ کپڑوں میں جوہر آباد پہنچ گیا۔ اس کے آنے کی خبر مقامی پولیس کو بھی نہیں تھی۔ وہ سیدھا شانی کے پاس پہنچا۔ شانی اس وقت خالو اعجاز کے سسر اور تابندہ کے پاس صحن میں بیٹھی تھی۔ تابندہ کو مدانی کی ڈوریاں ہلاتے اور کسی میں سے مکھن نکالتے دیکھ رہی تھی۔ ایک دہقانی زور تھا تابندہ کی بانہوں میں لیکن جب سے جمشید حوالات میں گیا تھا وہ پہلے جیسی توانائی نظر نہیں آتی تھی تابندہ میں۔ شانی، تابندہ کے پاس سے اٹھ کر بیٹھک میں اختر کے پاس آ گئی۔ سب انسپکٹر شانی سے عمر میں کافی بڑا ہونے کے باوجود اسے چھوٹی باجی کہتا تھا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد بولا۔ ''چھوٹی باجی..... ! یہ کیا سن رہے ہیں ہم؟''

''ٹھیک ہی سن رہے ہیں۔''

''یعنی آپ پوٹھوہاری علاقے میں رستم کے پاس جانا چاہتی ہیں؟''

''ہاں اختر بھائی..... ! میں اس سنگین مسئلے کو حل کرانا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں اس میں میرے لئے تھوڑا سا رسک بھی ہے لیکن بہت بڑے خون خرابے سے بچنے کے لئے میں یہ رسک لینے کو تیار ہوں۔''

''کہیں......اس بارے میں......ڈپٹی صاحب نے تو آپ پر کسی طرح کا پریشر نہیں ڈالا؟'' اختر نے پوچھا، یہ وہی سوال تھا جو کل خالو اعجاز نے بھی کیا تھا۔

''نہیں بھائی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے خود اس بارے میں سوچ بچار کی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس موقع پر جتنی اچھی طرح میں رستم اور اس کے ساتھیوں کو سمجھا سکتی ہوں کوئی اور نہیں سمجھا سکتا۔'' آخری الفاظ ادا کرتے کرتے شانی کو ایک بے نام سی جھجک محسوس ہوئی۔ جیسے وہ اپنے اور رستم کے تعلق کو لوگوں کے ذہنوں میں مزید واضح کر رہی ہو لیکن یہ سب کچھ تو پہلے ہو گیا تھا۔ شاید اسی وقت جب شانی نے بھرے میلے میں خود کو زخمی رستم کے اوپر گرایا تھا اور اس کے حصے کی لاٹھیاں بھی اپنے جسم پر کھائی تھیں۔

شانی نے اختر کے سامنے وہ ساری باتیں کہہ ڈالیں جو اس سے پہلے خالو اعجاز سے کہیں تھیں۔ ایس آئی اختر خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے بیچ بیچ میں سوالات بھی کئے۔ آخر میں وہ بولا۔ ''چھوٹی باجی! آپ کی کچھ باتوں پر واقعی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جس قسم کے حالات پیدا ہو گئے ہیں، ان میں کسی نہ کسی کو تو آگے بڑھ کر بہتری کی کوشش کرنا پڑے گی لیکن میری ذاتی رائے تھوڑی سی مختلف ہے۔ نارپور کے چوہدریوں سے آپ کو ہمیشہ دکھ اور تکلیف ہی پہنچی ہے۔ اب وہ اپنے کرتوتوں کے نتیجے میں خود ایک مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ انہیں اس مشکل سے نکالنے کے لئے آپ کا اتنا بڑا رسک لینا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''جو کام عام ڈگر سے ذرا ہٹ کر ہوتے ہیں، انہیں سمجھنے میں تھوڑی سی مشکل تو ہوتی ہے......پتھر کے بدلے پتھر تو ہر کوئی مارتا ہے لیکن پتھر کے بدلے پھول دینے سے ہی ہم اپنے اردگرد اچھی تبدیلیاں لا سکتے ہیں۔ سیانے کہتے ہیں نا کہ آگ کو آگ سے نہیں پانی سے بجھایا جاتا ہے۔''

اختر نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹی باجی! آپ بڑی اچھی باتیں کرتی ہیں اور میں سننا بھی چاہتا ہوں لیکن فی الحال وقت بہت کم ہے، مجھے ابھی تقریباً چالیس کلومیٹر سفر کر کے واپس جانا ہے اور حاجی حیات صاحب کو آپ کے پروگرام سے آگاہ کرنا ہے۔''

شانی نے کہا۔ ''بھائی! تم انہیں اپنی طرف سے بھی قائل کرنے کی کوشش کرنا......ان شاءاللہ جو کام میں کرنے جا رہی ہوں، اس میں سے خیر کا پہلو ضرور نکلے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گا لیکن اگر انہوں نے اتفاق نہ کیا اور آپ کے لئے کوئی پیغام دیا تو وہ پیغام بھی میں آج رات یا کل سویرے آپ تک پہنچا دوں گا۔''

''مجھے امید ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔'' شانی نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ایس آئی اختر شانی سے رخصت ہو کر واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے فوراً بعد شانی نے بھی جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے گھر کے باہر موجود ایک سفید پوش اے ایس آئی کے ذریعے ٹھیکرا تھانے میں ڈپٹی ریاض کو پیغام بھیجا کہ وہ جلد آ کر اس سے ملے۔ اپنی روانگی کے حوالے سے وہ کل رات سے ہی ضروری انتظامات کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں اس نے مہتم بستی کے سردار دراج سے بھی مشورہ کیا تھا اور عارف کمبوہ تو ہر مشورے میں شریک ہوتا ہی تھا۔

☆======☆======☆

رات تقریباً دس بجے کا وقت تھا۔ کڑاکے کی سردی تو رخصت ہو چکی تھی۔ تاہم رات کے وقت اب بھی ہلکی خنکی محسوس ہوتی تھی۔ اس خنکی کی ایک وجہ غالباً تیز ہوا بھی تھی۔ شانی ایک پولیس جیپ میں سوار تھی۔ اس جیپ میں شانی کے ساتھ جو پولیس آفیسر سوار تھا، وہ پورے ملک میں دہشت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ بدمعاش اور شریف دونوں ہی اس کے نام سے خوف کھاتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ شخص عرصے سے اپنی جیب میں ''قتل کرنے کا لائسنس'' ڈالے پھرتا ہے۔ اسے یونہی ہٹلر کا خطاب نہیں دیا گیا تھا۔ اس جیپ میں شانی اور ریاض ہٹلر کے علاوہ دو افراد اور بھی موجود تھے۔ ایک سردار دراج اور دوسرا عارف کمبوہ کا قریبی دوست بلاول اعوان۔

شانی کی صوابدید پر ہوتا تو وہ بلاول کی بجائے عارف کو ہی اپنے ساتھ لانا چاہتی، لیکن عارف کا آنا مشکل تھا۔ چند دن پہلے گاؤں سے باہر میدان میں جو خونی لڑائی ہوئی تھی اس نے بہت سے مسائل پیدا کر دیئے تھے۔ ان مسائل سے نمٹنا اکیلے چوہدری نواب کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ عارف کو تقریباً روز ہی تھانے بھی جانا پڑ رہا تھا......جمشید کے علاوہ بھی اس کے کم و بیش چھ ساتھی فوجداری مقدمے میں پھنس گئے تھے۔ ان میں سے ایک گوجرانوالہ کے ہسپتال میں زخمی پڑا تھا جس کی دیکھ بھال بھی عارف کے ذمے تھی۔

سردار دراج بخوشی شانی کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا تھا، اس کا سینہ ایک دیوار کی طرح تھا اور یہ دیوار شانی کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے اور بھی اونچی اور وسیع ہو گئی تھی۔ سردار دراج کو اپنے ساتھ لانے سے شانی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مہتموں پر سے پولیس کا دباؤ کم ہو جائے۔ اس کے علاوہ اس عمل سے مہتموں اور نارپوریوں کی باہمی دشمنی پر بھی پانی کے کچھ چھینٹے پڑ سکتے تھے۔ یہ دشمنی کٹھولی گاؤں کے میلے والے واقعے کے بعد ایک دم چمک اٹھی تھی۔ سردار دراج اور عارف کمبوہ شانی اور رستم کو موت کے گھیرے سے نکالنے کے لئے مشتعل

نار پوریوں سے بھڑ گئے تھے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے اور نار پوری منہ تکتے رہ گئے تھے۔ یہ بہت بڑی چوٹ تھی چوہدری حشام اور اس کے ساتھیوں کے لئے۔

جس جیپ پر وہ سوار تھے وہ ایک لینڈ روور تھی۔ یہ گاڑیاں طاقت اور سخت جانی میں اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ دشوار گزار پہاڑی راستوں پر ان سے بہتر ساتھی اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ جیپ کے اندر کافی گنجائش تھی۔ ڈپٹی ریاض اگلی نشست پر ڈرائیور کے برابر بیٹھا تھا۔ ڈرائیور ایک لاہوری اے ایس آئی تھا۔ پچھلی نشست پر شانی تھی۔ اس کا سراپا ایک گہرے نیلے رنگ کی چادر میں چھپا تھا۔ اس نے چہرہ بھی چادر کے پلو میں چھپا رکھا تھا۔ صرف آنکھیں اور پیشانی کا زیریں حصہ نظر آتا تھا۔ پچھلی نشستوں پر سردار دراج اور بلاول اعوان موجود تھے۔ گاہے بگاہے دونوں دھیمے لہجے میں آپس میں باتیں بھی کرنے لگتے تھے۔ بلاول شلوار قمیص میں تھا۔ اس کی قمیص کے نیچے ایک بریٹا پسٹل اور اس کی تقریباً سو گولیاں تھیں۔ چوڑے چکلے سردار دراج نے ایک نیم گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس چادر کے نیچے لائسنس یافتہ کلاشنکوف موجود تھی کچھ دیگر اسلحہ بھی اس کی چادر تلے موجود تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کا نہایت دشوار گزار سفر طے کر کے وہ لوگ ایک چھوٹی سی پختہ سڑک پر پہنچ گئے۔ یہ سڑک آگے جا کر ایک بڑی سڑک سے مل گئی۔ یہاں پہنچ کر ڈپٹی ریاض کے موبائل فون نے کام کرنا شروع کر دیا اور جب فون نے کام کرنا شروع کیا تو اسے وقفے وقفے سے کالیں آنا شروع ہوگئیں۔ یوں لگتا تھا کہ پنجاب کے سارے تھانوں کو صلاح مشوروں کے لئے جس شخص کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہی ڈپٹی ریاض ہے۔ ڈپٹی ریاض بھی اپنے مخصوص جارحانہ و حاکمانہ انداز میں بول رہا تھا۔ شانی کی پرواہ کئے بغیر وہ اپنی گفتگو میں گندی گالیاں بھی بک رہا تھا۔ کبھی کسی ملزم کی رشتے دار خواتین سے نازیبا رشتے جوڑتا تو کبھی اپنے کسی ماتحت کی ماں بہن ایک کر دیتا۔ اس کی باتوں سے اس کی بے پناہ شعلہ مزاجی کا اندازہ بھی ہوتا تھا۔ لاہور کے کسی تھانیدار کو اس نے حکم دیا۔ فلاں بندے کو اتنے چھتر مارو کہ اس کی پشت پر سے کھال دو دو انچ ابھر جائے۔ بس اسے مرنا نہیں چاہئے باقی سب کچھ کر ڈالو۔ کسی مفرور لڑکے کے باپ کو اس نے فون پر دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ پروفیسر! انسان بن جا.....ورنہ تیری آنکھوں کے سامنے تیری بیٹی کی عزت کا جنازہ نکلوا دوں گا۔ کل شام تک مجھے تیرے بیٹے کی گرفتاری چاہئے۔ اگر نہیں تو پھر کل نو بجے لیڈی پولیس پہنچ جائے گی تیری بیوی اور بیٹی کو تھانے لانے کے لئے۔''

چند منٹ بعد کسی سیکرٹری سے ریاض ہٹلر کا مکالمہ ہوا۔ اس سیکرٹری نے چند لڑکوں کی

رہائی کے لئے ریاض سے سفارش کی۔ ریاض نے جس بے پرواہی سے سیکرٹری کو انکار کیا اور اسے لتاڑا اس سے ریاض کے پیچھے موجود خفیہ ہاتھ کی طاقت کا اندازہ شانی کو ہوا۔

سفر کے دوران شانی اور دراج وغیرہ سے بھی ڈپٹی ریاض کی تھوڑی بہت بات چیت ہوتی رہی تاہم وہ زیادہ وقت اپنے وائرلیس سیٹ اور موبائل کے ساتھ ہی مصروف رہا۔ راستے میں جہاں جہاں کسی ناکے یا پولیس پوسٹ پر پولیس اہلکاروں نے ڈپٹی ریاض کو پہچانا، اسے بھرپور انداز میں تعظیم پیش کی۔ مختلف جگہوں پر ایڑیاں بجتی رہیں اور ہاتھ سیلوٹ کے لئے اٹھتے رہے۔

شانی کا خیال تھا کہ وہ لوگ پہلے جی ٹی روڈ پہنچیں گے۔ وہاں سے گوجر خان کے گرد و نواح تک جائیں گے اور پھر ٹیلوں میں سفر کریں گے لیکن دو ڈھائی گھنٹے کے سفر کے باوجود جب جی ٹی روڈ نہیں آئی تو شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ کوئی شارٹ کٹ استعمال کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد اس خیال کی تصدیق بھی ہوگئی۔ ڈرائیور اور ڈپٹی ریاض کے درمیان جو بات ہوئی اس میں چکوال روڈ کا ذکر آیا۔ شانی کی معلومات کے مطابق چکوال روڈ، گوجر خان کے آس پاس سے ہی جی ٹی روڈ میں سے پھوٹتی تھی۔

رات دو بجے کے قریب جیپ نے ایک بار پھر پختہ سڑک چھوڑ دی اور ناہموار راستے پر سفر شروع کر دیا لیکن اس مرتبہ ان کے اردگرد درخت اور میدان نہیں تھے۔ سیاہ بھوتوں جیسے اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ مدھم چاندنی ٹیلوں کو اور بھی پُراسرار بناتی تھی۔ ان ٹیلوں میں داخل ہوتے ہی ایک اور پولیس موبائل بھی ان کی ہم سفر ہوگئی۔ اس گاڑی میں کم و بیش آٹھ مسلح اہلکار موجود تھے۔ یہ گاڑی ان کے پیچھے آ رہی تھی۔ ڈپٹی ریاض نے شانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت شارٹ کٹ ہم نے استعمال کیا ہے جی ٹی روڈ کی طرف سے جاتے تو دو گھنٹے اور لگ جاتے۔''

''اندازاً کتنے بجے پہنچیں گے؟'' شانی نے پوچھا۔

''پہنچنے کی بات تو ابھی بہت دور کی ہے۔''

''میرا مطلب ہے کہ گاڑی کا سفر کتنا ہے؟''

''تقریباً ایک گھنٹہ۔''

وہ ایک گھنٹہ بے حد کٹھن تھا۔ جیپ خطرناک زاویوں سے دائیں بائیں جھکتی تھی اور آگے پیچھے بھی۔ اپنی نشست پر موجود رہنے کے لئے شانی نے بڑی مضبوطی سے ہینڈلز پر گرفت قائم کر رکھی تھی۔ جیپ کی رفتار بھی خاص تیز نہیں تھی۔ کسی وقت تو شانی کو لگتا تھا کہ اس

سواری سے پیدل چلنا بہتر ہے۔ ایک جگہ پر انہیں پہیہ تبدیل کرنا پڑا۔ ایک مقام پر پیچھے آنے والی گاڑی ایک کھڈے میں پھنس گئی۔ یوں انہیں متوقع وقت سے ایک گھنٹہ زیادہ لگ گیا۔ یہ بالکل سنسان پہاڑ تھے۔ کہیں روشنی کی ایک کرن تک نظر نہیں آتی تھی۔ جب مدھم چاندنی بدلیوں کی اوٹ میں چھپ جاتی تھی تو یہ لینڈ اسکیپ اور بھی ہیبت ناک ہو جاتے تھے۔

شانی سوچ رہی تھی اور اپنے دل میں کہہ رہی تھی۔ ''روشن بستیوں سے نکل کر یہ تم نے کہاں بسیرا کر لیا ہے رستم؟''

بالآخر جب دونوں گاڑیاں ٹیلوں کے درمیان ایک تھوڑی سی ہموار جگہ پر رکیں تو صبح صادق کی روشنی مشرقی افق سے پھوٹنا شروع ہو چکی تھی۔ کھیا دراج، بلاول اور شانی جیپ سے باہر آ گئے۔ ہوا سرد تھی۔ شانی کو یہاں اور بھی سات آٹھ جیپیں اور لوڈر وغیرہ نظر آئے۔ یہاں دو خیمے لگے تھے۔ دو تین جگہ الاؤ بھڑک رہا تھا اور لوگ اس کے اردگرد بیٹھے تھے۔ یہ سب مسلح تھے۔ ان کے کندھوں پر رائفلیں دور ہی سے نظر آتی تھیں۔ وہ تینوں ڈپٹی ریاض کے عقب میں چلتے ہوئے ایک بڑے خیمے کی طرف آ گئے۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ یہ خیمے پولیس والوں کے ہیں۔ باوردی پولیس اہلکاروں نے پتھریلی زمین پر کھٹاک کھٹاک سیلوٹ مار کر ڈپٹی ریاض کا استقبال کیا۔ ڈپٹی ریاض نے شانی، کھیا دراج اور بلاول سے خیمے کے اندر چلنے کے لئے کہا۔ خود وہ دوسرے خیمے کی طرف چلا گیا۔

خیمے کے اندر کیروسین لیمپ کی مدھم روشنی تھی۔ تین چار بستر بچھے تھے۔ پولیس اہلکاروں کی وردیاں اور دو رائفلیں بھی خیمے میں آویزاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک سب انسپکٹر انوار نے ان کا استقبال کیا۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھا۔ وہ عام پولیس والوں کے برعکس پڑھا لکھا اور قدرے شائستہ نظر آتا تھا۔ چائے اور بسکٹ وغیرہ شاید پہلے سے تیار پڑے تھے۔ یہ سامانِ خورد و نوش ان کے سامنے رکھ دیا گیا۔ سب انسپکٹر انوار جلد ہی ان سے گھل مل گیا۔ انوار سمیت دیگر پولیس اہلکار بھی پُرتجسس نگاہوں سے شانی کو دیکھتے رہے تھے۔ غالباً وہ اس کے کوائف سے آگاہ تھے اور غالباً یہ بھی جانتے تھے کہ رستم سیال کی روداد میں اس کا کیا کردار ہے۔ شانی نے خیمے کے اندر آ کر بھی نیلی چادر اپنے چہرے سے ہٹانے کی کوشش نہیں کی تھی، اس نے چائے کا کپ بھی نقاب کے نیچے سے ہی ہونٹوں سے لگایا۔

بلاول احمد نے سب انسپکٹر سے پوچھا۔ ''یہ آگ کے گرد کون لوگ بیٹھے ہیں..... میرے خیال میں یہ پولیس والے تو نہیں.....؟''

انوار نے بلاول احمد کی تائید کی۔ ''یہ نارپور کے چوہدری اور ان کے کارندے وغیرہ ہیں۔ بڑے غصے میں یہاں پہنچے ہیں۔ آگے جانا چاہتے تھے۔ ہم نے بڑی مشکل سے روکا ہے۔''

''آگے کہاں جانا چاہتے تھے؟'' شانی نے پوچھا۔

''رستم کی طرف۔ سیانے ٹھیک کہتے ہیں۔ جب جوش آتا ہے تو ہوش روانہ ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ پولیس رستم کے پیچھے جانے میں سستی کر رہی ہے۔ اس لئے یہ کام اپنے ذمے لینا چاہئے۔ ایک نشے باز گائیڈ نے بھی ان کو بہکایا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ انہیں رستم کے ٹھکانے تک پہنچا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے اگر کل ان کو روکا نہ جاتا تو ان میں سے بہت سے اب تک اللہ بیلی ہو چکے ہوتے یا سخت مصیبت میں ہوتے۔ یہ پہاڑیاں بالکل بھول بھلیوں کی طرح ہیں۔ اگر بڑوں کے زمانے سے یہ ویرانہ ڈاکوؤں اور مفروروں کا محفوظ ٹھکانہ رہا ہے۔ سوچاس بندے تو یہاں یوں غائب ہو سکتے ہیں کہ ان کا نشان تک نہ ملے۔''

''اب یہ نارپوری کیا کہتے ہیں؟''

''کہنا کیا ہے، بس بیٹھے ہوئے ہیں، کہتے ہیں جب تک بڑا اور چھوٹا چوہدری رہا نہیں ہوتے یہاں ہی ڈیرہ ڈالیں گے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ زیادہ دیر رکیں گے نہیں۔ کل یا پرسوں تک ان کا راشن پانی ختم ہو جائے گا تو واپس چلے جائیں گے۔''

کھیا دراج بولا۔ ''کہیں کسی اور طرف سے آگے جانے کی کوشش (کوشش) نہ کریں یہ لوگ؟''

''امید تو نہیں کہ ایسا ہوگا'' سب انسپکٹر نے کہا۔ ''آگے جانے کے دو تین ہی خاص رستے ہیں۔ وہاں ہم نے نظر رکھی ہوئی ہے لیکن پھر بھی اگر انہوں نے بے وقوفی کی تو خود ہی پچھتائیں گے۔''

اچانک کچھ فاصلے پر شور سنائی دینے لگا۔ یقیناً یہ وہی لوگ تھے جو کھلے آسمان تلے دو تین جگہ آگ بھڑکا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اب یہ بلند عصیلی آواز میں بول رہے تھے۔ پھر ایک پکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''دراج کتا!'' بہت سی دیگر آوازوں نے کورس کی شکل میں کہا۔ ''ہائے ہائے'' ایک بار پھر آواز گونجی۔ ''دراج کتا'' دیگر آوازوں نے اسی انداز میں ہائے ہائے کہا۔

کھیا دراج بظاہر اطمینان سے بیٹھا رہا لیکن اس کی عقابی آنکھوں میں گہری سرخی اُتر آئی بولا۔ ''کٹڑی! میرا کھیال ہے کہ ان شہدوں نے مجھے پہچان لیا ہے۔ اب کھوتوں جیسی آواجیں نکال نکال کر اپنی اوکات بتا رہے ہیں۔''

انسپکٹر انوار جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی ان کی بولتی بند کرواتا ہوں۔''

''انسپکٹر صاحب! کسی سے غصہ نہیں کرنا۔ آرام سے سمجھانے کی کوشش کرنا۔'' شانی نے ملتجی لہجے میں کہا۔

سب انسپکٹر باہر چلا گیا۔ بلاول احمد نے کہا۔ ''لگتا ہے صرف کھیا کو پہچانا ہے ان لوگوں نے۔ ورنہ ہماری عزت افزائی بھی ضرور شروع ہو جاتی۔''

شانی نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ کھیا دراج نے اپنی لاڈلی کالا شنکوف پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کھوتا جو سب سے اونچی آواز میں بول رہا ہے، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ چوہدریوں کا کرائے کا ٹٹو ہے۔ اس ٹٹو کی تو ایسی کھمر لوں گا کہ جندگی بھر روتا رہے گا۔''

شانی نے ذرا کڑی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''ابھی نہیں نکڑی، ابھی نہیں۔ پھر کسی وکت کی بات کر رہا ہوں۔ اب تو وہی ہوگا جو تُو کہے گی۔''

تھوڑی ہی دیر بعد آوازیں آنا بند ہوگئیں۔ پولیس والوں کے للکارے گونجے اور غصیلی آوازیں خیموں سے دور چلی گئیں۔

چائے اور بسکٹوں کا ناشتہ ان کے جسموں میں تھوڑی سی توانائی لے آیا تھا۔ ابھی اندھیرا چھٹا نہیں تھا کہ وہ لوگ اس پڑاؤ سے آگے روانہ ہوگئے۔ دیہاتی طرز کی ایک ڈولی لائی گئی۔ ڈولی کے درمیان میں سے ایک لمبا بانس گزرتا تھا۔ دو بڑی چادروں کے ذریعے ڈولی کو ڈھانپا گیا تھا، ڈولی خیمے کے دروازے کے عین سامنے رکھ دی گئی۔ ڈپٹی ریاض تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوا اور شانی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''چل اٹھ جا بھئی۔ تیری سواری آگئی ہے۔''

''لیکن..... میں پیدل.....''

''جو کہہ رہا ہوں وہ کر۔'' ریاض نے تیزی سے شانی کی بات کاٹی۔ ''رستے میں کسی کے کندھوں پر چڑھنا پڑے گا تو پھر شرم آئے گی تجھے۔'' اس کے نارمل لہجے میں بھی تیزکاٹ چھپی رہتی تھی۔

شانی ڈولی میں بیٹھ گئی۔ ڈولی میں بیٹھنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ اس سے پہلے وہ دو بانسوں والی ڈولیاں دیکھتی تھی جنہیں چار کہار اٹھاتے تھے۔ یہ ایک بانس والی تھی اسے دو کہاروں نے اٹھانا تھا۔ تاہم یہ دونوں کہار غیر معمولی طور پر ہٹے کٹے اور مضبوط تھے۔ انہوں نے پٹھو ہاری طرز کی شلواریں اور شلو کے پہن رکھے تھے۔ ڈولی میں ٹھنڈے پانی کے تھرماس

اور بسکٹوں کے دو ڈبے پہلے سے رکھے تھے۔ آٹھ دس افراد پر مشتمل یہ قافلہ آگے جانے کے لئے بالکل تیار تھا۔ ڈپٹی ریاض ساتھ نہیں جا رہا تھا اور یہ ایک لحاظ سے اچھا ہی تھا۔ ڈپٹی ریاض کی موجودگی اردگرد کے ہر نفس کو سہمائے رکھتی تھی، وہ خود بڑی غلیظ اور شعلہ بار زبان بولتا تھا۔ یہ زبان کم از کم خواتین کے سننے کے لائق تو ہرگز نہیں تھی۔ یہ جان کر کہ ریاض اب آگے نہیں جا رہا، شانی سمیت یقیناً کئی افراد نے بھی اطمینان کی سانس لی تھی۔ وقتِ رخصت ڈپٹی ریاض ہٹلر نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں شانی کو کچھ مزید ہدایات دیں اور پھر روانہ کر دیا۔

دونوں تنومند پٹھو باریوں نے ڈولی اٹھائی تو شانی کو ایک عجیب جھولتا، ہلکورے لیتا ہوا احساس ہوا۔ دشوار راستوں پر ان کا سنسنی خیز سفر شروع ہوگیا۔ دھیرے دھیرے دن کی روشنی قرب و جوار کو نمایاں کرنے لگی۔ شانی نے اپنے اردگرد ٹیلوں، گھاٹیوں اور کھائیوں کے لامتناہی سلسلے دیکھے۔ اسے کئی جگہ جنگلی بیری، پیلو اور کھباڑی کے درخت نظر آئے۔ پہاڑیوں میں نظر آنے والی دراڑیں اور کھوہیں تجسس کو ابھارتی تھیں اور ذہن میں سوال پیدا کرتی تھیں۔ کہار بڑی مشاقی سے ڈولی کو ٹیڑھی میڑھی راہوں پر درمیانی رفتار سے اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ دو کہار اور بھی تھے۔ وہ سب سے آخر میں آ رہے تھے۔ انہیں پہلے کہاروں کے تھکنے کے بعد ڈیوٹی سنبھالنی تھی۔ کھیا دراج اور بلاول احمد ڈولی کے پہلو میں چل رہے تھے اور کبھی کبھی شانی سے بات بھی کر لیتے تھے۔ سب انسپکٹر انوار اور اس کے پانچ ماتحت سادہ کپڑوں میں اس قافلے کے ہمراہ تھے۔ ان لوگوں کے پاس جدید اسلحہ اور واکی ٹاکی موجود تھے۔ پروگرام کے مطابق ان لوگوں کو ایک خاص حد تک پہنچ کر واپس آ جانا تھا۔

شانی کا ذہن خیالات کے تانے بانے میں الجھا تھا۔ رستم سے دوبارہ ملنے کا خیال ایک دم اس کی دھڑکنوں کو زیر و زبر کر دیتا تھا۔ وہ پچھلے چند دنوں میں سینکڑوں مرتبہ سوچ چکی تھی کہ رستم کس کیفیت اور کس حال میں ہوگا۔ وہ اس سے کس طرح بات کرے گا۔ اس کا رویہ کیسا ہوگا؟ وہ اپنا مدعا کیسے اس تک پہنچائے گی اور اگر رستم نے انکار کیا تو کس لہجے میں کن الفاظ میں اصرار کرے گی۔ اصرار کر بھی سکے گی یا نہیں؟ اس انداز میں سوچتے ہوئے کسی وقت عجیب سا خوف بھی اس کے سینے میں لہریں لینے لگتا تھا، اخبارات میں جو خبریں آ رہی تھیں اور لوگ جس طرح کی باتیں کر رہے تھے، ان سے یوں لگتا تھا کہ رستم شدید ہیجانی کیفیت کا شکار ہو چکا ہے۔ مہتم بستی چھوڑنے کے بعد ایک جنون کی سی کیفیت نے اسے اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ وہ بڑی تیزی سے تبدیل ہوا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مہتم بستی کے قریب ڈیک نالے کے کنارے اس نے جو خونی واردات کی تھی وہ اس کی اس ہیجانی بلکہ جنونی کیفیت کی طرف

اشارہ کرتی تھی۔ اکٹھے چار افراد کے قتل نے ہر طرف تہلکہ مچا دیا تھا۔ زیادہ سنسنی خیز بات یہ تھی کہ ان چار مقتولوں میں سے تین پولیس والے تھے۔

رستم کے بارے میں سوچتے سوچتے شانی کے ذہن میں تینوں مغویان یعنی تاؤ حشام، اس کے بیٹے راجو اور ان کے نوکر کا خیال آنے لگا۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہیں، زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ تاؤ حشام نے اپنی حویلی میں جو کچھ شانی کے ساتھ کیا تھا وہ آتشیں مینخوں کی طرح شانی کے ذہن میں گڑا ہوا تھا۔ اسے بے دردی سے مارا پیٹا گیا تھا۔ اس کی توہین کی گئی تھی۔ بعد ازاں تاؤ حشام نے اسے ایک زرخرید نوکرانی کی حیثیت سے اپنے بیٹے کے حوالے کر دیا تھا۔ بیٹے کو علی الاعلان اس حقیقت سے آگاہ کیا تھا کہ یہ نوکرانی اس کے استعمال کی چیز ہے۔ وہ اس نوکرانی سے جو چاہے سلوک کر سکتا ہے۔ تاؤ حشام کے بیٹے کا خیال آتے ہی اس کی شکل شانی کی نگاہوں میں گھومنے لگی اور پھر وہ اندھیری رات بھی اس کی نگاہوں میں گھوم گئی جب ایک بند کمرے میں تاؤ کا نوعمر بیٹا اسے انوکھے روپ میں نظر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس نے بڑی بے باکی سے شانی کو بے لباس ہونے کا حکم دیا تھا۔ شانی شدید غضب کے عالم میں اس پر پل پڑی تھی اور مار مار کر اسے بے حال کر دیا تھا اور پھر شانی کے علم میں تاؤ کے بیٹے کی وہ رومانی کہانی آئی جو ابھی تک شانی کے ذہن میں نقش تھی۔ تاؤ کا نوعمر بیٹا راجو کسی سے پیار کرتا تھا اور یہ کوکب نامی وہی لڑکی تھی جس کے ''محبوب'' کو ڈھونڈنے کے لئے کوتاہ قد ڈولا در بدر پھر رہا تھا۔ ڈولے کا خیال آتے ہی اس کی شباہت اور ساری حرکات و سکنات بھی شانی کی نگاہوں میں گھوم گئیں۔ شانی کو ابھی تک علم نہیں ہو سکا تھا کہ ڈولا کہاں اور کس حال میں ہے۔ راجو اور ڈولے سے شانی کی آخری ملاقات کئی ماہ پہلے تاؤ کی منحوس حویلی میں ہی ہوئی تھی۔ راجو اور کوکب کے رومانی معاملات جاننے کے بعد شانی کے دل میں خواہش جاگی تھی کہ کاش وہ ان دونوں کے لئے کچھ کر سکے لیکن پھر اچانک ہی حالات کی آندھی اسے اُڑا کر کہیں سے کہیں لے گئی۔

اب وہ ایک بار پھر تاؤ حشام اور راجو کے قریب جا رہی تھی۔ وہ ان کے حالات کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

ڈولی کے پہلو میں چلتے ہوئے کھیا دراج کی آواز آئی۔ اس نے شانی کو مخاطب کرتے ہوئے ہولے سے کہا۔ ''میرا کھیال ہے نکڑی! کوئی ڈیرہ آ گیا ہے، یہاں تالاب بھی ہے..... بندوقڑیوں والے بھی نجڑ آ رہے ہیں۔''

شانی نے ڈولی کا پردہ اٹھا کر باہر جھانکا یہ جگہ ٹیلوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ ایک

چٹان ان ٹیلوں میں زیادہ بلندی تک چلی گئی تھی۔ سامنے ہی کسی غار کے آثار بھی دکھائی دیتے تھے۔ بلاول احمد نے خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید اسی جگہ کو اگلا ڈیرہ کہا جاتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' کھیا دراج نے تائید کی۔ ''آپاں (ہم) نے اگلے ڈیرے کی جو نشانیاں سنی ہوئی ہیں وہ یہی ہیں۔''

کچھ دیر بعد ڈولی پتھریلی زمین پر رکھ دی گئی۔ یہ دس گیارہ بجے کا وقت تھا، دھوپ جسم میں چبھ رہی تھی۔ بلاول احمد نے ڈولی کے دونوں طرف کے پردے اٹھائے۔ ہوا کی آمد و رفت سے شانی کو قدرے سکون محسوس ہوا۔ اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ اس مقام پر کافی تعداد میں باوردی پولیس اہلکار موجود تھے۔ دو اونچی جگہوں پر ہیوی مشین گنیں بھی رکھی تھیں۔ ان گنوں پر ترپال ڈال دی گئی تھی۔ غار کے اندر بھی لوگ موجود تھے۔ شاید وہاں کھانا پکایا جا رہا تھا۔

سب انسپکٹر انوار نے شانی کے پاس آ کر کہا۔ ''آئیں جی.....! آپ کھوہ کے اندر چلیں۔ تھوڑی دیر آرام کر لیں اور کھانا شانا کھا لیں، پھر آپ کے سفر کا اگلا مرحلہ شروع ہوگا۔''

شانی باہر نکل آئی۔ بیٹھ بیٹھ کر اس کے پاؤں سن ہو گئے تھے۔ وہ غار میں پہنچی۔ ایک حصے میں چادریں وغیرہ تان کر اسے باقی غار سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ یہاں باقاعدہ گدے بچھے تھے اور تکیے وغیرہ رکھے تھے۔ ''یہاں سے اور کتنا سفر باقی ہے؟'' شانی نے سب انسپکٹر سے دریافت کیا۔

''تقریباً 30 گھنٹے کا سفر ہے..... اور یہ سفر آپ کو پیدل کرنا ہوگا۔ ڈولی بھی دو تین کلومیٹر سے آگے نہیں جا سکتی۔ اب دو طریقے ہیں۔ ایک تو آپ کھانا وغیرہ کھا کر یہاں سے روانہ ہو جائیں اور راستے میں ٹوپانامی جگہ پر رات گزار لیں یا پھر رات یہیں رہیں اور صبح منہ اندھیرے نکل جائیں۔''

''راستہ دکھانے کے لئے کون ہوگا ہمارے ساتھ؟'' شانی نے پوچھا۔

انوار نے ایک کالے بھجنگ کہار کی طرف اشارہ کیا جس کی آنکھیں سرخ انگارے کی طرح تھیں۔ ''اس کا نام جاجی بھا ہے۔ یہ ان راستوں سے اچھی طرح واقف ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اگر جاجی آپ کے ساتھ نہ بھی ہو تو آپ نے آسانی سے منزل پر پہنچ جانا ہے۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''رستم، حسنا اور لالہ وغیرہ کی سی آئی ڈی بڑی تیز ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان ٹیلوں میں داخل ہونے سے پہلے ہی وہ جان گئے ہیں کہ ہم کتنے ہیں، کون کون ہیں اور کس مقصد کے

لئے آرہے ہیں۔ ان لوگوں کے مخبر علاقے میں موجود ہیں اور وائرلیس کے ذریعے ان سے رابطہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ دستی پیغامات بھی پہنچائے جاتے ہیں۔''

''تمہارا مطمبل ہے کہ رستم نکڑی کے بارے میں جان گیا ہوگا؟'' وراج نے پوچھا۔

''سو فیصد۔'' سب انسپکٹر انوار نے جواب دیا۔ ''جب آپ یہاں سے محفوظ علاقے پر پہنچ جائیں گے تو لالہ اور رستم کے ساتھی خود آپ کو لینے پہنچ جائیں گے اور اگر آپ کے سامنے نہ بھی آئیں تو آپ کے اردگرد ضرور موجود رہیں گے۔ پھر جب وہ دیکھیں گے کہ آپ کے سامنے آنے میں کسی طرح کا خطرہ نہیں تو آنکھ مچولی ختم کردیں گے۔''

''لیکن اگر یہاں گھومتے ہوئے کسی اور آوارہ گرد یا آوارہ گردوں سے واسطہ پڑ گیا تو پھر؟'' شانی نے پوچھا۔

''ایسا نہیں ہوگا۔'' انوار نے اعتماد سے کہا۔ ''سمجھو کہ اس سے آگے لالہ اور رستم وغیرہ ہی کی عمل داری ہے۔''

''اوہو تُو کسی طرح کا پھکڑ نہ کر نکڑی! آپاں جو تیرے ساتھ ہیں۔ کسم پیدا کرنے والے کی، تجھے تتی ہوا نہیں لگنے دیں گے۔'' وراج اپنی چوڑی چھاتی کو خود ہی تھپتھپا کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں محبت آمیز خلوص کی متاثر کن چمک تھی۔

مشورے کے بعد شانی نے فیصلہ کیا کہ خواہ مخواہ وقت ضائع نہ کیا جائے اور کھانا کھا کر ابھی روانہ ہوا جائے۔

کھانے میں تازہ روٹی، چاول اور مارخور کا گوشت شامل تھا۔ اس کے علاوہ پولیس کے خانساماں نے بالکل چھوٹے سائز کی مچھلیاں بھی پکائی تھیں۔ انہیں پونگ کہا جاتا تھا۔ شانی نے سب انسپکٹر انوار کے اصرار کے باوجود بس چند لقمے لئے۔ کھانے کے دوران میں اس کی نگاہ اسی بلند چٹان پر پڑی جو یہاں پہنچتے ہی دکھائی دی تھی۔ یہ عجیب وضع چٹان ایک دم نگاہ کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ سب انسپکٹر انوار نے شانی کو چٹان کی طرف متوجہ دیکھا تو بولا۔ ''یہ بڑی خاص چٹان ہے۔ جن دنوں اس ڈیرے پر ڈاکوؤں کا تسلط تھا ایک جوان گوجری نے یہاں سے کود کر اپنی جان دے دی تھی۔ ڈاکو اس چٹان کے ساتھ والے ٹیلے کو مچان کے طور پر بھی استعمال کرتے تھے۔ یہاں سے دوربین کے ذریعے دور دور تک نظر رکھتے تھے۔ بعض اوقات یہاں سے فائرنگ بھی کی جاتی تھی۔''

''اب بھی کوئی چٹان پر موجود تو ہے۔'' بلاول احمد نے کہا۔

''اب یہ پولیس کا بندہ ہے۔ اردگرد نظر رکھے ہوئے ہے۔''

''ڈاکو یہاں سے کب گئے؟'' شانی نے پوچھا۔

''یہ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے۔ تقریباً تین سال پہلے تک وہ یہاں موجود تھے۔ پھر دو تین بار پولیس یہاں تک پہنچی اور اس سے ان لوگوں کی جھڑپ ہوئی۔ آہستہ آہستہ وہ یہ ڈیرہ چھوڑ کر آگے نکل گئے لیکن اب بھی کبھار کوئی ٹولی یہاں وارد ہو جاتی ہے۔ بلکہ چند ماہ پہلے جب رستم بھی فرار ہو کر یہاں پہنچا تو اس نے ایک دن یہاں گزارا۔ سنا ہے کہ یہاں اپنے ایک ساتھی گوہرا کے ساتھ اس کی زوردار لڑائی بھی ہوئی تھی۔'' رستم کے ذکر نے شانی کے جسم میں کرنٹ سا دوڑا دیا۔

انوار اور بلاول وغیرہ باتیں کرتے رہے۔ شانی چور نظروں سے ان درودیوار کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ رستم اَن گنت مرتبہ یہاں آچکا ہوگا۔ بسیرا کر چکا ہوگا۔ اس کے دل کی کیفیت عجیب تھی۔ کسی وقت وہ خود سے ہی الجھنے لگتی تھی، سوچتی تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ لاشعوری طور پر رستم کو دیکھنا چاہتی ہے، اس سے ملنا چاہتی ہے اور اسی لئے یہ دور دراز کا سفر کر رہی ہے۔

لیکن فوراً دوسرا خیال اس پر غالب آجاتا تھا..... نہیں ایسا نہیں ہے..... وہ کمزور لمحہ گزر چکا ہے جب وہ اپنی زندگی کو رستم سے منسوب کرنے پر آمادہ ہوگئی تھی۔ وہ ایک جذباتی لمحے کا ناپائیدار فیصلہ تھا۔ اب وہ اور رستم دو مختلف راستوں کے راہی ہیں۔ دلوں کے موسم اپنی جگہ ہیں اور وہ رہیں گے لیکن باہر کی رُت حتمی جدائی کی رُت ہے۔

کھانے کے فوراً بعد وہ جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ اب اس سے آگے کا سفر انہیں پولیس کے تحفظ کے بغیر کرنا تھا۔ فقط جاجی ان کے ساتھ تھا۔ پھر بھی کچھ دوری تک چند پولیس اہلکار ان کے ساتھ رہے۔ تقریباً دو کلومیٹر تک آنے کے بعد مسلح پولیس اہلکار واپس چلے گئے۔ جاتے جاتے سامان کے دو تھیلے انہوں نے دراج اور بلاول احمد کو تھما دیئے تھے۔ ان میں کھانے کا سامان، پانی کے تین گیلن اور گرم چادریں وغیرہ تھیں۔ ان کے علاوہ تین ٹارچیں، فرسٹ ایڈ اور مٹی کے تیل کی ایک بوتل بھی سامان کا حصہ تھی۔ اب دراج اور بلاول دونوں رائفل سے مسلح تھے۔ دراج کے کمر بند میں ایک چھوٹے دستے کی کلہاڑی بھی لگی ہوئی تھی۔ جاجی کے پاس سرکنڈے کا ننھا سا ایک لمبا چھرا تھا جو دراج نے اسے دیا تھا۔ اس کے علاوہ چمکیلے کوکوں والی ایک نہایت مضبوط لاٹھی بھی اس کے پاس تھی۔ اس لاٹھی کے بالائی سرے پر ایک خم دار چھری فلکس کی جا سکتی تھی۔

شام سے ذرا پہلے وہ اگلے ڈیرے سے تقریباً بارہ کلومیٹر دور آچکے تھے۔ شانی کا تھکن

سے بُرا حال تھا لیکن وہ اپنی حرکات وسکنات سے اس تھکن کو ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی۔

جاجی سب سے آگے جا رہا تھا۔ وہ اپنی لاٹھی کو ٹیکتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ وہ بے حد سخت جان اور کسی حد تک خاموش طبع شخص تھا۔ گاہے بگاہے وہ ماہیے کی طرز پر کچھ گانے بھی لگتا تھا۔ اس کی آواز بھاری لیکن سُر میں تھی۔

ہتھ وچ پالک نے
اوڈھولا نئیں ملدا مرضی دا مالک نے
ساوا گھا ہوسی
روز قیامت عادل آپ خدا ہوسی
ہتھ وچ چھج ماہیا
دیدن سجناں دا، مکے دا حج ماہیا

اچانک جاجی کی آواز تھم گئی۔ وہ خود بھی ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے پیچھے دراج، بلاول اور شانی بھی رک گئے۔ وہ اپنے سے صرف دو تین قدم کے فاصلے پر بڑے دھیان سے کسی شے کو دیکھ رہا تھا۔ کھائی سے گزرنے والے اس راستے پر تھوڑی بہت دھول بھی موجود تھی اس دھول میں شانی کو کچھ بھی نظر نہیں آیا، مگر جاجی کے تاثرات گواہ تھے کہ وہ کچھ دیکھ رہا ہے۔ اس نے اپنی لاٹھی کو بڑی احتیاط سے سونتا، سانس روک کر اسے سُر سے بلند کیا اور پھر بڑی پھرتی اور مہارت سے کسی شے پر دے مارا۔ یہ دیکھ کر شانی کا منہ کھلا رہ گیا کہ ایک تقریباً چار فٹ لمبا سانپ اچھل کر ایک طرف گرا اور دو چار بار اینٹھ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ جاجی کی لگائی ہوئی ضرب نے سانپ کا سر اس بُری طرح کچلا تھا کہ وہ دھڑ سے تقریباً علیحدہ ہو گیا تھا۔ اس کے جسم سے بہنے والا خون مٹی اور ریت میں جذب ہو رہا تھا۔ سانپ کے گہرے بھورے جسم پر زرد دائرے سے نظر آ رہے تھے۔

جاجی نے کہا۔ ''یہ بہت خطرناک سانپ ہے جی۔ اسے کریٹ کہا جاتا ہے لیکن عام دیہاتی اسے سنگ چور کہتے ہیں۔''

''لیکن...... یہ ایک دم آ کہاں سے گیا؟'' بلاول احمد نے حیرت سے کہا۔

''آ نہیں گیا جی...... یہ ہمارے سامنے ہی تو تھا۔ میرا ایک قدم اور اٹھتا تو پاؤں اس پر پڑ جاتا۔ اصل میں یہ خود کو مٹی دھول میں اس طرح چھپاتا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا۔''

جاجی نے لاٹھی کی مدد سے سانپ کو الٹا پلٹا اور بولا ''یہ مادہ ہے جی...... کئی لوگ کہتے ہیں کہ یہ زیادہ زہریلی ہوتی ہے۔''

شانی ایک طرف سمٹ کر کھڑی تھی۔ بلاول اور دراج وغیرہ سانپ کو بغور دیکھ رہے تھے اچانک شانی کی نگاہ مکھیا دراج کے عقب میں گئی۔ خودرو درختوں میں ایک پرچھائیں سی نظر آئی۔ کسی شخص نے الٹی کلہاڑی سے بلاول کے سر پر وار کیا۔ ایک ثانیہ پہلے بلاول کو خطرے کا احساس ہوا اور وہ تیزی سے ایک طرف سمٹا۔ کلہاڑی اس کے سر پر لگنے کی بجائے کندھے پر لگی اور وہ دو چار قدم لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ ایک دوسرے شخص نے دراج کو عقب سے اپنے چھبے میں جکڑنا چاہا لیکن شاید اس نے اس کام کے لئے غلط بندے کا انتخاب کیا تھا۔ بے پناہ جسمانی طاقت والے دراج نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ خود کو گھمایا اور عقب میں موجود فرد کو ایک درخت سے دے مارا۔ درخت کی چوٹ کھانے کے باوجود نو وارد نے دراج کو نہیں چھوڑا تو دراج پشت کے بل پتھریلی زمین پر گر گیا۔ یہ دوسری چوٹ عقب میں موجود حملہ آور کے لئے کارگر ثابت ہوئی۔ اس کی گرفت دراج پر سے ختم ہو گئی۔ دراج نے گھوم کر اسے نیچے لے لیا اور بُری طرح مارنے لگا۔

حملہ آوروں کی تعداد چار تھی۔ انہوں نے گہری رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھیں۔

تیسرے حملہ آور نے رائفل سیدھی کی اور بے دریغ دراج کو نشانہ بنانا چاہا۔ اگر وہ گولی چلا دیتا تو یہ یقیناً دراج کی پشت پر لگتی۔ شانی نے بے تاب ہو کر رائفل پر جھپٹا مارا اور رائفل کا رخ تبدیل ہوا اور اس کے ساتھ ہی فائر بھی ہوا۔ گولی پتھر میں لگی لیکن اس کے ساتھ ہی ایک حملہ آور بھی اپنی ٹانگ پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔

رائفل بردار نے بھنا کر شانی پر چڑھائی کی اس کی ٹانگ شانی کے کولہے پر لگی اور وہ لڑکھڑا کر سنگریزیوں پر گر گئی۔ اس سے پہلے کہ رائفل بردار وحشیانہ انداز میں اس پر جھپٹتا دراج اپنے مقابل سے فارغ ہو کر رائفل بردار کے سامنے آ گیا۔ دراج کے سر کی انتہائی خوفناک ٹکر رائفل بردار کے سینے پر لگی۔ دونوں پتھروں پر گرے۔ دراج نے کسی ماہر پہلوان کی طرح اپنے حریف کو نیچے لیا اور اس کی رائفل کو یوں جکڑا کہ وہ بے کار ہو کر رہ گئی۔ دوسری طرف بلاول بھی اپنے مدمقابل کو سنبھال چکا تھا۔ اس کا مدمقابل ایک جھاڑی کی شاخوں میں پھنس گیا تھا۔ بلاول نے اسے گردن سے دبوچا ہوا تھا اور اس کی ناف میں گھٹنے رسید کر رہا تھا۔ ایک حملہ آور تو زخمی ٹانگ کے سبب پتھریلی زمین پر لوٹ پوٹ تھا مگر چوتھے کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔

چند سیکنڈ بعد شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ نیچے تقریباً چودہ پندرہ فٹ گہری کھائی میں گرا پڑا ہے۔ شاید وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ ایک طرح سے یہ لڑائی دراج اور بلاول احمد جیت چکے

تھے۔مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ قطعی طور پر غیر متوقع تھا۔دوڑتے قدموں کی آوازیں آئی اور اچانک آٹھ کے قریب افراد رائفلوں اور کلہاڑیوں سے مسلح موقع پر پہنچ گئے یہ بھی پہلے حملہ آوروں کے ساتھی دکھائی دیتے تھے۔انہوں نے آتے ہی ہوائی فائر کئے شام کے جھٹپٹے میں شعلے سے لپکے اور ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی۔دو افراد نے اپنی خودکار رائفلیں مکھیا دراج کے سر سے لگا دیں۔دو ہٹے کٹے افراد نے بلاول کو اس کے مدِمقابل کے اوپر سے کھینچ لیا اور ہٹا کر پیچھے لے گئے۔

جس شخص کی پنڈلی زخمی ہوئی تھی اس نے دونوں ہاتھوں سے زخم کو دبا رکھا تھا اور وہیں پر پڑا ہوا تھا۔اس سارے ہنگامے میں جاجی اپنی لاٹھی سمیت بے تعلق ہی کھڑا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اندازہ ہوا کہ نئے آنے والوں کا رویہ شانی دراج وغیرہ کے ساتھ دوستانہ ہے۔اب وہ پہلے افراد کو غصیلی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ان سے سوالات کر رہے تھے۔ان کی دونوں رائفلیں اور ایک کلہاڑی بھی نئے آنے والوں نے اپنے قبضے میں لے لی تھی۔یہ سب افراد بھی شلواروں قمیصوں میں تھے۔داڑھیاں بڑھی ہوئی، چہروں پر دھول۔وہ سب کے سب آتشیں یا تیز دھار ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ان میں سے ایک دراز قد شخص سرکردہ لگتا تھا۔اسے یہ لوگ دلاور کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔دلاور کے اشارے پر دو افراد شانی، دراج اور بلاول کو لے کر کچھ فاصلے پر ایک پتھر کی اوٹ میں چلے گئے۔چند افراد نیچے تاریک کھائی میں اُترے اور زخمی شخص کو اوپر لے آئے۔وہ بے ہوش نظر آتا تھا۔ٹارچوں کی روشنی میں اس کے زخم وغیرہ دیکھے گئے۔کئی افراد آپس میں تلخ کلامی بھی کر رہے تھے۔صورتِ حال الجھی ہوئی نظر آتی تھی۔

دراج نے شانی سے پوچھا۔"نکڑی! تجھے کہیں چوٹ شوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں بس معمولی سی کمر پر لگی ہے لیکن بلاول کو کافی زور سے رائفل لگی ہے۔"

بلاول احمد نے کندھا دباتے ہوئے کہا۔"نہیں کچھ زیادہ نہیں۔" پھر وہ شانی کی طرف دیکھ کر بولا۔"اگر آپ رائفل پر جھپٹا نہ مارتیں تو سردار کو گولی لگ جانی تھی۔"

مکھیا دراج نے ستائشی نظروں سے شانی کو دیکھا۔شاید وہ کچھ کہتا لیکن اس سے پہلے شانی بول اٹھی۔"ہم کہاں پھنس گئے ہیں دراج! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"مجھ کو لگتا ہے کہ ہم پھنس گئے تھے لیکن اب نکل آئے ہیں۔" دراج بولا۔

"کیا مطلب؟"

"اندازا ہو رہا ہے کہ یہ جو دوجی پارٹی پہنچی ہے رستم اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے

ہے۔"

"اور پہلے کون تھے؟" بلاول احمد نے پوچھا۔

"ہوں گے کوئی اٹھائی گیرے۔اتنا بڑا الاقا ہے۔کئی طرح کے چور لپھنگے یہاں پھرتے ہوں گے۔"

بلاول احمد نے قریب کھڑے رائفل بردار کو آواز دے کر پوچھا۔"بھرا جی! یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟"

"دومنٹ جی......ابھی سب کچھ پتا چل جاتا ہے۔"

اور واقعی دومنٹ میں سب کچھ کلیئر ہو گیا۔یہ جرائم پیشہ افراد کی ٹولی تھی (یعنی چار افراد کی ٹولی) پولیس سے چھپتی چھپاتی اور وارداتیں کرتی اس طرف آنکلی تھی۔بعد میں آنے والے افراد کا تعلق اس ویرانے کے اصل "مالکوں" یعنی لالہ اور اس کے گینگ سے تھا۔ان لوگوں کو بذریعہ وائرلیس سیٹ اس امر کی اطلاع تھی کہ اگلے ڈیرے سے کچھ لوگ وڈے ڈیرے کی طرف آ رہے ہیں اور ان کی حیثیت رستم سیال کے خاص مہمانوں کی ہے۔پچھلے آدھ گھنٹے سے گینگ کے بندے شانی دراج وغیرہ کے آس پاس موجود تھے۔

آوارہ گردوں کو پکڑ کر ان کی مشکیں کس دی گئیں۔کھائی میں گرنے والا شخص بھی اب ہوش میں آ چکا تھا۔اس کے سر کندھوں پر گہری چوٹیں آئی تھیں۔اس کی کمر سے گولیوں کی بیلٹ کے علاوہ ایک تھیلا بھی بندھا تھا۔اس تھیلے میں پانچ چھ شکار شدہ پرندے تھے۔ٹارچوں کی روشنی میں دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ پرندہ سسی ہے۔انہیں غلیل سے مارا گیا تھا۔ایک دوسرے شخص کے پاس بہت سی فلم ایکٹرسوں کی عریاں تصویریں تھیں۔اس کے علاوہ ایک واک مین بھی اس سے برآمد ہوا۔

دلاور نامی شخص نے اپنے بارہ بندوں میں سے چھ کو ان بندھے ہوئے افراد کے پاس چھوڑا اور خود شانی کے سامنے آ کر ازحد احترام سے بولا۔"بی بی صاحبہ! ہمارے لئے کیا حکم ہے؟"

"میں سمجھی نہیں۔" شانی نے چہرے پر چادر کا نقاب درست کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہمیں لالہ اور رستم صاحب نے اس طرف بھیجا تھا۔ان کو ڈر تھا کہ کہیں آپ راستہ نہ بھولیں یا پھر رستے میں کسی طرح کا مسئلہ نہ بنے۔جیسا کہ اب بن بھی گیا تھا۔"

"خیر ان شہدوں کو تو ہم سنبھال ہی چکے تھے۔" بلاول احمد نے کہا۔

"بالکل جی! یہ آپ کی ہمت ہے۔اس کی داد دینی پڑتی ہے لیکن پھر بھی ہمیں خوشی ہے

کہ ہم موقع پر پہنچے اور آپ کا ساتھ دیا۔''

''اوئے ساتھ تم نے چھنکنا دیا۔'' دراج مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔ ''ساتھ تو تم نے ان کا دیا جن کو آپاں کے نیچے سے نکال کر ان کی جندڑی بچائی۔''

دلاور کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

اسے چپ دیکھ کر دراج نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور دلاور کا کندھا تھپتھپا کر بولا۔ ''نہیں بھئی نہیں۔ میں مجاک کر رہا تھا۔ تم بالکل موکے پر پہنچے ہو۔''

دلاور مسکرانے لگا اور اس کے ساتھی بھی۔

''ان لوگوں کا اب کیا کرنا ہے؟'' بلاول احمد نے راہزنوں کے بارے میں پوچھا۔

''یہ ہم پر چھوڑ دیں جی۔۔۔'' دلاور ادب سے بولا۔ ''ایسے کئی ٹٹوؤں سے ہمارا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ان کی طبیعت اچھی طرح صاف کرنے کے بعد ان کو چھوڑ دیں گے جہلم سائیڈ پر۔''

''جس کو گولی لگی ہے اس کا کیا ہوگا؟'' شانی نے فکرمندی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں جی۔۔۔! گولی ماس پھاڑ کر نکل گئی ہے۔ خون بند کر دیا ہے ہم نے۔'' دلاور نے کہا۔ شانی سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ بے حد مؤدب ہو جاتا تھا اور بات صرف دلاور ہی کی نہیں تھی باقی مسلح افراد بھی گردنیں جھکائے نگاہیں زمین میں گاڑھے کھڑے تھے۔ شاید وہ شانی کی سمت دیکھنا بھی ادب کے خلاف سمجھتے تھے۔

''لالہ اور رستم یہاں سے کتنے فاصلے پر ہوں گے؟'' شانی نے پوچھا۔

''ابھی بہت فاصلہ ہے بی بی صاحبہ۔۔۔ ہمیں ٹوپا نام کی جگہ پر رات گزارنا ہوگی۔ صبح سویرے پھر چلنا پڑے گا۔ ہم نے تو بڑا مشکل شارٹ کٹ لگایا ہے اس لئے جلدی پہنچے ہیں۔''

دلاور کے ساتھی باندھے گئے افراد کی جیبوں کی تلاشی لے رہے تھے اور ہر کام کی چیز نکال کر اپنی جیبوں میں منتقل کر رہے تھے۔

دلاور نے انہیں کچھ ضروری ہدایات دیں اور شانی وغیرہ کے ساتھ آگے روانہ ہوگیا۔

انہوں نے رات تقریباً دس بجے تک سفر کیا۔ ٹارچوں کی روشنی میں ان ہیبت ناک گھاٹیوں کا سفر بے حد دشوار اور سنسنی خیز تھا۔ دراج اور حاجی شانی کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ بلال احمد عقب میں تھا اس نے اپنا مضروب کندھا مسلسل ایک ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔ جب وہ ٹوپا نامی جگہ پر پہنچے تو تھکن سے بے حال تھے۔ یہاں دو افراد پہلے سے موجود تھے

انہوں نے ایک چٹانی سائبان کے نیچے آگ جلا کر چائے بنا رکھی تھی۔ چائے کے ساتھ کھانے کے لئے جو شے میسر تھی وہ بھنے ہوئے چنے اور گڑ تھا۔ شانی نے تھوڑے سے چنے لئے اور پانی پی کر ایک دری پر لیٹ گئی۔ کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ حشرات الارض، وسوسوں اور خطروں سے بھرے ہوئے اس تاریک ویرانے میں بھی شانی کو نہ جانے کب نیند آ گئی۔ سونے سے پہلے بس اسے اتنا احساس ہوا تھا کہ بلاول احمد اپنی عقابی آنکھوں کے ساتھ اور دراج اپنی چوڑی چھاتی کے ساتھ اس کے آس پاس موجود ہیں۔

اگلے روز صبح سویرے ان کا سفر پھر شروع ہوا۔ گھاٹیاں دشوار اور راستے مشکل ہوتے جا رہے تھے۔ دلاور کے سارے کے سارے ساتھی شانی کے سامنے بے حد مؤدب تھے۔ اونچی آواز میں بولتے تک نہیں تھے۔ جیسے وہ سارے ادنیٰ غلام ہوں اور ایک ذی وقار شہزادی ان کے جلو میں سفر کر رہی ہو۔ پتا نہیں کہ کس نے انہیں اس قدر مؤدب رہنے کا کہا تھا یا پھر وہ اپنے طور پر ہی شانی کو اتنا پروٹوکول دے رہے تھے۔ ان نشیب و فراز اور بھول بھلیوں کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا کہ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں ڈاکوؤں کے تعاقب میں یہاں آنے سے کیوں کترا رہی ہیں۔

رات کے تقریباً نو بجے کا وقت تھا جب وہ لوگ ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گئے۔ دلاور کے ساتھیوں نے پہلے شانی اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ معذرت کی پھر ان کی آنکھوں پر سیاہ پٹیاں باندھ دیں۔ تاہم شانی کو اس پابندی سے آزاد رکھا گیا (راستے میں بھی ایک مقام پر پٹیاں باندھی گئی تھیں۔ اس وقت بھی شانی کے ساتھ رعایت برتی گئی تھی) جن کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئیں انہیں ایک ایک فرد نے سہارا دے دیا۔ چند پُر پیچ راستوں کے سفر کے بعد وہ لوگ کھلی جگہ پر آ گئے، شانی کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھ گئی کہ ڈاکوؤں کا ڈیرہ آنے والا ہے۔ اب کچھ ہی دیر بعد وہ اور رستم چار ماہ کے طویل عرصے کے بعد آمنے سامنے ہوں گے۔ وہ کیسے اس کی نگاہوں سے نگاہ ملائے گی، کیسے اس کا سامنا کرے گی۔ وہ تو بے وفا ہے۔ وہ تو اسے شدید ترین خطرات میں تنہا چھوڑنے والی ہے۔۔۔ جب رستم بستی میں وہ ہر طرف سے خطروں میں گھرا ہوا تھا، پولیس اسے تر لقمہ بنانا چاہ رہی تھی، وہ ایک طرف ہوگئی تھی۔ اب جب وہ مضبوط تھا اور پولیس کو تگنی کا ناچ نچا رہا تھا۔ وہ پولیس ہی کی خواہش پر اپنی کچھ باتیں منوانے کے لئے اس کے پاس چلی آئی تھی۔ وہ کیوں کر رہی ہے ایسا؟ اسے کیا حق پہنچتا ہے ایسا کرنے کا؟ وہ سوچتی رہی اور اس کے قدم لرزتے رہے۔

☆======☆======☆

رستم اپنے کمرے سے باہر ایک ہموار چٹان پر بیٹھا تھا۔ اس کے لمبے ملائم بال جنوبی ہوا میں ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ اس کے شفاف دانتوں میں گھاس کا ایک تنکا تھا۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔ دو دن پہلے اسے ''سیٹ'' پر نظام کے ذریعے اطلاع ملی تھی کہ شانی مہتم بستی کے سردار دراج اور عارف کمبوہ کے قریبی ساتھی بلاول کے ساتھ جیپ میں سوار پوٹھوہاری علاقے میں داخل ہوئی ہے۔ یہ لوگ کسی خاص مشن پر نظر آتے ہیں۔

بعد میں کوئی بارہ گھنٹے بعد نظام نے دوسری مرتبہ وائرلیس رابطہ قائم کیا۔ اس بار نظام نے پورے یقین کے ساتھ بتایا کہ شانی بی بی اور ان کے تین ساتھی اگلے ڈیرے کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔ وہاں وہ تھوڑی دیر قیام کریں گے۔ بعد ازاں وہ پولیس کی حفاظت کے بغیر وڈے ڈیرے کی طرف روانہ ہوں گے۔ رستم کے دل و دماغ میں ہلچل مچ گئی تھی، بی بی کیوں کر رہی تھیں ایسا؟ وہ کیوں اس طرح اپنے آپ کو شدید خطروں میں ڈال رہی تھیں۔ کہیں ان سے یہ سب کچھ وہ خبیث ڈپٹی ریاض ہٹلر تو نہیں کروا رہا تھا۔ اگر وہ کروا رہا تھا تو اس کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟ اَن گنت سوالات رستم کے دماغ میں ابھرے تھے۔

اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے بی بی جی سے نہیں ملنا ہے۔ کسی صورت نہیں۔ اس نے اس وقت دلاور کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ اگلے ڈیرے کی سمت نکل جائے۔ وہ بی بی اور ان کے ساتھیوں کو آگے آنے سے روک دے۔ ان پر واضح کر دے کہ رستم ڈیرے پر موجود نہیں ہے اور نہ ہی وہ ان سے ملنا چاہتا ہے۔

دلاور حکم کا بندہ تھا۔ فوراً دس بارہ بندے لے کر روانہ ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد رستم تذبذب کا شکار رہا تھا۔ اس نے لالہ اور حسنا سے بھی مشورہ کیا۔ خود اپنے آپ میں بھی بُری طرح الجھتا رہا۔ یہ بات واضح تھی کہ بی بی، چودھری حشام اور اس کے بیٹے کی رہائی کے لئے [illegible] نے آ رہی ہیں۔ دلاور وغیرہ کے روانہ ہونے کے ایک گھنٹے بعد رستم نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا۔ اسے یوں لگا کہ بی بی جی کو اپنی طرف آنے سے روک کر وہ ان کی توہین کرنے کا مرتکب ہو گا اور یہ اسے کسی طور، کسی حال میں گوارا نہیں تھا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا اس کا عشق اسے ایسا کرنے کی اجازت ہی نہیں دے سکتا تھا۔ وہ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر دلاور کے پیچھے گیا اور کوئی پانچ میل دور اسے جا لیا۔ اس نے دلاور سے پہلی ہدایت واپس لے کر نئی ہدایات دیں اور ان ہدایات کے مطابق اسے شانی بی بی کو احترام اور حفاظت کے ساتھ ڈیرے تک لانا تھا۔

اب ان واقعات کو دو دن گزر چکے تھے۔ رستم اور لالہ کے اندازے کے مطابق یہ قافلہ

اب کسی بھی وقت وڈے ڈیرے پر پہنچنے والا تھا۔ رستم کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ دھڑکنیں زیر و زبر تھیں۔ وہ بی بی کا سامنا کیسے کرے گا؟ ان سے کیوں کر بات کر سکے گا؟ وہ کس لہجے میں اسے مخاطب کرے گی۔ اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ تھا۔ کسی وقت اس کا دل چاہتا وہ واقعی کسی طرف نکل جائے۔ بی بی کو اپنی صورت ہی نہ دکھائے۔ کسی وقت اس کے دل میں آتی کہ وہ اردگرد کی ساری پھولدار جھاڑیوں کے پھول اکٹھے کروائے اور انہیں بی بی کی راہوں میں نچھاور کر دے۔

لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکا اور پوٹھوہار کے پار سے آنے والا قافلہ ڈیرے پر پہنچ گیا......

مشعلوں کی روشنی میں وہ دیکھ سکتا تھا۔ گہری نیلی چادر میں لپٹی ہوئی بی بی ان میں موجود تھیں۔ ان کا حسین چہرہ نقاب میں چھپا تھا۔ فقط آنکھیں اور پیشانی کا تھوڑا سا حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ اب وہ مزید بیٹھا نہیں رہ سکا۔ اٹھ کھڑا ہوا۔ قافلے کی آمد کا شور سن کر نادیہ بھی کمرے سے نکل آئی۔ اس نے عجیب نظروں سے رستم کو دیکھا۔ رستم اس کے انداز کو نظرانداز کرتا ہوا تیزی سے ڈھلوان پر اُترا اور بی بی کے روبرو پہنچ گیا۔

''سلام بی بی۔'' اس نے ہاتھ ماتھے تک لے جا کر کہا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔

بی بی کے نقاب میں ہونٹوں کے مقام پر جنبش پیدا ہوئی۔ وہ اس کے سلام کا جواب دے رہی تھی۔

کھیا دراج تیزی سے آگے آیا اور بڑے جوش سے رستم کے ساتھ معانقہ کیا۔ ''دیکھ لے سیال! آ کھر آیاں نے تجھ کو ڈھونڈ ہی لیا۔ وہ کیا کہتے ہیں ڈھونڈنے سے رب بھی ملتا ہے۔''

بلاول احمد نے بھی رستم سے معانقہ کیا۔ اس کے بعد لالہ اور حسنا نے۔ سب سے ملنے کے بعد تقریباً پندرہ منٹ بعد شانی، دراج، رستم، لالہ اور بلاول چھجے کے نیچے بڑے کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے دیہاتی چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ شانی کا چہرہ بدستور نقاب کی اوٹ میں تھا فقط آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ چائے کے دوران میں تقریباً خاموشی ہی رہی۔ کہیں پاس سے ہی رکھوالی کے کتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ رستم نے فقط ایک بار دھیان سے شانی کی طرف دیکھا اس کے بعد نہیں دیکھ سکا تھا۔ ایسا لگتا تھا شانی کے سامنے ایک طرح کا رعب حسن اس پر حاوی ہو جاتا تھا۔ جسم میں لرزش اور زبان میں لڑکھڑاہٹ نمودار ہوتی تھی۔

چائے کے بعد بلاول اور حسنا باہر چلے گئے۔ اب صرف شانی، رستم، دراج اور لالہ کمرے میں تھے۔ شانی نے گہری سانس لیتے ہوئے رستم کی طرف دیکھا۔ ''رستم! چوہدری

حشام اور راجو یہاں ڈیرے پر ہیں؟''

''جی بی بی .....'' وہ معمول کی طرح بولا۔

''کیوں کیا تم نے ایسا؟ کیا ضرورت پڑ گئی تھی اس کی؟'' شانی نے بے ساختہ پوچھا۔

وہ کچھ دیر چپ رہا پھر ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔''بی بی جی! چوہدری نے میری تو بین کی آپ کی تو ہین کی۔ یہ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔''

''تو ہین کا بدلہ لینے کا یہ کون سا طریقہ تھا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح کرنے سے، ذلت اور خون خرابے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ تمہیں کیا پتا کہ وہاں ہمارے دیہات میں کیا قیامت مچی ہوئی ہے۔''

''مجھے افسوس ہے بی بی! لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔''

''وہ لوگ زخمی تو نہیں؟'' شانی نے ذرا تو قف سے پوچھا۔

رستم نے نفی میں جواب دیا۔ لالہ نے بھی سر ہلا کر تائید کی۔

شانی کے بالوں کی ایک لٹ اس کی نیلی اوڑھنی سے نکل کر اس کے کندھے پر جھولنے لگی تھی۔ رستم کی نظریں بے اختیار اس لٹ پر مرکوز ہو گئیں۔ اسے ایک بھولی بسری رات یاد آ گئی تھی..... شانی کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔''کیا ہم ان لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں؟''

یہ سوال لالہ سے پوچھا گیا تھا۔ لالہ نے سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھا۔ رستم نے کہا ''جیسے آپ کی مرضی لیکن آپ سب کافی تھکے ہوئے ہیں۔ اگر چاہیں تو صبح.....''

''اونہیں بھائیا۔'' دراج نے اٹھتے ہوئے کہا۔''میں اب بھی پانچ چھ میل کی دوڑ لگا سکتا ہوں اور ہماری ٹکڑی بھی کوئی ملوکڑی نہیں ہے۔ بڑا جگرا ہے اس کے اندر دیکھو چائے پی کر ایک دم پھریش ہو گئی ہے۔''

رستم اور لالہ ان دونوں کو لے کر کھوندر یعنی سرنگ نمبر دو کی طرف آ گئے۔ حشام، اس کے بیٹے اور نوکر کو یہیں پر رکھا گیا تھا۔ راستے میں کئی افراد نے جھک کر تعظیم پیش کی۔ یہ تعظیم رستم، لالہ اور مہمانوں کے لئے تھی، جلد ہی وہ چاروں پانچوں سرنگ کے اندر اس کوٹھڑی نما مقام پر موجود تھے جہاں چوہدری حشام اور راجو کو رکھا گیا تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں تاؤ حشام فرش پر لیٹا دکھائی دیا۔ وہ سو رہا تھا۔ نوعمر راجو جسے حویلی میں چھوٹے مالک کہا جاتا تھا کوٹھڑی کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور نیل کٹر سے پاؤں کے ناخن کاٹ رہا تھا۔

رستم کو معلوم تھا کہ باپ بیٹے کو دیکھ کر شانی اور دراج وغیرہ کو شدید جھٹکا لگے گا۔ وجہ

ظاہر تھی۔ دونوں زنانہ لباس میں تھے۔ ان کے ہاتھ تو نہیں باندھے گئے تھے تاہم ان کے سامنے پانی ربڑ کے دو تین جوتوں میں رکھا تھا۔ روٹی کے ٹکڑے بھی پتھریلے فرش پر پھینک دیئے گئے تھے۔ سالن ان ٹکڑوں کے اوپر ہی لیپ کر دیا جاتا تھا۔

رستم نے دیکھا، بی بی کی آنکھوں میں شدید دکھ کے آثار نظر آئے۔''یہ..... یہ کیا ہے رستم.....؟''

''یہ لوگ جو کچھ کرتے تھے بی بی جی! یہ اسی کا جواب ہے۔''

''لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔''

''معاف کیجئے بی بی! یہ اسی لائق ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بدتر سلوک ہو سکتا ہے ان کے ساتھ۔'' لالہ نے کہا۔

''ہمارے دماغوں کے ایسے ہی فیصلوں نے اس دنیا کو یہاں رہنے والوں پر تنگ کر رکھا ہے اس راستے پر چلا جائے تو پھر اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی بھائی صاحب۔'' شانی نے روانی سے کہا۔

اس سے پہلے کہ لالہ جواب میں کچھ کہتا رستم نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔ یہ اس امر کا اشارہ تھا کہ وہ چپ رہے۔ بی بی کی آنکھوں میں جلالی رنگ نظر آیا۔ رنگ والی کی چھوٹی چوہدرائی کا رنگ۔ رستم کو لگا اس رنگ نے بی بی کی آنکھوں کو اور بھی حسین کر دیا ہے۔

بی بی نے رستم کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''نہیں رستم! یہ ٹھیک نہیں فوراً ختم کرو اسے..... پلیز ختم کرو.....'' اس کے ساتھ ہی اس نے بے قراری سے اپنے مرمریں ہاتھ کو دائیں بائیں جنبش دی۔ وہ جیسے سرتاپا کانپ گئی تھی۔

''ٹھیک..... ٹھیک ہے بی بی۔'' رستم نے سر جھکا لیا۔

وہ سرنگ کے ایک نیم تاریک گوشے میں کھڑے تھے۔ یہاں سے وہ تو حشام اور لڑکے کو دیکھ سکتے تھے لیکن ان کی نظر شانی اور دراج وغیرہ پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ دراج نے رستم سے پوچھا۔''ان دونوں بدبختوں کے ساتھ ایک مالا جم کو بھی تو کابو کر کے لائے تھے تم لوگ؟ وہ کہاں ہے؟''

''وہ دوسری کوٹھڑی میں ہے۔'' رستم کی بجائے لالہ فرید نے جواب دیا۔''حرامی دن رات واویلا کرتا تھا۔ ان دونوں کو بھی نہیں سونے دیتا تھا۔''

شانی فوراً ہی پلٹ آئی۔ رستم کو اس کی فقط آنکھیں نظر آتی تھیں اور یہ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ موجودہ صورتِ حال سے بالکل خوش نہیں ہے۔

رستم نے جو کچھ کیا تھا وہ اس سے زیادہ کرنا چاہتا تھا۔ حشام اور اس کے کارندوں نے اس کے سامنے بی بی کی توہین کی تھی، سینکڑوں لوگوں کے سامنے انہیں ننگی گالیاں دی تھیں۔ انہیں گھسیٹا تھا اور لاٹھیاں برسائی تھیں۔ اس وقت وہ خود زخموں سے چُور تھا لیکن بی بی کی اس حالت کو دیکھ کر وہ ایک شدید جنونی کیفیت کا شکار ہوا تھا۔ نہ جانے کہاں سے آئی تھی اس میں اتنی توانائی کہ وہ نار پوریوں سے بھڑ گیا تھا..... دن گزرتے رہے تھے لیکن وہ کٹھولی میلے کے مناظر کو اور بی بی کی توہین کو بھولا نہیں تھا۔ اس کے سینے میں ہمہ وقت ایک آگ روشن رہتی تھی اور آخر کار وہ بی بی کی توہین اور آفندی کی موت کی پاداش میں تاؤ حشام اور اس کے بیٹے کو اٹھا لایا تھا۔

اب بی بی کچھ اور طرح کی سوچ لے کر یہاں پہنچ گئی تھیں۔ یقینی بات تھی کہ وہ حشام اور اس کے بیٹے اور نوکر کی رہائی کی بات کریں گی۔

بی بی جو کہتی تھیں وہ رستم کے لئے حکم ہو جاتا تھا اور ابھی اسے یہ حکم ملا تھا کہ حشام اور اس کے بیٹے کو بہتر حالت میں رکھا جائے۔ اب وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا لیکن اس سے پہلے وہ تاؤ اور اس کے بیٹے کو آخری بار دلیل ضرور کرنا چاہتا تھا خاص طور سے تاؤ کو۔ بی بی، وراج اور بلاول احمد چھجے کے آرام دہ کمروں کی طرف چلے۔ فرید ان کے ساتھ تھا۔ وہ بی بی کو اپنی بیوی مہناز سے ملانے جا رہا تھا۔ اب بی بی کو صبح تک وہیں رہنا تھا..... رستم اپنے کمرے کی طرف گیا۔ رستم کو دیکھ کر نادیہ نے جلدی سے چادر اپنے سر پر درست کی۔ اس کا تو بہ شکن جسم چادر کے اندر سے بھی کچھ نہ کچھ ہلچل دکھاتا رہتا تھا۔ رستم نے اسے ایک موٹی اوڑھنی لا کر دی تھی، مگر نادیہ اسے استعمال نہیں کر رہی تھی اور اس کے پاس معقول وجہ بھی تھی۔ ان پٹھوہاری ٹیلوں کا موسم دن بدن گرم ہوتا جا رہا تھا۔

نادیہ نے اشتیاق سے پوچھا۔ ''شانی باجی کیسی ہیں؟''

''بالکل ٹھیک ہے لیکن جب تک میں نہ کہو تم ان کے سامنے نہیں آؤ گی۔'' رستم نے تحکم سے کہا۔

''میری یہ مجال کہاں۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔

''تم اپنے کمرے میں ہی رہو۔''

''ٹھیک ہے لیکن کھانا؟ میرا مطلب ہے تم ان کے ساتھ ہی کھاؤ گے نا.....؟''

''مجھے ابھی بھوک نہیں۔'' رستم نے رکھائی سے کہا اور سرنگ کی طرف چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اس کوٹھڑی میں تھا جہاں حشام اور اس کا بیٹا بند تھے۔ رستم کے ہاتھ

میں شہتوت کی تقریباً چار فٹ لمبی بڑی مضبوط اور لچکیلی چھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت کروٹیں لیتی تھی۔ اسے دیکھ کر نوعمر راجو جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حشام کروٹ کے بل سویا ہوا تھا۔ رستم نے بے دریغ حشام کی پشت پر چھڑی سے ضرب لگائی۔ شائیں کی تیز آواز کے ساتھ ہی گوشت اور چھڑی کے ٹکرانے کی آواز آئی۔ حشام ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ سائن کی گلابی شلوار اور سلک کی پھولوں والی چست قمیص کے ساتھ وہ حد درجہ مضحکہ خیز نظر آتا تھا۔ رہی سہی کسر کلائیوں کی چوڑیوں اور ناک میں جھولتی ہوئی پیتل کی نتھ نے پوری کر دی تھی۔

اٹھتے کے ساتھ ہی تاؤ حشام بوکھلا کر کھڑا ہوا اور اس نے ایک ٹانگ پر کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ بھاری جسم کے سبب پہلی کوشش میں ناکام ہوا لیکن دوسری کوشش میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں وغیرہ پر گہری چوٹوں کے نشان تھے۔ غالباً ایک دن پہلے اس کی ناک سے رِسنے والا خون اس کی گھنی مونچھوں کے آس پاس جم کر سیاہ ہو گیا تھا۔

رستم نے زہرناک نظروں سے اسے دیکھا۔ ''اوئے کھوتے دے کھر! تجھے ایک ٹانگ پر کھڑا ہونے کے لئے کس نے کہا ہے؟ ایک ٹانگ پر اس وقت کھڑا ہونا ہے جب میں کہوں۔''

چوہدری حشام جلدی سے دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ راجو اس سے بس چند قدم کی دوری پر تھا۔ درمیان میں چند اپنی سلاخیں تھیں۔ یہ ایک ہی کوٹھڑی کے دو حصے تھے۔ باپ بیٹا ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے لیکن مدد نہیں کر سکتے تھے۔

حشام سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر زخم کا پرانا نشان لالٹین کی روشنی میں کچھ اور بھی سیاہ نظر آتا تھا۔ یہ فرعون صفت چوہدری تھا۔ اس کی فرعونیت کا یہ عالم تھا کہ اس درجے ذلیل و لاچار ہونے کے باوجود بھی اس کی گردن میں تھوڑا سا بل موجود تھا۔ آنکھوں میں خاموش اکڑ تھی۔ جیسے یہ آنکھیں کہہ رہی ہوں۔ ٹھیک ہے اب میں تمہارے بس میں ہوں۔ کر لو جو کرنا ہے لیکن اگر میری باری آئی تو پھر میں بھی دل کی حسرت نکالوں گا۔ کوئی رعایت نہیں کروں گا۔

رستم نے بے پرواہی سے حشام کی نتھلی میں انگلی گھسائی اور اسے کھینچتا ہوا ایک کونے میں لے آیا۔ جب رستم نے نتھ کی مدد سے چوہدری حشام کو کھینچا تو تکلیف سے بچنے کے لئے اس کے ہاتھوں نے بے ساختہ رستم کا ہاتھ تھام لیا۔ جس طرح بلند و بالا اونٹ کو نکیل کی مدد سے زمین پر بٹھا دیا جاتا ہے رستم نے بھی نتھ کی مدد سے چوہدری حشام کا سر زمین سے لگا دیا۔

وہ اب کسی چوپائے کے سے انداز میں فرش پر تھا۔ زنانہ لباس میں اس کا یہ پوز بے حد مضحکہ خیز نظر آتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی چوپایہ جوہڑ سے پانی پینے کی کوشش کر رہا ہے۔ رستم کی انگلی بدستور اس کی نتھ میں تھی۔

''بول شانی بی بی تیری بیٹی جیسی ہے۔'' رستم نے کہا۔

''شانی بی بی میری بیٹی جیسی ہے۔'' حشام کی میکانکی آواز ابھری۔

''شانی بی بی تیری بہن جیسی ہے۔''

''شانی بی بی میری بہن جیسی ہے۔''

''شانی بی بی تیری ماں جیسی ہے۔''

''شانی بی بی میری ماں جیسی ہے۔''

''بول میں نے اپنی ماں بہن پر ہاتھ اٹھایا۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔''

''میں نے اپنی ماں بہن پر ہاتھ اٹھایا، مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔''

رستم نے اس کی پیٹھ پر لات رسید کی، وہ ڈگمگاتا ہوا پانی سے بھرے جوتے کے اوپر گرا۔

راجو کوٹھڑی کے دوسرے حصے میں پتھریلی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھا ہوا تھا۔

رستم نے اسے پکارا۔ ''اوئے حشام کے انڈے، ادھر دیکھ میری طرف۔''

راجو نے جیسے بدک کر سر اٹھایا۔

رستم نے کہا۔ ''آج سے تم دونوں کے ساتھ تھوڑی سی رعایت کر رہا ہوں اور پتا ہے تمہیں کہ اس رعایت کی وجہ کیا ہے۔ اس رعایت کی وجہ وہی بی بی جی ہیں جنہیں تم نے اپنے ناپاک ہاتھوں سے رسوا کیا تھا۔ بھرے میلے میں جن کی بے عزتی کی تھی۔ آج وہ تمہارے لئے سفارش بنی ہوئی ہیں۔ تمہارے لئے پیدل چل چل کر پاؤں میں چھالے ڈالے ہوئے ہیں انہوں نے۔ تمہارے جیسے کتے، ان کے پاؤں چاٹنے کے لائق بھی تو نہیں ہیں۔''

رستم نے بے پناہ نفرت سے چوہدری حشام کی طرف تھوکا اور اسے قہر ناک نظروں سے دیکھتا باہر نکل گیا۔

پوٹھوہار کے ٹیلوں کو اب رات کے اندھیرے نے مکمل طور پر ڈھانپ لیا تھا۔ سیاہ آسمان پر تاروں کی برات تھی۔ شمال سے جنوب کی طرف ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ رستم کے لئے

یہ خیال بڑا ہی راحت افزا تھا کہ بی بی اس ڈیرے میں موجود ہے۔ اس فضا میں سانس لے رہی ہے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن بی بی کے قدم اس ویرانے میں پڑیں گے۔ اس کا دل چاہا وقت یہاں تھم جائے۔ زمین و آسمان کے قلابے میں جو شے بھی ہے، یہیں پر رک جائے۔ دنیا کے سمندر میں یہ ڈیرہ ایک جزیرے کی طرح ہو۔ کوئی اس جزیرے پر آسکے اور نہ یہاں سے جاسکے۔ آہ..... کتنا خوش کن تصور تھا یہ کہ بی بی یہاں موجود ہے..... لیکن اس تصور کو کب تک قائم رہنا ہے، اس کے بارے میں کوئی کیا کہہ سکتا تھا۔ اسے ریتلی زمین پر قدموں کے چند نشان نظر آئے۔ اس نے ٹارچ نکالی اور دھیان سے نشانوں کو دیکھنے لگا۔ یہ مہمانوں کے قدموں کے نشان تھے۔ ایک چوڑا چکلا پاؤں دراج کا تھا۔ ایک لمبا مردانہ جوتی کا نشان بلاول کی طرف اشارہ کرتا تھا اور ایک درمیانی سائز کی زنانہ جوتی کا نشان بی بی کا تھا۔ وہ ان نشانوں کو دھیان سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ یہ بی بی کے پاؤں کے نشان تھے۔ اسے یہ نشان دیکھنا بھی اچھا لگ رہا تھا۔

ایک آواز نے اسے چونکایا۔ ''کہاں جارہے ہو رستم؟'' یہ حسنا گجراتی تھا۔

''کہیں نہیں۔ بس ذرا ہوا خوری کو دل چاہ رہا تھا۔''

''ہونٹ گیلے کرو گے؟'' اس نے جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔

رستم چپ رہا۔ حسنے نے جیب سے ایک کوارٹر بوتل نکالی اور ڈھکنا کھول کر رستم کی طرف بڑھا دی۔ رستم نے دائیں بائیں دیکھا پھر بدبودار تیزابی محلول کے تین چار گھونٹ حلق سے اُتار لئے۔ حسنا بولا۔ ''رستم بھائی۔ ایک بات کہوں، بُرا تو نہیں مانو گے؟''

''ہاں کہو۔''

''میں سوچتا تھا اپنا رستم بھائی جس لڑکی پر فدا ہوا ہے، پتا نہیں وہ کیسی ہوگی۔ آج اس سوال کا جواب اور اس جیسے دوسرے سارے سوالوں کا جواب مل گیا۔''

''کیا جواب ملا؟''

''رستم بھائی تم سچے ہو۔ وہ لاکھوں میں ایک ہے۔''

''تم کیسے کہہ سکتے ہو۔ وہ تو پردے میں تھیں۔''

''میں نے ان کی آنکھیں دیکھی ہیں، پیشانی دیکھی ہے۔ انہیں چلتے پھرتے دیکھا ہے لیکن جو کچھ دیکھا ہے بڑی پاک نظروں سے دیکھا ہے۔ مجھے اس وقت گجراتی کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔ بلکہ یہ دو شعر ہیں۔ حسنے نے یہ دو شعر پڑھے اور پھر رستم کو اس کا مطلب بتاتے ہوئے بولا۔ ''وہ خوبصورت ہے اور ایسی خوبصورت ہے کہ اس کے سامنے جھکنے اور سر جھکانے

کو دل چاہتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ اسے دیکھا جائے اور اس سے محبت نہ کی جائے۔''

رستم نے تاریکی میں ہاتھ بڑھایا اور حسنے کے ہاتھ سے بوتل لے کر دو تلخ گھونٹ مزید لئے۔ اس کے سینے میں عجیب سا درد جاگا ہوا تھا۔ حسنے نے پوچھا۔ ''رستم بھائی کبھی اپنے دل کی بات کہی اس سے؟''

رستم نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں یار جی بنا کہے کا پیار بھی کوئی پیار ہوتا ہے۔''

''یہی تو پیار ہوتا ہے حسنے۔ ایسا پیار کسی سے کچھ مانگتا نہیں۔ یہ اپنا صلہ خود ہوتا ہے۔ اس میں جدائی اور ملاپ کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ سمجھو ان دونوں لفظوں کا مطلب ایک ہی ہوتا ہے۔''

''تمہاری باتیں میری کھوپڑی میں تو نہیں آ رہیں..... لیکن ایک بات کی پریشانی بھی ہے مجھے؟''

''کس بات کی؟''

''چھوٹی بھرجائی (نادیہ) کی۔ وہ بیوی کے طور پر تمہارے ساتھ رہ رہی ہے۔ جب شانی بی بی کو پتا چلے گا تو انہیں تو بڑا شدید جھٹکا لگے گا۔''

رستم نے گہری سانس لی۔ ''ہاں یہ تو ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بلکہ ایک طرح سے تو شاید یہ اچھا ہی ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''میری طرف سے ان کا دل پورا پورا کھٹا ہو جائے گا۔ اگر ان کے دل پر کوئی بوجھ بھی ہے تو وہ نہیں رہے گا۔''

شاید حسنا کچھ مزید بات چیت کرتا لیکن اسی دوران میں سرنگ نمبر دو کی طرف کسی نے اونچی آواز میں کیسٹ پلیئر لگا دیا۔ آواز گونجنے لگی۔ نور جہاں نغمہ سرا تھی۔

''صدا ہوں اپنے پیار کی، جہاں سے بے نیاز ہوں
کسی سے جو نہ کھل سکا، وہ زندگی کا راز ہوں''

رستم نے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ مہمانوں کی آمد کے بعد کوئی اونچی آواز میں ٹیپ نہیں لگائے گا۔ کہیں ہوائی فائرنگ نہیں ہوگی اور نہ ہی گالم گلوچ کیا جائے گا۔ حسنا تیزی سے اٹھ کر چلا گیا تاکہ کیسٹ پلیئر بند کرا سکے۔

رستم وہیں بیٹھا رہا۔ تاروں کی روشنی میں مخروطی ٹیلوں کی چوٹیاں چمک رہی تھیں.....

درخت جھومتے تھے، تارے بھی جیسے پلکیں جھپک جھپک کر آنے والے مہمان کو دیکھنا چاہتے تھے۔ یوں لگتا تھا، آج اس خرابے کی قسمت جاگی ہوئی ہے لیکن ایسا کب تک رہنا تھا۔ شاید کل یا پھر برسوں آنے والوں کو واپس چلے جانا تھا۔ اس کے بعد جدائی کی پھر وہی تاریک شب تھی۔ تاریک اور لامتناہی۔ یہ رات شروع ہوئے برسوں بیت گئے تھے۔ یہ کسی طور ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ کبھی کبھی اس میں صبح کاذب کے سے آثار نظر آتے تھے لیکن یہ صرف بصری واہمے ہوتے تھے۔ معدوم ہو جاتے تھے۔ ایسا ہی ایک مرحلہ مہتم بستی میں قیام کے دوران میں آیا تھا، علاقے کے ہزاروں مہتم سردار دراج کی قیادت میں بی بی سے رستم کی شادی کرانے پر تل گئے تھے۔ وہ سرتاپا کانپ گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ بی بی اس صورتِ حال کو قبول کریں گی۔ وہ بے حد ڈر گیا تھا۔ اسے خوف محسوس ہوا کہ کہیں بی بی یہ نہ سمجھیں کہ وہ بھی اس منصوبے میں شریک ہے۔ اس نے بی بی کے سامنے پہنچ کر اپنی پوزیشن صاف کی تھی اور پھر اگلی صبح وہ سب کچھ ہو گیا جس کا کسی نے تصور نہیں کیا تھا۔ پوری مہتم آبادی پیر قدرت اللہ کی طرف الٹ گئی اور شانی بی بی کی بدترین مخالفت پر اُتر آئی۔ اس کے بعد گزرنے والا ہر لمحہ رستم کو بی بی سے دور کرتا گیا اور اب وہ مہتم سے قریب ہو کر بھی ہزاروں لاکھوں میل کے فاصلے پر تھی اور رستم گہرائی سے سوچتا تھا تو اسے خیال آتا تھا کہ یہ فاصلے ٹھیک ہی ہیں..... وہ اب پھانسی کے تختے کا مسافر تھا..... یا پھر کسی دھواں دھار پولیس مقابلے میں خودکار رائفل کا ایک برسٹ اس کا مقدر تھا۔ زندگی کے ان بچے کھچے دنوں کے لئے وہ بی بی کی زندگی کو تہس نہس کرتا تو یہ کسی طور مناسب نہیں تھا۔ بلکہ بدترین خودغرضی کے زُمرے میں آتا تھا۔

اچانک اسے اپنے عقب میں نرم قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی اور پھر ایک ہاتھ دھیرے سے اس کے کندھے پر آ گیا۔ رستم کے جسم میں برقی لہریں دوڑ گئیں۔ ایک لمحے کے لئے..... صرف ایک لمحے کے لئے اس کے تصور میں یہ خیال ابھرا کہ یہ بی بی ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ خیال کا تاج محل دھڑام سے نیچے آ گرا۔ یہ نادیہ تھی۔ ''کیا بات ہے رستم۔ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟''

''بس ویسے ہی تمہیں کہا تھا، اپنے کمرے میں رہنا۔''

''شانی اور بھابی مہناز وغیرہ وہاں گھوم پھر رہے ہیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ میرے والے کمرے میں آ جائیں گے۔ میں یہاں چلی آئی۔'' وہ رستم کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

رستم پتھر پر بیٹھا تھا۔ وہ اس کے برابر بیٹھنے کے بجائے نیچے پاؤں کی طرف بیٹھ گئی۔

اکثر وہ ایسے ہی کرتی تھی۔ اس کے پارہ صفت بدن میں کوئی ایسی بات تھی کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے یہ جسم دیکھنے والوں کو پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رستم نے اسے پابند کر رکھا تھا کہ وہ گھر میں اور گھر سے باہر ایک بڑی چادر اوڑھ کر رکھے گی۔ پھر بھی ہر وقت نادیہ کے حوالے سے ایک اندیشہ سا رستم کے ذہن میں رہتا تھا۔ کچھ بھی تھا، یہ ایک ویرانہ تھا۔ یہ معاشرے سے بھاگے ہوئے جرائم پیشہ لوگوں کا ٹھکانہ تھا۔ ان میں سے اکثر ایسے تھے جو مدت سے عورت کو بس دور ہی سے دیکھ رہے تھے۔ ایسے لوگوں کے اندر فطری طور پر عورت کے لئے ایک مہیب خلا موجود ہوتا ہے۔ انہیں صرف عورت کی ضرورت ہوتی ہے۔ شکل و صورت، عمر، صحت، آمادگی باقی کسی شے کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ایسے واقعات اکثر سننے میں آتے ہیں کہ کوئی ضعیف العمر عورت یا کوئی کمسن فاتر العقل بچی کسی کی وحشت کا نشانہ بن جاتی ہے۔ وہ تو ایک چلتی پھرتی قیامت تھی۔ گناہ کی دعوت جیسے اس کے سراپا پر جلی حروف میں لکھی تھی۔ کسی وقت رستم کے ذہن میں یہ مہیب اندیشہ جاگتا تھا کہ رات کے اندھیرے میں ''کسی کی طلب'' کے نکیلے دانت اسے چیر پھاڑ کر چلے جائیں گے۔ وہ سوچتا تھا کاش وہ اس کے ساتھ یہاں نہ پہنچتی۔ وہ ایک ایسی چھچھوندر کی طرح تھی جسے نگلا جا سکتا تھا نہ اُگلا۔

نادیہ کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔ ''رستم! اگر تم چاہتے ہو کہ میں شانی جی کو یہاں نظر نہ آؤں تو مجھے کہیں اور بھیج دو۔ میں دو چار دن سرنگ میں کاٹ لوں گی یا جہاں تم کہو گے۔''

''اچھا سوچتا ہوں اس بارے میں۔'' رستم نے کہا۔

وہ ہاتھ کی پوڑی کو گھماتے ہوئے بولی۔ ''رستم! میں تمہارے اور شانی جی کے درمیان کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ہوں۔ نہ آئندہ کبھی مجھے رکاوٹ سمجھنا۔ میں تو بس.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔ شاید وہ وہی بادشاہ اور کنیز والی بات دہرانے لگی تھی۔ رستم کی ڈانٹ یاد کر کے ارادہ بدل دیا۔

رستم نے نادیہ سے پوچھا۔ ''بی بی کہاں ہیں اب؟''

''باجی مہناز کے ساتھ ہیں۔ لالہ بھی وہیں ہیں۔ ابھی ان کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ شاید شانی جی نے تمہارے بارے میں پوچھا تھا۔ لالہ نے بتایا تھا کہ تم باہر نکلے ہوئے ہو۔''

رستم خاموش رہا۔ نادیہ نے کہا۔ ''شانی جی اور ان کے ساتھی چوہدری حشام کی سفارش

کے لئے آئے ہیں کیا؟''

''شاید۔''

''تو پھر تم انہیں چھوڑ دو گے؟''

''شاید۔ چھوڑنا پڑے گا۔'' دل میں اس نے کہا، چوہدری کو رہا کرنا ایک طرف اگر بی بی جی خود اسے بھی باندھ کر اپنے ساتھ لے جانا چاہیں تو وہ انکار نہیں کر سکتا لیکن وہ جانتا تھا کہ بی بی ایسا کہیں گی نہیں۔ وہ کبھی اسے یہ مشورہ نہیں دے گی کہ وہ خود کو پولیس کے حوالے کرے۔ اب حوالگی کے مرحلے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔

نادیہ نے کہا۔ ''بہتر تو وہی ہوگا جو تم کرو گے لیکن کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ حسنا یا مراد وغیرہ اس بات پر اعتراض کریں۔''

''کس بات پر؟''

''یہی کہ تم نے چوہدری اور اس کے بیٹے کو کچھ لئے دیئے بغیر چھوڑ دیا۔''

''جب اعتراض کریں گے تو پھر دیکھا جائے گا لیکن تم میری ایک بات پورے دھیان سے سن لو اور اسے یاد بھی رکھنا ہے۔'' نادیہ پوری طرح متوجہ ہوگئی۔ رستم نے کہا۔ ''بی بی سے اگر تمہاری بات ہو تو انہیں کسی طرح کی الجھن میں نہیں ڈالنا۔ انہیں یہی بتانا ہے کہ ہم میاں بیوی کی طرح رہ رہے ہیں۔ سمجھ رہی ہو نا میری بات۔'' نادیہ نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ رستم نے نادیہ کو اس حوالے سے چند مزید ہدایات دیں اور اسے تسلی ہوگئی۔ نادیہ کے علاوہ اسے کسی طرف سے اندیشہ نہیں تھا۔ کیونکہ نادیہ اور لالہ کے علاوہ اصل صورتِ حال کوئی نہیں جانتا تھا۔ سب کو یہی معلوم تھا کہ رستم اور نادیہ حقیقی میاں بیوی ہیں۔

وہ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رستم اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا جب نادیہ ایک دم کراہ اٹھی۔ پھر اس کے ہونٹوں سے ایک تیز دہشت ناک چیخ نکلی۔ اس نے تڑپ کر اپنا پیٹ پکڑ لیا۔

''ہائے میں مری۔'' وہ چلائی اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی ریشمی قمیص ناف کے قریب سے دبوچ لی۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ اس نے مٹھی میں کوئی شے پکڑی ہوئی ہے۔ پیچھے ہٹنے کی کوشش میں وہ لڑکھڑائی اور پتھروں پر گر گئی۔ اس دوران میں رستم اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ نادیہ کے لباس میں کوئی رینگنے والی شے گھس گئی ہے۔ وہ گری ہوئی نادیہ کے پاس پہنچا، وہ مسلسل ''ہائے میں مری'' کی تکرار کر رہی تھی۔ رستم نے ایک جھٹکے سے اس کی ریشمی قمیص پھاڑ دی۔ مدھم روشنی میں اس کا ہموار پیٹ سنگ مرمر کی طرح چمکنے لگا۔ پیٹ کے وسط

سے خون بہہ رہا تھا۔ یہ قریباً آٹھ انچ لمبا پوٹھوہاری چھپکلا تھا۔ اس نے اپنے پنجے اور دانت نادیہ کی نازک جلد میں گاڑ رکھے تھے۔ رستم نے چھپکلے کو نادیہ کے جسم سے جدا کر کے دور ایک پتھر سے پٹخ دیا۔

نادیہ کے چلانے کی آواز دور تک گئی تھی۔ چھپے اور حجروں کی طرف سے کئی افراد تیزی سے موقع کی سمت بڑھے۔ نادیہ نے اٹھنے کی کوشش کی تو لڑکھڑا گئی۔ اس کے پاؤں میں سخت موچ آئی تھی۔

☆======☆======☆

کھانے کے بعد شانی اور مہناز لیٹ گئے۔ ننھا ٹیپو شانی کے ساتھ بڑی جلدی بے تکلف ہو گیا تھا اور اس کے پاس لیٹنا چاہتا تھا لیکن مہناز نے اسے سمجھایا کہ چاچی بہت دور سے سفر کر کے آئی ہے۔ تھکی ہوئی ہے۔ اسے سونے دو۔

یوں تو شانی سونے کے لئے لیٹی تھی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رستم اس کے اردگرد کہیں موجود تھا۔ اسی فضا میں سانس لے رہا تھا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا؟ کیا کر رہا تھا؟ ایک دو بار اس کا دل چاہا کہ مہناز سے رستم کے بارے میں کچھ پوچھے لیکن جب بھی اس نے پوچھنا چاہا، ایک بے نام سی جھجک آڑے آ گئی جس میں حیا کی آمیزش بھی تھی۔

رستم مہتم بستی سے بہت آزردہ خاطر ہو کر گیا تھا۔ وقتِ رخصت شانی اس سے کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔ تسلی کے دو لفظ بھی نہیں بول سکی تھی۔ کیا اب وہ اس سے کوئی بات کرے گا۔ اپنے باہمی تعلق کے حوالے سے کچھ کرے گا اسے؟ لیکن کیا کہے؟ کہنے کے لئے تھا ہی کیا؟

اس کے دل نے کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنے دل و دماغ کا بوجھ ہلکا کر لو۔ ایک دفعہ اپنی طرف سے رستم کا گلہ دور کر دو۔ اسے کہہ دو کہ تم سب کچھ اس پر چھوڑتی ہو۔ اپنی اور اس کی زندگی کے بارے میں وہ جو فیصلہ بھی کرے گا تم اسے قبول کرو گی۔''

فوراً ہی رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی بھاری کپڑوں اور رسم و رواج کے گہنوں میں جکڑی اس کے سامنے آ گئی۔ معترض لہجے میں بولی۔ ''لیکن اگر اس نے تمہیں اپنے ساتھ رہنے کو کہا تو پھر کیا کرو گی؟''

''وہ ایسا نہیں کرے گا۔'' دل سے آواز آئی۔ ''اگر اس نے ایسا کرنا ہوتا تو مہتم بستی سے چپ چاپ کیوں نکل آتا۔''

''لیکن وہ تو سرتاپا تمہاری محبت میں غرق ہے۔ تمہیں پانا اس کے لئے دنیا کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ اگر یہ خواہش تمہارے سامنے آ گئی تو پھر؟''

''ایسا نہیں ہو گا..... اور اگر ہوا..... تو میں انکار کر دوں گی۔ میں اسے کہہ دوں گی..... میں اسے کہہ دوں گی، میری زندگی رنگ والی، جوہر آباد، میانہ کے ہزاروں لوگوں کے ساتھ منسوب ہو چکی ہے۔ ان کے بے پایاں دکھوں اور صعوبتوں کے نام ہو چکی ہے۔ میں اب اپنے لئے نہیں، ان کے لئے جینا چاہ رہی ہوں۔''

شانی کا چوہدرانی والا روپ اس کے سامنے آیا۔ اس روپ نے کہا۔ ''غلطی کر رہی ہو۔ محبت کے دریا بڑے تند اور پُرشور ہوتے ہیں۔ انہیں پار کرنے والے کہیں کے کہیں جا نکلتے ہیں۔ پاؤں پھسلتے دیر نہیں لگتی۔ تم بھی کہنے کچھ جاؤ گی لیکن کیا پتا کیا کہہ جاؤ۔''

اچانک شانی کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ایک خوفزدہ نسوانی چیخ سناٹے میں گونجی تھی۔ پھر یہ نسوانی چیخ ہیجانی انداز میں تکرار کرنے لگی۔ ''ہائے میں مری..... ہائے میں مری۔'' کچھ فاصلے پر لیٹی ہوئی مہناز بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ باہر کو لپکی تو شانی بھی چپل پہن کر اس کے عقب میں گئی۔ باہر تاروں کی مدھم روشنی میں ٹیلے دور تک نظر آتے تھے۔ کچھ دوسرے افراد بھی دوڑتے ہوئے آواز کی سمت جا رہے تھے۔ وہاں اونچے نیچے سرخی مائل پتھروں کے قریب کوئی مسئلہ ہو گیا تھا۔

اتنے میں ایک شخص چھجے کی طرف لوٹا تو مہناز نے پوچھا۔ ''رزاق کیا ہوا ہے وہاں؟''

وہ احترام سے بولا۔ ''بھرجائی! وہاں رستم جی کی وہٹی کو کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔''

''رستم جی کی وہٹی'' کے الفاظ شانی کی سماعت پر بم کا خوفناک دھماکا ثابت ہوئے۔ وہ حیرت سے نوجوان کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''رستم جی اور ان کی وہٹی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ بھرجائی جی کی چادر میں شاید لالی والی چھپکلی گھس گئی تھی۔ ان کے پاؤں میں بھی موچ آ گئی ہے۔''

پھر شانی نے دیکھا چند مشعلوں کی روشنی میں رستم کمروں کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کی گود میں ایک لڑکی تھی۔ وہ قریب پہنچا تو شانی کو لڑکی کی صورت نظر آئی وہ دنگ رہ گئی۔ یہ نادیہ تھی۔ معروف فلم ایکٹریس نادیہ۔ شانی کے ساتھ نادیہ کی آخری ملاقات راولپنڈی میں ہی ہوئی تھی۔ پھر وہ کبھی ایک دوسرے سے مل نہیں سکی تھیں اور آج ایک عرصے بعد نادیہ، رستم کی ''وہٹی'' کی حیثیت سے اس کے سامنے تھی۔ وہ ششدر دیکھتی رہ گئی۔ رستم اس کی طرف دیکھے بغیر کمرے میں چلا گیا۔ کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ شانی سکتہ زدہ کھڑی تھی۔ مہناز اور لالہ تفصیل معلوم کرنے کے لئے رستم کے کمرے کی طرف چلے گئے۔ شانی گم صم سی واپس آ گئی۔

وہ بستر پر نیم دراز ہوئی تو ایک دم بہت سا نمکین پانی پتا نہیں کہاں سے اس کے حلق میں جمع ہو گیا۔ اُن گنت سوچوں نے تیزی سے اسے گھیر لیا۔ اس کا مطلب تھا..... نادیہ نے بالآخر رستم کو حاصل کر ہی لیا تھا..... چلو اچھا ہوا، بہت اچھا ہوا۔ وہ خود بھی تو ایسا ہی چاہتی تھی۔ بار بار رستم سے اصرار بھی کر چکی تھی۔ بہت مناسب بات تھی لیکن..... لیکن یہ سینے میں تپش سی کیوں محسوس ہو رہی تھی۔ یہ سانس گھٹ سا کیوں رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی اور لیٹنے کے بجائے کمرے کے اندر ہی ٹہلنے لگی۔ ننگی کمرے کے اندر لالٹین کی لَو بہت نیچی تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ نادیہ اور رستم کو یہاں اکٹھے دیکھے گی۔

نادیہ کیسے پہنچی تھی یہاں؟ یا رستم اسے خود لے کر آیا تھا؟ یا پھر دونوں اکٹھے آئے تھے۔

اتنے میں لالہ کے گھر چھوٹے موٹے کام کرنے والی ادھیڑ عمر عورت حنیفاں اندر داخل ہوئی۔ وہ خاصی لمبی تڑنگی اور مضبوط تھی۔ بڑی تیزی سے قدم اٹھاتی تھی۔

شانی نے پوچھا۔ ''یہ رستم کی بیوی رستم کے ساتھ یہاں آئی تھی؟''

''آہو بی بی جی! بڑا پیار کرتی ہے رستم سے۔ نہیں تو کون اس طرح کسی کے لئے جنگل بیابان میں اپنی جندڑی رولتا ہے۔ بال بچہ بھی کوئی نہیں ہے اس کا۔ پھر بھی رستم کی باندی ہے۔''

''اس کی شکل کچھ جانی پہچانی سی لگتی ہے۔'' شانی نے جان بوجھ کر کہا۔

''شاید آپ نے کہیں اخبار میں اس کی تصویر دیکھی ہوگی۔ کہتے ہیں کہ یہ فلموں اور ٹیلی ویژن میں کام شام کرتی تھی۔ ڈیرے کے سارے کے سارے بندے اس کو جانتے ہیں جی۔ اسی لئے رستم اس سے سخت پردہ کرواتا ہے۔''

شانی کچھ دیر خاموشی رہی پھر ہولے سے بولی۔ ''رستم بھی! اسے بہت چاہتا ہوگا؟''

حنیفاں نے ذرا چونک کر شانی کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''بہن جی، میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ رستم بس اس کے ساتھ گزارہ کر رہا ہے۔ حالانکہ وہ رج کے سوہنی ہے۔ خدمت گار بھی ہے اور اس کی آواز بھی بڑی سوہنی ہے جی۔ ایک دن کمرے میں اکیلی بیٹھی گا رہی تھی۔ میں اور مہناز بی بی چپ کر کے سنتی رہیں..... اور حیران رہ گئیں۔ بڑے گن ہیں اس میں لیکن رستم اس سے بہت کم سیدھے منہ بات کرتا ہے۔''

اسی دوران میں لالہ کی بیوی مہناز بھی آ گئی۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر بتایا۔ ''وچاری نادیہ کے ساتھ بُری ہوئی ہے۔ سینے سے ذرا نیچے اسے دو جگہ کاٹا ہے کرلے (چھپکلے) نے۔ رستم پاس نہ ہوتا تو پتا نہیں کیا ہوتا اس کے ساتھ۔ پاؤں بھی بُری طرح مڑ گیا

ہے وچاری کا۔'' پھر ذرا توقف کر کے اس نے شانی سے پوچھا۔ ''تم نے پتا کیا ہے اس کا؟''

شانی چند لمحے سوچتی رہی پھر لمبی سانس لے کر بولی۔ ''ہاں میرا خیال ہے مجھے جانا چاہئے۔''

مہناز بولی۔ ''چلو آؤ۔ میں تمہیں چھوڑ آتی ہوں۔''

''نہیں کوئی بات نہیں۔ میں خود چلی جاتی ہوں۔'' شانی اٹھتے ہوئے بولی۔

چھجے کے نیچے یہ تیسرا کمرہ زیادہ دور نہیں تھا۔ ان کمروں کی چھت قدرتی سائبان کی شکل میں تھی۔ پتھروں کے ذریعے اس وسیع سائبان کے نیچے تین کمروں اور ایک طویل برآمدے کی دیواریں بنا دی گئی تھیں۔ پلاستر اور رنگ سے انہیں بنا سنوار دیا گیا تھا۔ ان کمروں کو دیکھ کر یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ پوٹھوہار کے اس دور دراز ویرانے میں واقع ہیں۔ حیرت انگیز طور پر یہاں بہت سی شہری آسائشیں موجود تھیں۔ شانی کو پنکھے اور بلب وغیرہ بھی نظر آئے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں جنریٹرز وغیرہ موجود ہیں اور بوقتِ ضرورت چلائے جا سکتے ہیں۔

چھجے کے ساتھ ہی دو سرنگوں کے دہانے تھے۔ ان میں سے ایک سرنگ تو وہی تھی جس میں کچھ دیر پہلے شانی اور دراج وغیرہ نے چوہدری حشام اور راجو کی ہیئت کذائی دیکھی تھی۔ دوسری سرنگ میں مشعلوں اور لالٹینوں وغیرہ کی روشنی زیادہ تھی۔ اس روشنی سے اور دہانے پر نظر آنے والی آمد و رفت سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کافی لوگ قیام پذیر ہیں۔

شانی اوڑھنی درست کرتی ہوئی رستم اور نادیہ کے کمرے تک پہنچی۔ اب وہ خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔ پھر بھی پتا نہیں کیا تھا۔ اسے اپنی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس کے سینے کے اندر کچھ ٹوٹ رہا تھا..... اور بکھر رہا تھا۔ اس نے ادھ کھلے دروازے پر دستک دی۔

''کون؟'' اندر سے رستم کی آواز آئی۔

''میں اندر آ سکتی ہوں؟'' شانی نے پوچھا۔

رستم لپک کر دروازے پر آیا اور دروازہ پورا کھول دیا۔ ''آئیں بی بی..... آئیں۔''

شانی کمرے میں داخل ہوئی۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں کے ساتھ تین چار مخملی گاؤ تکیے رکھے تھے۔ ایک قدِ آدم الماری، لکڑی کا ایک ریک، ایک چھوٹا آئینہ اور اس قسم کا کچھ دیگر سامان کمرے کی آرائش کا حصہ تھا۔ دو کھونٹیوں پر رستم اور نادیہ کے کپڑے ساتھ ساتھ لٹکے دیکھ کر شانی کے سینے میں درد کی ایک لہر سی ابھر کر ڈوب گئی۔ نادیہ ایک گدیلے پر لیٹی تھی۔ اس نے اپنا منہ سرچادر میں دھانپ رکھا تھا۔ بوسیدہ پتلون قمیص والا ایک نوجوان اس کے پاؤں پر پٹی باندھ کر آخری گرہ لگا رہا تھا۔ اس نے شانی کو سلام کیا اور پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ ''رستم

بھائی! چھوٹی بھرجائی کو آرام کی ضرورت ہے۔ آرام کرے گی تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ انفیکشن کا انجکشن میں نے لگا دیا ہے۔ اگر پاؤں میں درد ہو تو ایک پین کلر گولی کھلا دیں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔''

''مہربانی ناصر۔''

''آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں۔'' نوجوان نے کہا اور سلام کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

نادیہ نے شانی کو دیکھا اور پہچان لیا تھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شانی جلدی سے آگے بڑھی اور اسے اٹھنے سے روک دیا۔ دونوں بیٹھے بیٹھے ہی ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔ نادیہ سسکوں سے رونے لگی۔ شانی کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

''آپ کتنے عرصے بعد ملی ہیں شانی۔ اس دوران میں کیا کچھ ہو گیا۔'' نادیہ نے کہا۔

شانی نے اسے گلے لگا کر تھپکا۔ ''میرے گمان میں بھی نہیں تھا نادیہ کہ یہاں تجھے دیکھوں گی اور اس طرح دیکھوں گی۔''

دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئیں۔ شانی زانو تہہ کر کے بیٹھ گئی۔ رستم نے جلدی سے اس کے پیچھے گاؤ تکیہ رکھ دیا۔ لالٹین کی روشنی میں رستم کا طویل سایہ ایک ساتھ نادیہ اور شانی پر پڑ رہا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا۔ نادیہ نے کہا۔ ''مجھے آپ کے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ آپ سے ملنے کے لئے تڑپ رہی تھی لیکن رستم کا کہنا تھا کہ ابھی دوسرے لوگ مل رہے ہیں۔ میں صبح تک انتظار کر لوں۔''

شانی نے ایک ہاتھ سے نادیہ کے بال سنوارے اور کسی انجانے جذبے کے تحت اس کا ماتھا چوم لیا۔ ''نادیہ، تمہیں یہاں دیکھ کر دکھ بھی ہوا ہے اور خوشی بھی۔ دکھ اس بات کا ہے کہ یہ جگہ تم جیسی لڑکی کے رہنے کے لئے نہیں ہے اور خوشی اس بات کی ہے کہ کچھ بھی ہے رستم تمہارے ساتھ ہے۔ شادی مبارک ہو نادیہ..... اور رستم تمہیں بھی۔'' شانی نے رستم کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

نادیہ نے ایک عجیب نگاہ رستم پر ڈالی اور پھر سر جھکا لیا۔ ایک بے نام سناٹا کمرے میں ٹھہر گیا۔

''میری بہن کو کوئی تکلیف تو نہیں دے رہے ہو؟'' شانی نے رستم سے پوچھا۔

''اس سے پوچھ لیں بی بی۔''

''دیکھو اگر اسے کچھ دکھ ہوا تو سمجھو مجھے ہوا۔''

رستم سر جھکائے باہر چلا گیا۔ شانی اور نادیہ باتیں کرنے لگیں۔ وہی باتیں جو دو

سہیلیاں بہت عرصے بعد مل کر کرتی ہیں۔ پرانی باتیں دہرائی گئیں۔ زوار اور شیری کا ذکر ہوا۔ شانی نے اپنے پیچیدہ حالات سے نادیہ کو آگاہ کیا۔ جواباً نادیہ نے بھی ایسا کیا..... اپنی اور رستم کی شادی کے بارے میں کچھ زیادہ تفصیل نادیہ نے نہیں بتائی۔ اسی دوران میں مہناز گرما گرم چائے لے کر آ گئی۔ تینوں گھل مل کر باتیں کرتی رہیں۔ باہر تاریکی میں رکھوالی کے کتے شور مچاتے رہے اور چنانوں پر موجود رات کے نگراں پہرے دار مخصوص آواز سے بلند کرتے رہے۔

صبح ناشتے کے بعد شانی پھر نادیہ سے ملنا چاہتی تھی۔ اس سے دیر تک باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن جب وہ نادیہ اور رستم کے کمرے کی طرف جانے کا ارادہ کر رہی تھی، مہناز نے کہا۔ ''کہاں جا رہی ہو شانی؟''

''نادیہ کی طرف۔ اب تو وہ جاگ گئی ہو گی؟''

''وہ قریباً ساری رات ہی جاگتی رہی ہے۔ اسے پاؤں میں بڑا درد ہو رہا تھا۔ شاید ہڈی میں چوٹ آئی ہے۔ رستم اسے صبح سویرے دو نمبر کھوندر (سرنگ) میں لے گیا تھا۔ یہاں ڈاکٹر ناصر کا چھوٹا سا ہسپتال بھی ہے نا۔ میرا خیال ہے اب کچھ دن نادیہ اور رستم وہیں پر رہیں گے۔''

شانی کو جھٹکا سا لگا۔ نہ جانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ رستم جان بوجھ کر نادیہ کو یہاں سے لے گیا ہے۔ تکلیف کا بس بہانہ ہی ہے۔ اصل میں وہ نہیں چاہتا کہ نادیہ اور شانی تادیر بات چیت کریں۔ رات کو بھی اس نے محسوس کیا تھا کہ شاید رستم نے ہی مہناز کو چائے دے کر کمرے میں بھیجا تھا..... اور یوں نادیہ اور شانی کی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوا تھا۔ وہ ایک دکھ بھری سانس لے کر رہ گئی۔ اگر رستم ایسا کر رہا تھا تو کیوں۔

دوپہر کو کھیا دراج، بلاول احمد اور شانی میں طویل صلاح مشورہ ہوا۔ وہ زیادہ دیر تک یہاں رک نہیں سکتے تھے۔ اب چوہدری اور اس کے بیٹے کی رہائی کے لئے حتمی بات چیت کی ضرورت تھی۔ دوپہر کے کھانے کے فوراً بعد یہ بات چیت ہوئی۔ اس گفتگو میں صرف چار افراد موجود تھے۔ شانی، رستم، کھیا دراج اور لالہ۔ کمرہ بالکل بند تھا۔

شانی نے رستم سے باقاعدہ درخواست کی کہ وہ چوہدری، اس کے بیٹے اور نوکر کو رہا کر دے۔ رستم نے ایک نظر شانی پر ڈالی اور گھمبیر لہجے میں کہا۔ ''بی بی! میں انہیں رہا کرنے کے لئے یہاں نہیں لایا۔ میری دلی خواہش ہے کہ ان حرامزادوں کی قبریں اب یہیں ڈیرے کے قبرستان میں بنیں۔ ہاں نوکر جانا چاہے تو جا سکتا ہے۔''

شانی نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں رستم، یہ ظالم لوگ ہیں۔ اس سے بھی بدترین سزا کے حق دار ہیں لیکن بات صرف ان دونوں باپ بیٹے کی نہیں ہے۔ ان کی وجہ سے پورے علاقے کی سلامتی خطرے میں ہے۔ ایک خونی لڑائی چند دن پہلے جوہر آباد میں ہو چکی ہے۔ اس میں پانچ بندے مرے ہیں اور درجنوں زخمی ہوئے ہیں اور ابھی نہ جانے کیا کچھ ہونا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم لوگ ان باپ بیٹا کی جان بخش دو۔''

''بی بی! میں اپنے دوست کی موت بھول سکتا ہوں۔ اپنا ہر بدلہ بھی چھوڑ سکتا ہوں لیکن انہوں نے آپ کی توہین کا جو جرم کیا ہے وہ معافی کے قابل نہیں۔''

''رستم! میں جانتی ہوں تمہیں اس کا بہت دکھ ہے لیکن جب میں خود معاف کر رہی ہوں..... تو تم بھی کر دو۔''

دراج بولا۔ ''لکڑی ٹھیک کہتی ہے رستم! یہ اتنی دور سے صرف پھ اس لئے چل کر آئی ہے کہ تم ان حرامیوں کو اب معاف کر دو۔''

رستم کی آنکھوں میں آتشیں نمی تھی۔ وہ اپنی بی بی کے سامنے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی اور پھر رستم نے سر جھکائے جھکائے کہا۔ ''ٹھیک ہے بی بی، جیسے آپ کہتی ہیں۔ ہم آپ کو انکار نہیں کر سکتے۔ اللہ کرے آپ کی توقع پوری ہو لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ لوگ اپنے شر سے باز نہیں آئیں گے۔''

''اس بارے میں بھی واپس جا کر نارپوریوں کے ساتھ تفصیل سے بات ہونی ہے۔ ہم نے اس کا کوئی نہ کوئی حل نکالنا ہے۔'' شانی نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''لیکن میں یہاں تم سے ایک اور بات کہنا چاہتی ہوں۔''

''جی بی بی۔''

شانی نے رستم اور لالہ کی طرف ایک ساتھ دیکھا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ آپ ان تینوں کو یونہی رہا نہ کریں۔ اس کے لئے اپنے طریقے کے مطابق تاوان لیں۔''

شانی کی بات سے لالہ کی آنکھوں میں چمک سی نمودار ہو گئی۔ غالباً وہ خود بھی اس قسم کی کوئی بات سننا چاہتا تھا۔ رستم حیران نظر آ رہا تھا۔

شانی نے تدبر سے کہا۔ ''میں نے دراج اور بلاول سے مشورہ کیا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ان تینوں کو یونہی رہا کر دینے سے آپ کے اپنے ساتھیوں میں کسی طرح کی مخالفت پیدا ہو..... مجھے پتا چلا ہے کہ یہاں تین گروپ ہیں اور تینوں کی اپنی اپنی رائے ہو سکتی ہے۔''

رستم اور لالہ خاموش رہے۔ ان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ شانی کی بات سے

اختلاف نہیں کر رہے۔

شانی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''چوہدریوں کے لئے تاوان دینا کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں ہے۔ انہوں نے خود اس کی پیشکش کی ہے۔ اس صورتِ حال میں ان سے کچھ نہ لینا ٹھیک نہیں ہو گا لیکن اس حوالے سے میں ایک اور بات کہنا چاہتی ہوں۔''

''جی بی بی۔''

شانی نے کہا۔ ''فرض کیا تم نے ان تینوں کے لئے نارپوریوں سے تاوان طلب کرنا ہوتا تو تمہارے ذہن میں کتنی رقم ہوتی؟''

لالہ فرید بولا۔ ''بی بی سچ جانیں ہم ان بدمعاشوں کو چھوڑنے کے لئے یہاں نہیں لائے تھے۔ اس لئے کبھی رقم کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا۔''

''پھر بھی۔ اگر کوئی ایسی صورتِ حال ہوتی تو تمہارے ذہنوں میں ان تینوں کی رہائی کے لئے آخری رقم کیا ہوتی؟''

فرید نے سوالیہ نظروں سے رستم کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔ گردن مسلسل جھکی ہوئی تھی۔ ایک عجیب سے والہانہ احترام نے اس کے سراپا کو جکڑ رکھا تھا۔ فرید نے اس کی طرف سے نگاہ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''شانی بی بی! اگر ہمارے اپنے پر ہوتا تو ہم ان لٹیرے نارپوریوں سے ان تینوں کی رہائی کے بدلے 50 سے کم وصول نہ کرتے لیکن اب آپ کی بات ہے۔ آپ جو کہیں گی ہمیں قبول ہو گا۔ بلکہ ہماری دلی خواہش ہے کہ ہم آپ کے لئے ان کتوں کو بغیر کسی شرط کے بخش دیں۔''

شانی نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ آپ تاوان کی رقم کم کر دیں لیکن اس کے بدلے آپ نارپوریوں سے تین بندوں کی رہائی کا مطالبہ کریں۔ یہ تین بندے میرے یقین کے مطابق اس وقت چوہدریوں کی حبس بے جا میں ہیں۔''

رستم نے چونک کر پوچھا۔ ''بی بی! یہ کون ہیں۔''

''یہ تینوں ڈاکٹر ہیں۔ ان میں سے دو میاں بیوی ہیں۔ ڈاکٹر زیب النساء اور ڈاکٹر محسن۔ تیسرے سینئر ڈاکٹر کا نام بہروز علی ہے۔''

''بہروز علی کا نام تو ہم نے بھی سنا ہوا ہے بی بی جی۔ جوہر آباد، میانہ اور آس پاس کے علاقوں میں کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر بہروز کی بڑی شہرت تھی۔ وہ ہر جگہ پر قدرت اللہ کے تعویذ گنڈوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا تھا اور لوگ اس پر بڑا یقین کرنے لگے تھے۔'' فرید نے کہا۔

''لیکن پھر وہ اچانک چلا گیا۔ کہتے ہیں کہ اسے اچھی نوکری مل گئی تھی اور وہ پاکستان

سے باہر نکل گیا۔'' رستم نے کہا۔

''یہ سب جھوٹ ہے۔'' شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ان لوگوں کے ساتھ جو کچھ بھی ہو ہے۔ نارپوریوں نے کیا ہے۔ ڈاکٹر بہروز کی گمشدگی کے بارے میں تو لاہور کے کچھ ڈاکٹروں نے کیس بھی کر رکھا ہے۔ مجھے نوے فیصد یقین ہے کہ ان تینوں کو نارپور کے چوہدریوں نے اٹھوایا ہے بلکہ زیب النساء اور ڈاکٹر محسن کے اغوا کی تو میں چشم دید گواہ ہوں۔ میں نے ان دونوں کو خود چوہدریوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے اور روتے بلکتے دیکھا ہے۔ یہ سب کچھ میانہ کی حویلی میں ہوا تھا۔ ڈاکٹر میاں بیوی کو مارکوٹ کر جس کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا وہ رستم کی کوٹھڑی کے بالکل ساتھ تھی۔ اب چوہدری حشام اور اس کا بیٹا یہاں ہمارے پاس ہیں۔ ان سے پوچھو گے تو وہ سب کچھ بتائیں گے۔ کم از کم زیب النساء اور محسن کے بارے میں تو وہ سب کچھ جانتے ہیں۔''

رستم نے اپنے لمبے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیچھے کی طرف پھینکا۔ اس کی سرخی مائل آنکھیں ایک لمحے کے لئے شانی کی آنکھوں سے چار ہوئیں پھر جھک گئیں۔ وہ بولا۔ ''حویلی میں ساتھ والی کوٹھڑی سے مجھے تین چار دن کسی لڑکی کے رونے کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ شاید یہ وہی ڈاکٹر ہو جس کا آپ ذکر کر رہی ہیں۔''

''چلیں..... ابھی چل کر اس بلی مارے سے پوچھ لیتے ہیں۔'' فرید نے کہا۔

''نہیں۔ اس حرامی کو یہاں بلاتے ہیں۔'' رستم نے زہرناک لہجے میں کہا۔ پھر باہر نکل کر وہ کسی کو تاؤ حشام کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد تاؤ حشام ان کے سامنے کمرے میں موجود تھا۔ آج وہ زنانہ کی بجائے مردانہ لباس میں تھا۔ اس نے سفید کرتہ اور رنگ دار لاچہ پہن رکھا تھا۔ سر اور پاؤں سے ننگا تھا۔ اس کے ہاتھ ایک مضبوط رسی سے پشت پر باندھے گئے تھے۔ گھنی مونچھوں والا ایک نہایت تنومند پوٹھوہاری اسے بازو سے پکڑ کر اندر لایا۔ وہ لنگڑاتا ہوا ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے اور جسم پر کئی زخم تھے۔ سب سے نمایاں اور رستا ہوا خون اس کی ناک پر تھا۔ یہ نتھ کا زخم تھا۔ وہی زخم جو طاقت ور ہمیشہ سے کمزور و ناتواں کو لگاتا آیا ہے۔ آج یہ زخم ایک جابر کی ناک پر نظر آیا تھا تو بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ وہ چاروں چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔

''بیٹھ جا بچے۔'' رستم نے تحکم سے کہا۔

چوہدری نے فرش پر بیٹھنے کے لئے گھٹنوں کو خم دیا تو شانی جلدی سے کھڑی ہوگئی۔

''نہیں چوہدری! ادھر بیٹھو۔'' اس نے ایک موڑھا نما کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

چوہدری نے ایک نظر شانی کو دیکھا اور خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

''یہ کتا اس لائق نہیں ہے بی بی! آپ اس پر ترس نہ کھائیں۔'' فرید نے چوہدری کو خونی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

شانی نے ہاتھ کے اشارے سے فرید کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

رستم کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ شاید وہ چوہدری کو ٹانگ مار کر فرش پر گرا دیتا۔ چوہدری سے مخاطب ہو کر بے حد زہریلے لہجے میں بولا۔ ''تو نے میرے ساتھ والی کوٹھڑی میں ڈاکٹر زیب النساء اور ڈاکٹر محسن کو رکھا ہوا تھا۔ وہ دونوں کہاں ہیں اب؟''

چوہدری نے فاتر العقل لوگوں کی طرح ارد گرد دیکھا پھر منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔

''او نیچا بول۔'' رستم نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ گرفت اتنی سخت تھی کہ چوہدری کا سیاہی مائل رنگ پھیکا پڑ گیا۔

اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور سر جھکائے جھکائے بولا۔ ''لیڈی ڈاکٹر میانہ میں ہی ہے.....''

''اور اس کا خاوند.....؟''

''وہ نہیں ہے۔'' حشام بڑبڑایا۔

''وہ کہاں ہے؟'' رستم پھنکارا۔

''پ..... پتا نہیں۔'' حشام نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

رستم نے طیش کے عالم میں بیٹھے بیٹھے ٹانگ چلائی۔ تاؤ حشام کرسی سے اچھل کر دیوار سے ٹکرایا اور اوندھے منہ پتھریلے فرش پر گرا۔ رستم نے غضب سے مغلوب ہو کر اس کا گریبان پکڑا اور جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیوں نہیں کہتا حرامی کہ تُو نے مار دیا ہے اسے۔ جان لے لی ہے۔''

چوہدری کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے تاثرات گواہ تھے کہ رستم ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ نوجوان خوبرو ڈاکٹر محسن میانہ گاؤں کی قاتل حویلی میں اپنی جان ہار چکا ہے۔ اس کی بیوی زندہ ہے اور وہ بھی شاید اس لئے کہ چوہدری اور اس کے شرابی ہرکاروں کی ''خدمت'' کر سکے۔

شانی سکتہ زدہ بیٹھی تھی۔ تاؤ حشام کے لئے رستم کا قہر بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک باہر سے شور اور بھاگنے کی آوازیں آئیں۔ رستم نے تاؤ کو چھوڑا اور کھڑکی کھولی۔ پچھلے پہر کی زردی مائل دھوپ میں ایک شخص بگٹٹ بھاگا چلا جا رہا تھا۔ اس نے ایک پتھر پھلانگا اور کھمبا ڑی کے

درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ پانچ چھ رائفل بردار اور کلہاڑی بردار اس کے پیچھے تھے۔

''کون ہے یہ؟'' شانی نے پوچھا۔

''چوہدری کا کاماں (نوکر) ہے۔'' رستم نے تیزی سے جواب دیا اور فرید کے ساتھ باہر کو لپکا۔

شانی سمجھ گئی کہ چوہدری کے نوکر نے موقع دیکھ کر فرار ہونے کی کوشش کی ہے۔ اس ویرانے میں اسے حماقت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا۔ وہ سارے باہر نکل آئے اور ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر نیچے وسیع نشیب میں بھاگتے ہوئے نوکر کو دیکھنے لگے۔ وہ کافی دور جا چکا تھا۔ رستم نے کوئی شارٹ کٹ استعمال کیا تھا اور بھاگتے ہوئے شخص کے کافی قریب پہنچ گیا تھا..... دونوں میں قریباً سو گز کا فاصلہ تھا۔ رستم کے ہاتھ میں یقیناً پستول وغیرہ نہیں تھا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اس شخص کو رکنے کے لئے کہہ رہا ہے لیکن وہ رک نہیں رہا تھا۔ پھر اچانک ہی ایک مقام پر پہنچ کر رستم رک گیا..... اس کے ساتھ ہی ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ انہوں نے بھاگنے والے کا جسم فضا میں اچھل کر نیچے گرتے دیکھا۔ زمین میں دبی ہوئی طاقت ور بارودی سرنگ نے اس کے پرخچے اُڑا دیئے تھے۔

☆======☆======☆

شانی اور مہناز سکتہ زدہ کھڑی تھیں۔ رستم انہیں خاصے فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ دھماکے سے ایک یا دو سیکنڈ پہلے رستم نہ صرف بھاگتے بھاگتے رک گیا تھا بلکہ گھٹنے زمین پر ٹیک کر بیٹھ گیا تھا۔ اب اس نے یاس زدہ انداز میں اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ دھماکے والی جگہ سے گرد و غبار کا ایک مرغولہ فضا میں بلند ہوا تھا۔ اس مرغولے میں مرنے والے کے کپڑوں کی سفید دھجیاں بھی نظر آئی تھیں۔

حیرت اور افسوس کے چند لمحے گزر گئے تو لالہ فرید، سردار دراج، بلاول اور بہت سے دوسرے لوگ جائے حادثہ کی طرف بڑھے۔ رستم بھی اب اٹھ گیا تھا اور اس مقام کی طرف جا رہا تھا جہاں تاؤ کا بدنصیب ملازم بھاگنے کی کوشش میں بارودی سرنگ سے ٹکرایا تھا۔ یہ بدنصیبی نہیں تو اور کیا تھی۔ تاؤ حشام اور راجو کے ساتھ ساتھ اس کی رہائی بھی عمل میں آنے والی تھی۔ اپنی جلد بازی کے سبب وہ قیدِ زندگی سے ہی رہا ہو گیا تھا۔

قریباً پندرہ بیس منٹ بعد چند مقامی افراد پولی تھین کی ایک بڑی شیٹ میں مرنے والے کی باقیات لے کر چھپے میں پہنچ گئے۔ لالہ فرید اپنے بندوں سے باز پُرس کر رہا تھا کہ یہ شخص سرنگ سے نکلا کیسے؟

پتا چلا کہ وہ پیٹ درد کا بہانہ کر رہا تھا اور کوٹھڑی کے فرش پر لوٹ رہا تھا۔ ڈاکٹر ناصر اسے دیکھنے کے لئے اندر گیا۔ اتفاق سے اس کے ساتھ اور کوئی نہ تھا۔ اس نے ڈاکٹر ناصر کو دھکا دے کر گرایا اور راستے میں آنے والے ایک شخص کے سر پر اس نے آہنی راڈ سے ضرب لگائی۔ وہ وحشت کے عالم میں چنگھاڑ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ مسلسل بند رہنے سے اس پر جنون سوار ہو گیا ہو۔ اس شخص کے بارے میں پہلے بھی یہی اطلاع تھی کہ وہ ہر وقت واویلا کرتا رہتا

تھا۔

تاؤ حشام کو بھی اپنے کارندے کی ہلاکت کی خبر مل گئی تھی لیکن اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں آیا۔ شاید اسے اپنی پڑی ہوئی تھی۔ ویسے بھی نوکر چاکر ایسے لوگوں کے لئے کیڑے مکوڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ شانی میانہ کی حویلی میں حشام کا سلوک نوکروں اور نوکرانیوں سے دیکھ ہی چکی تھی۔ نوکر کے مرنے کی خبر سن کر حشام نے بس ایک بار ناپسندیدگی سے سر ہلایا اور منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔ شانی کو وہ کچھ بدحواس بلکہ فاتر العقل سا محسوس ہوا۔

''چوہدری کو کیا ہوا ہے؟'' شانی نے قریب کھڑے لالہ فرید سے پوچھا۔

''کچھ نہیں بی بی جی! بالکل بھلا چنگا ہے۔ یہ پکا شرابی ہے۔ ایسے شرابیوں کو اگر آٹھ دس روز کڑوا پانی نہ ملے تو ان کا سواستیاناس ہو جاتا ہے۔''

''اوپر سے تھوڑی بہت مار بھی لگائی ہوگی رستم نے۔'' دراج نے دھیمی آواز میں کہا۔

پورے ڈیرے میں سنسنی سی پھیل گئی تھی۔ جہاں تک دھماکے کی آواز گئی، وہاں تک لوگ چونکے تھے۔ اب وہ چھجے کے سامنے جمع ہو رہے تھے۔ ان میں سے کچھ آگے جا کر مرنے والے کی باقیات بھی ملاحظہ کر رہے تھے۔ یہ جو کچھ ہوا تھا اس میں ڈیرے والوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ پھر بھی صورتِ حال میں ایک شدید قسم کا تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس موت کی ذمے داری کسی نہ کسی طور تو ڈیرے والوں پر عائد ہوتی ہی تھی لیکن دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو حشام اور اس کے ساتھی کسی طور بھی رعایت کے مستحق نہیں تھے۔ ابھی بارودی سرنگ کے دھماکے سے کچھ دیر پہلے جو اطلاع شانی کو ملی تھی وہ کچھ کم اندوہناک نہیں تھی۔ چوہدری حشام کے تاثرات سے واضح ہو چکا تھا کہ میانہ کی حویلی میں وہ ڈاکٹر محسن کی جان لے چکا ہے۔

رات نو بجے کے لگ بھگ شعلوں کی روشنی میں مرنے والے ملازم ساجن کو ڈیرے کے چھوٹے سے قبرستان میں نوجوان اباگیر کے پہلو میں دفنا دیا گیا۔ کچھ لوگ اپنے اردگرد والوں کو زندگی میں رُلاتے رہتے ہیں لیکن ان کی موت پر کوئی رونے والا نہیں ہوتا۔

اگلے روز رات کو وہ میٹنگ پھر وہیں سے شروع ہوئی جہاں دھماکے کے سبب ختم ہوئی تھی۔ حشام کے ہاتھ پشت پر باندھ کر اسے پھر چھجے کے کمرے میں لایا گیا۔ لالہ فرید، رستم، دراج اور شانی بھی کمرے میں موجود تھے۔

حشام کے سانولے چہرے پر چوٹوں کے تازہ نشان تھے۔ کل حشام کے منہ سے ڈاکٹر

محسن کے لاپتا ہونے کی اطلاع سن کر رستم غصے سے بے قابو ہوا تھا اور اس نے حشام کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی تھی۔ بات چیت شروع ہونے کے بعد تاؤ حشام نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ڈاکٹر محسن میانہ کی حویلی میں زندگی کی بازی ہار چکا ہے۔ رستم کے پوچھنے پر اس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا۔ ''اسے سرسام ہو گیا تھا۔ بخار اس کے سر کو چڑھ گیا تھا۔ الٹی سیدھی باتیں کرتا تھا۔ رات کو پانی پینے کے لئے اٹھا تو گر گیا اور اس کا سر منجی (چارپائی) کے پاوے کے ساتھ لگا۔ پھر وہ اٹھ نہیں سکا۔''

''بکواس کرتا ہے تُو۔'' رستم نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ''تیرے منہ میں کتے سے زیادہ پلید زبان ہے۔ تُو نے اس کو مارا ہوگا۔ تڑپا تڑپا کر اور رُلا رُلا کر۔ آفندی کی طرح اسے بھی چھت سے الٹا لٹکایا ہوگا اور اس کی جان نکلنے کا تماشا دیکھا ہوگا۔''

''نہیں..... میں اپنے پتر کی قسم کھاتا ہوں، مجھ سے کوئی بھی وڈی سے وڈی قسم لے لو۔ وہ بیمار ہونے سے مرا تھا۔''

''پر اگر وہ بیمار بھی ہوا ہوگا..... تو کیوں ہوا ہوگا؟'' رستم پھنکارا۔ ''کتے کے تخم! تُو نے اس کے لئے جینا حرام کر دیا ہوگا۔ اس بھلے مانس بندے کو موت اور زندگی کے درمیان لٹکا دیا ہوگا۔ وہ بے چارہ شہر میں اپنا گھر بار چھوڑ کر تم لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے یہاں آیا تھا..... تم نے اسے زخم زخم کیا اور موت کے منہ میں دھکا دے دیا۔ تم.....'' اس کے ساتھ ہی رستم کے ہونٹوں سے حشام کے لئے بے ساختہ ایک گندی گالی نکل گئی۔

گالی دینے کے بعد وہ ایک دم گم صم سا ہو گیا۔ غالباً اسے یہ احساس بے حد شدت کے ساتھ ہوا تھا کہ شانی کے سامنے اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔

حشام سر جھکائے کرسی پر بیٹھا تھا۔ جیسے ایک مجرم بغیر کسی وکیل دلیل کے کٹہرے میں ہو۔ لالہ فرید بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''چوہدری! تم کہتے ہو کہ تم نے ڈاکٹر محسن اور اس کی بیوی ڈاکٹر زیب کو ایک ہی کمرے میں یا کوٹھڑی میں رکھا ہوا تھا؟''

حشام نے اثبات میں سر ہلایا۔

فرید بولا۔ ''اب تم بک رہے ہو کہ ڈاکٹر محسن شدید بیمار تھا اور وہ پانی پینے کے لئے اٹھا تھا کہ گر گیا۔'' حشام خاموش رہا۔ فرید نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔ ''ڈاکٹر کی بیوی اس وقت کہاں تھی؟''

رستم پھنکارا۔ ''وہ حویلی کے کسی شرابی چوہدری کے کمرے میں ہوگی اور کہاں ہوگی۔''

اس کے ساتھ ہی ایک زناٹے کا تھپڑ اس نے چوہدری کے سانولے چہرے پر مارا۔ چوہدری کا

سر بڑے زور سے دیوار سے ٹکرایا اور ناک کے زخم سے تازہ خون بہنے لگا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ شانی کی موجودگی کے سبب رستم خود پر بے پناہ ضبط کر رہا تھا۔ ورنہ شاید وہ اسی جگہ مار مار کر چوہدری کی کھال اس کے جسم سے علیحدہ کر دیتا۔ شانی نے ہاتھ کے اشارے سے رستم کو اشارہ کیا کہ وہ تحمل کا ثبوت دے۔

''اس کی لاش کہاں دفن کی تم لوگوں نے؟'' شانی نے حشام سے پوچھا۔

''قبرستان میں..... رات کے وقت۔'' حشام نے مختصر جواب دیا۔

''اور ڈاکٹر زیب اب واقعی حویلی میں ہے یا کہیں اور رکھا ہے اسے؟''

''نہیں، حویلی میں ہے۔'' حشام نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''اور ڈاکٹر بہروز کہاں ہے؟''

حشام خاموش رہا۔ رستم نے ایک بار پھر بھڑک کر اس کے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لئے اور اس کا چہرہ اوپر اٹھا دیا۔ ''حرامزادے! بی بی کیا پوچھ رہی ہیں تجھ سے؟ ڈاکٹر بہروز کہاں ہے؟''

''وہ..... ناریور..... میں تھا۔'' حشام نے اٹک کر جواب دیا۔

اس نے ''تھا'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ شانی کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ کہیں وہ بھی تو جان کی بازی نہیں ہار چکا تھا۔

''وہ زندہ ہے یا مر گیا؟'' رستم نے حشام کے سر کو بُری طرح جھنجھوڑ کر پوچھا۔

''زندہ ہے..... پر میں ڈیڑھ دو مہینے سے اسے ملا نہیں۔'' حشام نے رستم کی برہمی دیکھ کر جلدی سے جواب دیا۔

دو چار منٹ کی مزید پوچھ گچھ کے بعد لالہ فرید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں حشام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا فیصلہ ہے کہ اگر تم اور تمہارا بیٹا یہاں سے اپنی جان چھڑانا چاہتے ہو تو تمہیں دونوں ڈاکٹروں کو چھوڑنا پڑے گا اور انہیں حفاظت سے جوہر آباد عارف کمبوہ کے پاس پہنچانا پڑے گا۔''

''دوسری شرط تاوان کی ہے۔'' رستم نے ٹھوڑی پکڑ کر حشام کا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔

''تمہارے وارثوں کو 20 لاکھ روپیہ دینا ہوگا۔ اس میں ایک پیسے کی بھی کمی بیشی نہیں ہوگی۔ نہ ہی دونوں ڈاکٹروں کی فوری واپسی میں کوئی رعایت ہوگی۔'' (کچھ دیر پہلے شانی، رستم، فریہ وغیرہ نے علیحدہ سے مشورہ کیا تھا اور اس میں ان مطالبوں کو حتمی شکل دے دی گئی تھی)

گروہ کے سردار کی حیثیت سے فرید نے کہا۔ ''حشام، جو کچھ تُو کر چکا ہے اس کے بعد تم باپ بیٹا پر دہی ڈال کر تازی کتے چھوڑ دیئے جائیں تو یہ بھی کم ہے۔ بی بی جی کو دعائیں دو جن کی کوشش سے تمہاری جان بچنے کی صورت پیدا ہوئی ہے لیکن ایک بات کان کھول کر سن لے، جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں اس پر کسی طرح کی سودے بازی نہیں ہوگی..... تیرے وارثوں کو بس ہاں یا نہ میں جواب دینا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں ہم تجھے ٹیپ ریکارڈر دیں گے۔ اپنے پچھلوں کے ساتھ تُو نے جو بھی بک بک کرنی ہے اس میں کر لینا۔''

اگلے ایک گھنٹے میں شانی نے بلاول سے کہہ کر ایک طویل خط چوہدری حشام کے لواحقین کے نام لکھا۔ اس خط میں یہاں کی تمام صورتِ حال وضاحت سے بیان کی گئی اور دونوں مطالبات کا ذکر بھی تفصیل سے کر دیا گیا۔ آخر میں شانی نے خصوصی طور پر یہ جملے لکھوائے۔

''لالہ گروپ کے لوگوں سے طویل بات چیت کے بعد یہ سب کچھ طے ہوا ہے۔ یہ لوگ مزید کوئی رعایت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اب ہمارا جواب بس ہاں یا نہ میں ہونا چاہئے۔ لالہ فرید کا ایک بندہ دلاور کھیدراج اور ایک تیسرے شخص کے ساتھ آپ کی طرف آ رہا ہے۔ یہ اس بات کی تصدیق کرے گا کہ ڈاکٹر بہروز اور لیڈی ڈاکٹر زیب جوہر آباد میں عارف کمبوہ کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ رقم بھی کیش کی صورت میں دلاور کے حوالے کرنا ہوگی۔ دلاور کے واپس پہنچتے ہی یہ لوگ چوہدری حشام اور چھوٹے چوہدری راجو کو رہا کر دیں گے۔ یہ لالہ فرید اور اس کے ساتھیوں کی ذمے داری ہوگی کہ وہ ہمیں حفاظت سے اگلے ڈیرے پر پولیس فورس تک پہنچائیں۔ اس خط کے ساتھ چوہدری حشام اور چھوٹے چوہدری راجو کی ٹیپ شدہ آواز بھی ارسال کر رہے ہیں۔ وہ دونوں بالکل خیریت سے یہاں موجود ہیں۔''

خط لکھنے کے دوران میں رستم نے چوہدری حشام اور راجو کی آواز بھی ریکارڈ کر لی تھی..... راجو نے تو چوہدری قادر کو مخاطب کرتے ہوئے دو تین جملے ہی بولے تھے۔ ان جملوں میں اس نے کہا تھا کہ وہ خیریت سے ہے لیکن جلد سے جلد ان ویران پہاڑیوں سے نکل کر اپنے گاؤں میں آنا چاہتا ہے۔ اپنے گھر اور گھر والوں کو یاد کر کے وہ آبدیدہ ہو گیا تھا اور اس کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔ تاہم چوہدری حشام نے پندرہ بیس منٹ کی ٹیپ ریکارڈ کروائی تھی۔ اس میں چوہدری نے اپنے پچھلوں کو بتایا تھا کہ رقم کہاں سے اور کیسے حاصل کرنی ہے۔ ایک جگہ اس نے چوہدری بشیر کا نام بھی لیا تھا اور قادر سے کہا تھا کہ چوہدری بشیر

کے ذمے پچھلے سال کی کپاس کا ڈیڑھ لاکھ روپیہ واجب الادا ہے۔ یہ روپیہ چوہدری بشیر سے لے لیا جائے۔ اس کے علاوہ اس نے گوجرانوالہ کے ایک بینک سے رقم نکلوانے کے لئے اپنے ایک بھتیجے کو بھی کچھ ہدایات دی تھیں۔

ریکارڈنگ کے آخر میں اس نے چوہدری قادر سے کہا تھا کہ ڈاکٹر بہروز جہاں اور جس حالت میں بھی ہے اسے میانہ پہنچایا جائے اور وہاں سے لیڈی ڈاکٹر کو لے کر دونوں کو حفاظت سے جوہر آباد میں عارف کمبوہ یا چوہدری نواب کے حوالے کیا جائے۔ چوہدری نے اپنے لواحقین کو اپنی خیر خیریت سے آگاہ کیا تھا، اس کے ساتھ ساتھ ڈپٹی ریاض کا نام لے کر اس سے خصوصی درخواست کی تھی کہ اس سارے معاملے میں کسی طرح کا ''بل فریب'' نہ رکھا جائے کیونکہ یہاں ان دونوں کی جان کو شدید خطرہ ہے۔

یہ ریکارڈ شدہ کیسٹ خط سمیت کھیا دراج کے حوالے کر دی گئی۔ شانی نے وقتِ رخصت دراج کو کچھ ضروری ہدایات بھی دیں۔ اگلے دن صبح سات بجے کے قریب کھیا دراج، دلاور اور اس کا ایک ساتھی مظفر گھوڑوں پر سوار اگلے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ شانی نے دراج کو جو ضروری ہدایات دی تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ فی الحال حشام کے ملازم کی موت کا ذکر کسی سے نہیں کرے گا۔

اب صورتِ حال ایسی ہو گئی تھی کہ شانی اور بلاول وغیرہ کو کم از کم تین چار دن یہاں مزید رہنا تھا۔ تین چار دن سے پہلے دراج اور دلاور کی واپسی کسی طور ممکن نہیں تھی بلکہ ہو سکتا تھا کہ اس سے زیادہ وقت لگ جاتا۔

شانی کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ برسوں اسے معلوم ہو گیا تھا کہ رستم نے یہاں شادی کر لی ہے اور اس کی بیوی کوئی اور نہیں نادیہ تھی۔ راولپنڈی میں قیام کے دوران ہی شانی نے نادیہ کو بہت اچھی طرح دیکھا اور پرکھا تھا۔ اس نے رستم کے لئے نادیہ کے والہانہ پیار کو بھی محسوس کیا تھا۔ ان دنوں اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی کہ نادیہ کسی طرح رستم کی زندگی میں آ جائے اور وہ دونوں آزاد علاقے کی طرف کہیں نکل جائیں۔ شانی نے محسوس کیا تھا کہ نادیہ، رستم کی زندگی میں خوشیاں لا سکتی ہے اور اس کا اتنا خیال رکھ سکتی ہے جتنا شاید کوئی اور نہ رکھ سکے۔

اب وہی ہوا تھا جو شانی نے ماضی میں چاہا تھا۔ رستم نہ صرف آباد دنیا سے دور، ان پہاڑوں میں چلا آیا تھا بلکہ نادیہ بھی بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ تھی۔ پھر اب اس کے سینے میں دھواں سا کیوں بھر رہا تھا۔ وہ اتنی گھٹن کیوں محسوس کر رہی تھی۔ وہ ایک طرف تو تہہِ

دل سے نادیہ کو مبارک باد دینا چاہتی تھی۔ دوسری طرف اس کے گلے میں نمکین پانی بھی جمع ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کوئی شے اچانک گم ہو گئی ہو۔

وہ نادیہ سے ملنا چاہتی تھی۔ اس کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن نادیہ کو رستم نے اوجھل کر دیا تھا۔ پرسوں شانی کو معلوم ہوا کہ وہ دو نمبر سرنگ میں تھی اور وہاں مقامی کلینک میں اس کا علاج ہو رہا تھا۔ شانی دوسرے کمرے میں لالہ فرید کی بیوی مہناز کے پاس پہنچی جو برتن مانجھ رہی تھی۔ شانی نے پوچھا۔ ''صفیاں کہاں ہے؟''

مہناز نے جواب دیا۔ ''وہ دوا خانے (کلینک) میں نادیہ کے پاس ہے۔ رات کو رستم بھی وہیں تھا۔''

''کیوں خیریت ہے؟''

''نادیہ کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ اسے الٹی بھی ہو رہی تھی۔ یہاں کے لوگ کہتے ہیں جس چھپکلے نے اسے کاٹا تھا اس میں چار کالی بھڑوں جتنا زہر ہوتا ہے، ابھی اسے ٹھیک ہونے میں تین چار دن لگیں گے۔''

شانی نے مہناز کو ساتھ لیا اور نادیہ کو دیکھنے سرنگ کی طرف چل دی۔ شانی کو یہاں ڈیرے پر خاص پروٹوکول دیا جا رہا تھا۔ وہ جدھر سے گزرتی اس کے لئے راستہ چھوڑ دیا جاتا۔ اس سے بات کرتے ہوئے بھی کوئی اس کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتا تھا۔ یہاں تک کہ یہاں کا کرتا دھرتا لالہ فرید بھی بے حد احترام سے بات کرتا تھا۔ لالہ کا ایک قریبی ساتھی کا ٹھیا، شانی اور مہناز کے عقب میں تھا اور بڑے ادب سے چند قدم کا فاصلہ رکھ کر چل رہا تھا۔

سرنگ میں داخل ہو کر شانی کلینک کے سامنے پہنچی تو اطلاع پا کر ڈاکٹر ناصر خود باہر آ گیا۔ شاید وہ چند سال پہلے تک شکل وصورت سے ڈاکٹر لگتا ہو گا مگر اب تو یہاں کے ماحول میں خود بھی جرائم پیشہ اشتہاری ہی نظر آنے لگا تھا۔ داڑھی مونچھیں جھاڑ جھنکار کی طرح تھیں۔ سر کے بال بھی خاصے لمبے تھے۔ بہرحال اس کا لباس اسے دوسروں سے ممتاز کرتا تھا۔ وہ ایک بوسیدہ سی پتلون قمیص میں دکھائی دیتا تھا۔ شانی نے اس سے نادیہ کے بارے میں پوچھا۔

وہ بولا۔ ''بی بی جی! چھوٹی بھرجائی یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک دوسرے کمرے میں ہیں۔ انہیں آرام کی سخت ضرورت ہے اور چونکہ یہاں شور شرابا زیادہ رہتا ہے اس لئے انہیں وہاں رکھا گیا ہے۔''

''کیا اب ان سے ملا جا سکتا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

’’آپ کو انکار بھلا کیسے کیا جا سکتا ہے۔‘‘

’’کیا وہ سو رہی ہیں؟‘‘

’’ہاں سو تو رہی ہیں۔ رات جاگتی رہی ہیں اب میں نے انہیں ہلکا سا ٹرنکولائز ر دیا ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ میں پھر مل لوں گی۔‘‘ شانی نے کہا اور واپس مڑی۔

ڈاکٹر ناصر بولا۔ ’’وہ جاگیں گی تو میں انہیں آپ کے بارے میں بتا دوں گا۔‘‘

پتا نہیں کیوں شانی کو محسوس ہوتا تھا کہ اسے جان بوجھ کر نادیہ سے دور رکھا جا رہا ہے۔ بے شک وہ بیمار بھی تھی۔ کل بلاول نے بھی شانی کو بتایا تھا کہ نادیہ کو بخار ہے اور متلی وغیرہ ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود شانی کو اس میں کچھ پردہ داری محسوس ہوتی تھی۔ شانی نے سوچ لیا کہ وہ اس معاملے میں زیادہ کرید نہیں کرے گی اور اگر رستم کی خواہش ہے کہ شانی اس کی بیوی سے زیادہ نہ ملے تو وہ اس خواہش کے مطابق چلے گی۔

صبح شانی بہت سویرے اٹھ گئی۔ ابھی پوٹھوہار کے مخروطی ٹیلوں سے شب کی تاریکی پوری طرح چھٹی نہیں تھی۔ ہلکی خنک سی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ سحر خیز پرندوں کی قطاریں نیم تاریک آسمان کے پیش منظر میں دکھائی دے رہی تھیں۔ شانی کمرے سے نکل آئی۔ کھباڑی، بیری اور گوندلی کے درخت اوس میں بھیگے ہولے ہولے جھوم رہے تھے۔ ڈیرے پر ہو کا عالم طاری تھا۔ سرکنوں میں لوگ سو رہے تھے۔ چھجے اور حجروں کی طرف سے بھی خاموشی تھی۔ سامنے ہی وہ کمرہ دکھائی دیا جہاں رستم اور نادیہ کی رہائش تھی۔ آج یہ کمرہ خالی پڑا تھا۔ شانی آہستہ آہستہ چلتی اس کمرے تک آئی۔ نادیہ دو دن سے زیر علاج تھی۔ کمرے میں ہر شے بے ترتیب نظر آ رہی تھی۔

شانی کچھ دیر تک کمرے کو دیکھتی رہی پھر نہ جانے کس جذبے کے تحت اس نے کمرے کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ رستم اور نادیہ کی ہر چیز اس نے سلیقے سے رکھی۔ رستم کے دھلے ہوئے کپڑے تہہ کر کے لکڑی کی الماری میں رکھے۔ ان کپڑوں کو چھوتے اور سنبھالتے ہوئے اسے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ ایک ایسی کیفیت جسے وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی تھی۔

باتھ روم کے دروازے کے پاس ایک کونے میں کچھ ان دھلے کپڑے پڑے تھے۔ اس نے کھونٹیوں پر لٹکانے کے لئے کپڑے اٹھائے۔ رستم اور نادیہ کے کپڑے باہم الجھے ہوئے تھے۔ جیسے ایک دوسرے میں گم ہوں۔ ایک بار پھر ایک شدید ٹیس اس کے سینے میں ابھری۔ کچھ ان دیکھے مناظر کا تصور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں گھس آیا۔ ایک خلوت، ایک ریشمی اندھیرا، کچھ سرگوشیاں۔ وہ اس تصور کو ذہن سے جھٹکنے کے لئے خواہ مخواہ چیزوں کو تیزی سے ادھر سے اُدھر رکھنے لگی۔ اس نے ایک قمیص الماری میں رکھنے کے بجائے کھانے والی ٹرے میں رکھ دی اور پلیٹیں ٹرے میں رکھنے کی بجائے کپڑوں والی الماری میں گھسا دیں۔ پھر وہ خود ہی سٹپٹائی اور ترتیب کو درست کیا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل ایک دم رونے کو چاہا۔ وہ تو ایسی نہیں تھی۔ سخت ترین حالات میں بھی خود کو سنبھالے رکھتی تھی۔ نہ آنکھ نم ہونے دیتی تھی نہ چہرے پر بے چارگی آنے دیتی تھی۔ رنگ والی کی وڈی چوہدرانی کی طرح اپنا سر اونچا اور دل مضبوط رکھتی تھی۔ مگر آج صورتِ حال کچھ مختلف تھی..... نامعلوم وجوہ کی بناء پر آنسوؤں کا تندریلا آنکھوں کے بند توڑ دینا چاہتا تھا۔ وہ باتھ روم میں چلی گئی اور رونے لگی۔ گرم ابلتے ہوئے آنسوؤں نے بڑی خاموشی سے اس کے چہرے کو تر بتر کیا۔

زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ رو رہی تھی اور اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ کیوں رو رہی ہے۔ کچھ دیر بعد دل کا بوجھ ہلکا محسوس ہونے لگا۔ وہ اچھی طرح چہرہ دھو کر باہر آ گئی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں مہناز جاگ نہ گئی ہو لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی یہاں پہنچ جاتی۔ کمرے میں اور ارد گرد بدستور ہُو کا عالم طاری تھا۔ رونے کے بعد شانی کی طبیعت میں عجیب طرح کا سکون آ گیا تھا۔ کل شانی نے رستم کا لباس دیکھا تھا۔ وہ کافی گندہ تھا۔ اسے بدلے جانے کی ضرورت تھی۔ ایک دھلی ہوئی قمیص تو شانی کو نظر آئی لیکن اس کے ساتھ ہم رنگ شلوار نہیں ملی۔ دوسری قمیص کی شلوار تو موجود تھی مگر قمیص کی جیب اُدھڑی ہوئی تھی اور گریبان کے بٹن بھی نہیں تھے۔ پتا نہیں کیوں شانی کا دل چاہا کہ وہ رستم کے آنے سے پہلے اس کے کپڑے پہننے کے لئے تیار کر دے۔ اس نے الماری سے سوئی دھاگہ تلاش کیا اور بٹن ڈھونڈ کر انہیں قمیص پر ٹانکنے کے بعد ادھڑی ہوئی جیب کو درست کیا۔ اب استری کا مرحلہ تھا۔ استری یہاں کوئلوں والی استعمال ہوتی تھی۔ شانی کچن میں گئی۔ مہناز، اکرم چوہدری، بلال، فرید بدستور گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ یہاں اسے کون دیکھ رہا تھا۔ شانی نے انگیٹھی میں پختہ لکڑی جلا کر کوئلے بنائے اور ایک چمٹے کی مدد سے انہیں استری میں رکھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ رستم کے دھلے ہوئے کپڑے استری کر رہی تھی۔ بعد میں ایک دو جوڑے اس نے نادیہ کے بھی استری کر ڈالے۔ اس دوران میں قریبی کمرے سے مہناز کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ شانی نے رستم کا جوڑا الماری میں لٹکایا اور کچن میں آ گئی۔ مہناز کے کچن میں پہنچنے سے پہلے اس نے چائے تیار کر لی۔

اب مہناز کو ناشتہ بنانے کی جلدی تھی۔ وہ بولی۔ ’’آج کافی دیر ہو گئی ہے۔ ابھی رستم

آ جائے گا اس نے رات کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ پتا نہیں کیوں اپنی طرف سے اتنا لاپرواہ ہو رہا ہے۔'' شانی نے چونک کر مہناز کی طرف دیکھا جیسے اس کے تاثرات جاننا چاہ رہی ہو کہ کہیں مہناز، رستم اور اس کے حوالے سے کچھ جانتی تو نہیں ہے لیکن مہناز کے تاثرات سے کچھ بھی اندازہ نہیں ہوا۔

مہناز آٹا گوندھ رہی تھی جب کمرے میں ننھے ٹیپو نے رونا شروع کر دیا۔ مہناز اس کے پاس گئی۔ معلوم ہوا کہ اس کے کان میں درد ہو رہا ہے۔ مہناز اس کی دیکھ بھال میں لگ گئی۔ شانی نے اس سے کہا۔ ''چلو تم بچے کو دیکھو، میں ناشتہ بناتی ہوں۔''

''نہ بھئی نہ۔'' مہناز نے جلدی سے کہا۔ ''کیوں میرے بندے سے مجھے چھینٹی لگوانی ہے۔ تم ہماری خاص الخاص مہمان ہو۔ تم سے روٹیاں پکواؤں گی تو سب ڈنڈا لے کر میرے دوالے ہو جائیں گے۔''

''میں اپنی خوشی سے کر رہی ہوں۔ اس میں ایسی کون سی بات ہے۔''

ایک دو منٹ تک دونوں میں خاصی بحث ہوئی۔ آخر شانی نے اپنی بات منوالی۔ ٹیپو بھی مسلسل روتا رہا تھا۔ مہناز اس کے پاس چلی گئی۔

شانی ناشتہ تیار کرنے لگی۔ لاہور میں لفافہ میکر ''جنتے'' اور اس کے بیٹے گلابے کا گھر چھوڑنے کے بعد شانی نے کوئی گھریلو کام نہیں کیا تھا۔ آج اتنے دن بعد ناشتہ تیار کرتے ہوئے اسے عجیب لگ رہا تھا اور بہت اچھا بھی۔ پتا نہیں کیوں اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ رستم کے لئے کر رہی ہے۔ ایک بار پھر اس سے جدا ہو جانے سے پہلے، وہ اپنے ہاتھوں سے اس کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہے۔ روزمرہ کے چھوٹے موٹے معمولی کام۔ کیا خبر پھر کبھی [illegible] ایسا موقع ملے یا نہیں۔ وہ ایک دو آخری اور بہت ضروری باتیں بھی رستم سے کہنا چاہتی تھی۔ اسے امید تھی کہ اگلے ایک دو دن میں اسے یہ باتیں کہنے کا موقع ضرور مل جائے گا۔

اس نے بڑی چاہتوں سے پرتوں والے پراٹھے بنائے، انڈوں اور پیاز کا آملیٹ بنایا اور ساتھ میں رستم کا پسندیدہ سوجی کا حلوہ بھی تیار کیا۔ کچھ دیر بعد رستم اور بلاول ساتھ ساتھ آتے دکھائی دیئے۔ بلاول رستم کے ساتھ بہت گھل مل گیا تھا۔ وہ اکثر رستم کے ساتھ ہی نظر آتا تھا۔ وہ خوش گفتار اور بے تکلف شخص تھا۔ اس کی دلیری اور ہمت بھی ہر شبے سے بالاتر تھی۔ اگلے ڈیرے سے روانہ ہونے کے بعد جب ان کا واسطہ آوارہ گردوں کی ٹولی سے پڑا تھا، بلاول نے دراج کے ساتھ مل کر جی داری سے مقابلہ کیا تھا۔ اس واقعے میں بلاول کی

حاضر دماغی بھی کھل کر سامنے آئی تھی۔

رستم، فرید اور بلاول ناشتہ کرنے لگے۔ وہ برآمدے میں ایک چٹائی پر بیٹھے تھے۔ شانی باورچی خانے کی کھڑکی میں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں رستم پر تھیں۔ رستم کے لمبے بالوں کی کچھ لٹیں اس کے استخوانی چہرے پر جھول رہی تھیں۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے وہ سو نہ سکا ہو۔ وہ بہت بے دلی سے کھا رہا تھا اور چھوٹے چھوٹے لقمے لے رہا تھا۔ شانی کھڑکی کی اوٹ سے اسے دیکھتی رہی۔ یوں لگتا تھا کوئی بہت بڑا بوجھ ہے جو رستم کو روند رہا ہے۔

کیا واقعی ایسا تھا؟ یا شانی کو محسوس ہو رہا تھا......؟

''کیا دیکھ رہی ہو شانی؟'' عقب سے مہناز کی آواز ابھری۔

شانی ٹھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ''کچھ نہیں...... بس...... یونہی کھڑی تھی۔''

وہ عجیب نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر زیر لب مسکرا کر ہولے سے بولی۔ ''سچ کہتے ہیں، عورت زندگی میں ایک ہی دفعہ پیار کرتی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب تم جانتی ہو شانی اور تھوڑا بہت میں بھی جانتی ہوں۔ فرید نے مجھے بتایا تھا۔ اخبار میں بھی تمہارے، اور رستم کے بارے میں کچھ باتیں آئی تھیں۔ پرانے اخبار اس ڈیرے تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔''

شانی کو تھوڑا سا غصہ آیا لیکن مہناز کے لہجے میں پیار، ہمدردی اور دانائی کی ایسی لہر تھی کہ وہ اپنے غصے کا اظہار نہ کر سکی۔

مہناز بولی۔ ''تمہاری طرح میں بھی عورت ہوں۔ عورت کی مجبوریاں سمجھتی ہوں۔ تمہارے خاندان کی عزت تھی، تمہارے بزرگوں کی نیک نامی تھی اور بات صرف تمہارے میکے کی ہی نہیں تھی۔ تمہارے سسرالی بھی تم پر پورا حق جتا رہے تھے اور پھر شاید تمہاری قسمت کا پھیر تھا کہ تمہیں پیار بھی ایک ایسے مرد سے ہوا جو لوگوں کی نظر میں ڈاکو، قاتل تھا...... تمہاری جگہ کوئی بھی دلیر سے دلیر عورت ہوتی، وہ اس پیار میں بس ایک حد تک ہی جا سکتی۔''

شانی اب بھی جواب میں کچھ نہیں کہہ سکی۔

مہناز سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ایک موقع پر تم نے اس حد کو توڑا بھی ہے۔ کٹھولی کے میلے میں سینکڑوں لوگوں کے سامنے تم نے خود کو رستم پر گرایا اور اس کے حصے کی لاٹھیاں اپنے پنڈے پر کھائیں۔ وہ بڑی جرأت والا کام تھا لیکن...... لیکن یہاں تم سے ایک غلطی بھی ہوئی شانی کم از کم میں تو اسے غلطی ہی سمجھتی ہوں۔ تم پتا نہیں کیا

سمجھتی ہوں؟''

''کون سی غلطی؟'' شانی نے ہولے سے پوچھا۔

''جب کٹھولی کے میلے والا سارا واقعہ ہوگیا تو پھر ہر چیز کھل کر سامنے آگئی۔ تمہارے اور رستم کے پیار کے بارے میں کسی کے دل میں کوئی شک شبہ بھی باقی نہ رہا۔ جب کٹھولی کے میلے والی خبر ہم تک پہنچی تو میرا اور فرید کا خیال تھا کہ اب تم دونوں کو ایک دوسرے کے سہارے کی سخت ضرورت ہے بالکل جس طرح ایک موقع پر مجھے اور فرید کو ضرورت تھی۔ ہمارے اور تمہارے حالات میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا شانی۔ سمجھو کہ یہ بھی ایک شریف گھر کی لڑکی اور ایک اشتہاری مجرم کے پیار کی کہانی ہے۔ اس وقت میں نے اپنے طور پر ایک فیصلہ کیا تھا اور ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے فرید کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ تم اور رستم ایک ہو جاؤ گے لیکن پھر پتا چلا کہ رستم کسی اور لڑکی کے ساتھ پوٹھوہار کی طرف آیا ہے اس کے بعد ''

''دیکھو مہناز آپا، یہ میرے ذاتی فیصلے ہیں اور ذاتی زندگی کے بارے میں فیصلے ہر کوئی کر سکتا ہے۔'' شانی کا لہجہ روکھا تھا۔

''تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے شانی! لیکن میں اس غلطی کی بات کر رہی ہوں، جو میرا خیال ہے کہ تم سے ہوئی ہے۔ میری رائے میں یا تو کٹھولی میلے والا واقعہ نہیں ہونا چاہئے تھا یا پھر اس وقت رستم کے ساتھ نادیہ کے بجائے تمہیں ہونا چاہئے تھا۔ میری بات کا بُرا نہ ماننا۔ میں صرف ''بڑی'' ہونے کی حیثیت سے اپنے دل کی بات تم سے کہہ رہی ہوں۔''

شانی خاموش رہی، اس کے چہرے پر ناراضگی کے آثار تھے۔ وہ مہناز کو کیسے بتاتی کہ وہ اتنی پتھر نہیں ہے جتنا اسے سمجھا جا رہا ہے اور اگر پتھر ہے تو بھی مہتر بستی میں گونجنے والے ایک محبت بھرے گیت کی حرارت میں یہ پتھر پگھل گیا تھا۔ ہزاروں ہونٹوں نے ہم آہنگ ہو کر کہا تھا، من جا پیاری من جا...... اور وہ ساری مصلحتوں اور اندیشوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے دل کو منانے میں کامیاب ہوگئی تھی لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ حالات کو کہیں سے کہیں لے گیا۔ پھر اسے اپنے بزرگوں کی یہ نہایت وزنی دلیل ماننا پڑی کہ اگر وہ رستم کے ساتھ رہی اور اس کا ساتھ دینے کی کوشش کرنے لگی تو وہ پولیس کے مہلک ترین گھیرے سے نکل نہیں سکے گی اور پھر وہ کچھ کہے سنے بغیر چلا گیا تھا اور اب چند ماہ گزرنے کے بعد شانی کو محسوس ہونے لگا تھا کہ جو کچھ ہوا بے شک بہت غم ناک تھا لیکن شاید یہی واحد راستہ تھا۔

شانی نے جوہر آباد اور رنگ والی میں عام لوگوں کی تکلیفیں اور دکھ دیکھے تھے۔ اس نے وہاں جاہلیت اور توہم پرستی کے وہ مہیب سائے دیکھے تھے جن کے ڈانڈے پیر قدرت اللہ اور

اس کے چیلے چانٹوں سے ملتے تھے۔ یہ سب کچھ اسے بے حد عجیب اور بے حد ناقابلِ قبول لگا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے حیرانی بھی ہوئی تھی۔ اس نے رنگ والی کی حویلی میں 20 سال گزار دیئے تھے لیکن وہ اپنے اردگرد کے حالات کی گہرائی میں نہیں اُتر سکی تھی۔ ان دکھوں کی اصل کاٹ محسوس نہیں کر سکتی تھی جنہوں نے ''عام شخص'' کو لہولہان کر رکھا تھا۔ پتا نہیں کیوں شانی کے دل و دماغ میں یہ بات سمائی تھی کہ اپنی ماں (وڈی آپا) کی طرح اسے بھی ان لوگوں کے لئے جینا ہے۔ زندگی کاٹنے کا کوئی بہانہ تو ہونا چاہئے تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ اس بارے میں مہناز سے کچھ کہتی، ایک شخص باورچی خانے کی طرف آیا اس نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''کیا بات ہے؟'' مہناز نے اندر سے پوچھا۔

''بھرجائی! لالہ صاحب کہتے ہیں اگر بی بی جی نے چوہدری کے لڑکے سے ملنا ہے تو آجائیں۔ لالہ اور رستم صاحب اُدھر ہی جا رہے ہیں۔''

''کیا تم نے کچھ کہا تھا فرید سے؟'' مہناز نے پوچھا۔

''ہاں، میں چوہدری کے بیٹے سے ایک دو باتیں کرنا چاہتی ہوں۔'' شانی اپنی اوڑھنی سنبھالتے ہوئے بولی۔

کچھ ہی دیر بعد شانی، لالہ فرید اور رستم کے ساتھ سرنگوں کی طرف جا رہی تھی۔ شانی کا چہرہ نقاب میں چھپا تھا، فقط آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ لالہ اور رستم شانی سے ایک قدم پیچھے چل رہے تھے۔ راستے میں ملنے والے لوگ احتراماً دائیں بائیں ہٹ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ لوگ سرنگ میں داخل ہوئے۔ دہانے سے تیس چالیس فٹ آگے تک سورج کی روشنی جاتی تھی۔ اس سے آگے تاریکی میں دن کے وقت بھی لالٹین اور گیس لیمپ وغیرہ روشن تھے۔ وہ اس کوٹھڑی تک پہنچے جسے آہنی جنگلے کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک حصے میں حشام اور دوسرے میں اس کے بیٹے کو رکھا گیا تھا۔ فی الوقت صرف بیٹا ہی نظر آ رہا تھا۔

لالہ نے بتایا۔ ''حشام مرہم پٹی کے لئے ڈاکٹر ناصر کی طرف گیا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں آجائے گا۔''

شانی نے کہا۔ ''وہ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے تک نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔''

''جیسے آپ کہیں بی بی!'' لالہ نے کہا اور آگے جھک کر دروازے کا قفل کھول دیا۔

راجو جو مردانہ شلوار قمیص میں تھا اور دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی ٹھوڑی اور کانوں کے نیچے داڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ یہی حال اس کے سر کے بالوں کا بھی تھا۔ وہ خاصا کمزور اور لاچار نظر آ رہا تھا۔ اس نے شانی کو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ بہرحال اس

نے شدید حیرت ظاہر نہیں کی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ چوہدری حشام نے اسے یہاں شانی کی موجودگی کے بارے میں تھوڑا بہت بتا دیا ہے۔

شانی اندر گئی تو وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ تاہم اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ شانی اس کے قریب ہی میلی کچیلی چٹائی پر بیٹھنے لگی تو رستم نے جلدی سے کہا۔ ''ٹھہریں بی بی!'' اس نے اپنے کندھے کی چادر اُتار کر شانی کی طرف بڑھائی تاکہ وہ اسے نیچے بچھا سکے۔ شانی نے شکریہ کے ساتھ چادر واپس کر دی اور راجو کے قریب تھوڑی سی جگہ اپنی اوڑھنی کے پلو سے صاف کر کے وہیں چٹائی پر بیٹھ گئی۔

''کیسے ہو راجو؟'' شانی نے اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش رہا۔ اس کے چہرے کا رخ شانی کی طرف نہیں پتھریلی دیوار کی طرف تھا۔

''میں تم دونوں کو یہاں سے لے جانے کے لئے آئی ہوں راجو! مجھے پوری امید ہے ہم ایک دو دن میں واپس روانہ ہو جائیں گے۔''

اب راجو نے ذرا سا چونک کر شانی کی سمت دیکھا۔ شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں راجو! بس دو بندوں کا انتظار ہے، وہ میانہ گئے ہوئے ہیں جیسے ہی وہ واپس آتے ہیں، ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔''

پھر شانی چونک گئی، راجو کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرے۔ وہ بہت غم زدہ نظر آتا تھا۔ کسی جذبے سے مغلوب ہو کر شانی نے راجو کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ اور شدت سے رونے لگا۔ بس آنسو گر رہے تھے آواز نہیں آ رہی تھی۔ اس کا سر شانی نے اپنے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔

یہ لڑکا اس چوہدری زادے سے مختلف تھا جس سے شانی کی ملاقات چند ماہ پہلے میانہ کی حویلی میں ہوئی تھی۔ وہ تو چمکیلے لاچے کُرتے میں ملبوس، غرور کے نشے میں ڈوبا ہوا، زمین کو اپنے پاؤں سے روندتا ہوا چلتا تھا۔ نوعمری میں ہی اس کی آنکھوں میں ہر وقت سرخ ڈورے تیرتے تھے اور اپنے اردگرد موجود جوان نوکرانیوں کو وہ کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا تھا۔ حشام کی حویلی کا وہ حصہ اس چوہدری زادے کے لئے جنس کا اکھاڑہ تھا۔ وہ وہاں جس وقت اور جس سے چاہے کشتی لڑنا شروع کر دیتا تھا۔ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ اسے روک سکے۔ صفیہ جیسی نہ جانے کتنی خوبرو لڑکیاں اس کم عمری میں ہی راجو کے ہاتھوں روندی گئی تھیں۔ آج فرعون صفت چوہدری کا یہ بے لگام و سرکش بیٹا واقعی ایک نوعمر لڑکا نظر آ رہا تھا۔ حالات کی سختی و بے رحمی نے اسے اذیت کی بھٹی میں تپایا تھا اور اس کے اندر کا بہت سا میل کچیل اس کے جسم سے علیحدہ کر دیا تھا۔

شانی نے ایک ہاتھ سے اس کا سر اپنے شانے سے لگائے رکھا اور دوسرا ہاتھ اس کی پشت پر پھیر کر اسے دلاسا دیتی رہی..... رستم اور لالہ اسے یہاں چھوڑ کر واپس جا چکے تھے۔ صرف بڑی بڑی مونچھوں والا ایک کرخت صورت رائفل مین دروازے سے باہر نگرانی کے لئے کھڑا تھا۔

یہی کوٹھڑی تھی جس میں راجو کو کئی روز تک اذیت کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اسے عورتوں والے کپڑے پہننے پر مجبور کیا گیا تھا۔ غالباً اسے چوہدری حشام کی طرح جوتے میں پانی وغیرہ پینے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا لیکن مار پیٹ تو یقیناً اس کے ساتھ بھی ہوئی تھی۔ شانی کو اس کے ہاتھوں اور کلائیوں پر نیل نظر آئے۔ پاؤں پر بھی ضربات اور سوجن کے آثار تھے اس کا لباس بے حد خستہ ہو چکا تھا۔ نہانے کی سہولت نہ ہونے کے سبب جسم سے بُو اٹھ رہی تھی۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ راجو سے بات چیت کرنے کے لئے یہ کوٹھڑی اور یہ ماحول ہرگز مناسب نہیں ہے۔

اس نے باہر کھڑے کرخت چہرہ موچھل کو اشارے سے بلایا۔ وہ بڑے احترام سے نگاہ جھکائے ہوئے اندر آ گیا۔ شانی نے اسے ہدایت کی کہ وہ راجو کے نہانے اور اس کے کپڑے وغیرہ بدلنے کا انتظام کرے۔

قریباً ایک گھنٹے بعد شانی اور راجو ایک بار پھر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ تاہم اس مرتبہ یہ پہلے والی کال کوٹھڑی نہیں تھی۔ یہ دو نمبر سرنگ کا ایک اور حصہ تھا۔ یہ ایک صاف ستھرا کمرہ تھا، یہاں دیواروں کو پلاستر کیا گیا تھا۔ الماریوں میں کچھ دوائیں وغیرہ رکھی تھیں۔ یہ غالباً مرغیوں اور مویشیوں کے استعمال کی دوائیں تھیں۔ یہاں فرش پر دری بچھی تھی اور لکڑی کی دو تین کرسیاں رکھی تھیں۔ شانی اور راجو کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ راجو بہتر حالت میں دکھائی دیتا تھا۔ جب شانی نے اس سے پوچھا کہ اس نے یہاں آنے سے پہلے کوکب کو تلاش کرنے کی کوشش کی؟ تو وہ بولا۔ ''پچھلے دو تین مہینوں میں یہی تو کرتا رہا ہوں۔ دو تین بار پاک پتن شریف بھی گیا ہوں۔ کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ پتا نہیں اس کے ماں باپ اسے لے کر کہاں چھپ گئے ہیں۔'' راجو کے لہجے میں افسردگی تھی۔

''کہتے ہیں راجو کہ ڈھونڈنے والے کو رب بھی ملتا ہے۔ تم اگر واقعی کوشش کر رہے ہو تو پھر تمہیں بھی کوکب مل جائے گی۔''

''کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ شاید وہ بدل گئی ہے۔ پاک پتن میں جہاں وہ رہتی تھی، وہاں ساتھ والے گھر میں اس کی ایک سہیلی بھی تھی۔ وہ ہم دونوں کے چکر کے بارے میں

سب کچھ جانتی تھی۔ کوکی اسے اپنا اتا پتا بتا سکتی تھی۔ وہ اسے بھی کچھ بتا کر نہیں گئی۔ شاید اس لئے کہ میں کہیں ڈھونڈتا ہوا اس تک نہ پہنچ جاؤں۔''

''لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں راجو کہ وہ تم سے پیار ہی نہیں کرتی۔ ہوسکتا ہے کہ اسے گھر چھوڑتے وقت اتنا موقع ہی نہ ملا ہو یا پھر اس کے ماں باپ نے اسے سختی سے منع کر دیا ہو۔ تمہیں بتایا تھا نا راجو کہ لڑکیوں کی بہت مجبوریاں ہوتی ہیں۔ انہیں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے بار بار سوچنا پڑتا ہے۔ بے شمار باتوں کو دھیان میں رکھنا پڑتا ہے۔''

''پھر اب میں کیا کروں۔ میں اخبار میں اشتہار دینے سے تو رہا۔ مم..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے۔ کسی وقت تو دل کرتا ہے کہ خود کو پستول سے گولی مار لوں۔'' وہ ایک دم آزردہ ہوگیا۔ آنکھیں بھر آئیں۔

''پھر وہی مایوسی اور بے وقوفی کی باتیں۔'' شانی نے اسے ڈانٹا۔ ''میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ تمہارا کام کوشش کرنا ہے اور کوشش کا مطلب صرف اسے ڈھونڈنا ہی نہیں۔ اپنے آپ کو بدلنا بھی ہے۔ کیا تم نے خود کو بدلنے کی کوشش بھی کی ہے؟''

راجو نے سر جھکا لیا۔ ''میں کیا پوچھ رہی ہوں۔ تم اپنے اندر کوئی تبدیلی لائے ہو؟'' شانی نے کہا۔

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ''اور کیا تبدیلی لاؤں۔ سب کچھ تو چھوڑ دیا ہے۔۔ چار مہینے ہوگئے ہیں نشے والے سگریٹ کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اب تو خالی سگریٹ بھی چھوڑ دیا ہے۔ وی سی آر کی اور گانوں کی ساری کیسٹیں نہر میں پھینک دی ہیں۔ اس کنجری کو بھی واپس بھیج دیا ہے جو اپنے (چوہدری حشام) نے میرے ساتھ چھوڑی ہوئی تھی۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''اور وہ نوکرانیاں جو ہر وقت تمہارے آگے دوالے رہتی تھیں؟''

''ان میں سے بس دو تین ہی ہیں۔ پر اب.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگیا تاہم اس کی بات شانی کی سمجھ میں آگئی۔

شانی کچھ دیر غور سے راجو کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ واقعی بدلا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کی کمزوری چمک اس کے اندر ہونے والی صفائی کی گواہی دے رہی تھی۔ شانی کے ہونٹوں پر ایک غیر محسوس مسکراہٹ آگئی۔ وہ بولی۔ ''اگر تم ٹھیک ہوگئے ہو راجو تو سمجھو کہ سب کچھ ٹھیک ہوگیا ہے۔''

وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ شانی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''شاید تمہارے دماغ میں آیا ہو کہ خود کو تبدیل کرنے کا یہ کیسا صلہ ملا ہے تمہیں۔ بجائے اس کے کہ کوکب کے بارے میں تمہاری پریشانیاں دور ہوتیں، تمہیں اور طرح کی مصیبتوں نے جکڑ لیا ہے۔ تم اپنے گھر اور گھر والوں سے دور یہاں اس ویرانے میں پہنچ گئے ہو اور ہر طرح کے دکھ جھیل رہے ہو۔ تمہارے دماغ میں اٹھتا ہے ناں یہ سوال؟'' راجو چپ رہا۔ اس کی خاموشی اثبات میں جواب دے رہی تھی۔ شانی نے کہا۔ ''یہی تو قدرت کا امتحان ہوتا ہے۔ وہ انسان کے صبر اور حوصلے کی آزمائش کرتی ہے اور جو پورے یقین کے ساتھ اس آزمائش سے گزر جاتے ہیں، خود کو ڈانواں ڈول نہیں ہونے دیتے وہ اپنے دل کی مرادیں پاتے ہیں۔''

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ نیم تاریک سنگ کے کسی دور دراز گوشے سے میوزک کی مدھم آواز ابھرتی رہی۔ کمرے سے باہر رائفل بردار موچھل کسی مجسمے کی طرح ساکت اور باادب کھڑا رہا۔ آخر راجو اپنے سر کے گیلے بالوں کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔''

''لیکن میری سمجھ میں آرہا ہے۔'' شانی ترنت بولی۔ ''میرا خیال ہے تمہاری آزمائش کی گھڑیاں ختم ہو رہی ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

شانی نے زیر لب مسکرا کر گہری سانس لی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولی۔ ''تمہارا ابا جب مجھے پکڑ کر اپنی حویلی میں لایا تھا تو میرے ساتھ ایک بالکل چھوٹے قد کا بندہ بھی تھا۔ اسے ڈولا کہتے ہیں۔ تم بھی یقیناً اسے جانتے ہو۔''

راجو نے شانی کی طرف دیکھا پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''جانتے ہو وہ بندہ کہاں سے آیا ہے؟''

''کہاں سے؟''

''اسی لڑکی کی طرف سے جس کے بارے میں تمہارا خیال ہے کہ وہ تمہیں بھول چکی ہے یا اس نے تم سے پیار ہی نہیں کیا تھا۔''

''تت..... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''وہ بندہ جسے ہم ڈولا کہتے ہیں، تمہاری کوکی کی طرف سے آیا ہے۔ تمہیں دربدر ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ اس لئے کہ کوکی کو تمہارے چھوڑے نے بستر سے لگا رکھا ہے۔ وہ تمہارے غم میں بیمار ہے۔ تمہیں دیکھنے کے لئے ترس رہی ہے۔''

راجو حیرت سے شانی کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ ''تمہیں کس نے بتایا ہے یہ سب

کچھ؟'' راجو نے پوچھا۔

''خود ڈولے نے۔ حویلی میں تمہارے باپ نے اسے میرے ساتھ ہی بند کر دیا تھا۔ میری طرح اسے بھی بہت مارا پیٹا گیا تھا۔ زنانہ کپڑے پہنائے گئے تھے۔ سردیوں کی ایک طویل رات میں لالٹین کی روشنی میں بیٹھ کر اس نے مجھے اپنی روداد سنائی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ کوکب اور اس کی بڑی بہن سنبل نے گھر والوں سے چوری اسے تمہاری تلاش میں بھیجا ہے۔ وہ دونوں بہنوں کی بتائی ہوئی نشانیوں کے ذریعے تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔''

''کوکی کا وہ کیا لگتا ہے؟'' راجو نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کوکی کا کچھ نہیں لگتا۔ پر اس بے چارے کو کوکی کی بڑی بہن سنبل اچھی لگتی ہے۔ وہ چپکے چپکے بڑے عرصے سے اسے چاہتا ہے۔ کوکی تمہارے غم میں بیمار تھی اور اس کی بیماری نے سنبل کو بے حال کر رکھا تھا۔ ڈولے سے یہ سب دیکھا نہیں گیا۔ وہ تمہیں تلاش کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔''

''ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ اسے کوکی نے میری تلاش میں بھیجا ہے۔''

''بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ تمہاری جدائی میں بستر سے لگی ہوئی ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر ڈولا تمہیں ڈھونڈنے نکلا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوا ناں کہ اس کی وجہ سے ڈولا تمہاری کھوج میں نکلا ہوا ہے اور پھر تمہیں ڈھونڈنے کے لئے ڈولے کو جو ایک دوسرا غ دیئے گئے ہیں وہ کوکی اور سنبل نے ہی تو دیئے ہیں۔ ان بے چاریوں کو بس اتنا پتا تھا کہ تمہارا ایک بڑا بھائی کپڑے کی ایک بڑی مل کا مالک ہے۔ یہ مل لاہور کے قریب جی ٹی روڈ کے ساتھ ہے اور اس کے ساتھ دوائیاں بنانے کا مشہور کارخانہ ہے۔''

شانی کو راجو کے چہرے پر عجیب سی روشنی نظر آئی۔ اس کی بجھی بجھی آنکھیں بھی جیسے کسی اندرونی احساس سے دمک اٹھیں۔ اس نے پُر امید نظروں سے شانی کو دیکھا اور بولا۔

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ڈولا کوکی کا پتا جانتا ہے؟''

''تو اس کا اور مطلب کیا ہو سکتا ہے؟''

''مجھے ابھی تک تمہاری بات کا یقین نہیں آ رہا۔'' اس نے بچوں کے سے انداز میں کہا۔

''میانہ پہنچنے کے بعد تمہیں یقین کرنا پڑے گا۔''

''ہم..... کب جا رہے ہیں واپس؟'' راجو نے بے ساختہ پوچھا۔ شانی کو پہلی بار اس کے لہجے میں واپسی کی تڑپ محسوس ہوئی۔ اس سے پہلے تو یوں لگا تھا کہ اسے واپس جانے کی خوشی نہیں یا پھر وہ واپسی کی اطلاع پر یقین نہیں کر پا رہا۔

''تمہیں بتایا ہے ناں۔ تھوڑا سا انتظار اور کرنا پڑے گا۔ میں پوری کوشش کر رہی ہوں کہ ہم جلد سے جلد یہاں سے روانہ ہو سکیں۔ تم بس دعا کرو۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر ہمت کر کے بولا۔ ''ڈولے نے اور کیا بتایا ہے اس کے بارے میں؟'' اس کا اشارہ کوکی کی طرف تھا۔

شانی زیر لب مسکرائی۔ ''وہی کچھ بتایا ہے جو تم سننا چاہتے ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ تمہارے وچھوڑے میں بے حال ہے۔ تمہارے انتظار میں ایک ایک گھڑی گن کر گزار رہی ہے۔''

''پر اس کے بابا جی اب کیا کہتے ہیں؟''

''وہ بھی وہی کچھ کہتے ہیں جو تم سننا چاہتے ہو لیکن یہ ساری باتیں میں تمہیں ابھی نہیں بتا سکتی۔ فی الحال بڑی مشکل سے وقت نکال کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ مجھے کئی ضروری کام نبٹانے ہیں۔ کل یا پرسوں پھر تمہارے پاس آؤں گی۔ اس وقت تک تم بالکل فریش ہو جاؤ۔ فریش سمجھتے ہو ناں؟ تازہ بہ تازہ۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ راجو سے مل کر شانی نے ڈاکٹر ناصر کے کلینک کا رخ کیا۔ وہ نادیہ سے ملنا چاہ رہی تھی۔ اسے امید تھی کہ آج ڈاکٹر ناصر اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔

وہ ابھی دو نمبر سرنگ میں واقع کلینک نما گوشے کی طرف جا رہی تھی کہ اسے چند زوردار آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا کہ کوئی شخص خوف زدہ ہو کر کسی دوسرے شخص کو پکار رہا ہے اور کسی کام سے منع کر رہا ہے۔

رائفل بردار موچھل باڈی گارڈز کے انداز میں شانی کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ شانی نے اس سے پوچھا۔ ''یہ کیسی آوازیں ہیں؟''

اس نے ذرا آگے جا کر دیکھا۔ آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ اب یہ ایک کے بجائے دو یا تین آوازیں تھیں۔ شانی نے بھی رائفل بردار کے پیچھے ہی پیچھے قدم بڑھائے۔ ڈیرے کے وسط میں تیس چالیس فٹ اونچی پانی کی ایک پختہ ٹینکی بنائی گئی تھی۔ اس ٹینکی میں ایک بڑے ڈونگی پمپ کے ذریعے پانی چڑھایا جاتا تھا۔ دو افراد جو غالباً ٹینکی کی صفائی وغیرہ کے لئے اوپر چڑھے تھے، ٹیلوں میں ایک شخص کو دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے اور اسے ڈیرے کی طرف واپس بلا رہے تھے۔

وہ شخص ڈیرے سے تقریباً دو سو گز دور موجود تھا اور اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ ٹینکی پر چڑھے ہوئے افراد کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہے۔ شانی نے اس شخص کو غور سے دیکھا اور چونک گئی۔ وہ اس کا ساتھی بلاول تھا۔ شاید وہ چہل قدمی کرتا ہوا ٹیلوں میں آگے نکل گیا تھا اور ایسی جگہ پر تھا جہاں اسے خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ اس دوران میں لالہ فرید بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بھی ہاتھ ہلا ہلا کر بلاول کو واپس آنے کی تاکید کی۔ بلاول محتاط قدموں سے واپس آنے لگا۔

لالہ فرید ایک پہرے دار پر برسنے لگا۔ ''اس طرف کون تھا ڈیوٹی پر؟''

''شاید اسلم تھا جی۔'' پہرے دار نے ڈر کر جواب دیا۔

''اگر اس بندے کو کچھ ہو جاتا تو کون ذمے دار تھا۔ تمہیں پتا بھی ہے کہ یہ لوگ مہمان ہیں۔ انہیں یہاں کی اونچ نیچ معلوم نہیں۔ یہ تم لوگوں کی ذمے داری ہے کہ ان باتوں کا خیال رکھو۔''

ان باتوں کے دوران ہی بلاول اعوان دو افراد کے ساتھ واپس پہنچ گیا۔ لالہ فرید نے نرم الفاظ میں اسے سمجھایا کہ ڈیرے سے زیادہ دور جانا خطرناک ہے۔ خاص طور سے جس سمت پر وہ جا رہا تھا، وہاں بارودی سرنگیں ہیں اور بارودی سرنگیں جو حشر کرتی ہیں اس کا تماشا تو تین دن پہلے سب نے دیکھ ہی لیا تھا۔''

بلاول کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اس نے لالہ سے معذرت کی۔ لالہ نے وہیں کھڑے کھڑے اسے انگلی کے اشارے سے بتایا کہ کون کون سے ٹیلے محفوظ ہیں اور کس کس سمت جانا خطرناک ہے۔

بلاول نے کہا۔ ''کیا ایسا ممکن نہیں کہ خطرناک جگہوں پر خبردار کرنے کے لئے کچھ ایسی نشانیاں لگا دی جائیں جن کا صرف مقامی لوگوں کو پتا ہو۔''

''یہ تجویز بُری نہیں۔'' فرید نے کہا۔ ''اس بارے میں ہم نے بھی سوچا تھا اور ہو سکتا ہے اس پر عمل بھی کیا جائے۔ اندھیرے میں یا آندھی بارش میں اس سے پہلے بھی دو دفعہ اس طرح کا حادثہ ہوتے ہوتے رہا ہے۔''

''لوگ کہتے ہیں کہ بارودی سرنگیں بچھانا آسان ہوتا ہے لیکن ان سے بچنا اور انہیں ختم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ فوج میں اس کے لئے باقاعدہ نقشے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔''

''خیر ایسی بات نہیں، نقشہ تو یہاں بھی بنایا گیا ہے اور باقاعدہ ہر چیز کا ریکارڈ رکھا گیا ہے۔'' لالہ فرید نے کہا۔

اسی دوران میں رستم اور حسنا گجراتی بھی وہاں پہنچ گئے۔ ہفتے والے حادثے کی بات ہونے لگی جس میں حشام کے نوکر کے پرخچے اُڑ گئے تھے۔ لالہ فرید نے رستم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک دفعہ تو ہماری جان ہی نکل گئی تھی۔''

''کیا مطلب؟''

''جب تم اس بندے کے پیچھے بھاگتے ہوئے آگے نکل گئے تو ایک دو سیکنڈ کے لئے ایسے لگا کہ تم بھی کسی سرنگ پر چڑھ جاؤ گے لیکن پھر تم نے وقت پر بریک لگا لئے۔''

''میں اسے بچانا چاہتا تھا اور آخر وقت تک کوشش کرتا رہا۔ پر ایک جگہ پہنچ کر مجھے رکنا پڑا۔'' رستم نے افسردہ لہجے میں کہا۔

رستم باتیں کر رہا تھا اور شانی چپکے چپکے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ اسے جی بھر کر دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کی صورت، اس کی آواز کو ہمیشہ کے لئے اپنے حافظے میں محفوظ کرنا چاہتی تھی۔ آج کل اس کے دل کی کیفیت کچھ عجیب تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کا ایک باب بند ہونے کو ہے۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت جب شانی، مہناز کے پاس بیٹھی تھی اور نو عمر ٹیپو کی دلچسپ باتیں سن رہی تھی۔ دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ مہناز نے دروازہ کھولا۔ سامنے رستم موجود تھا۔ شانی نے دیکھا اس کے چہرے پر دبا دبا جوش ہے۔ اس کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے شانی سے چار ہوئیں، پھر رستم کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح جھک گئیں۔ عقیدت آمیز محبت کے بوجھ نے نگاہوں کو زمین سے چپکا دیا۔ وہ پُرحرارت لہجے میں بولا۔ ''بی بی جی! آپ کے لئے ایک اچھی خبر ہے۔''

''کیا رستم؟'' شانی اٹھ کر دروازے میں آ گئی۔

''ہمیں اپنے ذریعے سے اطلاع ملی ہے کہ بلی ماروں نے دونوں مطلبے مان لئے ہیں۔ دونوں ڈاکٹروں کو رہا کر کے جوہر آباد عارف کے پاس پہنچا دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زیب اور ڈاکٹر بہروز اس وقت جوہر آباد میں ہیں۔ جوہر آباد کی ساری آبادی انہیں دیکھنے کے لئے جمع ہو گئی ہے۔ لوگ بہت خوش ہیں۔ وہ ڈاکٹر بہروز کو کندھوں پر اٹھا کر جوہر آباد کے ہسپتال تک لے گئے ہیں۔''

''واقعی؟'' شانی کی آواز میں مسرت آمیز کپکپاہٹ تھی۔

''جی بی بی..... اور دوسرا مطالبہ بھی آج شام تک پورا ہو جائے گا..... وہ لوگ شام تک رقم دلاور کے حوالے کر دیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ دلاور اور دراج آج رات تک وہاں سے روانہ ہو کر پرسوں تک یہاں پہنچ جائیں گے۔'' شانی نے خوش ہو کر کہا۔

''جی بی بی۔'' رستم نے تائید کی۔

شانی رستم کے تاثرات دیکھ کر ایک دم چونک گئی۔ خوشی کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں غم کی ایک لہر بھی تھی۔

اس لہر کو محسوس کر کے شانی بھی افسردہ ہو گئی۔ ہاں یہ خوش ہونے کا مقام تھا اور افسردہ ہونے کا بھی۔ جو مہمانوں کی طرح آئے تھے انہیں مہمانوں کی طرح جانا بھی تھا۔ اب ان کا مختصر قیام گزرنے والے ہر پل کے ساتھ ''مختصر تر'' ہوتا جانا تھا اور پھر ایک گھڑی آنی تھی جب ہاتھ خدا حافظ کہنے کے لئے اٹھتے تھے اور نگاہوں نے ایک دوسرے کو الوداعی انداز میں دیکھ کر رخ پھیر لینا تھا اور کون جانتا تھا کہ اس کے بعد ملاقات ہونی تھی یا نہیں۔ جدائیوں کا چناب پوری شدت کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ گزرنے والے ہر پل کے ساتھ اس کا پاٹ زیادہ چوڑا اور اس کا پانی زیادہ طوفانی ہوتا جا رہا تھا۔ ایک کنارے پر رستم ''اندھے بہرے قانون'' کی جان لیوا زد میں تھا۔ دوسری طرف شانی اپنے حالات میں جکڑی ہوئی تھی۔ شانی کے دل میں ایک بار پھر یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ جانے سے پہلے تنہائی میں رستم سے چند باتیں کر لے۔ چند ایسی باتیں جو اس کے دل و دماغ پر پڑے ہوئے نہایت گراں بوجھ کو تھوڑا سا ہلکا ہی کر دیں۔

اگلے روز شانی صبح سویرے نادیہ کو دیکھنے سرنگ میں گئی۔ اس مرتبہ ڈاکٹر ناصر اسے انکار نہیں کر سکا۔ وہ اسے ساتھ لے کر سرنگ کی گہرائی میں چلا گیا۔ یہاں دن کے وقت بھی لالٹینیں اور گیس لیمپ روشن تھے۔ کہیں کہیں مشعل بھی بھڑکتی دکھائی دی۔ یہ جگہیں عجیب و غریب تھیں اور دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ شانی سوچتی تھی کہ اگر ایسی سرنگیں یا ایسے غار انسانی ہاتھوں نے بناتے ہوتے تو شاید ہزاروں افراد کو برسوں تک کام کرنا پڑتا۔ یہ سرنگیں باہر کے موسمی اثرات سے مکمل طور پر محفوظ تھیں۔ یعنی سردیوں میں گرم اور گرمی میں نہایت ٹھنڈی۔ یہ آگے جا کر شاخ در شاخ پھیلتی تھیں کئی جگہ یوں لگتا تھا کہ چھوٹے چھوٹے حجرے یا کمرے بنے ہوئے ہیں۔ کہیں یہ برآمدوں کی شکل اختیار کرتی تھیں اور کہیں مستطیل Halls کی۔ ان کی دیواروں میں شفاف سنگریزے تھے اور کہیں بڑے بڑے پتھر بھی۔ جہاں سنگریزے یا پتھر بھربھرے تھے وہاں انسانی ہاتھوں نے پلاستر وغیرہ کر رکھا تھا۔ آوازیں ان شاخ در شاخ غاروں میں گونجتی تھیں اور کسی کسی جگہ پر حیران کن طور پر قدرتی ہوا کے

جھونکے محسوس ہوتے تھے۔ یہاں بسیرا کرنے والے چونکہ زیادہ تر مرد ہی تھے لہٰذا شراب اور سگریٹ وغیرہ کی بُو واضح طور پر محسوس ہوتی تھی۔ صفائی ستھرائی کا بھی وہ معیار نہیں تھا جو اس دلفریب جگہ پر ہونا چاہئے تھا۔ شانی، ڈاکٹر ناصر اور رائفل بردار موچھل ایک ایسی جگہ سے گزرے جہاں اوپر کسی قدرتی روزن سے سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی۔

تقریباً ایک سو میٹر چلنے کے بعد وہ تینوں ایک ایسی حجرہ نما جگہ پر پہنچے جہاں نادیہ اور رستم موجود تھے۔ نادیہ ایک پتھریلے چبوترے پر گدیلا ڈالے لیٹی تھی اور رستم اس کے پاس قریب بیٹھا گہرے سبز رنگ کا سیب چھیل رہا تھا۔

شانی کو دیکھ کر نادیہ بے قراری سے اٹھ بیٹھی۔ شانی اسے روکتی ہی رہ گئی۔ نادیہ کے پیٹ پر سینے سے ذرا نیچے پٹی بندھی تھی اور پاؤں پر بھی لچک دار پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ اس کی حالت خاصی بہتر لگتی تھی وہ اور شانی باتیں کرنے لگیں۔

شانی قریباً دو گھنٹے نادیہ اور رستم کے پاس رہی۔ اس نے نادیہ سے تو خوب باتیں کیں تاہم رستم سے علیحدہ میں بات کرنے کا یہاں کوئی موقع نہیں تھا۔ شام کو وہ واپس آئی تو اس کی افسردگی بڑھی ہوئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ شاید وہ رستم سے بات کر ہی نہیں پائے گی۔ جونہی دلاور اور دراج واپس آتے انہیں یہاں سے فوراً جانا تھا۔

رات کو جب ٹیپو سو گیا تو شانی نے ہمت کر کے مہناز سے بات کی۔ ''آپا! میں جانے سے پہلے رستم سے چند باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''تو کر لو۔''

''لیکن مسئلہ یہ ہے کہ رستم کے ساتھ ہر وقت کوئی نہ کوئی ہوتا ہے۔''

وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔ ''اس کا حل نکال لیتے ہیں..... کل حسنا، مراد اور مراد گروپ کے کچھ بندے شکار پر جا رہے ہیں..... یہ لوگ کارتوسوں والی بندوق سے خرگوش اور پرندے وغیرہ مارتے ہیں۔ دوپہر دو بجے سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔ میرا خیال ہے کہ رستم ساتھ نہیں جا رہا نادیہ کی وجہ سے۔''

''تو تم رستم کو یہاں بلاؤ گی؟''

''ہاں، اس کے لئے ایک اچھا بہانہ ہے۔ ٹیپو کے کان میں درد ہے۔ جب یہ بیمار ہوتا ہے تو بہت ضد میں کرتا ہے۔ کل سے کہہ رہا ہے کہ چاچو رستم کو بلاؤ اور چاچی نادیہ کو بھی۔ میں نے ان سے باتیں کرنی ہیں، نادیہ تو آ نہیں سکتی لیکن رستم آ جائے گا۔ میں نے کل بھی حنیفاں کے ہاتھ اسے سناں (پیغام) بھیجا تھا۔ کل پھر بھیجتی ہوں۔''

''وہ آگیا تو پھر؟''

''میں اور تم پہلے سے ٹیپو کے پاس بیٹھے ہوں گے۔ وہ جب آئے گا تو میں کچھ دیر بعد ٹیپو کو کسی بہانے باہر لے جاؤں گی۔ کمرے میں تم دونوں اکیلے ہوگے، جو بات کرنی ہوگی کر لینا۔''

سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسے مہناز نے کہا تھا۔ اگلے روز صبح سویرے کچھ لوگ بندوقیں وغیرہ لے کر نکل گئے۔ ان کے پاس پرندے پکڑنے والا ایک بڑا جال بھی تھا۔ بلادل مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے اس ٹولی کے ساتھ تھا۔ لالہ فرید کا پروگرام پہلے تو ڈانوں ڈول نظر آیا لیکن پھر وہ بھی چلا گیا۔ دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے مہناز نے رستم کو پیغام بھیجا اور وہ چلا آیا۔

شانی اور مہناز اس وقت ٹیپو کے سرہانے بیٹھی تھیں۔ ٹیپو کا کان سوجا ہوا تھا اور اسے ہلکا سا بخار بھی ہوگیا تھا۔ رستم کی آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پوری نیند نہیں لے رہا۔ اس کے لمبے بال جو کنگھی کے بغیر ہی بڑے سلجھے ہوئے نظر آتے تھے، بوسیدہ ہو رہے تھے۔ رستم نے اندر آ کر سلام کیا اور پھر ٹیپو کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ٹیپو کے چہرے پر روشنی سی بکھر گئی۔ اندازہ ہوا کہ رستم کی کمپنی اسے اچھی لگتی ہے۔ رستم اس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ اٹھ کر رستم کی گود میں بیٹھ گیا اور رستم کی چھوٹی چھوٹی نرم داڑھی میں انگلیاں چلانے لگا۔

''چاچی نادیہ کیوں نہیں آئی؟'' ٹیپو نے پوچھا۔

''وہ ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ ایک دو دن میں ہو جائے گی۔''

''کیا اس کا بھی کان خراب ہوگیا ہے؟''

''نہیں اس کے پاؤں پر چوٹ آئی تھی۔ تم نے دیکھا تو تھا۔''

''ٹھیک ہے، میں جب تک چاچی شانی سے کھیلوں گا۔''

مہنا نے کہا۔ ''تمہیں بتایا ہے، یہ چاچی نہیں باجی ہے۔ باجی شانی۔''

اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں پھر مہناز باہر گئی اور واپس آ کر بولی۔ ''ٹیپو پانی گرم ہوگیا ہے چلو دو منٹ میں نہا کر واپس آجاؤ۔''

''بخار میں نہلانا ٹھیک رہے گا؟'' رستم نے پوچھا۔

''ناصر نے کہا تھا کہ کوئی حرج نہیں ہے۔''

ٹیپو نے ٹھنکنا شروع کر دیا۔ مہناز اسے اٹھا کر باہر لے گئی۔ کمرے میں رستم اور شانی رہ گئے۔ مطلع صبح سے ابر آلود تھا۔ اب ہلکی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ کمرے کی کھڑکی سے باہر

کھباڑی اور بیری کے پیڑ خاموشی سے بھیگ رہے تھے۔ بکریوں کا ایک چھوٹا سا ریوڑ سرسبز ڈھلوان سے اُتر رہا تھا اور ڈیرے کی طرف جا رہا تھا۔ کچھ دور ایک اونچی چٹان پر ایک سیاہ بادل کسی دیوہیکل پرندے کی طرح منڈلا رہا تھا..... رستم اور شانی خاموش بیٹھے تھے۔ پھر اس خاموشی کو شانی نے ہی توڑا۔ ''رستم! میں جانتی ہوں، تمہارے لئے چوہدری حشام اور اس کے بیٹے کو چھوڑنا آسان نہیں تھا۔ ان لوگوں نے تمہارے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔ تمہارے دوست کی جان لی ہے۔ یہ تمہارے ہاتھوں بدترین سزا کے حق دار تھے۔ میرے کہنے پر تم انہیں چھوڑ رہے ہو، تمہارا یہ احسان میرے دل پر نقش رہے گا۔ میرے دل میں تمہاری عزت اور بڑھی ہے۔''

''بی بی! آپ کا حکم پورا کرنے کے لئے تو میں بڑی سے بڑی آزمائش سے گزر سکتا ہوں۔ یہ تو ایک چھوٹی سی بات تھی۔''

''نہیں رستم! یہ بہت بڑی بات ہے۔ کوئی اور چاہے نہ سمجھے لیکن میں سمجھتی ہوں۔ میرے کہے کا مان رکھنے کے لئے تم نے خود پر بڑا جبر کیا ہے۔''

''آپ شرمندہ کر رہی ہیں بی بی۔''

شانی کچھ دیر خاموش رہی۔ وہ بے خیالی میں کھڑکی سے باہر خاموشی سے بھیگتے ہوئے پیڑوں، ممیاتی ہوئی بکریوں اور چوٹی پر ٹھہرے ہوئے بادل کو دیکھتی رہی پھر ہولے سے بولی۔ ''رستم! میرے دل پر بوجھ ہے۔ مجھے لگتا ہے... میں تمہارے لئے وہ نہیں کر پائی جو مجھے کرنا چاہئے تھا اور تم میرے لئے وہ سب کچھ کرتے رہے جس کی میں حق دار نہیں تھی۔ تم نے میرے لئے بہت کچھ کھویا ہے رستم! میرے لئے بہت کچھ جھیلا ہے۔''

''آپ میرے دکھے ہوئے دل کو اور دکھا رہی ہیں بی بی۔ ... تو اپنے آپ سے سب سے بڑا گلہ ہی یہی ہے کہ میں اپنے حالات سے مجبور ہو کر اور آپ کو خطرے میں چھوڑ کر اپنی زندگی بچانے کے لئے اس ویرانے میں آچھپا ہوں۔ میں اپنے آپ کو جتنی لعنت ملامت کروں وہ کم ہے بی بی۔ آپ... آپ مجھے حکم دیں بی بی! میں آپ کے لئے کیا کروں۔ میری یہ زندگی تو اب ویسے بھی کچھ دنوں کی ہے۔ اگر یہ آپ کے کسی کام آجائے تو میرے لئے مرنا بہت آسان ہو جائے گا بی بی۔''

''ایسی باتیں کر کے مجھے رُلانا چاہتے ہو؟'' شانی نے کہا۔

''نہیں بی بی! میں تو بس حقیقت بتا رہا ہوں۔ اس میں کوئی طنز نہیں، کوئی شکوہ نہیں اور میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ مجھے آپ سے کوئی گلہ شکوہ ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ نے ابھی کہا

ہے کہ میں آپ کو رُلانا چاہتا ہوں۔ اس فقرے میں آپ کی انپائیت کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ کی اس انپائیت کے بدلے میں اپنی کھال آپ کے قدموں میں بچھا سکتا ہوں تو پھر گلے شکوؤں کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔''

''تم کچھ بھی کہو رستم! لیکن میں جانتی ہوں کہ میری طرف سے تمہارے ساتھ کئی زیادتیاں ہوئی ہیں۔ یہ زیادتیاں ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہتی ہیں اور مجھے تکلیف دیتی ہیں۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا اور بولی۔ ''ان میں سے ایک زیادتی وہ..... طمانچہ بھی ہے جو میں نے تمہیں مارا تھا۔ مجھے وہ بات ابھی نہیں بھولی..... اور مجھے پتا ہے، تمہیں بھی بھولی نہیں ہوگی۔''

رستم کا سر کچھ اور جھک گیا۔

شانی نے کہا۔ ''کتنی بیوقوف ہوں۔ غلطی ایک مدت پہلے کی، معافی اب مانگ رہی ہوں لیکن میں جانتی ہوں جب تک معافی نہیں مانگوں گی۔ میرا جیون ایسے ہی حرام ہوتا رہے گا، ہاں رستم۔ میں نے تمہیں بلا وجہ طمانچہ مارا تھا۔ میں اپنی اس غلطی پر شرمندہ ہوں اور.....''

''بی بی! آپ نے بلا وجہ کہاں مارا تھا؟'' رستم نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں نے آپ کے سامنے آپ کے چچا کی برائی کی تھی۔ ان کے خلاف آپ کو بھڑکانا چاہا تھا.....''

''لیکن تم نے جو کیا ٹھیک کیا تھا۔ وقت نے بعد میں ثابت کیا کہ چاچا رئیس واقعی ہماری جڑیں کاٹ رہے تھے۔ ہمیں مصیبتوں میں پھنسا کر انگلینڈ جانے کی تیاریاں کر رہے تھے.....'' رستم نے کچھ کہنا چاہا مگر شانی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کر دیا۔ ''نہیں رستم، سچ کو سچ ہی رہنے دو۔ وہ میری غلطی تھی، میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ مجھے اپنی اس حرکت پر اتنی ندامت ہے کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ پلیز رستم۔''

شانی کی بات سن کر رستم کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ اسے جیسے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس بات کا کیا جواب دے۔

شانی بولی۔ ''میری دوسری بڑی غلطی یہ تھی رستم کہ حویلی میں آگ لگنے کے بعد میں تمہارے ساتھ پنڈی گئی اور پھر پنڈی میں تمہیں کچھ بھی بتائے بغیر ایک دن چپکے سے کہیں نکل گئی۔ میں جانتی ہوں میری اس حرکت نے تمہیں بے حد پریشان کیا تھا۔ تم دیوانوں کی طرح میری تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے، پتا نہیں کہاں کہاں دھکے کھاتے رہے اور میں لاہور میں بیٹھی رہی۔ اپنی اس غلطی کے لئے بھی میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔''

''بی بی ایسا مت کہیں..... خدا کے لئے..... میں اپنی نظروں میں گر رہا ہوں۔''

شانی کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ رستم کی بات کو خاطر میں لائے بغیر بولتی چلی گئی۔ ''میں نے تم سے بہت کچھ لیا ہے رستم اور بدلے میں تمہیں کچھ نہیں دے سکی۔ کچھ بھی نہیں۔ بس تمہارے دکھوں میں اضافہ کیا ہے۔ میری خاطر تمہیں حشام کے بے پناہ تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ تمہارے پیارے دوست آفندی اور گونگے مختار کی جانیں بھی میری ہی خاطر گئیں۔ میری ہی وجہ سے ریاض ہٹلر جیسے قاتل پولیس افسر تمہارے خون کے پیاسے ہوئے اور جب مہتم بستی میں تم ہر طرف سے گھر گئے تو میں نے چپ چاپ اپنا راستہ تمہارے راستے سے الگ کر لیا۔ مجھے اس کے لئے بھی تم سے معافی مانگنی ہے رستم، ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنی ہے۔'' شانی نے باقاعدہ اپنے ہاتھ جوڑ دیئے اور اپنے ہی کندھے میں منہ چھپا کر سسک اٹھی۔

رستم نے تڑپ کر شانی کے ہاتھ تھام لئے لیکن پھر اس نے ہاتھ پیچھے بھی ہٹا لئے۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ اٹک اٹک بار لہجے میں بولا۔ ''خدا کے لئے بی بی! مجھے اتنی تکلیف نہ دیں۔ میں یہ سہہ نہیں سکتا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ جانے کے لئے اٹھ گیا لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ شانی کی اجازت کے بغیر کمرے سے نکل جاتا۔ وہ بت کی طرح کھڑا رہا۔ شانی نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا رکھا تھا اور آنسو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

چند سیکنڈ اسی طرح گزرے۔ پھر شانی نے چہرے سے ہاتھ اٹھائے۔ اس کا چہرہ سرخ گلاب کی طرح تھا اور آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک سچے موتیوں کے لشکارے جیسی تھی۔ اس نے کہا۔

''رستم تم کہیں ملک سے باہر کیوں نہیں چلے جاتے۔ لوگ بارڈر پار کر جاتے ہیں یا پھر لانچ وغیرہ کے ذریعے مسقط، دبئی کی طرف نکل جاتے ہیں۔ تم یہاں رہو گے تو زیادہ دیر پولیس سے بچ نہیں پاؤ گے۔ وہ ریاض ہٹلر بڑا زہریلا بندہ ہے رستم۔ وہ پولیس کی وردی میں بھیڑیا ہے۔ مجھے یقین ہے اگر ایس پی حاجی حیات خان نہ ہوتا تو یہ ریاض ہٹلر تم تک پہنچنے کے لئے کئی درجن بندوں کی جان لے چکا ہوتا اور شاید میں بھی..... ان میں سے ایک ہوتی۔''

رستم کی آنکھوں میں یک بارگی آگ کے کئی الاؤ بھڑک اٹھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گلے اور پیشانی کی رگیں پھول گئیں۔ وہ عجیب لہجے میں بولا۔ ''بی بی! اپنے پہلے سوال کا جواب تو آپ نے خود ہی دے دیا ہے۔ ملک چھوڑ کر اس لئے بھی نہیں جا سکتا کہ ریاض ہٹلر، چوہدری بشیر اور پیر قدرت اللہ جیسے لوگ آپ کے اردگرد موجود ہیں۔ یہ بڑے بے رحم لوگ ہیں بی بی اور ان سے ٹکرانے کے لئے جس بے رحمی اور بے حسی کی ضرورت ہے وہ اب

میرے اندر واپس آچکی ہے۔ دوسری بات آپ نے ریاض ہٹلر کے بارے میں یہ کی ہے کہ وہ آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں بی بی! وہ بہت خطرناک شخص ہے۔ اس کے پیچھے بڑے بڑے ہاتھ ہیں اور پولیس کی پوری فورس بھی ہے۔ عام حالات میں میرے جیسا بندہ شاید اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا لیکن ایک بات میں آپ کو پورے یقین اور ایمان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں..... ہاں بی بی! پورے یقین اور ایمان کے ساتھ۔ اگر اس شخص نے کبھی اپنا ناپاک ہاتھ آپ کی طرف بڑھانے کی غلطی کی تو وہ اس کی زندگی کا بدترین دن ہوگا۔ میری جان رہے نہ رہے لیکن میں اسے بدترین مثال بنادوں گا۔''

رستم کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ شانی سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ اسے لگا جیسے رستم کے لہجے میں کوئی اور بول رہا ہے۔ کوئی وحشی جنونی۔ جو تن تنہا کسی لشکر سے ٹکرانے اور اسے تہہ وبالا کرنے کی ہمت اور طاقت رکھتا ہے۔

شانی نے مناسب سمجھا کہ وہ یہ آگ اگلتا ہوا موضوع بدل دے۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''رستم! مجھے پتا چلا ہے کہ تمہاری ایک بہن اور بہنوئی ہیں۔ پولیس نے ان دونوں پر بھی مقدمے بنا رکھے ہیں۔ تم نے انہیں کہاں چھپا رکھا ہے؟ کیا وہ یہیں پر ہیں؟ میرا مطلب ہے یہاں تمہارے پاس ڈیرے پر؟''

رستم کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ بولا۔ ''بی بی! بہن اور بہنوئی کے بارے میں آپ کو کس نے بتایا؟''

''یہ بات بہت سے لوگوں کو معلوم ہے۔''

''لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو یہ بات حاجی حیات یا ڈپٹی ریاض ہٹلر سے معلوم ہوئی ہوگی اور زیادہ امکان یہی ہے کہ ریاض ہٹلر سے معلوم ہوئی ہوگی۔''

''ہاں۔ ریاض نے مجھ سے اس بارے میں پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ جب میں جیل میں تھی تو وہ میرے پاس آیا تھا اور دیر تک اس بارے میں سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ میں اس بارے میں کچھ جانتی نہیں تھی اور اگر جانتی بھی ہوتی تو ریاض کو اس بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا۔''

''کیا کسی اور نے بھی اس بارے میں آپ سے بات کی؟'' رستم نے پوچھا۔

''جوہر آباد میں مجھے ایک شخص نے بتایا تھا کہ چند برس پہلے تمہارے بہنوئی کا کسی سے جھگڑا ہوا تھا اور یہ جھگڑا اتنا بڑا تھا کہ بات قتل وغارت تک پہنچ گئی تھی۔ تمہاری بہن کو بچاتے ہوئے تمہارے والد قتل ہوگئے تھے اور جواب میں تم نے چوہدریوں کے کئی بندے مار دیئے

تھے۔ اس کے بعد تم باقاعدہ ڈاکوؤں کے ساتھ مل گئے اور اپنے دشمنوں سے سارے حساب چکانے لگے۔''

''ہاں بی بی! ایسا ہی ہوا تھا اور ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے اور رونے پیٹنے کے باوجود انصاف نہیں ملتا تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے۔ میں نے کچھ انوکھا نہیں کیا۔''

شانی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''خیر یہ ایک علیحدہ بحث ہے کہ تمہیں ایسا کرنا چاہئے تھا یا نہیں لیکن فی الوقت میرے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ تمہارے ساتھ تمہاری بہن، تمہارے بہنوئی اور ان کے بچوں کو بھی پولیس اور نارپوریوں سے خطرہ ہے۔ کیا تمہارے خیال میں وہ محفوظ جگہ پر ہیں؟''

''ہاں بی بی، میں نے اپنی طرف سے تو اس بارے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔ انہیں ایک محفوظ ٹھکانہ دیا ہے۔ اس ٹھکانے کے بارے میں میرے دوست زوار کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ زوار کے جسم کی ایک ایک بوٹی علیحدہ کردی جائے تو بھی وہ کسی کو آپوزاہدہ اور بھائی اکرام تک نہیں پہنچا سکتا۔''

کچھ دیر تک اس بارے میں بات ہوتی رہی۔ پھر شانی نے کہا۔ ''رستم! مجھے خوشی ہے کہ تمہاری زندگی میں نادیہ آگئی ہے۔ میں نے کہا تھا ناں کہ وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔ اس کے پیار کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ وہ اپنی خوش حال زندگی کو ایک طرف رکھ کر اور تمہاری ساری تکلیفوں اور مصیبتوں میں حصے دار بن کر تمہارے ساتھ اس خطرناک ویرانے میں موجود ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ نادیہ کو اپنی زندگی میں لانا تمہارا اپنا فیصلہ ہے یا میری خواہش پر تم نے ایسا کیا ہے۔ دونوں صورتوں میں، میں تمہاری بہت بہت شکرگزار ہوں۔ میرے دل ودماغ پر بہت زیادہ بوجھ ہے رستم لیکن جب نادیہ کو تمہارے ساتھ دیکھتی ہوں تو اس بوجھ میں تھوڑی سی کمی آجاتی ہے۔ میری خواہش ہے اور میری دعا بھی ہے کہ تم ایک دوسرے کا سہارا بنو اور اپنی زندگی کو مصیبتوں سے نکالنے میں کامیاب رہو۔''

شانی نے بات مکمل کی تو اسے رستم کے چہرے پر عجیب سا رنگ نظر آیا۔ جیسے کوئی ٹیس اس کے سینے میں اٹھی ہو اور اس کی شدت نے اسے نیم جان کردیا ہو۔ ایک لمحے کے لئے شانی کو یوں محسوس ہوا کہ وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن اس کے ہونٹ ایک دفعہ لرز کر ساکت ہوگئے۔ یہ ہونٹ بولتے بولتے چپ ہوجاتے تھے اور یہ کوئی آج کی بات نہیں تھی، ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ پچھلے برسوں میں کتنے مواقع ایسے آئے تھے جب شانی کو لگا تھا

کہ یہ ہونٹ بہت شدت سے کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن پھران پر لگی ہوئی خاموشی کی مہر برقرار ہی تھی اور ہر بار جب ایسا ہوا تھا، شانی کو لگا تھا کہ ایک اور زنجیر نے اس کے سراپا کو جکڑ لیا ہے۔ اب ایسی اَن گنت زنجیریں شانی سے لپٹی ہوئی تھیں۔ پتا نہیں کیا ناتا تھا رستم کے بند ہونٹوں میں اوران زنجیروں میں۔ یہ بڑی سخت بندشیں تھیں، یہ بڑے بے رحم شکنجے تھے، شانی بظاہر آزاد اور خودمختار ہوتے ہوئے بھی آزاد و خودمختار نہیں تھی۔ خودمختار ہونا تو دور کی بات ہے کسی وقت تو وہ کسمسا بھی نہیں سکتی تھی۔ کبھی کبھی وہ جھنجھلا جاتی تھی۔ وہ اپنے آپ سے لڑنے لگتی تھی۔ وہ کیوں نہیں توڑ سکتی ان تصوراتی بندھنوں کو.....

کھڑکی سے باہر برسنے والی بارش اب مدھم پڑ گئی تھی۔ ٹیلے کی چوٹی پر منڈلاتا ہوا بادل بکھرنے لگا تھا۔ کھباڑی، بیری اور گوندنی کے پیڑ ہوا سے ہولے ہولے جھومنے لگے تھے۔ دوسرے کمرے میں ٹیپو نے شاید نہا لیا تھا۔ وہ رستم کے پاس واپس آنے کی ضد کر رہا تھا۔ مہناز اسے روک رہی تھی اور تولیے سے اس کا جسم صاف کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''کیا ننگا ہی جائے گا۔ کپڑے تو پہن لے بے حیا۔''

شانی سمجھ گئی کہ ملاقات کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ امید تھی کہ اگلے ایک دو دن میں کھیا دراج اور دلاور وغیرہ واپس ڈیرے پر پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد ان سب کی یہاں سے واپسی تھی۔ امید نہیں تھی کہ اب دوبارہ یوں تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملے گا۔ شانی نے کہا۔ ''رستم، تم منہ سے کچھ کہو یا نہ کہو لیکن میں جانتی ہوں تمہاری مجھ سے کچھ توقعات تھیں اور میں مانتی ہوں یہ توقعات بے جا بھی نہیں تھیں۔ تمہیں حق تھا اس انداز میں سوچنے کا۔ میں اپنی مجبوریوں اور کمزوریوں کے سبب ان توقعات پر پورا نہ اُتر سکی۔ تمہیں بالکل ناجائز طور پر دکھ دیئے، آنسو دیئے اور انتظار دیا۔ میں ان سارے دکھوں اور آنسوؤں کے لئے تم سے ایک بار پھر معافی مانگتی ہوں۔ اگر تم میرے لئے دل میں تھوڑی سی بھی جگہ رکھتے ہو تو مجھے سچے دل سے معاف کر دینا۔ کیونکہ میں جانتی ہوں، اگر تم سچے دل سے معاف نہیں کرو گے تو میں غم نہیں بھی چلی جاؤں، کچھ بھی کرلوں، سکون سے جی نہیں سکوں گی۔ زندگی کا یہ سفر اب زیادہ لمبا تو نہیں لگتا لیکن جتنا بھی ہے میرے لئے عذاب جیسا ہے۔ میرے اس سفر کو تم ہی قابلِ برداشت بنا سکتے ہو رستم۔''

''بی بی! مجھے شک تھا کہ آپ نے مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے یہاں بلایا ہے۔ بے شک یہ ایک مشکل اور تکلیف دہ مرحلہ ہے لیکن اسے میرے لئے اور تکلیف دہ تو نہ بنائیں۔ میں آپ سے کچھ مانگ تو نہیں رہا ہوں، نہ مانگ سکتا ہوں لیکن..... لیکن اتنا تو کریں بی بی کہ

مسکراتے ہوئے الوداع کہہ دیں۔''

رستم نے ''الوداع'' کا لفظ اس انداز میں کہا کہ شانی پھر تڑپ گئی۔ وہ آنکھوں میں آنسو اور لہجے میں انتہا درجے کا کرب بھر کر بولی۔ ''رستم! میری بات مان لو۔ تم یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ۔ باڈر پار کر جاؤ۔ یہ لوگ..... یہ لوگ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے ان کے ارادے دیکھے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے خون کی پیاس ہے۔ ڈپٹی ریاض بڑی تیزی سے گھیرا تنگ کر رہا ہے۔ وہ بڑی جلدی یہاں پہنچ جائے گا۔ تم لوگ سرکاری طاقت کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہو؟''

شانی نے بڑے کرب سے رستم کو دیکھا۔ وہ بھی سر اٹھا کر اسی کو دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے کے لئے دونوں کی آنکھیں چار ہیں۔ پھر رستم کے ہونٹوں کے پیچھے ایک بہت پھیکی بالکل غیر محسوس مسکراہٹ ابھری۔ اس نے نظر جھکالی۔ ہولے سے بولا۔ ''ٹھیک ہے بی بی! میں اس بارے میں سوچوں گا۔''

انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ محض بحث سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ بات اس نے ہونٹوں سے کہی ہے، دل سے نہیں۔

''ہائے اللہ چاچی! تم رو رہی ہو؟'' ٹیپو کی آواز نے شانی کو بُری طرح چونکا دیا۔ وہ صاف ستھرے کپڑوں میں اندر داخل ہو رہا تھا۔ بھیگے بال پیشانی سے چپکے تھے۔

شانی نے جلدی سے اوڑھنی کے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔ ٹیپو پہلے کی طرح رستم کی گود میں چڑھ بیٹھا۔ ''چاچو، تم نے رُلایا ہے چاچی شانی کو؟'' وہ معصومیت سے بولا۔

''ہاں میں نے ہی رُلایا ہے۔'' وہ عجیب لہجے میں بولا۔

''تو آپ گندے ہیں؟''

''ہاں گندہ ہوں۔ اسی لئے گندے کام ہوئے مجھ سے۔''

اسی دوران میں مہناز بھی ٹیپو کو آواز دیتی اندر آ گئی۔ ماحول کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے وہ ذرا چونکی، پھر ٹیپو کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے بابا جانی آ رہے ہیں۔ آواز آ رہی ہے ناں گولی کی؟''

ٹیپو نے اثبات میں سر ہلایا۔ ٹیلوں کی طرف سے گاہے بگاہے شاٹ گن چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ لوگ واپس آتے ہوئے شاید پرندوں وغیرہ پر فائر کر رہے تھے۔

''اچھا بھر جائی..... اچھا بی بی جی، میں چلتا ہوں۔'' رستم نے اٹھ کر دونوں کو ایک ساتھ سلام کیا اور الٹے قدموں چل کر باہر نکل گیا۔

شانی گم صم بیٹھی رہی۔ اس کے دل کا ایک گوشہ بالکل ویران اور تاریک ہو گیا تھا۔

کچھ دیر میں شکار پارٹی واپس آ گئی۔ ان لوگوں نے دو بڑے تھیلوں میں شکار کئے ہوئے پرندے اور جنگلی خرگوش وغیرہ بھر رکھے تھے۔ یہ لوگ کہیں سے ایک بڑا خارپشت بھی پکڑ کر لائے تھے۔ اسے ایک جال میں لپیٹا گیا تھا اور اوپر سے نائیلون کی رسی کے بل بھی دیئے گئے تھے۔ بلاول اعوان بھی شکار پارٹی کے ساتھ گیا تھا۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے انجوائے کیا ہے..... شکار کو صاف کرنے اور پکانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شانی کو اس سارے کام میں بالکل دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔ گوشت پکنے کی بُو اسے پریشان کر رہی تھی۔ وہ تھوڑے سے چاول کھا کر جلد ہی سونے کے لئے لیٹ گئی۔ جب دوبارہ اس کی آنکھ کھلی رات گیارہ ساڑھے گیارہ کا وقت تھا۔ مہناز اور ٹیپو بھی سو چکے تھے۔ ایک دم شانی کو احساس ہوا کہ اس کی آنکھ کسی آہٹ کی وجہ سے کھلی ہے۔ شاید کوئی کھٹکا ہوا تھا۔ شاید کوئی بلی یا دوسرا جانور تھا۔ اچانک وہ ٹھٹک گئی۔ اس نے کھڑکی کے سامنے سے ایک پرچھائیں گزرتے ہوئے دیکھی۔ یہ کوئی شخص تھا جو چوروں کی طرح جھک کر چلتا ہوا بڑی تیزی کے ساتھ گزر گیا تھا۔

شانی ایک دم اٹھ بیٹھی۔ اسے خطرے کا احساس ہوا۔ اس کا دل چاہا کہ مہناز کو جگائے۔ اس نے مہناز کی طرف ہاتھ بھی بڑھایا لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔ وہ سارے دن کی تھکی ماندی ابھی ابھی سوئی تھی۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف گئی۔ دروازے اور کھڑکی کی کنڈیاں اچھی طرح چیک کیں۔ کھڑکی کا ایک پٹ کھلا تھا، تاہم لوہے کی گرل موجود تھی۔ اس نے گرل کے ٹھنڈے لوہے سے چہرہ لگایا اور باہر جھانکا۔ باہر ڈیرہ خاموشی اور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر شے محوِ خواب تھی..... بس کسی فاصلے سے کسی بکری یا کتے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ شانی نے جھرجھری سی لی اور کھڑکی کا یہ پٹ بھی اچھی طرح بند کر دیا۔

کافی دیر تک مختلف خیالات اسے پریشان کرتے رہے۔ وہ ایک نہایت غیر محفوظ جگہ پر تھی۔ یہ خطرناک ترین جرائم پیشہ افراد کا ٹھکانہ تھا۔ ان کے تین گروہ تھے اور تینوں ایک سے بڑھ کر ایک خطرناک۔ اگر وہ یہاں اس دور دراز جگہ پر پہنچی تھی تو صرف اس آسرے پر کہ یہاں رستم موجود تھا اور رستم کے ہوتے ہوئے شاید کوئی بھی جگہ اس کے لئے خطرناک نہیں تھی۔ خاصی دیر تک سوچوں میں گرفتار رہنے کے بعد وہ بتدریج پھر نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

دوبارہ اس کی آنکھ دھماکے کی خوفناک آواز سے کھلی تھی۔ یہ شاید پمپ ایکشن گن کا دھماکہ تھا۔ شانی کے ساتھ ہی مہناز بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دونوں نے جلدی سے اپنے سروں

پر اوڑھنیاں کھینچیں۔ ''کیا ہوا آپا؟'' شانی نے گھبرا کر پوچھا۔

''شاید حجرے کے سامنے گولی چلی ہے۔'' مہناز نے جواب دیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک دم کئی افراد کے چلانے کی آوازیں آئیں۔ کمرے کے سامنے بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ مہناز اور شانی ایک ساتھ باہر نکلیں۔ تین چار افراد نے ایک شدید زخمی شخص کو ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا ہوا تھا اور اس سرنگ کی طرف دوڑے جا رہے تھے جہاں ڈاکٹر ناصر کا کلینک تھا۔ سامنے ہی ایک حجرے کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ ایک شخص نے تالا ہاتھ میں اٹھا کر لالہ فرید کو دکھایا۔ ''یہ دیکھیں جی۔ تالا توڑ کر اندر گھسا ہے۔ وہ یہیں کہیں چھپا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسے۔''

لالہ فرید نے پکار کر کہا۔ ''چاروں طرف گھیرا ڈال لو۔ وہ یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتا۔''

ایک شخص نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''ساری لائٹس جلا دو۔''

ابھی اس کا فقرہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ ارد گرد موجود کئی بلب روشن ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی لالٹینیں بھی گردش کرتی نظر آئیں۔ لالے فرید کے رائفل بردار ساتھی پلک جھپکتے میں چاروں طرف پھیل گئے۔

''شاید اس سامنے والے کمرے میں گھسا ہے۔'' ایک سندھی ٹوپی والے نے انگلی سے اشارہ کر کے ہیجانی لہجے میں کہا۔

مراد گروپ کا ایک بندہ تیزی سے شانی اور مہناز کے قریب آیا۔ ''وڈی اِدھر لفڑا ہے۔ اپن کا خیال ہے آپ دونوں اندر چلی جائیں۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ شانی اور مہناز واپس کمرے کی طرف مڑیں۔ ابھی شانی نے دو تین قدم ہی اٹھائے تھے کہ بائیں جانب تاریک گوشے سے ایک شخص بجلی کی طرح لپکا اور سیدھا شانی کے پاس آیا۔ شانی کو لگا جیسے وہ کسی پتھریلی شے سے ٹکرائی ہے۔ وہ ڈگمگا کر کئی قدم آگے چلی گئی۔ اس پر جھپٹنے والے شخص نے بے حد تیزی سے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ شانی کی گردن اس کے بازو کے شکنجے میں تھی۔ کوئی سرد آہنی چیز شانی کے سر سے آ لگی۔ یہ پستول یا ریوالور کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ گردن پر قائم ہونے والی گرفت میں ایسا وحشیانہ پن تھا کہ شانی کو محسوس ہوا، اس نے سر کو جنبش دی تو منکا ٹوٹ جائے گا۔

''پیچھے ہٹ جاؤ خبردار۔ گولی مار دوں گا۔'' کسی نے وحشت سے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

شانی کی طرف مدد کے لئے بڑھنے والے دو تین مسلح افراد ٹھٹک کر رک گئے۔ ان میں

رستم کا قریبی ساتھی حسنا گبراتی بھی تھا۔ شانی کی نگاہ حجرے کے کھلے دروازے میں گئی۔ یہاں ایک اور شخص بے حس و حرکت پڑا تھا۔ یقیناً وہ مر چکا تھا۔ اس کے پاس ہی پتھریلے فرش پر بہت سے کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ شانی کے دھندلائے ہوئے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کوئی نامعلوم شخص حجرے کا تالا توڑ کر کچھ چرانے کی نیت سے حجرے میں گھسا تھا۔ اس نے ایک شخص کو جان سے مار ڈالا تھا اور اب شاید اپنی جان بچانے کے لئے شانی کو اپنی ڈھال بنایا تھا۔

شانی کا سانس سینے میں گھٹنے لگا۔ اسے دبوچنے والا ٹھیک ٹھاک جسمانی قوت کا مالک تھا۔ خوف آمیز دہشت نے اس کی طاقت میں مزید اضافہ کیا تھا۔ وہ شانی کو ہیجانی انداز میں کھینچتا اور گھسیٹتا ہوا پندرہ بیس قدم پیچھے لے گیا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے اردگرد موجود افراد کو جنونی لہجے میں دھمکا بھی رہا تھا۔ ''خبردار، کوئی پاس نہ آئے۔ اسے گولی مار دوں گا۔ خدا قسم جان لے لوں گا اس کی۔'' اس کا اشارہ شانی کی طرف تھا۔

شانی کو آواز کچھ جانی پہچانی لگی۔ پھر ایک دم جیسے اس کے جسم میں ہزاروں وولٹ کا کرنٹ دوڑ گیا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ یہ کسی اور کی نہیں بلاول کی آواز تھی۔ بلاول جو عارف کمبوہ کا قریبی ساتھی تھا۔ جو ایک طویل اور پُرخطر سفر طے کر کے ان کے ساتھ یہاں ڈیرے پر پہنچا تھا۔ اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ شانی نے بے حد استعجاب کے عالم میں سوچا۔

کہیں اس کی سماعت دھوکا تو نہیں کھا رہی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔

''بلاول۔'' اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا لیکن یہ آواز اتنی گھٹی ہوئی تھی کہ اس کے حلق سے باہر نہیں نکل سکی۔

پھر اچانک شانی کی دھندلائی ہوئی نگاہ رستم پر پڑی۔ وہ بڑی تیزی سے سامنے آیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لمبی نال کا سیاہ پستول اور دوسرے ہاتھ میں بھڑکتی ہوئی مشعل تھی۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ لمبے بال ہیجانی انداز میں لہرا رہے تھے۔

اسے دیکھ کر بلاول گرجا..... ہاں وہ بلاول ہی تھا۔ ''میرے قریب کوئی حرام زادہ نہ آئے۔ میرے سر کو خون چڑھا ہوا ہے۔ میں اسے گولی مار دوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے پستول کی نال اتنے زور سے شانی کے سر پر دبائی کہ شانی کا سر بائیں طرف مڑ کر تقریباً کندھے سے جا لگا۔ رستم نے یہ منظر دیکھا اور اپنے قدم روک لئے۔

شانی کے دل نے گواہی دی کہ اس نے ٹھیک کیا ہے۔ سننے والے اور دیکھنے والے صرف سن اور دیکھ رہے تھے، مگر شانی خوفناک گرفت کو بھی محسوس کر رہی تھی جس نے اسے جکڑا ہوا تھا۔ یہ ایک جنونی گرفت تھی اور یہ ایسا جنون تھا جس میں شدید خوف بھی شامل ہوتا ہے۔ ایسا جنون شاید زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

رستم نہ صرف خود رک گیا بلکہ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر دیگر افراد کو بھی روک لیا۔ بلاول شانی کے کان میں پھنکارا۔ ''تیرا قیمہ کر ڈالوں گا۔ چپ چاپ چلتی جا۔ چپ چاپ۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک بار پھر پستول کی نال بے پناہ شدت سے شانی کے سر میں گھسیڑی۔ شانی کا سر پھر کندھے سے چھو گیا۔ اسے لگا کہ سر کی کھال چھل گئی ہے اور خون رِسنے لگا ہے۔

بلاول اسے کھینچتا ہوا سرنگ نمبر تین کے اندر لے گیا۔ یہ سرنگ نسبتاً کم آباد تھی۔ یہاں دوسری سرنگوں کے مقابلے میں روشنی بھی تھوڑی تھی۔ وہ سرنگ کے اندر تقریباً 200 فٹ آگے جانے کے بعد ٹھہر گیا۔ اگر وہ اس سے آگے جاتا تو سرنگ کا دہانہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ زور سے بولا تو اس کی آواز سرنگ کے طول میں دور تک گونجی۔ ''اندر آنے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ ابھی اس حرام زادی کا بھیجا نکال کر دیوار سے چپکا دوں گا۔''

شانی کے کانوں میں بدبودار سانسیں زہریلی پھنکاروں کی طرح گونج رہی تھیں۔ حملہ آور کے پسینے کی بُو اور جسم کی حیوانی حدت شانی کے جسم میں منتقل ہو رہی تھی۔ اس کی اوڑھنی کہیں راستے میں ہی گر گئی تھی۔ چپل بھی اُتر چکی تھی۔ اب وہ ٹھنڈے پتھریلے فرش پر ننگے پاؤں کھڑی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سرنگ کے دہانے پر درجنوں مشعلیں، لالٹینیں اور لیمپ وغیرہ نظر آنے لگے۔ ان چیزوں کی سرخی مائل روشنی میں رائفلوں کے بیرل، کلہاڑیوں کے پھل اور دیگر ہتھیار چمک رہے تھے۔ رات کا سناٹا ایک ہیجانی شور کی زد میں آ گیا تھا۔ جیسے صور پھونکا گیا اور ڈیرے کی اتھاہ خاموشی میں ایک قیامت جاگ گئی ہو۔

چند منٹ اسی طرح گزرے پھر دہانے کی طرف سے لالہ فرید کی پکارتی ہوئی آواز آئی۔ ''بی بی کو چھوڑ دو۔ کیا چاہتے ہو تم؟''

''میں کچھ نہیں چاہتا۔ بس تم میں سے کوئی کتا اندر نہ آئے۔ میں لاش گرا دوں گا اس کی ایک سیکنڈ میں۔''

کچھ دیر تک اسی طرح کے فقروں کا تبادلہ ہوا۔ پھر رستم کی آواز سنائی دی۔ ''تم کچھ بتاؤ گے نہیں تو کیسے پتا چلے گا کہ کیا چاہتے ہو؟''

رستم کی آواز سن کر وہ جیسے چند سیکنڈ کے لئے کچھ سوچنے لگا۔ جب وہ دوبارہ بولا تو اس کی آواز میں وحشت کا عنصر تھوڑا سا کم تھا۔ ''تم اکیلے اندر آجاؤ لیکن ہتھیار نہ ہو تمہارے پاس۔ کانوں کی کھڑکیاں کھول کر سنو ہتھیار نہ ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آرہا ہوں۔'' رستم نے کہا۔

دہانے کے قریب جمع ہو جانے والی روشنیوں کے جمگھٹے میں سے ایک روشنی علیحدہ ہوئی اور آہستہ آہستہ قریب آنے لگی۔ روشنی سرنگ کے جس حصے سے گزرتی تھی وہ روشن ہو جاتا تھا اور جب روشنی آگے بڑھ جاتی تو عقب میں پھر تاریکی پھیل جاتی تھی۔ اس سرنگ میں دن کے وقت تو تھوڑی بہت آمد و رفت نظر آتی تھی لیکن اس وقت بالکل ویرانی کی کیفیت تھی۔ یقیناً اکا دکا افراد یہاں موجود بھی تھے لیکن وہ صورتِ حال کی نزاکت دیکھتے ہوئے سامنے آنے کا رسک نہیں لے رہے تھے۔

رستم کے ہاتھ میں ایک گیس لیمپ تھا، وہ اسے اٹھائے ہوئے قریباً سو ڈیڑھ سو فٹ اندر آ گیا۔ ''بس رک جاؤ۔'' بلاول گرجا۔

رستم رک گیا..... اور گیس لیمپ سرنگ کے پتھریلے فرش پر رکھ دیا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' رستم نے تحمل سے پوچھا۔

''میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے نکل جاؤ۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ یہ وعدہ ہے۔''

''میں لعنت بھیجتا ہوں وعدوں پر..... اور وعدے کرنے والوں پر۔ مجھے گارنٹی چاہئے۔ پوری پوری گارنٹی۔ میں صحیح سالم اگلے ڈیرے تک واپسی چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں چاہئے اور اس سے کم بھی کچھ نہیں۔''

''تم کس گارنٹی کی بات کر رہے ہو؟''

''اس گارنٹی کی۔'' بلاول نے شانی کو اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ کر بے رحم جھٹکا دیا، شانی کے ہونٹوں سے کراہ نکل گئی۔ ''میں یہ گارنٹی چاہتا ہوں۔ یہ میرے ساتھ جائے گی۔ اگلے ڈیرے پر پہنچ کر اسے چھوڑ دوں گا۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' رستم نے مستحکم لہجے میں کہا۔

''یہ نہیں ہو سکتا تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے تو اپنی جان تلی (ہتھیلی) پر رکھ لی ہوئی ہے لیکن مرنے سے پہلے اگر میں اسے نہ مار دوں تو میں اپنے باپ کا نہیں کسی کتے کا تخم ہوں۔ بے شک میری قبر پر لکھوا دینا یہاں ایک کتے کا بچہ سو رہا ہے۔'' بلاول بے پناہ وحشت

سے بولتا چلا گیا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر رستم کی ٹھہری ہوئی آواز آئی۔ ''گارنٹی کے طور پر میں تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھوا لو۔ جس طرح کی تسلی چاہتے ہو تمہیں مل جائے گی۔''

''مجنوں ہو ناں۔ خون کے اندر عاشقی پنا کے مار رہی ہے لیکن جائے گی تو میرے ساتھ یہی لیلیٰ جائے گی۔ نہیں تو یہیں پر ہم دونوں کی لاشیں گریں گی۔'' بلاول نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اس کی گرفت ایک بار پھر سخت ہوتی جا رہی تھی۔

رستم اپنی جگہ کھڑا رہا۔ بلاول دھاڑا۔ ''جاؤ مشورہ کر لو اپنے یاروں اور چیچوں کڑچھوں سے۔ مجھے دس پندرہ منٹ کے اندر بتا دو۔ میری بات منظور ہے یا میرے ساتھ اپنی اس سہیلی کی لاش بھی اٹھانی ہے یہاں سے۔''

رستم کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ سب کچھ بڑی مشکل سے برداشت کر رہا ہے۔ وہ گھوما اور واپس دہانے کی طرف چلا گیا۔ شانی، بلاول کی گرفت میں جکڑی سرنگ کی دیوار کے ساتھ کھڑی رہی۔ رستم کے جانے کے بعد بلاول نے شانی پر سے اپنی جنونی گرفت قدرے نرم کر دی تاہم وہ اس کی طرف سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ اس کا ہیجان دیکھ کر شانی کو یہ شدید خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں وہ اضطراری طور پر ہی ٹرائیگر نہ دبا دے۔ شانی کا جسم پوری طرح بلاول کے جسم سے پیوست تھا لیکن یہ صورتِ حال اس قسم کی تھی کہ جسموں کا اتصال اور لمس بے معنی ہو گیا تھا۔ زندگی اور موت کی کشمکش جس جیسی طاقت ور جبلت کو بھی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیتی ہے۔ سرنگ میں لالٹینیں روشن تھیں۔ یہاں بہت سا کاٹھ کباڑ موجود تھا۔ کھیتی باڑی کا بے کار ہو جانے والا سامان، مویشیوں کا خشک چارہ، لکڑی کی خالی پیٹیاں، کنڈم ہو جانے والا اسلحہ، ایک بہت بڑا خراب جنریٹر اور گھوڑوں کے ساز وغیرہ..... یہ سرنگ کچھ آگے جا کر دو شاخوں میں تقسیم ہوتی تھی۔ ایک شاخ قدرے روشن اور دوسری تاریک تھی۔

چند منٹ بعد رستم دوبارہ سرنگ میں آ گیا۔ اس مرتبہ رستم کے ساتھ لالہ فرید بھی تھا۔ لالہ فرید کی آمد پر بلاول نے اعتراض کیا لیکن جب رستم نے یہ یقین دلایا کہ وہ دونوں بالکل غیر مسلح ہیں تو وہ ذرا سا نرم پڑ گیا۔ رستم، فرید اور بپھرے ہوئے بلاول احمد میں ایک بار پھر مکالمہ شروع ہوا۔ رستم اور فرید کا کہنا تھا کہ بے شک بلاول کے ہاتھوں ایک بندہ قتل اور ایک سخت زخمی ہوا ہے پھر بھی وہ اسے یہاں سے نکلنے کا محفوظ راستہ دے دیتے ہیں لیکن وہ شانی

بی بی کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات نہ کرے۔ اس کے بدلے وہ جسے چاہے ضمانت کے طور اپنے ساتھ رکھ سکتا ہے۔

بلاول احمد یہ شرط ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا اس نے کہا۔ ''اگر تمہاری نیتیں صاف ہیں اور تم واقعی مجھے جانے کا راستہ دے رہے ہو تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرے ساتھ بی بی ہے یا بی با ہے۔ تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیئے۔''

''یہ عورت ذات ہیں۔ ہمارے لئے عزت کی جگہ پر ہیں۔'' فرید نے کہا۔

''میرے لئے یہ بہت عزت کی جگہ پر ہے۔ اس کی وجہ سے تو میری جان بچی ہوئی ہے۔'' بلاول نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''دیکھو، عورت کو ایسے معاملوں میں گھسیٹنا جوانمردی نہیں ہے۔'' رستم بولا۔

''بات جوانمردی کی نہیں۔ ابھی تو تمہارے گھیرے سے نکلنے کا سوال ہے۔ بعد میں کسی وقت جوانمردی بھی دیکھ لیں گے۔''

پانچ دس منٹ کی بات چیت میں بلاول ٹس سے مس نہیں ہوا، نہ ہی ایک لمحے کے لئے اس نے اپنے پسٹل کی نال شانی کے سر سے علیحدہ کی۔ رستم نے تھوڑا سا آگے آنے کی کوشش کی تو وہ دیوانے لہجے میں گرجنے برسنے لگا۔ ''خبردار، آگے نہ آؤ۔ میں لاش گرا دوں گا۔ میں گرا دوں گا لاش۔ میں کہتا ہوں میں گرا دوں گا۔''

رستم رک گیا۔ بلاول ڈرے ہوئے انداز میں شانی کو کچھ اور گہرائی میں لے گیا۔ یہاں آنے سے اسے یہ نقصان ہوا کہ سرنگ اور سرنگ کا نصف دہانہ اس کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ پھر بھی اسے یہ تسلی تو ہوئی کہ وہ رستم اور فرید سے دور ہٹ گیا ہے۔

کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ رستم اور فرید عارضی طور پر دہانے کی طرف گئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی مشعلوں کی روشنی بھی اب ذرا فاصلے پر چلی گئی تھی۔ مناظر اوجھل ہو جانے کی وجہ سے بلاول اعوان کچھ پریشان ہو گیا لیکن اب وہ دوبارہ آگے بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے تھوڑا سا مزید پیچھے ہٹنا مناسب سمجھا۔ گاہے بگاہے وہ شانی کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے فحش زبان میں کوئی دھمکی بھی دے دیتا تھا۔

شانی کی درخواست پر اس نے شانی کی گردن پر سے گرفت ذرا نرم کر دی تھی، تاہم اب گردن کے ساتھ ساتھ اس کے بال بھی مٹھی میں جکڑ لئے تھے۔ شانی اب شاید سراسیمگی کی کیفیت سے کافی حد تک نکل آئی تھی۔ اس کا ذہن ''مزاحمت'' کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ اغوا کنندگان اور یرغمال بنائے جانے والے افراد جب اعصابی اور

جسمانی طور پر تھک جاتے ہیں تو معاملات ان کی گرفت سے نکلنے لگتے ہیں۔ ایسے میں ان کے خلاف اچانک ہونے والی کارروائی مؤثر ثابت ہوتی ہے لیکن یہ شخص تو ابھی تازہ دم تھا۔ موت کے خوف نے اس کے جسم میں بلا کی چستی اور چوکسی بھر رکھی تھی۔ وہ نشے میں بھی نہیں تھا۔ اس نے شانی کو عقب سے جکڑا ہوا تھا اور قریباً پون گھنٹہ گزرنے کے باوجود تھوڑی دیر کے لئے بھی خود سے جدا نہیں کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ معمولی سا رسک لینے کو بھی تیار نہیں تھا۔

شانی کے ذہن میں اس شخص کے حوالے سے بے شمار سوالات اُبھر رہے تھے۔ عارف کمبوہ پر کسی طرح کا شبہ کرنا تو ''نادانی'' تھی۔ یہ شخص عارف کا ساتھی ہونے کے باوجود اس کا ساتھی نہیں تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ پولیس سے ملا ہوا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ ریاض ہٹلر سے ملا ہوا ہے۔ وہ دراج اور شانی کے ساتھی کی حیثیت سے یہاں پہنچا تھا اور پہنچ کر اپنی کارروائیوں میں مصروف ہو گیا تھا۔ شانی کو یاد آیا کہ تین دن پہلے وہ کس طرح لالہ فرید سے کرید کرید کر بارودی سرنگوں اور یہاں موجود اسلحے وغیرہ کے بارے میں سوالات پوچھ رہا تھا۔ اس نے لالہ فرید سے بارودی سرنگوں کا خاص طور سے ذکر کیا اور کہا تھا کہ بارودی سرنگوں کا کوئی نقشہ وغیرہ ہونا چاہئے۔ وہ ساری باتیں چند لمحوں میں شانی کے ذہن میں گونج گئیں۔ یوں لگتا تھا کہ پولیس افسروں نے بلاول کو آلہ کار بنا کر یہاں کے حفاظتی انتظامات کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا ہے۔ ڈیرے والوں کی خوش قسمتی کہ وہ یہاں مشکوک حالت میں دیکھ لیا گیا..... اور اب وہ ایک شخص کو قتل کرنے کے بعد اپنی جان بچانے کے لئے شانی کو یرغمال بنائے ہوئے تھا۔

چند سیکنڈ بعد شانی کے کانوں میں ایک آواز آئی۔ یہ فائر کی آواز تو نہیں تھی۔ ایسا لگا جیسے کوئی کریکر یا بڑے سائز کا پٹاخہ چلا ہے۔

بلاول سرتاپا لرز گیا۔ شانی کی گردن پر اس کی گرفت ایک بار پھر بے حد ظالمانہ ہو گئی۔ شانی کو لگا سانس رک جائے گا۔ وہ چلا کر بولا۔ ''یہ کیا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے.....؟'' اس کی آواز سرنگ میں دور تک گونجی۔ ''یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟''

وہ شانی کو دھمکیاں دیتا اور گھسیٹتا ہوا کچھ اور آگے لے گیا ساتھ ساتھ وہ باہر والوں سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

جواب میں لالہ فرید کی آواز آئی۔ اس نے کچھ صفائی پیش کی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آ سکے۔

دو چار منٹ مزید گزر گئے۔ بلاول احمد کی بے چینی اب بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ رستم اور لالہ وغیرہ کو گالیاں دینے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے با آواز بلند ایک الٹی میٹم بھی دے ڈالا۔ ''میں تمہیں دس منٹ دیتا ہوں۔ اس کے بعد اسے گولی مار کر خود کو بھی مار لوں گا۔ یہ خالی دھمکی نہیں ہے حرام زادو۔ میں تمہیں کر کے دکھا دوں گا۔''

اس کی آواز جنون کی شدت سے پھٹی ہوئی تھی۔ اچانک شانی کی تیز حس شامہ نے ایک بُو سی محسوس کی۔ یہ ہلکی لیکن نامانوس بُو تھی۔ پہلے تو شانی نے سمجھا شاید یہ سرنگ کی اپنی بُو باس ہے لیکن تھوڑی دیر بعد اسے اپنا یہ خیال رد کرنا پڑا۔ بُو سرنگ کی گہرائی سے نہیں دہانے کی طرف سے آ رہی تھی۔ شانی کو لگا جیسے یہ بُو سانس کے ذریعے جسم میں داخل ہو کر حواس کو پریشان کر رہی ہے۔

دس پندرہ سیکنڈ بعد یہ بُو بلاول احمد کے دماغ تک بھی پہنچ گئی۔ اس نے ناک سے سوں سوں کی آواز نکال کر چاروں طرف دیکھا۔ ''یہ کیسی بُو ہے؟'' اس نے جیسے خود سے سوال کیا۔

اگلے چند سیکنڈ میں بُو تیز ہو گئی۔ شانی کو واضح طور پر محسوس ہوا کہ اس کے ہاتھ پاؤں اور رخسار پر چیونٹیاں سی رینگنے لگی ہیں۔ شانی کے دل نے گواہی دی کہ اس ہلکی لیکن تیز اثر بُو کا تعلق اس دھماکے نما آواز سے ہے جو تھوڑی دیر پہلے سنائی دی تھی۔

یکایک بلاول چنگھاڑا۔ ''یہ کیسی بُو ہے۔ یہ کیا کر رہے ہو؟ میں کہتا ہوں کوئی چالاکی نہ دکھانا۔ میں گھوڑا دبا دوں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔''

سرنگ کے خم پر ایک مشعل کی روشنی نظر آئی۔ بلاول نے طیش اور بدحواسی کے عالم میں اس روشنی پر فائر جھونک مارا۔ سرنگ میں ہونے والا دھماکہ دور تک گونجا۔ بارود کی تیز بو شانی کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ بلاول ہیجانی لہجے میں چنگھاڑا۔ ''اگلی گولی تمہاری اس بہن کی کھوپڑی میں ماروں گا۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے پسٹل شانی کے سر سے ہٹا لیا۔ پسٹل والے ہاتھ سے اس نے غالباً اپنی ناک چٹکی میں دبائی تھی۔ شانی کی گردن پر اس کے مضبوط بازوؤں کا شکنجہ کچھ اور بھی کسا گیا۔ شانی کے حلق سے کھیں کھیں کی آواز نکل کر رہ گئی۔ وہ شانی کو کھینچتا اور گھسیٹتا ہوا نیم تاریک سرنگ کی طرف بڑھا۔ سرنگ کی یہ شاخ قدرے تنگ اور ناہموار تھی۔ اس شاخ میں گھستے ہی بلاول نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک ٹارچ نکالی اور اسے اپنا پورا منہ کھول کر منہ میں دبا لیا۔ ٹارچ کے روشن دائرے میں شانی کو دیواروں پر جالے اور گرد و غبار دکھائی دیا۔ یہاں وہاں چمگادڑوں کے پر بھی دکھائی دیئے۔ حواس کو مختل کرنے والی نامانوس بُو سے بچنے

کے لئے بلاول شانی سمیت آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک شانی کی نگاہ ٹارچ کے روشن دائرے میں آنے والے ایک پتھر پر پڑی۔ اس پتھر پر سیاہ رنگ سے مردے کی کھوپڑی اور دو ہڈیوں کا نشان بنایا گیا تھا۔ ساتھ ہی دائیں طرف تیر کا نشان تھا۔ جیسے ظاہر کیا گیا ہو کہ اس سے آگے جانا خطرناک ہے۔ بلاول تو جیسے اندھا بہرا ہو رہا تھا۔ اسے یہ نشان نظر نہیں آیا اور نظر آتا بھی تو وہ شاید رکنے کی عقل مندی نہ کرتا (ٹارچ اس کے منہ میں آ جانے سے کم از کم اتنا فائدہ ہوا تھا کہ اس کے منہ سے نکلنے والے گندے الفاظ شانی کے کانوں میں نہیں پڑ رہے تھے) وہ دس پندرہ قدم مزید آگے بڑھا۔ یہاں کسی نے سرنگ کی دیوار پر سیاہ روشنائی سے ''خطرہ'' لکھ رکھا تھا۔ شانی نے بلاول کو اس طرح متوجہ کرنا چاہا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔ بولنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش ناکام رہی۔ بلاول بڑی درندگی اور طاقت سے شانی کو کھینچے لئے چلا جا رہا تھا۔ شانی کے نازک پاؤں سرد سنگریزوں کی وجہ سے زخمی ہو چکے تھے۔ ٹخنوں پر کئی ضربیں بھی آئی تھیں۔ تاہم اسے زیادہ فکر اپنی گردن کی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ گولی کا شکار نہ بھی ہوئی تو گردن ٹوٹنے سے ضرور مر جائے گی۔ نہ جانے کیوں ان لمحوں میں پھر بس دو ہی چہرے اس کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ رستم اور منا۔ ''کہاں ہو منے؟ کہاں ہو رستم؟'' اس کے دل نے پکار کر کہا۔ ''میرا دم سینے میں گھٹ رہا ہے۔ میرا دہن اندھیرے میں ڈوب رہا ہے۔ پتا نہیں کہ اب یہ اندھیرا کبھی چھٹ سکے گا یا نہیں۔''

اس کی سانس رک رہی تھی۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے اپنی گردن کو بلاول کے شکنجے سے چھڑانا چاہا۔ مگر یہ ایسے ہی تھا جیسے چھرے والی بندوق سے ہاتھی کو گرانے کی کوشش کی جائے۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس سے پہلے کہ شانی کوئی اور کوشش کرتی اچانک ہی بلاول کا پاؤں پھسلا۔ وہ شانی سمیت چار پانچ فٹ کی گہرائی میں گرا۔ شانی کے جسم کو شدید جھٹکا لگا لیکن یہ گرنا تو صرف ایک ابتداء تھی۔ اصل اور خوفناک مرحلہ بعد میں آیا۔ جونہی بلاول نے شانی سمیت اٹھنے کی کوشش کی اس کا پاؤں گہرے اندھیرے میں پھر پھسلا۔ اس کا مشکوس بازو ابھی تک شانی کی گردن میں تھا، تاہم اس کے پستول اور ٹارچ کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اس کا پاؤں پھسلنے سے شانی کی گردن کو بھی شدید جھٹکا لگا۔ پھر یکایک زمین اس کے زخمی پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ شانی کو لگا جیسے وہ آسمانی جھولے میں ہے اور تیزی سے نیچے آ رہی ہے۔ ایک دم ہی بڑی تیز ہوا اس کے جسم سے ٹکرانے لگی۔ اس قبر نما غار میں یہ ہوا کیسی؟ اس کے ڈوبتے ہوئے ذہن نے جواب دیا۔ یہ بادِ مرگ ہے۔ یہ موت کی ہوا ہے۔ وہ جانے کتنی بلندی سے نیچے پتھریلی زمین پر گر رہی تھی۔ بلندی سے پتھریلی بے رحم زمین پر گرنے کا احساس کیا ہوتا

ہے؟ شانی کو معلوم نہیں تھا۔ نہ ہی اسے پتا تھا کہ موت کی آمد کیسی ہوتی ہے لیکن وہ وقت سے پہلے ان دونوں چیزوں کا لمس محسوس کر رہی تھی۔ اس کے کانوں میں اپنی ہی دہشت زدہ چیخ گونجی۔ یہ سب کچھ بے حد بھیانک تھا۔ اسے لگا وہ زمین آسمان کے درمیان معلق ہو گئی ہے۔ نہ مری ہے، نہ زندہ رہی ہے۔ اسے اپنے اردگرد نمی کا احساس ہوا۔ وہ پانی میں تھی۔ گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تاریک پانی۔ اس نے پاؤں زمین پر لگانے کی کوشش کی مگر پانی گہرا تھا۔ اس کا سکتہ ٹوٹا تو وہ ہاتھ پاؤں چلانے لگی وہ رنگ والی کے پاس سے گزرنے والے سُوئے (چھوٹی نہر) میں اپنی سکھیوں سکینہ اور صغراں کے ساتھ کپڑوں سمیت نہایا کرتی تھی۔ پھر جب وہ ذرا بڑی ہوئیں اور راہ گیروں نے چور نظروں سے انہیں دیکھنا شروع کر دیا تو انہوں نے دن کے بجائے شام کے بعد نہانا شروع کر دیا۔ گرمیوں کی حبس زدہ شاموں میں وہ پانی میں خوب اودھم مچاتیں اور حویلی کی نوکرانیاں انوری، مختاری وغیرہ راہ گیروں کو نہر سے دور رکھنے کے لئے اردگرد موجود رہتیں۔

وہ بڑی اچھی تیراک تھی۔ آج یہ تیراکی اس کے کام آئی۔ شل ہوتے ذہن کے باوجود اس نے اپنی بچی کھچی توانائی جمع کی اور سرد پانی میں تیرنے لگی۔

''بچاؤ...... بچاؤ......'' اس نے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے پکارا۔

اس کی آواز یوں گونجی جیسے لاہور کی سیر کے موقع پر مقبرہ جہانگیر، بادشاہی مسجد یا لاہور میوزیم کے بڑے بڑے ہالوں میں گونجتی تھی۔ ''یا خدا! میں کہاں ہوں، کس حال میں ہوں، وہ خونی قاتل کہاں ہے؟'' اس نے گہرے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے سوچا۔

پانی میں ایک خاص قسم کی بُو باس تھی۔ جیسے اس میں گندھک یا چونے وغیرہ کی آمیزش ہو۔ اچانک شانی کے ہاتھ میں کسی چکیلے پتھر کا ابھرا ہوا کنارہ آیا۔ شانی نے اس مخروطی پتھر پر گرفت مضبوط کی اور بہاؤ کی طرف جانے سے بچ گئی۔ تھوڑی سی کوشش کر کے وہ پانی سے نکل آئی۔ تاریکی اتنی زیادہ تھی کہ اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ بس اپنی آواز کی گونج سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی گہرائی میں ہے اور چھت بہت اونچی ہے۔ شاید کئی منزلہ بلڈنگ کی اونچائی کے برابر۔ اسے اپنے بالکل قریب پانی بہنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ اس کے پاؤں بُری طرح زخمی تھے۔ بلندی سے گرتے ہوئے اس کا ایک کندھا بُری طرح مڑا تھا اور اب اکڑا سا محسوس ہوتا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ گرتے وقت بلاول اس کے ساتھ تھا۔ نشیب کی طرف جاتے ہوئے اس کا سر شدت کے ساتھ کسی شے سے ٹکرایا تھا اور شاید وہ کرب ناک انداز میں چیخا بھی تھا۔

وہ کہاں تھا؟ کیا مر چکا تھا یا زخمی حالت میں کہیں اس کے آس پاس موجود تھا۔ اس دوسرے خیال نے شانی کے جسم میں سرد جھرجھری دوڑا دی۔ اس نے اپنے چہرے کا رخ بلندی کی طرف کیا اور ایک بار پھر ہیجانی انداز میں چلائی۔ ''کوئی ہے...... بچاؤ...... کوئی ہے۔ میری مدد کرو۔''

اس کی آواز کسی بلند و بالا گنبد نما چھت کے اندر گونجی اور اس گونج کی شدت پر وہ حیران رہ گئی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنی بلندی سے گری ہے۔ بس یہ معلوم تھا کہ وہ اس بلندی سے گر کر زندہ ہے۔ کیا واقعی وہ زندہ اور سلامت ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں کو ٹٹولا۔ پاؤں کے تلوؤں پر چپچپاہٹ کا احساس ہوا۔ وہاں سے خون رس رہا تھا۔

دفعتاً اسے آس پاس کہیں حرکت کا احساس ہوا۔ کوئی زندہ جسم اس کے قریب موجود تھا۔ اپنی جان بچانے کے فطری عمل کے تحت اس نے نیچے بیٹھ کر تاریکی میں ہاتھ چلائے۔ وہ کوئی پتھر ڈھونڈنا چاہتی تھی لیکن اس کے ہاتھ میں جو شے آئی وہ ایک چوبی دستے والی خستہ حال مڑی تڑی بندوق تھی۔ پتا نہیں یہ کب اور کس نے اوپر بلندی سے پھینکی ہوگی۔ اسے یہاں پڑے ہوئے نہ جانے کتنا عرصہ گزر چکا تھا اور اب یہ اس تاریک کھوہ میں شانی کا ہتھیار تھی۔ شانی کے کپڑے اور بال بھیگ کر جسم اور چہرے سے چپکے ہوئے تھے۔ اس نے قریباً پانچ کلو وزنی بندوق کو بڑی مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور سامنے تاریکی میں گھورنے لگی۔ اب کچھ وقت گزر چکا تھا اور اس کی آنکھیں اندھیرے میں کچھ کچھ دیکھنے لگی تھیں۔

وہ فاصلے پر دیکھ رہی تھی لیکن جو شے اسے نظر آئی وہ اس کے چہرے سے فقط پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر تھی۔ یہ بھی ایک چہرہ تھا...... تاریکی میں نظر نہیں آتا تھا لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ یہ خون میں لتھڑا ہوا ہے۔ یہ بلاول کا چہرہ تھا۔ وہ کسی شے کا سہارا لیتا ہوا شانی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''خبردار...... پیچھے ہٹ جاؤ......'' شانی رائفل سونت کر پھنکاری۔

اس کے ساتھ ہی وہ دو تین قدم پیچھے کی طرف ہٹی۔ وہ زیادہ پیچھے نہیں جا سکتی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ پیچھے کیا ہے۔ نہ دائیں بائیں کا کچھ معلوم تھا۔ وہ بلاول والی غلطی دہرانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اعصاب شکن بُو سے بچنے کے لئے تیزی سے پیچھے ہٹتا چلا گیا تھا اور گہری کھائی میں آ گرا تھا۔ وہ ہمت کر کے رک گئی۔

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ بلاول کی حالت بہت بُری تھی۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ اس کا ایک بازو تقریباً کندھے سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ اس کا سر اس بُری طرح پھٹا تھا کہ

ہڈی کا فریکچر پیشانی تک آ گیا تھا۔ اب اس کا چہرہ شانی کی آنکھوں سے بس تین چار فٹ کی دوری پر تھا۔ وہ ایک کھردری دیوار کا سہارا لے کر شانی کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں یقیناً کوئی تیز دھار ہتھیار تھا۔ اس ہتھیار کا لوہا پتھریلی دیوار سے رگڑ کھا کر آواز پیدا کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے زخمی پھنکاریں نکل رہی تھیں۔

''رک جاؤ۔'' شانی پورے زور سے چلائی۔

پھر اس نے رائفل دستے کی طرف سے گھما کر پوری طاقت سے بلاول کی کنپٹی پر ماری۔ وہ ایک طرف لڑھکا۔ چند ثانیے بعد تاریک پانی میں چھپاک کی آواز پیدا ہوئی اور خاموشی چھا گئی۔ شانی ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ سردی اور ہیجان سے اس کا سارا جسم پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

اب خاصی بلندی سے کچھ آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ لوگ سنبھل سنبھل کر اس اندھی کھائی کے کنارے کی طرف آ رہے ہیں۔ پھر اوپر اندازاً پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی پر مشعلوں اور الاؤ کی سرخی مائل روشنی دکھائی دینے لگی۔ نیچے سے دیکھنے پر یہ بلندی خوفناک نظر آتی تھی۔ کچھ مشعلیں بالکل کنارے پر پہنچ گئیں۔ شانی نے چہرہ اوپر کیا۔ سینے میں ہوا بھری اور زور سے چلائی۔ ''میں یہاں ہوں..... نیچے..... پانی کے پاس۔''

چند سیکنڈ بعد لالہ فرید کی بے قرار آواز ابھری۔ ''بی بی جی! آپ ٹھیک ہیں؟''

''ہاں ٹھیک ہوں۔'' شانی روتے ہوئے بولی۔

''زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟'' یہ آواز رستم کی تھی۔

''نہیں، زیادہ نہیں آئیں۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں پتا۔ شاید پانی میں گر گیا ہے۔''

''کوئی آواز تو نہیں آ رہی آس پاس سے؟'' فرید نے پوچھا۔

''نہیں..... ابھی تو نہیں۔''

فرید نے پھر کچھ کہا لیکن گونج اتنی زیادہ تھی کہ مفہوم سمجھ میں نہیں آیا۔

''کیا کہہ رہے ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' شانی نے روہانسا ہو کر کہا۔

اس مرتبہ رستم نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی آواز شانی تک پہنچائی۔ ''آپ جہاں ہیں وہیں کھڑی رہیں۔ ایک قدم بھی ادھر اُدھر نہ جائیں۔ ہم آپ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''اور اس کتے کی طرف سے بھی ہوشیار رہیں۔'' یہ آواز شاید حسنا گجراتی کی تھی۔

شانی سمٹ کر دیوار کے سہارے بیٹھ گئی۔ ٹوٹی پھوٹی رائفل اب بھی مضبوطی سے اس کے ہاتھوں میں دبی تھی۔ اس کی انگلیاں دکھنے لگیں۔ اس نے رائفل پر اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کر دی۔

کندھے کا کھچاؤ ٹھنڈا ہو کر زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ اب اندازہ ہونے لگا کہ جسم پر اور بھی کئی چھوٹی بڑی چوٹیں اور خراشیں موجود ہیں۔ پاؤں کے نیچے پتھر چبھ رہے تھے۔ مطلب تھا کہ خون کا رساؤ موجود ہے۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر ذرا دھیان سے اوپر کی سمت دیکھا۔ سینے میں اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اب اس کی آنکھیں کافی کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اوپر کنارے پر جو روشنیاں موجود تھیں ان کے سبب بھی دیکھنے میں کچھ مدد مل رہی تھی۔ وہ جہاں موجود تھی یہ کوئی کھائی نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی بہت بڑا گڑھا تھا۔ یہ تو ایک دراڑ تھی۔ ایک خوفناک دراڑ۔ اس دراڑ کی دیواریں بالکل عمودی تھیں۔ بلکہ عمودی سے بھی آگے کی چیز تھیں۔ دراڑ کا پھیلاؤ نیچے سے زیادہ اور اوپر سے کم تھا۔ اس طرح دراڑ کے بالائی حصے کی دونوں دیواروں کا زاویہ عمودی سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ یہاں سے اتر کر نیچے آنا کسی کے لئے آسان نہیں تھا۔ شانی اس پانی کو دیکھنے لگی جس میں گرنے سے اس کی جان بچی تھی۔ یہ بالکل مٹیالے رنگ کا پانی تھا یہ زمین کی کسی نامعلوم پرت سے نکل کر نامعلوم پرت کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی چوڑائی اندازاً پچاس پچپن فٹ رہی ہو گی۔ گہرائی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ کہیں سے گہرا اور کہیں سے اتھلا ہے۔

شانی نے کچھ عرصہ پہلے ایک میگزین دیکھا تھا۔ جس میں دنیا کی زمین دوز قدرتی سرنگوں اور غاروں کا احوال بیان کیا گیا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ایسے غار دنیا کے بیشتر حصوں میں موجود ہیں۔ خاص طور سے سطح مرتفع کے علاقوں میں۔ ایسے غار زمین میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں میٹر گہرائی تک چلے جاتے ہیں اور نیچے جا کر شاخ در شاخ تقسیم ہوتے ہیں۔ یہاں باقاعدہ آبی گزرگاہیں موجود ہوتی ہیں۔ ایسے پانیوں میں آبی حیات پائی جاتی ہے اور ایسی مچھلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں جن کی آنکھیں پیدائشی طور پر ناپید ہوتی ہیں۔ آنکھوں کی عدم موجودگی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ آبی مخلوق لاکھوں سال سے اندھیرے میں پیدا ہو کر اندھیرے میں مرتی رہی ہے۔

شانی کو اس مضمون میں پڑھی ہوئی بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں لیکن اپنے دھندلائے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ ان پر غور نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے ذہن میں ابھی تک وہ دھند بھری ہوئی تھی جس کی وجہ سرنگ میں پھنسنے والے کریکر کی عجیب بُو تھی۔ یقیناً وہ کوئی ایسی گیس تھی جو

ذہن کو مختل کر کے بندے کو لاچار کر سکتی تھی..... اور شانی کو محسوس ہوا کہ اس بُو نے اتنی گہرائی میں بھی اس کا پیچھا چھوڑا نہیں ہے۔ شاید یہ عام ہوا سے بھاری تھی اور طویل سرنگ کے دہانے سے آنے والی ہوا نے اسے آہستہ آہستہ اس گہری دراڑ میں دھکیل دیا تھا۔

شانی کو یہ سب کچھ بیدار آنکھوں کے بھیانک خواب جیسا لگ رہا تھا۔ وہ تو مہناز کے ساتھ کمرے میں واپس جانے کے لئے مڑی تھی۔ پھر اچانک ہی یہ سب کچھ ہو گیا تھا وہ اس بیسیوں فٹ گہری دراڑ میں موجود تھی اور غالب امکان تھا کہ اس کے ارد گرد ایک لاش یا شدید زخمی شخص بھی موجود ہے۔

بلندی سے آوازیں آ رہی تھیں۔ پتا نہیں کیا صلاح مشورے ہو رہے تھے۔ نیچے اُترنا آسان نہیں تھا۔ اس کے لئے کوہ پیمائی کا سامان درکار تھا یا کم از کم کسی طویل مضبوط رسّے کی ضرورت تھی۔ پچاس ساٹھ فٹ لمبا رسہ۔

بلندی سے رستم کی آواز آئی اور اسے یوں لگا کہ رگ رگ میں زندگی بخش توانائی بھر گئی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''بی بی! آپ ٹھیک ہیں ناں؟''

''ہاں ٹھیک ہوں۔''

''ہم نیچے آنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔'' شانی خاموش رہی۔ وہ پھر پکارا۔ ''آپ میری بات سن رہی ہیں ناں؟''

''سن رہی ہوں۔''

''آپ جہاں کھڑی ہیں وہاں سے بالکل نہ ہلیں۔ ہم نیچے آ رہے ہیں۔''

دس پندرہ منٹ مزید گزر گئے۔ پتا نہیں وہ لوگ اوپر کیا کر رہے تھے۔ مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کسی بات پر بحث ہو رہی تھی۔ شانی کو اپنے پاؤں پر کچھ رینگتا محسوس ہوا۔ یہ غالباً کوئی مکڑی نما کیڑا تھا۔ شانی نے اسے چٹکی میں پکڑ کر دور پھینک دیا۔

کچھ دیر بعد شانی کو ایک شخص کے آثار دکھائی دیئے۔ وہ کسی رسے کے ذریعے نیچے آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رسہ اس کے جسم سے بندھا ہوا تھا اور وہ قریباً ساٹھ فٹ کی بلندی پر ہوا میں جھول رہا تھا۔

شانی کا دل بے ساختہ دھڑکنے لگا۔ ''یا اللہ خیر۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اسے نہیں پتا تھا کہ نیچے آنے والا کون ہے۔ بس اس کے دل میں ایک شک سا تھا۔ قریباً دس منٹ میں نیچے آنے والے نے بمشکل پندرہ بیس فٹ طے کئے لیکن پھر یہ ہوا کہ اس کے پاؤں دیوار پر ٹک گئے۔ اب وہ ہوا میں جھولنے کی بجائے عمودی دیوار پر قدم جما جما کر

نیچے آنے لگا۔ غالباً اس کی پشت پر ایک بیگ تھا جس میں ٹارچ روشن کر کے اس طرح رکھی گئی تھی کہ اس کی تھوڑی بہت روشنی اطراف میں پھیل رہی تھی۔

''رستم سنبھل کر۔'' بلندی سے فرید کی ڈری ہوئی آواز آئی۔

اور شانی جان گئی کہ اس کا اندازہ درست ہے۔ اس جان لیوا ڈھلوان پر نیچے اُترنے والا وہی ہے جو برسوں سے اس کی بے لوث محبت میں دکھ اٹھا رہا ہے۔

شانی کی دھڑکنوں کی بے ترتیبی بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد شانی نے دیکھا کہ رستم ایک مقام پر ٹھہر گیا ہے۔ وہ اپنی کمر سے رسہ کھول رہا تھا۔ ''رسہ کیوں کھول رہے ہو؟'' شانی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

رستم نے جواب نہیں دیا۔ شانی نے دوبارہ پوچھا۔ وہ پھر بھی نہیں بولا۔ تاہم شانی کو خود ہی اندازہ ہو گیا کہ رسے کی لمبائی بس اتنی ہی تھی۔

شانی کی بے چینی کئی گنا بڑھ گئی۔ تقریباً عمودی دیوار پر رستم کو بقایا پینتیس چالیس فٹ کا فاصلہ بغیر کسی سہارے کے طے کرنا تھا۔ ''رستم سنبھل کر۔'' وہ کرب کی انتہا کو چھو کر بولی۔

''بے فکر رہیں۔'' رستم کی ہانپتی ہوئی لیکن مضبوط آواز ابھری۔

وہ سنبھل سنبھل کر اُترتا رہا اور شانی اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتی رہی۔ شانی اور بلاول دوسرے زاویے سے گرے تھے۔ اگر خدانخواستہ رستم دیوار سے علیحدہ ہو کر گرتا تو نیچے تاریک سنگلاخ زمین تھی اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ رستم کے اُترنے سے چھوٹے چھوٹے پتھر گر رہے تھے وہ پانی کے بجائے پتھریلی زمین پر گر رہے تھے۔

بالآخر مشکل ترین گھڑیاں گزر گئیں۔ رستم نے آخری چھ سات فٹ جست لگا کر طے کئے اور شانی کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ رستم کا چہرہ ایک دھاتا نما کپڑے میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے پشت پر بندھے کینوس کے تھیلے میں سے ٹارچ نکالی اور اسے شانی کے سراپا پر دوڑایا۔ وہ اس کی جسمانی حالت کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ شانی بھی گرنے کے بعد پہلی بار اپنے سراپا کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاؤں زخمی تھے۔ گھٹنے سے بھی شلوار خون آلود ہو رہی تھی۔ ہاتھوں کی دو تین انگلیوں کے ناخنوں سے بھی خون رِس رہا تھا۔

اب تک شانی جانے کیسے خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ ایک سنبھالنے والے کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کی سکت ختم ہو گئی۔ وہ جیسے تیرا کر سنگلاخ زمین پر بیٹھ گئی اور اپنا سر کھردری دیوار سے ٹکا دیا۔ اوپر سے ٹارچوں کی روشن لائنیں تہہ تک پہنچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ ان Light Beams کی حرکات کسی ڈسکو شو کے مناظر سے مشابہ تھیں لیکن یہ ڈسکو شو نہیں

تھا۔ یہ ایک سنگین ترین حادثے کے تشویشناک لمحات تھے۔

اوپر سے لالہ فرید بار بار استفسار کر رہا تھا۔ ''رستم پہنچ گئے ہو؟''

رستم نے اپنی سانسیں درست کیں اور پکارا۔ ''ہاں پہنچ گیا ہوں۔ میں بی بی کے پاس ہوں۔ بی بی ٹھیک ہیں۔''

''بلاول؟''

''وہ کہیں نظر نہیں آ رہا۔'' رستم نے ٹارچ کا دائرہ ادھر اُدھر پھینکتے ہوئے کہا..... ایک جگہ پر پتھر پر بہت سا خون دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ یقیناً یہ خون شدید زخمی بلاول کے سر یا بازو سے بہا تھا۔ رستم نے ٹارچ کے دائرے کو مزید حرکت دی تو اسے آبی گزرگاہوں کے عین کنارے پر ایک شکاری چاقو پڑا نظر آیا۔

شانی سمجھ گئی۔ یہ چاقو شانی کے ہاتھوں شدید چوٹ کھانے کے بعد بلاول کے ہاتھ سے گرا تھا۔ یقیناً یہی چاقو تھا جس کے دیوار پر رگڑ کھانے کی آواز شانی نے تاریکی میں سنی تھی۔

''نیچے گرنے کے بعد بلاول آپ کو نظر آیا؟'' رستم نے پوچھا۔

شانی نے چند لمحے سوچا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''وہ کہاں ہے؟''

''میں نے اسے اس رائفل سے چوٹ لگائی تھی۔ وہ پانی میں گرا اور آگے نکل گیا۔'' شانی نقاہت سے بولی۔

رستم بے قراری سے پانی کے اوپر ٹارچ کا روشن دائرہ دوڑانے لگا۔ طاقت ور ٹارچ کی روشنی کافی حد آگے تک جا رہی تھی۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ وہ بچا ہوگا۔'' شانی نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

کھائی میں موجود اعصابی گیس کی بُو ابھی تک اس کے حواس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ غالباً اسی بُو سے بچنے کے لئے رستم نے ایک بڑے کپڑے سے اپنے سر اور چہرے کو لپیٹ رکھا تھا۔ اب شانی سے بات کرنے کے لئے اس نے یہ کپڑا چہرے سے ہٹایا تھا۔

ٹارچ کا روشن دائرہ حرکت کرتا ہوا شانی کے عقب میں گیا تو اس کا دل کانپ گیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ملبے کا ایک ڈھیر سا نظر آیا۔ شانی کو یوں لگا جیسے کافی مدت پہلے یہاں کسی نے پتھروں سے سیڑھیاں تعمیر کی تھیں۔ یہ سیڑھیاں پچیس تیس فٹ نیچے ایک دوسری کھائی تک جاتی تھیں۔ اس کھائی میں بھی پانی جمع تھا لیکن یہ ٹھہرا ہوا ایک گدلا پانی تھا۔ یہ

پتھریلی سیڑھیاں تقریباً مسمار ہو چکی تھیں۔ اب اگر کوئی تاریکی میں ان پر قدم رکھتا تو لڑھکتا ہوا پچیس تیس فٹ نیچے جا گرتا۔ اس نے اچھا ہی کیا تھا پانی سے نکلنے کے بعد زیادہ حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''بی بی! آپ کا دل شاید لیٹنے کو چاہ رہا ہے۔'' رستم نے اس کی نقاہت دیکھتے ہوئے کہا۔

شانی اثباتی انداز میں خاموش ہی۔

رستم نے اپنی پشت پر بندھا ہوا تھیلا کھولا۔ پھر تھیلے کی زپ کھولی اور اس میں دیگر سامان کے علاوہ ایک موٹی گرم چادر موجود تھی۔ رستم نے چادر کو دو تین بار تہہ کر کے بچھونے کی شکل دے دی۔ شانی بے دم سی تھی۔ چادر پر نیم دراز ہو گئی۔ اس کے کپڑے نم تھے اور اسے سردی محسوس ہو رہی تھی لیکن یہاں کپڑے تھے اور نہ ان کپڑوں کو سکھانے کا کوئی وسیلہ تھا۔

رستم نے بیگ میں سے فرسٹ ایڈ کا سامان نکالا۔ ''بی بی! اگر آپ کہیں تو میں یہ دوا آپ کے پاؤں پر لگا دوں؟''

''نہیں، میں خود لگا لیتی ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

اس نے ٹارچ کی روشنی میں زخمی پیروں کو پائیوڈین سے صاف کیا اور ان پر اینٹی بائیوٹک مرہم لگا دیا۔ گھٹنے پر بھی گہری خراشیں تھیں۔ یہاں سے شلوار کا کپڑا پھٹ گیا تھا۔ شانی نے گھٹنے پر بھی مرہم لگایا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بلکہ پورا جسم سنسنا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ بڑی تیزی سے نیند آ رہی ہے۔ وہ ایک بار پھر نیم دراز ہو گئی۔ سب سے زیادہ تکلیف اس کی گردن میں تھی۔ ذرا سا ہلنے پر بھی گردن سے ٹیسیں اٹھنے لگتی تھیں۔ بلاول نے قریباً ایک گھنٹے تک مسلسل اس کی گردن کو اپنی بے رحم گرفت میں جکڑے رکھا تھا۔

شانی کے ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ ارد گرد کے مناظر اور آوازیں اسے خود سے دور جاتی محسوس ہو رہی تھیں۔ رستم اس کے قریب موجود تھا۔ اس کی ٹارچ کا روشن دائرہ گاہے بگاہے شانی کے ارد گرد حرکت کرتا تھا۔ پھر شانی کو اندازہ ہوا کہ اوپر پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی سے کوئی بھاری بھرکم شے نیچے پھینکی گئی ہے۔ یہ شے دھپ کی زوردار آواز سے پتھریلی زمین پر گری رستم آگے جا کر اسے اٹھا لایا۔ دیکھنے میں یہ ایک بہت بڑا ''بستر بند'' نظر آتا تھا۔ رستم نے اسے کھولنا شروع کیا۔ روئی کے تین چار موٹے لحافوں کے اندر کچھ سامان لپیٹ کر پھینک دیا گیا تھا۔ اس میں دو ٹارچیں تھیں۔ ایک رائفل اور اس کی گولیاں تھیں۔ کھانے پینے کا کچھ

سامان تھا۔ ایک سویٹر تھا۔ ایک زنانہ اور ایک مردانہ جوڑا، اوڑھنی اور چپل وغیرہ تھے۔ یہ اشیاء دیکھ کر شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ جلدی یہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔ کم از کم آج کا دن تو نہیں۔

اس نے خمار آلود آواز میں رستم سے پوچھا۔ ''ہم کب باہر نکلیں گے؟''

''بی بی جی! اس میں تھوڑا سا وقت لگے گا۔ شاید آج شام یا کل صبح تک۔''

''لیکن کیوں؟''

''یہاں سے نکلنے کے لئے ایک لمبا اور مضبوط رسہ چاہئے بلکہ شاید دو رسے اور فقط رسوں سے ہی کام نہیں چلے گا بی بی۔ فرید اور مراد وغیرہ کا خیال ہے کہ انہیں لوہے کی ایک چرخی کا انتظام بھی کرنا پڑے گا۔ رسے تو شاید یہ لوگ خود یہیں پر تیار کرلیں۔ مگر لوہے یا لکڑی کی چرخی کا مسئلہ ہے.....''

رستم بتا رہا تھا اور شانی کو یہ آوازیں کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھیں..... غنودگی بڑھتی جا رہی تھی۔

''آپ..... آپ کپڑے بدلیں گی؟''

شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ سر ہلاتے ہوئے اس کی گردن میں شدید ٹیسیں اٹھیں۔ شروع میں گردن کی تکلیف زیادہ نہیں تھی لیکن اب گردن ہلانا دشوار ہو رہا تھا۔

رستم نے بڑی آہستگی سے ایک لحاف شانی پر ڈال دیا اور ایک کمبل کو تہہ کر کے تکیے کی طرح شانی کے سر کے نیچے رکھ دیا۔ شانی کے گیلے کپڑے اس کے جسم کی حرارت سے ہی خشک ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ حالتِ نیند میں بھی اسے اپنی گردن کی تکلیف کا احساس ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ بلاول کے پستول کی مسلسل رگڑ سے سر پر جو گہری خراشیں آئی تھیں وہ جلن کا احساس پیدا کرتی رہیں۔ پھر اسے لگا کہ وہ گہری غنودگی میں کراہتے ہوئے، اپنی گردن کو سہلا رہی ہے۔ تب رستم کی دور افتاد آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ''بی بی جی! میں گردن پر دوا لگا دوں؟'' ہاں شاید یہی کہا تھا اس نے۔

شانی جواب میں خاموش رہی۔ یہ نیم رضامندی کا انداز تھا۔ کچھ دیر بعد اسے اپنی گرم گردن پر مرہم کی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ یہ پٹھوں کے کھچاؤ کو دور کرنے والی کوئی VIX قسم کی دوا تھی۔ VIX کی تیز خوشبو شانی کے نتھنوں سے ٹکرانے لگی۔ اس نے اپنے دھندلائے ہوئے ذہن کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ رستم کی نرم انگلیاں دھیرے دھیرے اس کی گردن کو سہلا رہی ہیں۔ یہ عجیب و غریب احساس تھا۔ اس میں انتہا درجے کی راحت تھی لیکن ساتھ ساتھ شانی کے اندر کروٹ لیتا ہوا گریز بھی تھا۔ وہ رستم سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ پیچھے ہٹ جائے۔ مگر

وہ کہہ نہیں سکی تھی یا شاید اس نے اتنے مدھم لہجے میں کہا تھا کہ یہ بات رستم کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں پائی تھی۔

اس کا ذہن ایک بار پھر نیند کی تاریکیوں میں اُتر گیا۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر گہری غنودگی کی کیفیت میں لیٹی رہی۔ اس کے ارد گرد تاریکی تھی۔ بس اس تاریکی میں نارنج کی روشنی نظر آتی تھی یا یہ احساس ہوتا تھا کہ دور اوپر دراڑ کے سرخ روشنیوں والے کنارے پر کچھ لوگ موجود ہیں اور گا رہے ہیں بلند آواز میں رستم سے مخاطب ہوتے ہیں۔ جب وہ مخاطب ہوتے تھے تو ان کی آوازیں دیر تک دراڑ کے وسیع خلا میں گونجتی تھیں اور شانی کو ایک طلسماتی دنیا میں لے جاتی تھیں۔

غنودگی کی ہی کیفیت میں شانی کو ایسا لگا کہ وہ اس تاریک غار میں نہیں ہے۔ وہ کہیں اور ہے۔ اس کے کانوں میں ہزاروں مہتم مرد و زن کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ وہ ایک زبان ہو کر گا رہے تھے۔

من جا پیاری من جا
راج دلاری من جا
تیرا ماہی بڑی دور سے آیا ہے
اس کا مکھڑا زخموں نے گہنایا ہے
دیکھ نی اس کے بھیڑے حالوں کو
دیکھ نی اس کے پاؤں کے چھالوں کو
من جا پیاری من جا
راج دلاری من جا

غنودگی ہی کی کیفیت میں اس نے اپنے سامنے چمکتی دھوپ میں لہلہاتے سرکنڈے دیکھے۔ ان سرکنڈوں کے پیش منظر میں وہ ہزاروں مہتم قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کاہو کے خوش رنگ پھول تھے اور آنکھوں میں شانی کے لئے محبت تھی۔

پھر ایک نہایت خوفناک کرخت آواز شانی کے کانوں میں گونجی۔ کوئی خوفناک انداز میں چنگھاڑا تھا۔

شانی ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے لگا اس کا پورا جسم لرز رہا ہے۔ چند فٹ کے فاصلے پر رستم اس کے سامنے موجود تھا اور سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''کیا ہوا بی بی؟''

وہ خود بھی سوچنے لگی۔ کیا ہوا تھا۔

ایک عجیب سا خوف شانی کے سینے میں لہریں لینے لگا۔ ایک بے نام ڈر اس کے کشیدہ اعصاب کو جکڑتا چلا گیا۔ وہ بیدار تھی لیکن لگتا تھا کہ اس کا ذہن بیدار نہیں ہے۔ قرب و جوار نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ بلندی سے اُبھرنے والی آوازیں جیسے سینکڑوں ہزاروں میل کے فاصلے سے زمانوں کا سفر طے کرنے کے بعد آ رہی تھیں..... یہ کن کی آوازیں تھیں۔ یہ کون سا قبیلہ تھا؟ وہ خود تاریخ کے کس دور سے گزر رہی تھی؟

اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے رستم کو دیکھا۔ وہ اس سے چند فٹ کی دوری پر موجود تھا۔ ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے کے ایک حصے کو روشن کر رہی تھی۔ شانی نے جیسے سہارے کے لئے اس کا بازو تھام لیا۔ اس کا بازو مضبوطی سے تھامے تھامے اس نے اپنا سر کمبل سے بنے ہوئے تکیے پر ٹکا دیا۔ اس کا ذہن ایک بار پھر غنودگی کی ہلکی دھند میں اُترنے لگا۔ وہ کسی کی آواز پر ڈری تھی۔ وہ کون تھا؟ اس نے چلا کر کہا تھا۔ ''میں تجھے زندہ درگور کردوں گا۔''

شاید وہ پیر قدرت اللہ تھا۔ اسی کی آواز میں ایسی گرج اور اتنی پُراسراریت ہو سکتی تھی۔ شانی کے لئے اتنی نفرت بھی شاید اسی کی آواز میں تھی۔ اس آواز کو یاد کر کے شانی کے جسم کی کپکپی بڑھ گئی۔ اس نے دُھندلائے ذہن کے ساتھ سوچا، یہ کیسی کپکپی ہے۔ خوف ہے، سردی ہے یا بخار ہے؟ ایک بار پھر مدہوشی کی کیفیت میں گم ہونے سے پہلے اسے بس اتنا یاد رہا کہ وہ پہلو کے بل لیٹی ہے اور اس کے ہاتھوں کی گرفت رستم کے بازو پر قائم ہے۔ نہ جانے اسی طرح وہ کب دوبارہ سو گئی۔ نیند کی حالت میں بھی اسے مسلسل کپکپی محسوس ہوتی رہی۔

نیند اور نیم بیداری کے یہ دورانیے وقفے وقفے سے آتے رہے۔ نیم بیداری یا غنودگی کے ایک ایسے ہی دورانیے میں اسے لگا کہ اسے آگ کا ایک الاؤ میسر آ گیا ہے..... اس کے ہاتھوں میں رستم کا توانا بازو بدستور موجود تھا۔ وہ رستم کے بالکل قریب لیٹی ہوئی تھی۔ اس قدر قریب کہ اس کا چہرہ رستم کی گردن سے چھو رہا تھا۔ وہ رستم سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس نے غنودگی کے عالم میں سوچا۔ کیا وہ مر چکی ہے؟ کیا یہ دوسری دنیا ہے جہاں چوہدری فاخر یا چوہدری بشیر کے بجائے رستم سیال اس کا شریکِ سفر ٹھہرا ہے۔ کیا وہ واقعی رستم سیال ہے یا صرف ایک الاؤ ہے جو اس کے ٹھٹھرے ہوئے جسم کو حرارت پہنچا رہا ہے اور وہ اسے رستم سمجھ رہی ہے۔ وہ پوری طرح بیدار ہونا چاہتی تھی۔ اس صورتِ حال کو سمجھنا چاہتی تھی۔ اگر وہ واقعی رستم سیال تھا اور وہ مری بھی نہیں تھی اور یہ دوسری دنیا بھی نہیں تھی، تو پھر اسے رستم سے دور ہٹ جانا چاہئے تھا۔ رستم اور اس کا میل ممکن نہیں تھا اور..... وہ کسی اور کی امانت تھا.....

اس نے پوری طرح بیدار ہو کر اپنی آنکھیں کھولنا چاہیں، آنکھوں اور پلکوں پر بے پناہ بوجھ تھا۔ غنودگی کی سنہری دھند چند لمحوں کے لئے چھٹتی محسوس ہوئی لیکن ایک بار پھر کسی جانب سے گہرے سنہری، گاڑھے مرغولے اُمڈ اُمڈ کر آنے لگے۔ ان میں عجیب سا خمار تھا۔ شانی نے دھندلائے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچا..... اگر وہ زندہ ہے تو شاید اسی خمار آلود دھوئیں کے زیرِ اثر ہے جو اس نے سرنگ میں محسوس کیا تھا۔ ہاں یہ ویسا ہی خمار ہے، یہ ویسی ہی بے خودی ہے۔ کتنا سکون ہے، کتنی راحت ہے، کاش حرکت کرتا ہوا وقت رک جائے، کاش کائنات کی گردش تھم جائے۔ وہ انہی سنہری مرغولوں میں کسی کا بازو تھامے، کسی کی گردن سے چہرہ لگائے ساکت پڑی رہے۔ کوئی اسی طرح اس کے قریب رہے، اتنا قریب کہ سر سے پاؤں تک اس کے پُرحرارت جسم کا لمس محسوس ہوتا رہے۔ اس نے بازو پر گرفت مضبوط کی اور الاؤ کے کچھ اور بھی قریب ہو گئی۔

☆=======☆======☆

رستم، شانی کے قریب تھا۔ اتنا قریب کہ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے حواسِ خمسہ پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ پچھلے 20 گھنٹے کے مناظر اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے..... شانی اور بلاول احمد کے دراڑ میں گر جانے کے آٹھ دس منٹ بعد رستم نے شانی کی آواز سنی تھی اور اس کے بعد اس کے لئے ممکن ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کنارے پر موجود رہتا۔ فرید، حسنے اور گوہر وغیرہ نے اسے بہت منع کیا تھا۔ تھوڑے سے صبر کے مشورے دیئے تھے لیکن وہ یہ مشورے قبول نہیں کر سکا تھا اور پھر ایک نہایت کٹھن اور پُرخطر کوشش کے بعد دراڑ میں اُتر کر شانی تک پہنچ گیا تھا.....

یہاں پہنچنے کے بعد جو واقعات رُونما ہوئے تھے وہ بھی ایک انہونے سپنے کی طرح تھے اور اب..... اب شانی اس کے قریب موجود تھی۔ اتنی قریب کہ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ غنودگی کی کیفیت میں تھی۔ اس کی ساری حسیات جیسے اونگھ رہی تھیں۔ اس میں کچھ خلل غالباً اس ایک فٹ لمبے سرخ شیل کا بھی تھا جو رستم کے منع کرنے کے باوجود فرید نے سرنگ میں پھینکو ادیا تھا۔ یہ اعصاب شکن گیس کا شیل تھا یہ خاص قسم کی گیس صحت کو کسی طرح کا نقصان پہنچائے بغیر دل و دماغ پر نشہ آور دوا کی طرح اثر کرتی تھی۔

شانی پچھلے کم از کم دو گھنٹے سے ہلکے بخار کی کیفیت میں بھی تھی۔ اسے کپکپی محسوس ہو رہی تھی..... اسی کیفیت میں اس نے رستم کا بازو تھاما اور اسے اپنے قریب کر لیا تھا۔ اب وہ رستم کے پہلو میں اس طرح موجود تھی کہ اس کا تپا ہوا چہرہ رستم کی گردن سے پیوست تھا اور وہ خود

بھی۔

یہ عجیب ہیجان تھا، یہ عجیب لمس تھا۔ رستم کے لئے باہوش وحواس یہ سب کچھ جھیلنا بے حد مشکل تھا۔ اس کی حالت اس شخص جیسی تھی جو چند گھونٹ پانی کے لئے ترس رہا ہو اور اسے ایک عظیم الشان لہریں مارتے دریا کے روبرو کھڑا کر دیا جائے یا تاریک قید خانے میں مومی شمع کی ایک کرن کے لئے تڑپنے والے کو ٹھاٹیں مارتی دھوپ کے سمندر میں ڈبو دیا جائے۔ وہ اتنی روشنی، ایسی پُرشکوہ تجلی جھیلتے ہوئے سرتاپا لرز رہا تھا۔ وہ اس کے قریب تھی۔ اس کی سانس جس کی مہک پر وہ دنیا بھر کی خوشبوئیں وار سکتا تھا، اس کے سینے سے چُھو رہی تھی۔ اس کے جسم پر پھیل رہی تھی اور اس کا لمس جو اس کے لئے کائنات کی حسین ترین شے تھا، اسے ان طلسماتی گھڑیوں میں میسر تھا۔ وہ ایک ڈاکو تھا۔ ایک قاتل بھی تھا۔ لوگ کہتے تھے اس کے سینے میں پتھر کا دل ہے۔ وہ موت کا مقابلہ ہی نہیں کرتا اس کا پیچھا بھی کرتا تھا لیکن آج وہ ڈر رہا تھا۔ رعبِ جلوہ، پندارِ حسن اس کو لرزہ براندام کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں خیرہ تھیں، اس کا سینہ شق تھا۔ وہ اس کی پرستش کرتا تھا۔ وہ دیوی تھی اور اس کی بانہوں میں تھی۔

''بی بی جی۔'' وہ ذرا اونچی آواز میں بولا۔ وہ بدستور اس کی بانہوں میں رہی۔ بس اس کے ہونٹوں نے اس کی گردن پر حرکت کی۔ شاید غنودگی میں اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔

ہونٹوں کی یہ حرکت رستم کی گردن نے محسوس کی لیکن اس کا اثر اس کے دل اور روح کی اتھاہ گہرائیوں تک گیا۔

وہ کچھ اور بھی اس کے ساتھ پیوست ہوئی۔ اس کے نم بال رستم کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا انگارہ بدن رستم کے ہر گریز کو راکھ کر رہا تھا۔ بڑی محبت...... بڑی نرمی اور دل گداز وارفتگی سے رستم نے دیوی کے نم بالوں کو چوم لیا ایک بار...... دو بار۔ پھر اس کی پیشانی کو، پھر اس کے رخسار کو، پھر دیوی کے آتشیں ہونٹوں کو، پھر گردن کو۔ وہ جیسے چوم نہیں رہا تھا پرستش کر رہا تھا۔ خراجِ بندگی ادا کر رہا تھا۔ چومنے کے لئے رونا ضروری نہیں ہوتا لیکن پرستش اور بندگی کو اشکوں سے منسوب کیا جاتا ہے اور وہ اشک بار تھا۔ وہ اس کے جسم کو چومنے لگا، ایک نازک گلاب کی طرح اس نے دیوی کو اپنی بانہوں میں لیا اور اس احتیاط کے ساتھ اپنے سینے سے لگایا کہ گلاب کی کوئی پنکھڑی بھی دبنے یا مڑنے نہ پائے۔ ہاں یہ محبت تھی...... اور پرستش تھی...... اور دیوانگی تھی۔

......وہ گہری غنودگی میں تھی اور عجیب کیفیت میں تھی۔ جیسے کچھ بھی سمجھ نہ پا رہی ہو۔ اس

کی زندگی میں تو بس ایک روندنے اور بھنبھوڑنے والا مرد آیا تھا۔ جو اس کے کومل [illegible] پر اپنی وحشت کے نشان چھوڑتا تھا، اسے توڑتا موڑتا تھا اور نڈھال کر کے چھوڑ جاتا تھا۔ [illegible] چوہدری فاخر کہتے تھے۔

رستم دیوی سے پیار کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا یہ کوئی سپنا ہے، جادو ہے؟ یا صرف فریب احساس اور واہمۂ نظر۔

ایک دم وہ کانپ گیا۔ سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک دہل گیا۔ دیوی مکمل ہوش میں نہیں تھی لیکن اس کا اپنا ذہن تو برا بھلا کام کر رہا تھا۔ بے شک وہ پرستش کر رہا تھا لیکن کہاں پرستش ختم ہوگی، کہاں بے ادبی شروع ہو جائے گی۔ اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ پرستش کی حد سے آگے چلا جاتا تو پرستش بدترین جرم بن جاتی۔ پھر اس جرم کی پاداش میں اسے بار بار زندہ کر کے مارا جاتا تو یہ بھی کم ہوتا۔ وہ ایسے جرم کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو دیوی کی پیشانی پر ایک شکن کا متحمل نہیں تھا۔ وہ یکایک پیچھے ہٹ گیا۔ پنجاب کے نامور ڈکیت کا دل خشک پتے کی طرح لرزنے لگا۔ پرستش کے آنسو اس کی چھوٹی چھوٹی ریشمی داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔

وہ دو زانو بیٹھ گیا۔ بڑی ٹارچ کی پھیلی ہوئی روشنی میں وہ روبرو تھی۔ لحاف اس کے بدن سے تھوڑا سا سرک گیا تھا۔ وہ سراپا حسن اور دلکشی۔ وہ پنجاب کا عطر تھی۔ گجرات کی سوہنی، تخت ہزارے کی ہیر، سوہنے پنڈ کی صاحباں اس کے وجود میں یکجا ہو گئی تھیں۔ ان لمحوں میں رستم کو لگا کہ اس کے جسم کے ہر پیچ وخم پر ہیر اور مرزا صاحباں جیسی ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

وہ دو زانو بیٹھا رہا۔ ایک عابد کی طرح اسے دیکھتا رہا۔ اس کا پریشان ذہن سوچتا رہا کہیں پرستش نے بے ادبی کی حد کو چُھو تو نہیں لیا...... اور اگر ایسا ہوا ہے اور مکمل ہوش میں آنے کے بعد دیوی نے اس بارے میں ناراضی ظاہر کی تو وہ اس ناراضی کو کیسے جھیل پائے گا۔ اس نے لحاف پھر سے شانی کے اوپر سرکا دیا ان لمحوں میں وہ نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس صورتِ حال پر خود بھی حیران ہو۔

رستم ننگے پاؤں فرش پر اس طرح لیٹ گیا کہ اس کا سر شانی کے پاؤں کی طرف آ گیا۔ جس طرح نازک آبگینوں کو تھاما جاتا ہے، ایسے ہی رستم نے شانی کے دونوں پاؤں تھامے اور ان پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ ہونٹ جو آنسوؤں سے تر تھے۔

''بی بی، اگر غلطی ہوئی ہے تو معاف کر دینا۔'' اس نے خود کلامی کے انداز میں [illegible]

عجیب کیفیت کے زیر اثر اونگھنے لگا۔

نہ جانے وہ کب تک سویا رہا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو اس کا سر بی بی کے پاؤں پر نہیں تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ ٹارچ کی روشنی بے حد مدھم ہو چکی تھی۔ اس نے دوسری ٹارچ جلائی۔ کلائی کی گھڑی دیکھی۔ رات گزر چکی تھی۔ نیا دن طلوع ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا بی بی ایک طرف سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ اس نے کپڑے تبدیل کر لئے تھے۔

کتنی ہی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ رستم کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ بات کرتا۔ رات کے مناظر نگاہوں کے سامنے تھے۔ ذہن چکرا رہا تھا۔ اس نے دو تین بار کوشش کی کہ بی بی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے لیکن نہیں دیکھ سکا۔ بی بی بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ خاموشی گھمبیر ہوتی چلی گئی۔ آخر بی بی کی آواز نے ہی خاموشی توڑی۔ ''تم نے کہا تھا کہ صبح تک ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ صبح ہو چکی ہے۔''

''لل..... لیکن ابھی سورج نہیں نکلا بی بی۔ میرا اندازہ ہے کہ اگلے ایک دو گھنٹے میں ہمیں نکال لیا جائے گا۔''

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ نہایت بوجھل اور بے ڈھنگی خاموشی، رستم نے ہمت کر کے کہا۔ ''بی بی، آپ کا..... بخار کیسا ہے اب؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''اور آپ کی گردن کا درد؟''

''وہ بھی پہلے سے بہتر ہے۔''

''بی بی! آپ کچھ کھائیں گی؟ کھانا موجود ہے۔''

''نہیں۔''

''اور دوا؟''

''نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔''

ایک بار پھر بے ڈھنگی خاموشی۔ اس خاموشی میں بس پانی بہنے کی آواز تھی اور بہت اوپر بلندی سے پنچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ دراڑ کے کنارے پر چرخی وغیرہ نصب کی جا رہی ہے۔

خاموشی طویل ہوتی چلی گئی۔ رستم نے ہمت جمع کر کے کہا۔ ''بی بی..... آپ..... ناراض ہیں؟''

اس سوال کا جواب چند سیکنڈ بعد آیا۔ ''نہیں۔'' یہ جواب بھی پہلے جوابوں کی طرح

بہت مختصر تھا۔ تاہم بی بی کے انداز سے عیاں تھا کہ یہ جواب بیتی ہوئی رات کے تسلسل میں ہے۔

شانی اپنی جگہ سے لنگڑاتی ہوئی اٹھی اور کینوس کے بیگ سے خود ہی فرسٹ ایڈ بیگ نکال لیا۔ پہلے اس نے اپنی گردن پر VIX لگائی۔ پھر پاؤں اور گھٹنے پر دوا لگانے میں مصروف ہو گئی۔ رستم کے ذہن میں ابھی تک تجسس تھا کہ بلاول کہاں گیا؟ وہ اسے زندہ یا مُردہ حالت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک ٹارچ بی بی اور آبی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔

ایک آٹومیٹک رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ ابھی وہ دس پندرہ قدم ہی چلا تھا کہ اسے بھورے پتھروں پر ایک سیاہ رنگ کی چیز پڑی نظر آئی۔ یہ ایک پستول تھا۔ رستم نے پستول اٹھا لیا۔ یقیناً یہ بلاول کے ہاتھ سے گرا تھا۔ اس میں پانچ گولیاں موجود تھیں۔ ایک گولی اس بدبخت نے سرنگ میں چلائی تھی۔ رستم نے یہ پستول قمیص کے نیچے لگا لیا۔ وہ دس پندرہ قدم مزید چلا۔ آگے جا کر کھائی ایک دم تنگ ہو گئی تھی۔ یہاں پانی میں چھوٹے بڑے پتھر بھی پڑے تھے۔ بہتے پانی کی مسلسل رگڑ سے یہ گول یا بیضہ گول ہو چکے تھے۔ اچانک رستم کی ٹارچ کا روشن دائرہ ایک جسم پر پڑا۔ اس کے اعصاب تن گئے۔ یہ بلاول کی لاش تھی۔ لاش اوندھی پڑی تھی اور دو پتھروں کے درمیان اٹکی ہوئی تھی۔ حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تقریباً 24 گھنٹے پہلے ہی مر چکا ہے۔ ٹارچ کی روشنی میں رستم نے دیکھا۔ اس کا ایک بازو کندھے پر سے تقریباً اکھڑ چکا تھا۔ سر پر سامنے کی طرف سے ایک گہرا مہلک زخم تھا۔ یہ زخم کسی بھی شخص کی جان لینے کے لئے کافی تھا۔ اس کے علاوہ بلاول کے بائیں رخسار پر بھی چوٹ کا گہرا نشان دکھائی دیا۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ یہ نشان شانی کی رائفل سے لگائی گئی چوٹ کا ہے۔

بلاول کی صورت دیکھ کر رستم کا خون کھولنے لگا۔ اس کے کانوں میں کچھ فقرے گونجنے لگے۔ غیظ و غضب کی ایک ایسی بلند لہر اس کے اندر سے اٹھی کہ اسے خود کو سنبھالنا ناممکن ہو گیا۔ بلاول لاش کی شکل اختیار کر چکا تھا اور لاش قابل احترام ہوتی ہے لیکن وہ اس لاش کا احترام نہیں کر سکا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس نے یکے بعد دیگرے پانچ دفعہ ٹریگر دبایا اور بلال کی کھوپڑی اور چہرہ اُڑا کر رکھ دیا۔ دراڑ کے خلا میں رائفل کے دھماکے اتنی شدت سے گونجے کہ ہر ام مچ گیا۔ کسی نامعلوم جگہ سے کچھ چمگادڑیں اڑیں اور پر پھڑپھڑاتی مزید تاریکی میں گھس گئیں۔

شانی کے چلانے کی آواز رستم کو صاف سنائی دی۔ ''کیا ہوا رستم، کون ہے یہاں؟''

رستم نے بلاول کے مسخ چہرے پر ایک نفرت انگیز نگاہ ڈالی اور اپنے لہجے کو سنبھال کر بولا۔ ''کوئی نہیں بی بی۔''

''گولی کیوں چلائی؟''

''یونہی شک ہوا تھا جی..... کوئی نہیں ہے۔''

اسی دوران میں اوپر سے بھی پُرتشویش آوازیں سنائی دینے لگی۔ جسنے گھبراتی کی گھبرائی ہوئی آواز رستم کے کانوں تک پہنچی۔ ''رستم بھائی کیا پھڈا ہو گیا ہے، فائر کیوں کئے؟''

رستم نے منہ اوپر اٹھایا۔ دونوں ہاتھوں کا بھونپو سا بنا کر زور سے بولا۔ ''کچھ نہیں ہے یار..... بس شک ہوا تھا۔ سب ٹھیک ہے۔''

''جھوٹ تو نہیں بول رہے؟'' جسنے نے پکار کر کہا۔

''نہیں بول رہا جھوٹ۔'' رستم قدرے بے زاری سے بولا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ بی بی ٹارچ پکڑ کر اِدھر آئیں اور بلاول کی بگڑی ہوئی خوفناک شکل دیکھیں۔ وہ بلاول پر آخری نظر ڈال کر واپس مڑا اور بی بی کی طرف آ گیا۔

''کیا دیکھا تھا تم نے؟'' بی بی نے اس کی طرف نگاہ اٹھائے بغیر پوچھا۔

''مجھے لگا تھا کہ اندھیرے میں کوئی ہلا ہے۔ تھوڑا سا کھڑکا بھی ہوا تھا۔''

شانی نے مزید دو تین سوال کئے۔ پتا نہیں کہ وہ رستم کے جوابوں سے پوری طرح مطمئن ہوئی یا نہیں لیکن چپ ضرور ہو گئی۔

کچھ دیر بعد فرید کی بھاری آواز اس دراڑ کے وسیع خلا میں گونجی۔ ''رستم، اگر کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ میں نیچے آنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

رستم نے کہا۔ ''کہا ہے ناں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم نیچے نہ آؤ ابھی کتنی دیر لگے گی؟''

''زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ۔ ہم نے چرخی تیار کر لی ہے۔ بس جلدی یہ رسہ نیچے پھینکیں گے۔'' پھر اس نے ذرا توقف کیا اور پوچھا۔ ''کیا بی بی، اکیلی اوپر آ سکتی ہیں میرا مطلب ہے زخمی تو نہیں؟''

رستم نے شانی کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

رستم نے فرید سے پوچھا۔ ''کیا رسے سے باندھنا ہے؟''

''نہیں۔'' فرید نے نفی میں جواب دیا۔ ''ہم نے جھولے کی طرح بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ جب تم رسہ پھینکو گے تو دیکھ لیں گے کیا کرنا ہے۔''

جواب میں فرید نے پھر کچھ کہا لیکن زیادہ گونج کے سبب بات سمجھ میں نہیں آئی۔

رستم نے کن انکھیوں سے بی بی کی طرف دیکھا۔ وہ مسمار سیڑھیوں کے قریب کسی تصویر کی طرح بیٹھی تھیں۔ ٹارچ کی روشنی بی بی اور سیڑھیوں کو ایک جادوئی ٹچ دے رہی تھی۔ ایسی تصویریں رستم نے کیلنڈروں اور انگریزی رسالوں میں دیکھی تھیں۔ وہ جیسے ساکت بیٹھی ان سیڑھیوں کے بارے میں ہی سوچ رہی تھیں۔ یہ کب اور کس نے بنائی تھیں.....؟ ان کا مقصد کیا تھا؟ کیا اس گہری تاریک دراڑ میں انسانی ہاتھوں سے بنی ہوئی کچھ اور چیزیں بھی موجود تھیں.....؟

اچانک رستم نے شانی کو بُری طرح چونکتے اور سیڑھیوں سے پیچھے ہٹتے دیکھا۔ وہ نہ صرف ہٹ گئیں بلکہ کھڑی بھی ہو گئیں۔ وہ واضح طور پر خوف زدہ نظر آئیں۔

''کیا ہوا بی بی؟'' رستم نے بی بی سے فاصلہ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں..... وہ..... میں۔'' بی بی ہکلا کر رہ گئیں۔

رستم نے ٹارچ کی روشنی شانی کے اردگرد پھینکی۔ اسے بھی بظاہر کوئی شے نظر نہیں آئی۔ بی بی سیڑھیوں سے ہٹ کر کھردری سیاہ دیوار کے پاس آ گئیں اور ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے گردن کے گرد بام لگا کر ایک گرم کپڑا باندھ رکھا تھا۔

رستم ابھی تک الجھن میں تھا۔ پھر وہ بھی گہری سانس لے کر ایک جانب بیٹھ گیا۔ یہاں کئی قسم کے حشرات الارض بھی موجود تھے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ بی بی کسی کیڑے وغیرہ سے ڈری ہیں اور اب اپنا ''فطری نسوانی خوف'' چھپانے کے لئے چپ ہو گئی ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد اوپر سرخ روشنیوں والے کنارے پر ہلچل میں اضافہ ہو گیا۔ پھر اسے وہ شے نظر آئی جس کا وہ اور بی بی (خاص طور سے بی بی) بڑی شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ یہ ایک رسہ تھا۔ جو کنارے سے دراڑ میں لٹکایا گیا تھا اور اب آہستہ آہستہ نیچے آ رہا تھا۔

رستم نے سامان وغیرہ سمیٹنا شروع کر دیا۔ بی بی اس کی مدد کر رہی تھیں۔ وہ انہیں روکنا چاہتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں اس کے ہونٹوں پر تالا سا لگ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ طویل رسہ تاریک خلا میں لہراتا ہوا تہہ تک پہنچ گیا۔ یہ دراصل دو رسے تھے۔ یوں تو یہ ایک رسہ ہی دو بندوں کا وزن اٹھانے کے لئے کافی تھا۔ تاہم مزید احتیاط کے طور پر دوسرا رسہ بھی ساتھ لگا دیا گیا تھا۔ رسوں کے نچلے سرے پر ایک حلقہ سا بنایا گیا تھا۔ اس حلقے میں ایک کشن باندھ کر

بیٹھنے کے لئے جگہ بنادی گئی تھی۔

پہلے اس طویل رسے کے ذریعے بی بی کو اوپر پہنچایا گیا۔ اس کے بعد رستم نے کھوہ میں موجود سامان کو رسے سے منسلک کرکے اوپر بھیجا۔ بی بی اوپر جا چکی تھیں۔ وہ ایک بار پھر بلاول کی مسخ لاش کے پاس پہنچا۔ کچھ سیاہ چوہے اس کے اردگرد موجود تھے۔ رستم نے لاش کے کپڑوں کی تلاشی لی۔ تھوڑی سی نقدی، فون انڈکس اور چند کاغذات برآمد ہوئے۔ رستم نے یہ اشیاء رکھ لیں۔ بلاول پولیس کے ایک مخبر کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔ اس کے لباس سے برآمد ہونے والی اشیاء سے اس کے کردار پر روشنی پڑ سکتی تھی۔

بلاول نے سرنگ میں بی بی پر پستول تاننے کے بعد انہیں غلیظ گالیاں دی تھیں۔ اس کی پاداش میں رستم نے اس کی کھوپڑی ٹکڑوں میں تقسیم کرڈالی تھی۔ اب وہ اس گہری تاریک قبر کے گدلے پانی میں سیاہی مائل چوہوں کی خوراک بننے کے لئے موجود تھا۔ رستم نے اس پر آخری نفرت بھری نگاہ ڈالی اور رسے کی طرف بڑھ گیا۔

☆======☆======☆

اب وہ ایک بار پھر تاریک قبر سے باہر روشن دنیا میں تھے۔ یہاں پھوٹھوہار کے رنگ برنگے ٹیلوں پر دھوپ چمک رہی تھی۔ اوپر گہرا نیلا آسمان تھا اور پرندوں کی قطاریں تھیں۔ رستم قریباً 32 گھنٹے اس گھٹا ٹوپ تاریکی میں رہا تھا۔ اس لئے اس کی آنکھیں روشنی میں کھلنے سے انکار کرنے لگی تھیں۔

قریباً سارا ڈیرہ تین نمبر سرنگ میں انہیں دیکھنے کے لئے موجود تھا۔ سب سے پہلے مہناز نے آگے بڑھ کر شانی کو گلے سے لگایا اور اس کا ماتھا چوما۔ پھر فرید، حسنا اور گوہرا وغیرہ رستم سے بغل گیر ہوئے۔ پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی سے گرنے کے بعد شانی کو صرف چند ضربیں آئی تھیں۔ وہ گہرے پانی میں گری تھی۔ گرا تو بلاول بھی پانی میں تھا لیکن اس سے پہلے اس کا سر کسی پتھر سے ٹکرایا تھا اور بُری طرح گھائل ہوا تھا۔

شانی اور رستم کو چھجے کے آرام دہ کمروں میں لے جایا گیا۔ ڈاکٹر ناصر نے فوری طور پر شانی کو طبی امداد دی اور انفیکشن مٹینیس کے ٹیکے لگائے۔ فرید نے شکرانے کے طور پر دو بڑی دیگوں میں میٹھے چاول پکانے کی ہدایت کی۔

بلاول اور اس کے کردار کے بارے میں گرما گرم بحث ہوتی رہی۔ رستم کو معلوم ہوا کہ بلاول کی نقل و حرکت پچھلے دو دن سے مشکوک تھی۔ رات کو اس نے تالا توڑا اور اس حجرے میں گھس گیا جہاں لالہ فرید اور سابقہ سردار نادر کاکا کی ذاتی اشیاء موجود تھیں۔ یہاں ایک

الماری میں کرنسی، وائرلیس سیٹ اور ذاتی نوعیت کے کاغذات موجود تھے۔ بلاول اس الماری میں ہاتھ مار رہا تھا جب مراد گروپ کے شوکت بھائی نے اسے دیکھ لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ شور مچا سکتا بلاول نے درندگی سے حملہ کرکے اس کی شہ رگ کاٹ ڈالی۔ اسی دوران میں حسنا گروپ کا میاں سعید چونک کر اندر گیا۔ بلاول نے اس کے پیٹ میں شکاری چاقو مارا اور اسے بھی شدید گھائل کردیا۔

میاں سعید نے زخمی ہوکر بھی اپنی رائفل سے فائر کردیا۔ فائر کی آواز نے سب کو چوکنا کردیا اور بلاول گھبرا کر چھجے کے تیسرے کمرے میں گھس گیا۔ یہاں سے اس نے اچانک حملہ کرکے شانی کو دبوچا۔

یہ ساری تفصیل رستم کو حسنا گجراتی اور گوہرا سے معلوم ہوئی۔ اچانک گوہرا نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''لالے دی جان! کچھ پتا ہے دلاور اور کھیا دراج واپس پہنچ گئے ہیں۔''

''یہ تو اہم خبر ہے تم نے پہلے کیوں نہیں سنائی۔ کیسا رہا ہے معاملہ؟''

''ایک دم ٹچن ٹاچ۔ دونوں باتیں مان لی گئی ہیں۔ مال بھی پہنچ گیا ہے یہاں۔''

''لیکن یہ سب دھوکے کا کھیل تھا۔ اب نئے سرے سے سوچنا پڑے گا۔'' حسنے نے کہا۔ حسنا بات تو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ پولیس اور بلی ماروں نے ڈبل کراس کیا تھا۔ اپنے بندے چھڑانے کے ساتھ ساتھ ڈیرے کے دفاع میں نقب لگانے کی زہریلی کوشش بھی کی تھی اور رستم جانتا تھا اس کا ماسٹر مائنڈ کون ہوگا۔ بہرحال وہ حسنا کی ہاں میں ہاں نہیں ملا سکتا تھا۔ جب تک اس بارے میں بی بی کا خیال اسے معلوم نہ ہوجاتا وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا اور نہ کسی کو کہنے کی اجازت دے سکتا تھا۔ وہ بولا۔ ''ابھی اس بارے میں کچھ بھی کہنا ٹھیک نہیں حسنے۔''

''کیوں ٹھیک نہیں رستم بھائی؟'' مراد کا ایک بندہ تیزی سے بولا۔ ''یہ کھلی جنگ ہے۔ اس جنگ میں ہمیں دشمن کو کسی طرح کی رعایت نہیں دینی۔ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ ہی دھوکا نہیں کیا بی بی اور سردار دراج وغیرہ کے ساتھ بھی کیا ہے اور یہ دھوکا کرنے والا وہی زہریلا سانپ ہے جسے لوگ ریاض ہنڈر کہتے ہیں۔ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ اب یہ لوگ ہمیں زیادہ مہلت نہیں دیں گے۔ بہت جلد یہاں ایک بہت بڑا آپریشن ہوگا جس میں بارود بارش کی طرح برسایا جائے گا اور ہمیں ان ٹیلوں میں بھگا بھگا کر کتوں کی موت مارا جائے گا اور جب ہم نے مرنا ہی ہے تو پھر ہم بھی ان سے کسی طرح کی رعایت کیوں کریں۔''

مراد کا ایک اور ساتھی بولا۔ ''ہاں، یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے وڑی کہ اپن کو اپنا چھوٹے

سے چھوٹا پتا بھی ہاتھ میں رکھنا چاہیئے۔''

مراد کا ایک دوسرا ساتھی اپنے ساتھی کی مخالفت میں بولا۔'' بکواس نہ کرو وڑی اس طرح کا پھیسلہ کرنا اپن کا کام نہیں ہے۔لالہ فرید جانے اوراس کا کام۔''

''اوئے،تمیز سے بولنے کا ہے۔بکواس کس کو کہہ رہا ہے؟''

''اپنا مغز گھوم گیا تو اور بھی بہت کچھ بولے گا۔جاؤ پھوٹو یہاں سے۔''

دوسرے شخص نے آگے بڑھ کر پہلے والے کو دھکا دینا چاہا لیکن رستم درمیان میں آ گیا۔ اس نے الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ دوسرے شخص کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔وہ منہ میں بڑبڑایا لیکن اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ رستم سے کچھ کہہ سکتا۔

بہر حال تھپڑ کا رزلٹ آدھ پون گھنٹے بعد سامنے آ گیا۔ گوہرا نے آ کر رستم کو بتایا۔

''لالے دی جان! مراد بڑے غصے میں ہے۔وہ کہتا ہے یہاں جو کچھ ہورہا ہے الٹا ہو رہا ہے۔ قاصدوں کے بھیس میں پولیس کے ٹاؤٹ یہاں پہنچ رہے ہیں اور ان کے کہنے پر چوہدری اوراس کے بیٹے کو پھوکٹ میں چھوڑا جارہا ہے۔چوہدری کے وارث ایک کروڑ بھی آرام سے دے سکتے تھے۔''

''اس سے کہنا جا کر چوہدری کو پھر اغوا کرلائے۔ایک کی بجائے دو کروڑ لے لے۔'' رستم نے تپ کر کہا۔

ترچھی آنکھ والے کاٹھیا نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔''اس کی زبان چاقو کی طرح تیز ہے۔ بولتے ہوئے کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ابھی کہہ رہا تھا کسی کی نیت اس کے ماتھے پر نہیں لکھی ہوتی۔ کیا پتا بلاول کے ساتھ آنے والوں میں سے بھی کوئی مخبر ہو۔''

رستم کی آنکھیں ایک دم جل اٹھیں۔گوہرا کا رنگ اُڑ گیا۔اسے شاید اگلے ڈیرے پر اپنی پٹائی یاد آ گئی تھی۔کاٹھیا کے منہ سے بھی ایسی بات نکلی تھی جو رستم کو خوفناک حد تک مشتعل کر سکتی تھی......اور حقیقت یہی تھی کہ رستم مشتعل ہو چکا تھا۔مراد کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوما اور وہ ایک آتشیں بگولے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔اس کا پورا جسم تن گیا تھا۔

ہاں یہی شخص تھا جس کے بارے میں ایک بڑے پولیس افسر نے کہا تھا۔''یہ شخص خالی ہاتھ بھی بندے کو مار دینے کی خداداد صلاحیت رکھتا ہے۔'' رستم کا انداز دیکھ کر گوہرا کا ایک ساتھی بجلی کی طرح باہر نکل گیا۔اس نے قریبی کمرے میں جا کر لالہ فرید کو اطلاع دی۔ لالہ فرید بھی ایک سیکنڈ ضائع کئے بغیر رستم کے پاس پہنچ گیا۔رستم اس وقت دروازے سے نکل چکا تھا۔فرید نے اسے بانہوں میں لیا اور پورے زور سے دھکیل کر واپس کمرے میں لے گیا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔اگلے تین چار منٹ میں بند کمرے کے اندر دو پرانے دوستوں میں شدید تکرار بلکہ زور آزمائی ہوتی رہی۔فرید، رستم کو سنبھالنے کی کوشش کررہا تھا اور ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ وہ مراد کی طرف جائے اور ڈیرے پر ابتری پھیلے۔جس قسم کے حالات یہاں پیدا ہو چکے تھے ان سے نمٹنے کے لئے انہیں مکمل اتحاد اور یک جہتی کی ضرورت تھی۔جلد ہی رستم بھی اپنے طیش کو لگام دینے میں کامیاب رہا۔ویسے بھی وہ بی بی کی موجودگی میں کسی طرح کی بدمزگی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

فرید نے کہا۔''ہمیں اس مسئلے کا حل مل بیٹھ کر سوچنا ہے اور اپنے ہر ساتھی کی بات سننی ہے۔ابھی ہمارے پاس کافی وقت ہے بی بی کی حالت ایسی نہیں کہ وہ ابھی سفر کرسکیں۔انہیں کم از کم چار پانچ روز آرام کرنا ہوگا۔ڈاکٹر ناصر کا کہنا ہے کہ ان کی گردن میں کافی تکلیف ہے۔''

''لیکن فرید!تم مراد کو سمجھا دو۔اگر وہ اب اس طرح کی بات کرے گا تو میں چپ نہیں رہوں گا۔''

فرید نے یقین دہانی کرائی۔رستم،فرید،حسنا اور گوہرا وغیرہ ایک جگہ بیٹھ گئے۔چائے کا دور چلا اور رستم نے اپنے ساتھیوں کو دراڑ میں پیش آنے والے سارے حالات سے تفصیلاً آگاہ کیا۔تاہم بی بی کی ہدایت پر اس نے یہ نہیں بتایا کہ دراڑ میں بلاول کو آخری چوٹ بی بی نے لگائی تھی۔اس نے کہا۔''لگتا یہی ہے کہ وہ بدبخت نیچے گرتے ہوئے کسی پتھر سے ٹکرایا اور پانی میں پہنچتے ہی ڈوب گیا۔میں نے پانی میں آگے تک جا کر اسے دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کا کھوج نہیں ملا۔''

فرید نے رستم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔''اور وہ فائرنگ؟''

رستم نے طویل سانس لی۔''وہ سیاہ رنگ کے موٹے چوہے تھے جیسے کبھی کبھی سرنگ میں بھی ملتے ہیں۔مجھے اندھیرے میں لگا کہ شاید کوئی آرہا ہے۔''

فرید چند لمحے رستم کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر موضوع بدل کر بولا۔''بی بی سے آئندہ کے بارے میں بات ہوئی ہے؟''

''نہیں،ابھی نہیں۔''

فرید نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پُرسوچ لہجے میں کہا۔''یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ پولیس ہمارے خلاف کارروائی کا ارادہ رکھتی ہے اور ممکن ہے کہ چوہدری اوراس کے بیٹے کے چلے جانے کے بعد یہ کارروائی اور یقینی ہو جائے۔''

''لیکن اس کی بھی تو کوئی ضمانت نہیں کہ وہ یہاں رہیں گے تو کارروائی نہیں ہوگی۔'' رستم نے کہا۔

''یہ بات بھی ٹھیک ہے۔'' فرید نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

رستم نے اپنے لمبے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیچھے کی طرف گرایا۔ اس کی عقابی آنکھیں کھڑکی سے باہر پوٹھوہار کے ٹیلوں اور ان پر چمکتی ہوئی دھوپ کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ بولا۔ ''مجھے نہیں لگتا فرید! پولیس اور ایجنسیاں اتنی جلدی یہاں گھسنے کا فیصلہ کریں گی۔''

چاروں دوست اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر بات کرتے رہے۔ اس دوران میں حنیفاں ایک بڑی گول ٹرے میں مہک دیتے ہوئے میٹھے چاول لے کر آ گئی۔ فرید اٹھتے ہوئے بولا ''تم لوگ کھاؤ۔ میں مراد کی طرف جا رہا ہوں۔''

اس نے دو تین پلیٹیں ایک چھوٹی ٹرے میں رکھیں اور لے کر مراد کی طرف چلا گیا۔

شام سے کچھ دیر پہلے رستم اپنے کمرے میں پہنچا۔ خوبرو نادیہ ڈاکٹر ناصر کے کلینک سے واپس آ چکی تھی۔ واپس آنے کے بعد اس نے کمرے کی کئی چیزوں کو اِدھر سے اُدھر کیا تھا۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی لیکن رستم کو یہ سب بہت بُرا لگا۔ اس کا دل چاہا کہ نادیہ کو بُری طرح جھڑک دے لیکن پھر اس نے دماغ کو ٹھنڈا کیا۔ اس میں بھلا نادیہ کا کیا قصور تھا۔ اسے کیا پتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کمرے کو کس نے سنوارا تھا اور یہ سنوارنا رستم کے لئے کتنا اہم تھا۔

چار دن پہلے رستم کو مہناز کی زبانی معلوم ہوگیا تھا کہ صبح سویرے شانی بی بی اس کے کمرے میں گئی تھیں اور شاید کچھ دیر وہاں رہی تھیں۔ رستم کے بس میں ہوتا تو اس کمرے کو تاقیامت اسی حالت میں رہنے دیتا۔ ہاں وہ دیوانہ تھا اس کی انوکھی محبت نے اسے دیوانہ کر دیا تھا۔

اس نے کپڑے بدلے۔ یہ کپڑے بھی اب اس کے لئے بے حد..... بے حد اہمیت کے حامل ہو چکے تھے۔ صرف وہی جانتا تھا کہ کیوں؟ یہ کپڑے ''دیوی'' کے کپڑوں سے مس ہوئے تھے۔ اس کے جسم سے چھوئے تھے۔ وہ ان کپڑوں کو ہمیشہ ایسے ہی رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے لباس بدلا اور پہلے کپڑے ایک بڑے شاپر میں بڑی احتیاط سے الماری میں مقفل کر دیئے۔

ایک دم اسے یاد آیا کہ جو لباس اس نے بدلا ہے اس کی قمیص کی جیب تو اُدھڑی ہوئی تھی۔ گریبان کے کچھ بٹن بھی غائب تھے۔ اب بٹن بھی موجود ہیں اور جیب بھی سلی ہوئی تھی۔

اس کے دل میں ایک نیا خیال آیا اور خوشگوار دھڑکنیں جاگ اٹھیں۔ اس نے نادیہ سے پوچھا۔ ''یہ بٹن تم نے لگائے تھے؟''

''نہیں۔'' نادیہ نے نفی میں سر ہلایا، پھر بولی۔ ''شاید مہناز آپا نے لگا دیئے ہوں گے۔''

''اور استری؟''

''وہ بھی شاید انہوں نے کی ہوگی یا شاید حنیفاں نے۔''

رستم نے مزید تحقیق مناسب نہیں سمجھی اور باہر آ گیا۔ سورج دور مغربی ٹیلوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ جنوب کی طرف ہلکی سی لالی تھی..... اور ہوا چل رہی تھی۔ ہاں یہ وہی جنوب تھا جہاں بی بی رہتی تھیں۔ جہاں انہیں جانا تھا۔ آج نہیں تو دو دن بعد..... یا چار دن بعد۔ انہیں چلے جانا تھا اور شاید رستم نے بھی چلے جانا تھا۔ رستم کا سفر زیادہ لمبا تھا۔ پولیس رپورٹوں اور قانونی دستاویزات میں اس کی موت طے ہو چکی تھی۔ واپسی کا کوئی راستہ تھا اور نہ کوئی گنجائش۔ وہ درجنوں افراد کا قاتل تھا اور ان میں کئی پولیس والے بھی شامل تھے۔ آخری کارنامہ وہ مہتم بستی کے قریب ڈیک نالے کے کنارے انجام دے چکا تھا۔ اس نے چار افراد کو مارا تھا اور ان میں تین پولیس والے تھے۔ ہاں وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

لیکن..... کل رات اسے جو کچھ ملا تھا وہ اتنا زیادہ تھا کہ اسے آنے والی موت کا اب ذرا بھی دکھ نہیں رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اس بے مثال آسودگی اور خوشی کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا اور اس کی حرکتِ قلب بند ہو جائے گی..... وہ تو صرف بی بی کا ہاتھ چھونے کے بدلے اپنی پوری زندگی نچھاور کر سکتا تھا۔ قدرت نے اسے دیا تھا اور اتنا کہ اس کے دامن میں سمٹ نہیں رہا تھا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کہیں کسی پُرسکون جگہ جا بیٹھے۔ وہاں کوئی اس کی تنہائی میں مخل ہونے والا نہ ہو۔ وہ کل بیت جانے والی طلسمی رات کو بار بار یاد کرے، بار بار ان بے بہا مناظر کا تصور ذہن میں لائے جنہوں نے اس کی زندگی کا مول ادا کر دیا تھا۔ وہ ان جادوئی مناظر کو پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ بار بار ذہن میں لانا چاہتا تھا۔

اور وہ ایک سرخی مائل ٹیلے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ یاد کرنے لگا اور خود کو یقین دلانے لگا کہ ایسا کیوں تھا۔ بخار اور غنودگی کے عجیب و غریب خمار میں کپکپاتی ہوئی بی بی نے اس کے بازو کو بڑی شدت سے تھام رکھا تھا۔ پھر انہوں نے اپنا چہرہ اس کی خوش نصیب گردن میں گھسا دیا تھا۔ پھر ان کے ہونٹوں نے رستم کی گردن پر حرکت کی تھی۔ انہوں نے کچھ کہا تھا لیکن رستم کو یہ گمان..... کہیں زیادہ..... کہیں زیادہ زندگی بخش لگتا تھا کہ انہوں نے اپنے

ہونٹوں سے اس کی گردن کو چھوا تھا۔ پھر کیا ہوا تھا؟ پھر یہ ہوا تھا کہ رستم ایک ناقابلِ بیان جاں افزا روح پرور لہر میں بہہ گیا تھا۔ اس نے بی بی کو چوما تھا۔ ان کے نم بالوں کو، ان کی گرم پیشانی کو، ان کے رخسار کو، ان کے ہونٹوں کو، ان کے جسم کو۔ وہ ایک ایک لمس کو یاد کرنے لگا۔ اس کی گہرائی میں کھونے لگا۔ اسے لگا کہ صدیاں بھی بیت جائیں تو وہ اسی طرح بیٹھ کر اس گرم خوشبودار لمس کو یاد کر سکتا ہے۔ ایک ہزار سال تک پیشانی کا لمس، ایک ہزار سال تک رخسار اور ایک ہزار سال تک ہونٹوں کا لمس۔ وہ دیوانوں کی طرح سوچ رہا تھا اور اس دیوانگی پر دیوانہ جہان کو قربان کر سکتا تھا۔ یہ دیوانگی اسے راحت دے رہی تھی۔

اس کا جی چاہا کہ وہ کچھ گنگنائے یا پھر یونہی ان ٹیلوں میں گھومتا رہے۔ کسی چلبلے نوجوان کی طرح بھاگ بھاگ کر ڈھلوانوں پر چڑھے اور اُترے۔ مد بھری ہوا سے بغل گیر ہو کر کنکر اٹھا اٹھا کر باری باری تالاب میں پھینکے اور پانی پر بننے والے دائروں کو دیکھے۔ اسے لگ رہا تھا کہ زندگی نے اسے سیراب کر ڈالا ہے۔ اب اسے اور کچھ بھی نہیں چاہئے۔ ان حسین ترین یادوں کو اپنے سینے اور اپنی آنکھوں میں سجا کر اسے جلدی سے کہیں بہت دور چلے جانا چاہئے، یا پھر مر جانا چاہئے۔

اچانک ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا اور وہ آج صبح تاریک غار میں پیش آنے والے ایک واقعے کو یاد کرنے لگا۔ بی بی مسمار شدہ سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں۔ اچانک وہ بُری طرح چونکی تھیں اور گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کوئی وجہ نہیں بتائی تھی۔ رستم نے اپنے طور پر گمان کیا تھا کہ شاید وہ کسی کیڑے یا چھپکلے وغیرہ سے ڈر گئی تھیں لیکن اسے بی بی کے اردگرد کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا۔ وہ کیوں ڈری تھیں؟ یہ ایک معمولی سی بات تھی مگر رستم کو وہاں دراڑ میں پیش آنے والا ہر واقعہ ہر ہر بات یاد کرنا اچھا لگ رہا تھا۔

اچانک ایک آہٹ نے رستم کو چونکا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ حسنا گجراتی اس کی طرف آ رہا تھا۔ ایک ایل ایم جی اس کے کندھے پر تھی اور ایک چھوٹی ٹارچ اس نے حسبِ معمول اپنی جیب میں ڈال رکھی تھی۔

رستم کو اس کا یوں آنا اچھا نہیں لگا تھا لیکن وہ بے تکلف دوست کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ وہ اسے کچھ کہہ نہیں سکا۔

حسنے نے رستم کو مسکراتی نظروں سے دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر گجراتی کے وہی دو شعر پڑھے جو چند دن پہلے بھی پڑھے تھے۔ ان شعروں کا مطلب تھا "وہ خوبصورت ہے اور ایسی خوبصورت ہے کہ اس کے سامنے جھکنے اور سر جھکانے کو دل چاہتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں

کہ اسے دیکھا جائے اور اس سے محبت نہ کی جائے۔"

رستم بس خاموشی سے حسنے کو دیکھتا رہا۔ پھر ہولے سے بولا۔ "کہاں گھوم رہے ہو؟"

"بھرا جی، یہی سوال میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"بس ہوا کھا رہا تھا۔"

"مجھے تو لگتا ہے، کسی کا غم کھا رہے تھے۔"

رستم نے بالوں کو انگلیوں میں تھام کر پیچھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ "حسنے میں کالج کا منڈا نہیں ہوں اور نہ ہی تم نئے نئے جوان ہوئے ہو کہ ہم اس طرح بیٹھ کر عاشقی معشوقی کی باتیں شروع کر دیں۔"

"عاشقی کے لئے کوئی عمر نہیں ہوتی یار جی اور تم کون سا بڈھے ہو گئے ہو۔ پینٹ قمیص پہن کر کلین شیو ہو جاؤ تو کالج کے منڈے ہی لگو۔"

"اچھا، اب کیا مسئلہ ہے۔ کس لئے آئے ہو؟" رستم نے مزید سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

حسنا نے جواب دینے کے بجائے جیکٹ کی جیب سے وِنسکی کی چھوٹی بوتل نکالی اور ہونٹ تر کرنے کے بعد اسے رستم کی طرف بڑھایا۔ رستم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔ بس ایک سگریٹ دے دو۔"

حسنا نے دو سگریٹ نکالے ایک اپنے ہونٹوں میں دبایا اور دوسرا رستم کی طرف بڑھا دیا۔ دو تین گہرے کش لینے کے بعد بولا۔ "رستم بھائی! میں اچھی طرح جانتا ہوں، تم چھوٹی بھرجائی کے ساتھ زیادہ خوش نہیں ہو۔ ایسے لگتا ہے کہ چھوٹی بھرجائی سے تمہارا رشتہ مجبوری کا رشتہ ہے۔ پتا نہیں کیا مجبوری ہے؟" اس نے چند لمحے توقف کر کے ایک اور کش لیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میرا دل کہتا ہے کہ تمہارا دل اب بھی بی بی جی پر ہے اور شاید دوسری طرف بھی کچھ ایسی ہی بات ہے..... میری بات کا بُرا نہ ماننا۔ ایسی باتیں چھپانے سے چھپتی نہیں ہیں بلکہ چھپانے سے اور بھی ظاہر ہوتی ہیں۔"

"تم اپنی بات مختصر کرو تو بہتر ہے۔" رستم نے روکھے لہجے میں کہا۔

وہ بے خوفی سے بولا۔ "رستم بھائی، میں نہیں جانتا کہ تمہارے اور بی بی جی کے ساتھ کیا مجبوریاں ہیں لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے کہ اگر بی بی تمہاری زندگی میں آ جائے تو تمہاری زندگی کیا سے کیا ہو سکتی ہے۔"

حسنے کی بات سن کر رستم نے سر کو مایوسی سے جھٹکا اور بدمزہ ہو کر سگریٹ پاؤں تلے مسل دیا۔ "پتا نہیں حسنے! تم کس زندگی کی بات کر رہے ہو۔ یہ زندگی جو ہم جی رہے ہیں زندگی نہیں

ہے۔ یہ تو موت کا انتظار ہے اور انتظار بھی ایسا جس میں ہر گھڑی مر مر کر جینا پڑتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں بی بی کو اپنی اس پھٹکاری ہوئی زندگی میں گھسیٹ لاؤں؟ اور تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ اس نجس زندگی میں آنے کے لئے تیار ہو جائیں گی؟'' اس نے ایک بار پھر شدید مایوسی اور کرب کے عالم میں سر جھٹکا۔ اس کا سارا موڈ غارت ہونے لگا۔ اس نے حسنے کے ہاتھ سے بوتل لی اور کئی تیز ابی گھونٹ حلق سے نیچے اُتار لئے۔

حسنے نے نیا سگریٹ رستم کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''پتا ہے یہ بات مجھ سے کس نے کہی ہے؟''

''کس نے؟''

''بھرجائی جی (مہناز) نے۔ ان کو بہت اچھی لگی ہیں بی بی جی۔ میرے سامنے دیر تک ان کے گن گاتی رہی ہیں اور رستم بھائی، سچی بات یہ ہے کہ بی بی کو جو بھی دیکھتا ہے، جو بھی ان سے ملتا ہے ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ کوئی خاص بات ہے ان کے اندر۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ جادو سا ہے۔''

پھر حسنا بتانے لگا کہ بھرجائی مہناز، ماسی حنیفاں اور دیگر لوگوں کے خیالات بی بی جی کے بارے میں کیا ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اتنے بڑے حادثے سے بی بی کے بچ جانے کو لوگ معجزہ کہہ رہے ہیں اور اسے نیک شگون سمجھ رہے ہیں۔

حسنا حسب عادت بولتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بی بی کے بارے میں ہی بات کر رہا تھا۔ مگر اس وقت رستم مکمل تنہائی چاہتا تھا۔ اسے گزرتی ہوئی رات کا تصور کرنا اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ اس کے سامنے کوئی شے بھی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ حسنا کچھ دیر تک اس کوشش میں رہا کہ رستم اس کی باتوں میں دلچسپی لے، پھر ناکام ہو کر واپس چلا گیا۔

رستم بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ ٹیلوں سے پرے کالا سیاہ آسمان روشن تاروں سے بھر گیا۔ ہوا کچھ اور بھی مست ہو گئی۔ کوئی چکور سریلی آواز نکالتا ہوا اس کے سر پر سے گزر گیا۔ رستم بے خیالی میں اپنی قمیص کے بٹنوں کو ہولے ہولے سہلا رہا تھا۔ اس کی انگلیوں کی پوروں میں ایک سرور سرایت کر رہا تھا۔ ایک دم رستم چونکا۔ اسے کچھ دور ایک سایہ سا دکھائی دیا۔ یوں لگا کہ کوئی عورت ہے۔ رستم تیزی سے اٹھ کر اس سمت میں گیا۔ ایک بڑے پتھر کی اوٹ سے اس نے دیکھا۔ وہ واقعی عورت تھی۔ وہ اپنا سراپا چادر میں لپیٹے ڈیرے کی مخالف سمت میں جا رہی تھی۔ یہاں ڈیرے پر عورتیں تو بس تین چار ہی تھیں۔ مہناز، حنیفاں، نادیہ اور بی بی وغیرہ۔ وہ ان میں سے کون ہو سکتی تھی۔ یہ حنیفاں تو ہرگز نہیں ہو سکتی وہ خاصی لمبی تڑنگی ہے۔ مہناز کا

جسم بھی ذرا سا بھاری تھا۔ تو پھر نادیہ یا بی بی؟

یہ بی بی تو ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ ویسے بھی ان کے پاؤں زخمی ہیں اور وہ اتنی تیزی سے چل نہیں سکتی تھیں۔ تو پھر نادیہ؟ اگر یہ نادیہ تھی تو ڈیرے سے اتنی دور کیوں آئی اور اتنی عجلت میں کہاں جا رہی تھی.....؟ رستم نے کچھ فاصلہ رکھا اور پیچھے چلتا رہا۔ ایک دو منٹ بعد وہ ایک چھوٹی سی کھوہ میں داخل ہو گئی۔ رستم کا دماغ چکرا گیا۔ یہ کیا معاملہ تھا؟ وہ چار پانچ منٹ تک اپنا لائحہ عمل سوچتا رہا پھر بڑی احتیاط سے کھوہ کی طرف بڑھا۔ وہ کھوہ کے دہانے پر پہنچا تو اس کا تجسس مزید جاگ گیا۔ اندر سے سسکاریوں کی نسوانی آواز آئی۔ گو یہ آواز مدھم تھی مگر رستم پہچان گیا۔ یہ نادیہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تکلیف میں تھی اور اس کے منہ سے ''اُف..... اُف'' کی مدھم آواز نکل رہی تھی۔

رستم ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر آگے بڑھا۔ وہ بلی کی چال چلتا کھوہ کے خم پر پہنچا تو اسے ٹارچ کی مدھم روشنی دکھائی دی۔ اندر کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ نادیہ نے اپنی قمیص عقب سے اس طرح اٹھائی ہوئی تھی کہ اس کی شفاف پشت کندھوں تک عریاں ہو گئی تھی۔ اس کا سر اور چہرہ وغیرہ قمیص کے اندر چھپ گیا تھا۔ ایک شخص جس کی صرف پشت ہی رستم کو نظر آ رہی تھی، کسی نکیلی شے سے نادیہ کی کمر پر کچھ لکھ رہا تھا۔ ''اُف..... آہستہ۔'' وہ سسک رہی تھی۔

☆======☆======☆

رستم حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے یہ سب کچھ بہت شرم ناک محسوس ہوا۔ نادیہ نے قمیص تو اپنی کمر سے اوپر اٹھا رکھی تھی لیکن اس کا جسم سامنے سے بھی نیم عریاں ہو رہا تھا۔ بڑے سائز کی نارچ ایک پتھر پر رکھی تھی۔ اس کی روشنی نادیہ کے بدن کے ہیجان خیز نشیب و فراز پر تھی۔ رستم نے غور سے دیکھا، لکھنے والے کے ہاتھ میں کوئی قلم یا بال پوائنٹ وغیرہ نہیں تھا۔ یہ بڑے سائز کی ایک سوئی تھی جس سے لحاف وغیرہ سینے کا کام لیا جاتا ہے۔ پنجاب میں اسے ''گھسنڈ وئی'' بھی کہتے ہیں۔ وہ شخص جو درمیانی عمر کا لگتا تھا، بڑے انہماک اور دلچسپی سے نادیہ کی شفاف جلد پر گھسنڈ وئی سے خراشیں ڈالتے ہوئے کچھ لکھ رہا تھا۔ وہ لرز رہی تھی اور گاہے بگاہے اس کے ہونٹوں سے ''ہائے..... اُف اللہ'' کی آواز نکل جاتی تھی۔

لکھنے والے نے بوسیدہ سی جیکٹ اور شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے بال گردن پر سے قدرے لمبے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ نادیہ کی تکلیف اسے مزہ دے رہی ہے اور وہ لکھنے کے ساتھ ساتھ نادیہ کے عریاں بدن کا نظارہ بھی کر رہا ہے۔ اس نے نادیہ کی قمیص تھوڑی سی مزید اوپر اٹھائی۔ نادیہ نے ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ کر قمیص کو تھام لیا جیسے وہ مزید عریانی سے بچنا چاہتی ہو۔ تاہم اس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی لکھنے والے ڈشکرے نے اس کے کندھے بھی عقب سے عریاں کر دیئے۔

نادیہ نے بے زاری سے کچھ کہا لیکن الفاظ رستم کی سمجھ میں نہیں آئے۔ اب لکھنے والے کا انداز رستم سے ڈھکا چھپا نہیں رہا، وہ واضح طور پر نادیہ کی عریانی سے حظ اٹھا رہا تھا۔ پتا نہیں اس نے نادیہ کو کس چکر میں پھنسایا ہوا تھا۔ نادیہ کے پہلو پر لکھنے کے لئے اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے نادیہ کا پسینہ صاف کیا۔ اس کے ہاتھ نے بڑی بے باکی سے اور یقیناً بدنیتی سے نادیہ کے بائیں پہلو پر اوپر سے نیچے حرکت کی۔ نادیہ نے پھر کچھ کہا۔ غالباً اپنی بے زاری

کا اظہار کیا۔

اب یہ سب کچھ دیکھنا رستم کے بس میں نہیں رہا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر لکھنے والا چونکا اور اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ تیس پینتیس سالہ شخص فرید کے ساتھیوں میں سے تھا۔ رستم کو اس کا نام معلوم نہیں تھا لیکن شکل دیکھی بھالی تھی۔ رستم کو دیکھ کر اس شخص کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ رستم نے اسے گریبان سے پکڑا اور بڑی وحشت سے گھما کر دیوار پر دے مارا۔ وہ دیوار سے ٹکرایا اور لڑکھڑاتا ہوا باہر جا گرا۔

نادیہ کی دہشت زدہ چیخ رستم کے کانوں میں گونجی۔ اس نے نادیہ کو جلدی سے اپنی قمیص سیدھی کر کے کھڑے ہوتے دیکھا۔

رستم اسے نظر انداز کر کے لمبے بالوں والے کے پیچھے بھاگا۔ وہ پندرہ بیس قدم آگے جا چکا تھا۔ اس نے مڑ کر رستم کو دیکھا اور پھر شدید خوف کے عالم میں قریباً بیس فٹ کی بلندی سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ خوش قسمتی سے وہ ایک چھوٹی جھاڑی پر گرا اور وہاں سے اٹھ کر پھر بھاگ کھڑا ہوا۔ رستم چھوٹا سا چکر کاٹ کر نیچے اُترا اور اس نے لمبے بالوں والے کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔

''رک جاؤ۔ میں کہتا ہوں رک جاؤ۔ نہیں تو گولی مار دوں گا۔'' رستم نے چلا کر کہا۔

لیکن وہ بے حد خوفزدہ تھا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ رکے گا نہیں۔ رستم نے اپنی رفتار کچھ اور تیز کر دی۔ ان نشیب و فراز میں رستم نے ایک عرصہ گزارا تھا۔ وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا۔ جلد ہی وہ اپنا اور بھاگنے والے کا فاصلہ کم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی دوران میں اچانک ایک گھاٹی کے موڑ پر پانچ چھ افراد نمودار ہوئے اور انہوں نے بھگوڑے کو دبوچ لیا۔

یہ ڈیرے کے پہرے داروں میں سے تھے اور رستم کی آواز سن کر یہاں پہنچے تھے۔ ان میں کاٹھیا بھی شامل تھا۔ بھگوڑے کو اوندھے منہ زمین پر گرا دیا گیا۔ کاٹھیا نے اس کے ہاتھ پیچھے موڑے اور ایک مفلر کے ذریعے مضبوطی سے پشت پر باندھ دیئے۔ رستم نے ٹارچ کی روشنی میں اس کے چہرے پر ڈالی۔ اس کے ہونٹوں اور ناک سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

رستم کو دیکھ کر وہ خوفزدہ آواز میں بولا۔ ''رستم صاحب! میں نے کچھ نہیں کیا۔ مم..... میں بے قصور ہوں۔ بالکل بے قصور ہوں۔''

رستم نے اس کی پسلیوں پر ٹھوکر رسید کی۔ ''تیری ساری بے قصوری میں نے اپنی

آنکھوں سے دیکھی ہے حرام زادے۔'' پھر رستم کاٹھیا سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''اسے لے کر ڈیرے پر پہنچو۔ میں ابھی آ رہا ہوں اور اچھی طرح تلاشی بھی لے لو اس کی۔'' کاٹھیا نے ادب سے سر جھکایا۔

رستم انہیں چھوڑ کر واپس کھوہ میں پہنچا۔ کھوہ میں پڑی ہوئی ٹارچ ابھی تک روشن تھی۔ مگر نادیہ وہاں نظر نہیں آ رہی تھی۔ رستم سمجھ گیا کہ وہ واپس ڈیرے پر چلی گئی ہے۔ رستم نے دیکھا۔ ایک طرف پتھر کی درز میں دو اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ ایک کالے رنگ کی لمبوتری سی ڈائری بھی وہاں پڑی تھی۔ ڈائری میں پتا نہیں کیا کیا اوٹ پٹانگ لکھا گیا تھا۔ پرانی کتابوں اور انگریزی رسالوں سے کاٹی ہوئی کچھ خوفناک تصویریں بھی ڈائری میں تھیں۔ جانوروں اور جانور نما انسانوں کی بڑی بھیانک شکلیں تھیں۔ رستم نے تھوڑی سی تگ و دو کی تو اسے ایک اور چونکا دینے والی شے نظر آئی۔ یہ انڈین وسکی کی ایک کوارٹر بوتل تھی۔ اسے ایک پتھر کے پیچھے چھپا کر رکھا گیا تھا۔ رستم نے یہ ساری چیزیں جن میں دو تین تعویذ بھی شامل تھے، اپنی تحویل میں لیں اور واپس ڈیرے کی طرف چل دیا۔

ڈیرے واپس پہنچ کر اس نے سب سے پہلے اس بات کی تصدیق کی کہ نادیہ آ چکی ہے یا نہیں؟ وہ آ چکی تھی اور اپنے کمرے میں تھی۔ چھجے کے نیچے بہت سے لوگ جمع تھے اور گیس لیمپس کی روشنی میں ہلچل کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ یقیناً لمبے بالوں والا بھگوڑا یہیں موجود تھا۔ اس کی طرف جانے کے بجائے رستم پہلے اپنے کمرے میں گیا۔ وہ اس سارے چکر کے بارے میں نادیہ سے پوچھنا چاہتا تھا۔ کمرے میں ایک طرف نادیہ شال میں لپٹی سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ حسنے گجراتی کی بیوی شاہدہ اور حنیفاں بھی اس وقت نادیہ کے پاس موجود تھیں۔ رستم نے اشارہ کیا تو وہ دونوں باہر چلی گئیں۔

رستم کمرے کا دروازہ بند کر کے نادیہ کے سامنے آ بیٹھا۔ ''یہ کیا چکر چلا رکھا ہے تم نے؟'' وہ بے حد تپے ہوئے لہجے میں بولا۔

وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

رستم نے اسے شانے سے پکڑ کر بُری طرح جھنجھوڑا۔ ''میرے سامنے زیادہ ایکٹنگ نہ کرو۔ مجھے بتاؤ یہ کیا معاملہ ہے۔ وہ لفنگا وہاں کیا کر رہا تھا تمہارے ساتھ؟ اور کب سے ہو رہا ہے یہ سب کچھ۔''

''مم...... میں اس سے دم کرانے گئی تھی۔'' وہ اٹک اٹک کر بولی۔

''کیا تکلیف تھی تمہیں؟'' رستم پھنکارا۔ ''اور کیا دم کر رہا تھا وہ حرامی۔ وہ خبیث تو دو دو مہینے نہاتا نہیں ہے۔ دن رات تمبا کو اور شراب پیتا ہے۔ وہ کیا دم کرے گا تمہیں اور جس طرح کا دم وہ کر رہا تھا وہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس بدبخت نے تمہیں ننگا کر کے بٹھایا ہوا تھا۔''

''وہ...... وہ کہتا تھا۔ اس عمل کا یہی ... طریقہ ہے۔ وہ میری کمر پر ... کچھ لکھ رہا تھا۔''

''اور اگر وہ کہتا کہ عمل کے لئے باقی کپڑے بھی اُتار دو۔ تو کیا تم اُتار دیتیں؟''

''وہ...... میں...... دراصل۔'' نادیہ ہکلا کر رہ گئی۔

''تم پڑھی لکھی بنتی ہو۔ خود کو شہرن کہتی ہو۔ فلموں میں کام کرتی ہو۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا ہے تم نے۔ لعنت ہے تم پر اور تمہاری عقل پر۔ تم جیسی عورتیں ہی ان مشٹنڈے عاملوں کے ہاتھوں بے آبرو ہو جاتی ہیں اور ایسی مت ماری جاتی ہے کہ بار بار بے آبرو ہونے کے لئے جاتی ہیں۔ ان کے ہاتھوں کا کھلونا بنتی ہیں۔ ننگی تصویریں کھنچوا لیتی ہیں۔ بلیک میل ہوتی ہیں۔ اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگی برباد کر دیتی ہیں۔'' رستم طیش کے عالم میں بولتا چلا جا رہا تھا۔

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور سسک رہی تھی۔ رستم نے ہاتھ بڑھا کر ایک جھٹکے سے اس کی پشت سے قمیص اٹھائی۔ قمیص کا چاک پھٹ گیا اور نادیہ کی کمر کا کچھ حصہ عریاں ہو گیا۔ یہاں شفاف جلد پر گھنڈوئی کی نوک سے بہت سی خراشیں ڈالی گئی تھیں۔ ان میں سے کچھ الفاظ ہی رستم کی سمجھ میں آ سکے۔ ''رانی ماتا ... رات کا راجا ...... بنگالن گوری ......'' اسی طرح کے بے معنی الفاظ تھے اور کچھ آڑھی ترچھی لکیریں کھینچی گئی تھیں۔ کہیں کہیں ان خراشوں میں سے خون بھی رِستا تھا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟'' رستم نے اس کی کمر پر قمیص کو برابر کرتے ہوئے کہا۔

وہ سسک کر چپ ہو گئی۔ رستم کا پارہ کچھ اور چڑھ گیا۔ ایک بار پھر اس کا دل چاہا کہ نادیہ کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دے لیکن ایک دم نہ جانے کیا ہوا کہ اس کا غصہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ گہری سانس لے کر اسے دیکھتا رہا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ کسی بات پر رستم کو نادیہ پر بہت طیش آیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ اسے مار بیٹھے گا۔ مگر پھر اچانک غصہ خود بخود کم ہو جاتا تھا۔ ایسے لمحوں میں اسے محسوس ہوتا تھا کہ نادیہ لاچار ہے۔ اس کے دل نے اور دل میں پیدا ہونے والے جذبات نے اسے مجبور کر رکھا ہے۔ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی کچھ نہیں جانتی۔ اپنے نفع نقصان سے بے گانہ ہو چکی ہے۔ یہ سب دل کا

قصور تھا اور دل پر انسان کا اختیار کیسے ختم ہوتا ہے، اس بارے میں رستم سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا۔

کمرے کے گوشے میں سکڑ سمٹ کر بیٹھی ہوئی نادیہ پر اسے بے اختیار ترس آ گیا۔ اس نے اٹھ کر پانی پیا پھر دوبارہ نادیہ کے پاس آ بیٹھا اور نرم لہجے میں بولا۔ ''تم اچھی بھلی سیانی ہو۔ مجھے تم سے ایسی بے وقوفی کی امید نہیں تھی۔ تم جو کچھ کر رہی تھیں وہ بالکل غلط تھا۔ وہ خبیث وہاں اس کھوہ میں تمہارے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں لچا پن دیکھا ہے اور یہ دیکھو، یہ کیا ہے۔''

رستم نے اپنے نیفے میں اُڑسی ہوئی شراب کی چھوٹی بوتل نکال کر نادیہ کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ ''یہ بھی مجھے وہیں سے ملی ہے۔ اس بدمعاش نے ایک پتھر کے پیچھے چھپا رکھی تھی۔ ایسے لوگ تم جیسی عورتوں کی مت مار دیتے ہیں اور جب سمجھتے ہیں کہ مت واقعی ماری جا چکی ہے تو پھر سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ شکر کرو تم کسی بڑی مصیبت سے بچ گئی ہو۔''

نادیہ کچھ دیر خاموش رہی پھر دوبارہ سسکنے لگی۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو شاید..... مجھ سے غلطی ہوئی ہے..... مجھے ایسا نہیں کرنا چاہتے تھا۔ مم..... میں اس کی باتوں میں آ گئی تھی۔ میری عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔''

''کیا کہا تھا اس نے تم سے؟''

''اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ مجھے شاہدہ نے بتایا تھا کہ عظمت نے بڑے مشکل چلّے کاٹے ہوئے ہیں۔ یہ کئی طرح کے نوری عمل کرتا ہے اور ڈیرے کے لوگ اسے بہت مانتے ہیں۔ پھر ایک دن قبرستان کے پاس یہ مجھے ملا۔ وہاں یہ ایک بیری کے نیچے بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں نے اس سے چہرہ چھپا رکھا تھا۔ گھونگھٹ کے پیچھے سے ہی میں نے اس سے دو چار باتیں کیں۔ اس نے مجھے میرے بارے میں کچھ بتایا۔ مجھے لگا کہ اس کی باتیں بالکل صحیح ہیں۔ بس پھر میں اس کے چکر میں آ گئی۔ یہ دو تین دفعہ مجھے قبرستان میں ہی ملا۔ اس نے کہا کہ میں تمہارے دل کے سکون کے لئے سات راتوں والا چھوٹا چلہ کاٹ رہا ہوں۔ چلہ پورا ہو گیا تو ایک عمل کروں گا۔ اس کے بعد تمہیں کوئی شکایت نہیں رہے گی۔ سات دن پورے ہو گئے تو اس نے مجھے وہاں کھوہ میں بلایا اور میری دونوں پنڈلیوں پر پیچھے کی طرف کچھ لکھا۔ ایک دن چھوڑ کر پھر مجھے جانا تھا لیکن میں جا نہ سکی۔ اس سے اگلے دن چھپکلے والا مسئلہ ہو گیا تھا۔ میں زخمی ہو کر ناصر کے دواخانے میں پہنچ گئی۔ کل جب تم شانی جی کو کھائی سے نکالنے کے لئے گئے ہوئے تھے اور باقی لوگ بھی وہاں جمع تھے۔ یہ عظمت پھر مجھ سے ملا۔ اس نے کہا کہ ''آدھا

عمل کالے جادو کی مار سے زیادہ خطرناک ہے۔ مجھے جلد از جلد عمل پورا کرنا چاہئے۔ اس نے کہا کہ میں بیمار بھی اسی لئے ہوتی ہوں کہ عمل پورا نہیں ہوا ہے۔ اس کی باتوں میں ایسا اثر ہے کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں چلی گئی۔''

اسی دوران میں باہر سے رونے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں وہیں سے آ رہی تھیں جہاں لوگ جمع تھے۔ نادیہ کو کمرے میں چھوڑ کر رستم پیچھے کے سامنے پہنچا۔ یہاں فرید کے ساتھی دلاور اور کاٹھیا بڑے غصے میں تھے اور عظمت کے ساتھ مار پیٹ کر رہے تھے۔ عظمت ان کی ٹھوکریں کھا کر پتھریلی زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' رستم نے قریب جا کر پوچھا۔

''رستم بھائی! یہ دیکھو اس کے سامان میں سے کیا نکلا ہے۔'' دلاور نے ایک کالے شاپنگ بیگ میں رکھی ہوئی چند تصویریں رستم کی طرف بڑھائیں۔

رستم نے دیکھا یہ تاش کے پتوں پر بنی ہوئی حیا سوز تصویریں تھیں۔ دو سفید فام لڑکیاں اور تین لڑکے شیطان کی چیلوں کی حیثیت سے مصروف کار نظر آتے تھے۔ مرد و زن کا وہ عظیم اور بے مثال تعلق جو کائنات کا جوہر ہے، جو زندگی کا حسن ہے، ان تصویروں میں ایسی مکروہ حالت میں دکھائی دیتا تھا کہ ابکائی آنے لگتی تھی۔

دلاور نے کہا۔ ''کھوندر میں اس کے سامان کی تلاشی لی گئی ہے تو ایک تکیے کے نیچے سے یہ ملی ہیں اور اس کے علاوہ یہ دیکھیں۔'' دلاور نے ایک ریشمی کپڑے کی سیاہ تھیلی رستم کی طرف بڑھائی۔ اس میں انسانی اور حیوانی بالوں کے گچھے، مختلف قسم کی چھوٹی بڑی سوئیاں، دو طلائی انگوٹھیاں، پلاسٹک کی ننھی منی انسانی کھوپڑیاں اور اسی قسم کی اشیاء تھیں۔

تصویریں دیکھ کر رستم کا پارہ کچھ اور چڑھ گیا۔ اس نے عظمت کو زمین سے اٹھایا اور گریبان سے پکڑ کر کھینچتا ہوا پیچھے کے کمرے میں لے گیا۔ فرید اور حسنا بھی اس کے ساتھ تھے۔ تاہم چند قدم آگے جا کر فرید نے حسنے کو اشارہ کیا اور وہ رستم کے ساتھ کمرے میں نہیں گئے۔

بند کمرے میں رستم نے عظمت سے پوچھ گچھ کی۔ وہ بُری طرح گھبرایا ہوا تھا۔ رستم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ منت سماجت کرنے لگا اور ہاتھ پاؤں جوڑنے لگا۔ (اس کے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ رستم نے کھول دیئے تھے)

رستم نے اس کی گردن اپنے آہنی پنجے میں دبوچتے ہوئے کہا۔ ''کیا کر رہے تھے تم اس کے ساتھ؟''

''مجھ سے میری مری ہوئی ماں کی قسم لے لیں جی۔ میرا کوئی بُرا ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو چھوٹی بھر جائی ہیں جی۔ میں اس طرح کی کسی بات کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور پھر یہ تو آپ کا معاملہ تھا جی..... میں بھلا آپ کو جانتا نہیں ہوں۔ کون ہے جو آپ کو نہیں جانتا۔ کسی کی موت ہی آئی ہوگی جو آپ کی عزت کی طرف آنکھ اٹھائے گا۔ میں تو صرف..... میں تو صرف.....''

رستم نے الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ عظمت کے منہ پر مارا۔ ''تم تو صرف ٹھرک پوری کر رہے تھے لیکن اس سے آگے جانے کا انتظام بھی تم نے کر رکھا تھا۔ کیا پتا کسی وجہ سے قسمت تم پر مہربان ہو ہی جاتی۔ اس لئے احتیاطاً تم نے شراب کی بوتل بھی وہاں چھپا رکھی تھی۔''

''شش..... شراب کی بوتل؟'' عظمت کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

''ہاں یہ بوتل۔'' رستم نے بوتل اس کے سامنے لہرائی۔

''مم..... مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں جی۔ مجھے اس کا کچھ پتا نہیں۔''

''اور ان تصویروں کا بھی تمہیں کچھ پتا نہیں ہوگا۔ کسی جن بھوت نے شرارت سے تمہارے تکیے میں گھسیڑ دی ہوں گی۔''

عظمت کے سیاہ ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ رستم نے دو تین تھپڑ مزید اس کے منہ پر جڑے۔ اس کے ہونٹوں سے خون تو پہلے ہی بہہ رہا تھا۔ اب ناک سے بھی رسنے لگا۔ وہ سرتاپا کانپ رہا تھا۔ رستم پھر پکارا۔ ''دیکھ سب کچھ سچ سچ بتا دے۔ اس سے پہلے کیا کچھ کرتا رہا ہے اور اس کے بعد کیا کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اگر خود نہیں بتائے گا تو پھر مجھے پوچھنا پڑے گا اور تجھے پتا ہی ہے میرے پوچھنے کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔''

''میں قسم کھاتا ہوں جی.....'' وہ پھر قسمیں کھانے اور منتیں سماجتیں کرنے لگا۔

رستم نے اسے فرش پر گرا کر اس کی گردن پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ گردن پر پاؤں رکھنے کا عمل شاید سننے میں اتنا خوفناک نہ ہو لیکن جو شخص اس عمل سے گزرتا ہے، وہ ہی اس کی دہشت ناکی کو جان سکتا ہے۔ گردن انسانی جسم کا ایک نازک عضو ہے۔ جب پاؤں کا سارا بوجھ گردن پر آتا ہے تو جسم مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ بندے کا سانس تو رک ہی رہا ہوتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس نے کسی طرح کی مزاحمت کی یا خود کو چھڑانا چاہا تو گردن کا کڑاکا نکل جائے گا۔ پولیس والے اکثر یہ حربہ اختیار کرتے ہیں۔ کوئی ایک اہلکار حوالاتی کی گردن پر پاؤں رکھ دیتا ہے اور دوسرا اس کی چھترول کرنے لگتا ہے۔

عظمت کی گردن پر پاؤں کا دباؤ پڑا تو اس کی زبان باہر نکل آئی اور آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ اس کے منہ سے کھیں کھیں کی اذیت ناک آواز نکلی۔ اس نے اپنے ہاتھ جوڑے اور سر کے اشارے سے رستم کو بتایا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ تاہم رستم نے فوری طور پر اس کی گردن آزاد نہیں کی۔ چند سیکنڈ مزید اسی طرح گزارے، بالآخر عظمت کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ وہ رستم کے پاؤں تلے مچھلی کی طرح تڑپنے لگا اس نے دونوں ہاتھوں سے رستم کا پاؤں تھام رکھا تھا۔ رستم نے پاؤں پیچھے ہٹایا تو وہ بُری طرح کھانسنے لگا اور پھر الٹی کرنے لگا۔ رستم خاموشی سے دیکھتا رہا۔ اس کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تو رستم کے کہنے پر اس نے اپنے گلے سے صافہ نما کپڑا اُتارا اور فرش کو صاف کر کے کپڑا کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ بس ایک دو منٹ میں ہی اس کا سارا دم خم ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد رستم نے جو کچھ پوچھا اس کا جواب فوراً ملا۔

سب سے پہلے تو عظمت نے تسلیم کیا کہ کھوہ سے ملنے والا نڈین شراب کی بوتل اسی کی ہے اور اس نے وہاں چھپائی تھی۔

رستم نے پوچھا۔ ''یہ جادو ٹونا کہاں سے سیکھا تم نے؟''

''پیر شاہی سے جی جو جوہر آباد میں رہتا ہے۔''

''یہ کون ہے؟''

''یہ ذات کا تیلی ہے جی۔ حضرت صاحب کے شاگردوں میں سے ہے۔''

حضرت صاحب کا نام سنتے ہی رستم کے اعصاب تن گئے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس بہروپئے عامل کے ڈانڈے کس شیطان سے ملتے ہیں۔ رستم نے عظمت کے پیر اور پیر کو ایک گالی دی اور نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ اس کا جی چاہا کہ قمیص کے نیچے سے چاقو نکالے اور اس بدمعاش عامل کو یہیں فرش پر بکری کی طرح لٹا کر ذبح کر دے لیکن خود پر ضبط کرتے ہوئے اس نے عظمت سے پوچھا۔ ''نادیہ سے تمہارا رابطہ کیسے ہوا؟''

''انہوں نے خود کیا تھا جی..... میں اپنی مری ماں کی.....''

''قسمیں نہ کھا۔'' رستم نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ ''جو بھی بکواس کرنی ہے بس کرتا جا۔''

وہ لرز کر بولا۔ ''انہوں نے خود رابطہ کیا تھا جی۔ انہوں نے کہا تھا، وہ عمل کرانا چاہتی ہیں۔''

''کیسا عمل؟''

''دراصل..... ان کی سوچ عجیب سی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ آپ کے دل میں ان کے جسم کی چاہت پیدا ہو۔ آپ ان کو اپنے قریب رکھیں اور میاں بیوی والا حق ادا کریں۔''

رستم نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''اس میں عجیب بات کیا ہے۔ اکثر عورتیں ایسا چاہتی ہیں ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا مرد ان کی طرف زیادہ توجہ دے۔''

''لل..... لیکن وہ اس کے علاوہ بھی کچھ اور چاہتی تھیں جی۔''

''کیا مطلب؟''

عظمت نے اپنی گردن سہلا کر آنکھوں میں آنے والے آنسو پونچھے اور بولا۔ ''وہ بیوی کے ساتھ ساتھ سوکن بننا بھی چاہتی تھیں۔ ان کی تمنا تھی کہ آپ ایک اور شادی کریں اور یہ شادی اس لڑکی کے ساتھ ہو جسے آپ دل سے چاہتے ہیں اور بڑی مدت سے چاہتے ہیں۔''

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟''

''میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا رستم صاحب! وہی کہہ رہا ہوں جو انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ میں نے ان سے اس لڑکی کا نام پوچھا مگر انہوں نے نہیں بتایا۔ کہنے لگیں کہ میں نے جو عمل بھی کرنا ہے نام کے بغیر ہی کروں۔ وہ چاہتی ہیں کہ آپ اپنی من پسند شادی کریں لیکن وہ بھی آپ کی بیوی رہیں۔ آپ کی من پسند بیوی کی نوکرانی اور خدمت گار بن کر رہنا بھی انہیں قبول ہے۔''

''اس کام کے لئے کتنی رقم لی تم نے اس سے؟''

''نن..... نہیں جی۔ رقم نہیں لی۔'' وہ ہکلایا۔

''پھر جھوٹ؟'' رستم نے اس کا گریبان پکڑا۔

اس کا رنگ پھر سیاہ پڑ گیا۔ ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس نے سر جھکایا اور لرزاں آواز میں بولا۔ ''میں نے کچھ نہیں لیا تھا جی..... انہوں نے خود دیا۔ وہی سونے کی دو انگوٹھیاں ہیں جی، جو میرے سامان سے نکلی ہیں۔ انہوں نے زبردستی دی تھیں۔''

''انگوٹھیاں، اس نے زبردستی دی تھیں اور باقی جو رہ گیا تھا اس کے لئے تم زبردستی کرنے والے تھے۔''

''مم..... میں سمجھا نہیں جناب؟''

''لیکن میں سمجھ گیا ہوں اور دیکھ بھی لیا ہے۔ تمہارے عمل کی قیمت انگوٹھیاں نہیں، اس کی آبرو تھی اور تم آہستہ آہستہ اسی ''قیمت'' کی طرف بڑھ رہے تھے۔''

''نہیں جناب..... بالکل نہیں..... میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میری زبان میں

کیڑے پڑیں اگر میں جھوٹ بولوں۔'' اس نے پہلے اپنے کانوں اور پھر رستم کے پاؤں کو ہاتھ لگائے۔

''تم بکواس کرتے ہو۔ تم نے اس کا آدھا جسم ننگا کر رکھا تھا۔ تم نے وہاں شراب کی بوتل چھپائی تھی۔ تم اس کی کمر پر تعویذ نہیں لکھ رہے تھے، اپنی حرام کاری کا رستہ سیدھا کر رہے تھے۔ تم جیسے شیطان عاملوں نے گھروں کے گھر برباد کئے ہیں۔ ان گنت سیدھی سادی عورتوں کو چکلوں اور قبرستانوں تک پہنچایا ہے۔ تم کچھ نیا نہیں کر رہے تھے۔ یہ بڑی پرانی بدکاری ہے جسے تم جیسے حرامی شعبدہ باز پیری فقیری کا نام دیتے ہیں۔''

عظمت نے رستم کا طیش دیکھا تو ایک بار پھر ہاتھ پاؤں جوڑنے لگا۔ پہلے تو وہ اس بات سے قطعی انکار کرتا رہا کہ نادیہ کے حوالے سے اس کی نیت میں کوئی فتور تھا لیکن جلد ہی کسی حد تک مان گیا۔ اس نے اقرار کیا کہ نادیہ کی پنڈلیوں پر تعویذ لکھتے وقت وہ اس کے خوبصورت جوان جسم سے آنکھیں نہیں چرا سکا۔ اس نے اسے دوسری مرتبہ آنے اور کمر پر تعویذ لکھوانے کا جھانسا دیا لیکن یہ سب کچھ اسی حد تک تھا۔ اس سے آگے جانے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور آج کے بعد اس نے نادیہ کو بلانا بھی نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر بڑی بڑی قسمیں کھانے لگا۔

رستم نے اس سے پوچھا کہ وہ شاہی کا چیلا ہونے کے باوجود یہاں ان پہاڑوں میں کیا لینے آیا اور اس کے ارادے کیا تھے۔ جواب میں عظمت نے روتے ہوئے، اٹک اٹک کر جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا..... ''وہ میانہ کے قریب ایک گاؤں میں تعویذ گنڈے کا کام کرتا تھا۔ اس نے مردوں کے لئے ایک خاص قسم کا کشتہ بنایا۔ اس نے یہ کام نیک نیتی سے کیا تھا لیکن اس کا نتیجہ صحیح نہیں نکلا۔ اس کے ایک نوجوان شاگرد نے یہ کشتہ اپنی مرضی سے کھایا اور مقدار سے زیادہ کھا لیا۔ وہ بے ہوش ہو کر ہسپتال پہنچا اور چند گھنٹے بعد مر گیا۔ اس کی موت کا سارا الزام اس (عظمت) کے سر پر آ گیا۔ مخالفوں نے دعویٰ کیا کہ اس کی نظر اپنے شاگرد کی نوبیاہتا بیوی پر تھی اور اس نے زہر دے کر شاگرد کو مارا ہے۔ دونوں الزام بالکل غلط تھے لیکن یہ بات نہیں تھی کہ وہ پاک صاف تھا۔ اس سے بہت سی غلط کاریاں بلکہ شرمناک غلط کاریاں ہوتی رہی تھیں۔ شاید ان کے بدلے میں وہ ایک ناکردہ جرم میں پھنس گیا تھا۔ وہ پولیس سے بھاگ کر پہلے گجرات اور پھر جہلم آ گیا۔ یہاں اس کی ملاقات کاٹھیا کے ایک اشتہاری دوست سے ہو گئی۔ وہ ایک ایم پی اے کے ڈیرے پر ٹھہرا ہوا تھا اور لوٹ کے مال سے عیاشی کر رہا تھا۔ اس نے عظمت کو بھی خوب عیاشی کروائی۔ پھر ایک دن انہیں پتا

چلا کہ ایم پی اے انہیں پکڑوانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ بات ایم پی اے کی جواں سال بیوی نے بتائی جو اشتہاری غازی خان کو ''خاص'' نظر سے دیکھنے لگی تھی۔ غازی خان وہاں سے فرار ہوا اور ساتھ ہی عظمت کو بھی فرار ہونا پڑا۔ اب وہ عرصہ دو سال سے یہاں وڈے ڈیرے پر تھا۔''

عظمت کی روداد سننے کے بعد بھی رستم کے طیش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس روداد میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو اس کے جرم کی شدت کو کم کرتی یا اس کے لئے رحم کے جذبے کو ابھارتی۔ وہ ایک Typical بدمعاش عامل تھا اور کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا۔

رستم نے دو مسلح افراد کو بلا کر اس کے ہاتھ پشت پر بندھوائے اور اسے ایک مجرم کی حیثیت سے سرنگ میں بھجوا دیا۔

عظمت نے جو کچھ نادیہ کے حوالے سے بتایا اگرچہ تھا تو یہ نادیہ کی شخصیت کو اور بھی الجھا تا تھا۔ وہ رستم کے لئے ایک معمے کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ اس کا رویہ سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ رستم کے سختی سے منع کرنے کے سبب بادشاہ اور کنیز والی بات اس کے سامنے نہیں دہراتی تھی لیکن بہ زبانِ حال وہ یہ بات رستم کے سامنے کہتی رہتی تھی۔ اس کا رویہ وہی شاہ اور کنیز والا تھا۔ خادمہ کی طرح رستم کے اردگرد گھومنا، اس کے پاؤں کی طرف بیٹھ جانا، اپنے ہوش ربا جسم کو ہر لمحے رستم کے لئے دستیاب ظاہر کرنا۔ یہ سب اشارے کنائے اس کی خاص سوچ کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ اب وہ اپنی خود ساختہ کہانی کے تیسرے کردار یعنی ملکہ کو سامنے لانے کے لئے بھی کوشاں ہو گئی تھی۔ اس نے عظمت کے سامنے رستم کی من پسند شادی والی بات کی تھی۔ اس میں شے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ اشارہ بی بی کی طرف تھا۔ وہ عجیب تضاد کا شکار نظر آتی تھی۔ ایک طرف بی بی اور رستم کو ایک دیکھنا چاہتی تھی، دوسری طرف یہ خواہش بھی رکھتی تھی کہ رستم اس کے جسم میں دلچسپی لے، اسے اپنے تصرف میں لائے۔ رستم جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جا کر نادیہ کو کھری کھری سنائے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس پر زیادہ سختی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک تو بی بی کا فرمان اس کے کانوں میں گونجنے لگتا تھا۔ دوسرے اس کے اپنے اندر سے بھی ایک آواز بلند ہوتی تھی جو اسے نادیہ سے درگزر کرنے کا مشورہ دیتی تھی۔

وہ نادیہ کے حوالے سے زبردست الجھن کا شکار تھا۔ ابھی چند دن پہلے اس کے ذہن میں شدت سے خدشات جاگے تھے۔ اسے ڈر محسوس ہوا تھا کہ کہیں اس ویرانے میں کسی سرپھرے کی ''وحشت'' نادیہ کی خوبصورتی کو نوچ کھسوٹ کر نہ رکھ دے۔ آج یہ صورتِ حال

ذرا مختلف انداز میں سامنے آ گئی تھی۔ نادیہ ایک ہوس کار عامل کی سازش کا شکار ہوتے ہوتے بچی تھی۔

☆======☆======☆

اگلے روز پھر بی بی، فرید اور سردار دراج کے ساتھ ایک طویل میٹنگ ہوئی۔ اس مرتبہ مراد گروپ کا مراد اور حسنا گجراتی بھی میٹنگ میں موجود تھے۔ پورے معاملے پر کھل کر بات ہوئی۔ بی بی کا مؤقف یہ تھا کہ بلادل والے معاملے کو نظر انداز کیا جائے اور باقی معاہدے پر پہلے کی طرح ہی عمل کیا جائے۔ بی بی بات کر رہی تھی اور رستم ہمہ تن گوش تھا۔ اس کے لئے بی بی کی بات سے زیادہ ان کی آواز اہم تھی۔ وہ اس آواز کو کانوں میں نہیں اپنے دل میں اُتار رہا تھا اور اسے اپنے اندر محفوظ کر لینا چاہتا تھا۔ بی بی کہہ رہی تھیں۔ ''بے شک پولیس نے چال چلی ہے۔ ہمیں دھوکا دیا ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم اس دھوکے سے محفوظ رہے ہیں۔ دھوکا دینے والا بھی کیفر کردار کو پہنچا ہے۔ اس کی واپسی تو دور کی بات ہے اس کی لاش بھی واپس نہیں جا سکتی۔ دوسرے بندے کی اپنی غلطی کی وجہ سے ہی اس کی زندگی چلی گئی ہے۔ میرا مطلب ساجن سے ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''لیکن بی بی جی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ریاض ہٹلر ایک دغاباز دشمن ہے اور اس سے عنقریب ہمارا آمنا سامنا ہونے والا ہے۔ اگر چوہدری اور اس کا بیٹا ہمارے پاس ڈھال کی صورت میں رہیں تو ممکن ہے کہ ریاض ہٹلر اور اس کے ساتھی یہاں حملہ کرنے سے باز رہیں یا کم از کم انہیں سوچ بچار کرنی پڑے۔''

''لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے بھائی کہ ایسی صورت میں الٹا اثر ہو۔ اگر کارروائی کچھ عرصے بعد ہونی ہے تو وہ چھ سات دن میں ہی ہو جائے۔'' شانی نے کہا۔

''بی بی جی! ہمیں اس وقت رقم کی نہیں اپنی سلامتی کی ضرورت ہے۔ اگر جان ہی نہ رہی تو پھر یہ تاوان کی رقم کس کام کی۔'' مراد نے دلیل پیش کی۔ ''بہتر تو یہ ہے کہ ہم رقم کے بجائے چوہدری اور اس کے بیٹے کو اپنے پاس رکھیں بلکہ اگر ایک دو اور ایسے بندے بھی اغوا کر کے یہاں لا سکیں تو اچھا ہے۔''

فرید نے مراد کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کا بھی خیال یہی تھا کہ بندے اغوا کرنے سے کارروائی ٹالی نہیں جا سکتی۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس طرح پولیس مزید پھرتی دکھانے کی کوشش کرے۔

ایک طویل بحث کے بعد یہ طے ہو گیا کہ پروگرام کے مطابق چوہدری اور اس کے بیٹے

کو رہا کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ شانی بی بی کو کوشش کریں گی کہ ڈپٹی ریاض کو کسی فوری اقدام سے باز رکھیں اور اسے بتائیں کہ یہ صورتِ حال دونوں فریقوں کے لئے کتنی تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔

شانی نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔

شانی کے پاؤں اب کافی بہتر تھے۔ گردن کی حرکت بھی بحال ہو رہی تھی..... رستم شانی کے ساتھ قریباً ایک گھنٹہ میٹنگ والے کمرے میں موجود رہا لیکن اس دوران میں ایک بار بھی دونوں کی نگاہیں نہیں ملیں۔ رستم کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی ہیں۔

شانی نے قریباً 36 گھنٹے مزید آرام کیا اور پھر چلنے کی تیاری کی۔ رستم کے دل کی کیفیت عجیب تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہتا تھا کہ بی بی اب جلدی سے چلی جائیں۔ ان کے جانے سے پہلے کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جو اس کے حسین ترین تصور کو گہنا دے..... وہ ایک زندگی بخش نشے میں ڈوبا ہوا تھا اور اس نشے کے خمار کا ٹوٹنا اسے کسی طور گوارا نہیں تھا۔ باقی کی زندگی پتا نہیں کتنی تھی لیکن جتنی بھی تھی وہ اس یاد کو سینے سے لگا کر گزار دینا چاہتا تھا۔ بی بی کا لمس، ان کی پیشانی کا..... بالوں کا..... رخساروں کا..... اور ہونٹوں کا۔ زندگی کے باقی دنوں کے لئے یہ زادِ راہ بہت تھا، بہت زیادہ تھا۔ پچھلے چھ سات دن میں رستم کو کئی بار اس ''تلخ خط'' کا بھی خیال آیا تھا جو اس نے پلانگ کے تحت بی بی کے تایا معصوم کے نام لکھا تھا اور جس میں بی بی کے لئے بھی سخت باتیں لکھی تھیں۔ کئی بار رستم کا دل چاہا کہ اس خط کے بارے میں بی بی سے وضاحت کرے لیکن پھر اس نے سوچا کہ ضروری تو نہیں کہ ہر بات کی وضاحت ہی کی جائے۔ کچھ باتیں بغیر کہے سنے بھی تو سمجھ لی جاتی ہیں۔

اور پھر بی بی چلی گئیں۔ وقتِ رخصت وہ ان سے کوئی بات نہ کر سکا۔ بات کرنا تو درکنار بی بی کی نگاہ سے اس کی نگاہ بھی نہیں ملی۔ وقتِ رخصت بی بی گھوڑے پر سوار تھیں۔ کھیا دراج، چوہدری حشام اور راجو گھوڑوں پر تھے۔ گھڑ سواروں کا ایک دستہ حفاظت کے لئے ان کے ساتھ جا رہا تھا۔ پانچ چھ میل کے سفر کے بعد گھوڑوں نے واپس آ جانا تھا اور انہوں نے پیدل آگے بڑھنا تھا۔ یہ خطرناک راستہ پا پیادہ ہی طے کیا جا سکتا تھا۔

روانگی کے وقت کھیا دراج، چوہدری حشام اور راجو کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ تاہم احتراماً بی بی کی آنکھیں بند نہیں کی گئیں۔ بی بی نے اس صورتِ حال سے اتفاق نہیں کیا۔ انہوں نے اشاروں کنایوں میں لالہ فرید سے کہا کہ ان کی آنکھوں پر بھی پٹی باندھی جائے۔

بی بی کی یہ بات عقل مندانہ تھی۔ رستم نے اشارے میں فرید سے کہا کہ وہی کرنا چاہئے جو بی بی کہہ رہی ہیں۔ تھوڑے سے تذبذب کے بعد فرید نے بی بی کی آنکھوں پر بھی سیاہ پٹی باندھ دی۔ ایسا کرنا بی بی کے حق میں بھی اچھا تھا۔ بعد میں چوہدری حشام یا راجو وغیرہ کہہ سکتے تھے کہ شانی ڈوے ڈیرے کے راستے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہے۔

یہ صبح سویرے کا وقت تھا۔ درختوں اور ٹیلوں کے سائے لمبے تھے۔ رستم دیگر افراد کے ساتھ ایک ٹیلے پر کھڑا تھا اور اپنی بی بی کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں تھا کہ اب جیتے جی پھر ملنا ہوگا یا نہیں۔ وہ بی بی کو آخری لمحے تک دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ پتھر پر کھڑا رہا۔ بظاہر ہنسنے باتیں کرتا رہا لیکن اس کی نگاہیں بی بی اور اس کے قافلے پر مرکوز ہیں۔ بی بی کا آسمانی رنگ کا دوپٹہ اور کریم رنگ کی شال اس کی نگاہوں میں رہی۔ وہ دیکھتا رہا..... اور بس دیکھتا رہا۔ اسے لگا کہ شاید نگاہوں سے اوجھل ہونے سے پہلے بی بی ایک بار مڑ کر پیچھے دیکھیں گی لیکن انہوں نے نہیں دیکھا۔ دیکھتیں بھی کیسے؟ آنکھوں پر تو پٹی بندھی تھی۔

وہ کھڑا رہا۔ اس کے لمبے بال پوٹھوہار کی سحری ہوا میں جھومتے رہے۔ بی بی ایک ٹیلے کے پیچھے ایسے اوجھل ہو گئیں جیسے کسی حسین یادگار دن کا سورج غروب ہوتا ہے۔ پہلے تازی گھوڑا اوجھل ہوا، پھر بی بی کا دھڑ، پھر بی بی کے کندھے، پھر وہ پوری کی پوری اوجھل ہو گئیں۔ پوٹھوہار کی ہوا وہی رہی، ٹیلوں پر چمکنے والی وہ پہلی دھوپ بھی وہی رہی، اردگرد کے سارے مناظر بھی جوں کے توں رہے مگر رستم کو اچانک یوں لگا کہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ ہر منظر اور ہر آواز نے ایک سسکی بھری ہے اور کسی کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ دیا ہے۔

ہاں جانے والے نے بہت غم زدہ کیا تھا۔ مگر وہ جاتے جاتے حسین دل گداز یادوں کی جو دولت دے گیا تھا وہ ہفت اقلیم کے خزانوں سے بھی زیادہ قیمتی تھی..... یادوں کا یہ سرمایہ پا کر رستم کے دل میں جیسے کوئی حسرت ہی نہیں رہی تھی۔ اسے لگا کہ اب اگر کسی تپتی ہوئی دوپہر، یا خون رنگ شام، یا یخ بستہ رات میں سرکاری رائفل سے نکلنے والی گولیوں کی باڑ نے اس کا سینہ چھلنی بھی کر دیا اور وہ پوٹھوہار کے کسی ناہموار پتھر پر تڑپ تڑپ کر مر بھی گیا تو اس میں آنسو بہانے والی کوئی بات نہیں ہے۔

☆======☆======☆

یہ ٹھیکرا تھانے کے ایک کمرے کا منظر تھا۔ شانی، کھیا دراج اور چوہدری حشام وغیرہ تقریباً ایک گھنٹہ پہلے یہاں جوہر آباد میں پہنچے تھے۔ ریاض ہٹلر کمرے میں شانی کے سامنے بیٹھا تھا، اس کی شیو ہمیشہ کی طرح بڑھی ہوئی تھی اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ شانی اسے

وڈے ڈیرے پر پیش آنے والے تقریباً سبھی واقعات بلا کم و کاست بتا چکی تھی۔ وہ اپنی خطرناک آنکھیں شانی کی آنکھوں میں گاڑے سن رہا تھا۔ گاہے بگاہے وہ بڑی بے پرواہی اور غیر ذمے داری سے اپنی رانیں کھجانے لگتا تھا یا گونجدار ڈکار لینے لگتا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک گندہ اور کرخت شخص نظر آتا تھا۔

شانی کے بیان کردہ دو واقعات نے اسے خاص طور سے چونکایا۔ ایک چوہدری کے نوکر ساجن کے مرنے کا واقعہ اور دوسرا بلاول کا المناک انجام۔

شانی نے کہا۔ ''بلاول کی طرح ساجن کے مرنے کا قصہ بھی میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ میں پوری ذمے داری سے یہ گواہی دے سکتی ہوں کہ ساجن نے اپنی غلطی اور جلد بازی کی وجہ سے جان گنوائی۔ اس بے چارے کو پتا نہیں تھا کہ اس کی رہائی کا معاملہ تقریباً طے ہو چکا ہے۔ وہ بدحواس ہو کر بھاگا...... اور اس ایریا کی طرف چلا گیا جہاں بے شمار بارودی سرنگیں ہیں۔ ڈیرے والوں نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی اور آخر تک اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ دھماکے سے اُڑ گیا۔''

ڈپٹی ریاض نے خالص تھانیدارانہ لہجے میں اس حوالے سے چند سوال جواب کیے پھر وہ بلاول والے واقعے کی طرف آ گیا۔ ''وہ مُنڈا تو چنگا بھلا تھا۔ اس کے ساتھ کیا کر آئی ہو۔ کہیں مذاق شذاق تو نہیں کر رہی ہو مجھ سے۔'' وہ زہریلے انداز میں بولا۔

''دیکھیں...... میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ اپنا اور آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گی۔ جو کچھ آپ کو بتاؤں گی، وہ سچ ہو گا۔''

''بی بی جان! تم نے جو کچھ بتانا ہے بتاتی جاؤ۔ سچ جھوٹ کا پتا ہم خود ہی چلا لیں گے۔ اپنا تو کسب ہی یہی ہے...... ہاں بتاؤ...... کیا ڈرامہ ہوا اس مُنڈے کے ساتھ؟''

''ڈرامہ اس کے ساتھ نہیں ہوا۔ اس نے کیا ہے اور ڈرامہ بھی ایسا کہ سب دیکھتے رہ گئے۔''

''منہ سے آگ نکالی تھی اس نے...... یا عورتوں کی طرح بچہ پیدا کر دیا تھا۔''

شانی اس کی واہیات بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''پتا نہیں اس نے ایسا کیوں کیا۔ کیا مقصد تھا اس کا۔ وہ رات چوری چھپے لالہ فرید کے کمرے میں گھس گیا۔ وہاں سردار نادر کا کا کچھ سامان وغیرہ پڑا ہوا تھا۔ ایک پہرے دار نے اسے کمرے میں دیکھ لیا۔ وہ اس کے قریب گیا تو اس نے شکاری چاقو سے اس کی گردن کاٹ دی۔ وہ بے چارہ وہیں مر گیا۔ ایک دوسرا بندہ بھی اس کے ہاتھوں زخمی ہوا۔ پھر اس نے مجھے پکڑ لیا اور میرے سر پر پستول

رکھ دیا۔'' شانی نے اوڑھنی پیچھے کر کے اور بالوں میں مانگ نکال کر ڈپٹی کو وہ گہری خراشیں دکھائیں جو بلاول کے پستول کی وحشیانہ رگڑ سے نمودار ہوئی تھیں۔

بعد کا تقریباً سارا واقعہ بھی شانی نے ڈپٹی ریاض کے گوش گزار کر دیا۔ بس اس واقعے سے اس نے رستم کا ذکر حذف کر دیا۔ اس نے ڈپٹی ریاض کو یہ نہیں بتایا کہ اسے اندھی دراڑ میں سے نکالنے کے لئے جو شخص نیچے اُترا تھا وہ کون تھا۔ اس نے ایک کے بجائے دو تین افراد کا ذکر کیا تا کہ ریاض کا عیار ذہن رستم کی طرف نہ جا سکے۔

''اگر تمہاری بات پر یقین بھی کر لیا جائے تو اس بدبخت کی لاش تو ملنی چاہئے تھی۔ اگر تم اس اندھی دراڑ سے ہڈی پسلی سلامت لے کر نکلی ہو تو اس کو بھی نکلنا چاہئے تھا۔''

''میں نے آپ کو بتایا ہے ناں کہ اس کے سر پر گرتے ہی چوٹ لگی تھی۔ وہ پانی میں گرنے کے بعد پھر باہر نہیں نکل سکا۔ میں ہوش میں تھی اس لئے ہاتھ پاؤں چلا کر باہر نکل آئی۔''

''ہاں یہ بات تو ہے جب بندہ کہیں پھنس جائے تو پھر باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں تو چلانے ہی پڑتے ہیں۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کا زہر تھا۔

پتا نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ شاید اس کا اشارہ جمشید کی طرف تھا۔ وہ بُری طرح پولیس کے چکر میں پھنسا ہوا تھا اور ابھی تک حوالات میں تھا یا پھر شاید ریاض خود شانی کی طرف ہی اشارہ کر رہا تھا۔ شانی اپنی طرف سے بے حد احتیاط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس نے بلاول کے حوالے سے ڈپٹی پر کسی طرح کا کوئی الزام نہیں لگایا تھا۔ وہ بالکل انجان بنی ہوئی تھی اور چاہتی تھی کہ ڈپٹی ریاض کسی بھی طرح مشتعل نہ ہو۔

''رستم سے ملاقات ہوئی؟'' ریاض نے اچانک تھانیدارانہ سوال کیا۔

''نن...... نہیں۔'' شانی ہکلائی پھر سنبھل کر بولی۔ ''بس اسی طرح ملاقات ہوئی جس طرح دوسروں سے ہوئی۔''

''تیری جنڈری پر صدقے واری جانے کے لئے دراڑ میں کون کون اُترا تھا؟''

شانی سناٹے میں رہ گئی۔ وہ واقعی شکاری درندے کی طرح عیار تھا۔ وہ بولی۔ ''مجھے ٹھیک سے پتا نہیں...... وہاں اندھیرا تھا۔''

''تم نے ابھی مجھے یہ بتایا کہ دراڑ میں ٹارچیں بھی لائی گئی تھیں۔''

''در...... دراصل دراڑ میں اُترنے والوں نے گیس کی وجہ سے اپنے منہ سر لپیٹے ہوئے تھے۔'' شانی نے بات بنائی۔

''منہ لپیٹنے سے کیا ہوتا ہے بی بی! خون کے اندر عاشقی تڑپ (تڑپ) رہی ہو تو سات پردوں کے پیچھے سے بھی معشوق کا کھوج نکل آجاتا ہے۔'' پھر اس نے ایک دم بات بدلی۔ ''خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ تم دو بندوں کو واپس لے آئی ہو..... لیکن بندوں کو گنوا بھی آئی ہو۔ ایک تو حشام کا نوکر اور دوسرا بلاوا۔ یہ سارا معاملہ اور بھی الٹا سیدھا ہو گیا ہے۔ اس کی تفتیش آسان نہیں ہے۔ تمہارے اور کھیا دراج کے سوا کوئی اور گواہ بھی نہیں ہے۔ اب تم دونوں ہی سچ سچ بتاؤ گے تو بات آگے بڑھے گی۔''

''میں سچ سچ ہی بتا رہی ہوں۔''

''اور دراج کیا بتا رہا ہے؟''

''وہ بھی سچ بتا رہا ہے۔''

''پھر میرے کھوپڑ میں ہی دماغ کی جگہ گوبر بھرا ہوا ہے شاید۔''

''کک..... کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تم دونوں میں سے ایک سچا ہو سکتا ہے دونوں نہیں۔ تم دونوں کے بیانوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا شادی کے بعد پیدا ہونے والے بچے اور شادی سے پہلے پیدا ہونے والے بچے میں ہوتا ہے۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''دو چار دن بعد پھر تم سے ملاقات ہو گی۔'' اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

اب تاؤ حشام اور راجو کو ان کے وارثوں کے حوالے کیا جانا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ والے کمرے میں موجود تھے۔ پولیس کی موجودگی میں انہیں چوہدری قادر، چوہدری احسان اور دیگر افراد کے سپرد کیا جانا تھا۔ یہ لوگ تھوڑی دیر میں میانہ گاؤں سے یہاں پہنچنے والے تھے۔ یہاں پٹواری کے گھر میں چوہدری اور اس کے بیٹے کو مہمان کی حیثیت سے رکھا گیا تھا۔ شانی کی ہدایت پر خالو اعجاز ان دونوں کی خاطر مدارت میں مصروف تھے۔ شانی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خیر سگالی کے جذبات ابھارنے کی خواہش مند تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ نار پوری چوہدریوں، کمبوہ اور مہتم برادرز میں بڑھتی ہوئی کشیدگی کو کم سے کم کیا جائے۔ خیر سگالی کا ایک بڑا قدم تو اس نے اٹھا ہی لیا تھا۔ چوہدری اور اس کے بیٹے کو چھڑانے کے لئے وہ خود کو خطروں میں ڈال کر مفرور ڈکیتوں کے ڈیرے پر پہنچی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر سردار دراج کو بھی ساتھ لیا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ مہتم برادری کی طرف سے بھی نار پوریوں کا دل کسی طرح صاف ہو۔ اب وہ اپنی طرف سے تاؤ حشام کو بھی عزت دینے کی کوشش کر رہی

تھی۔ دیکھنے والے حیران تھے کہ اپنے ایک بدترین دشمن کے لئے اس نے اپنے دل میں گنجائش کیسے پیدا کر لی تھی۔ ٹھیکرا پہنچتے ہی تاؤ حشام اور راجو کو نہلا دھلا کر نیا لباس پہنایا گیا تھا اور ایک ڈاکٹر کو بلوا کر باپ بیٹے کی عمومی صحت کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اب وہ دونوں خالو اعجاز کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ سردار دراج بھی وہیں موجود تھا۔ تاؤ حشام بار بار بیٹے کا سر چوم رہا تھا۔ راجو تاؤ کی چہیتی بیوی کا بیٹا تھا اور تاؤ کے لئے بے حد اہمیت رکھتا تھا۔

تاؤ حشام اور راجو کے رخصت ہونے سے پہلے شانی ایک بار راجو سے ملنا چاہتی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ دوسرے کمرے میں کھانا کھا لیا گیا ہے تو اس نے ایک ملازمہ کو بھیجا اور راجو کو اپنے پاس بلا لیا۔ نہا دھو کر اور نیا لاچہ کرتہ پہن کر راجو نکھرا نکھرا نظر آیا۔

شانی نے اسے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ ''راستے میں تم سے بات کرنے کا زیادہ موقع نہیں مل سکا۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

''ہاں۔'' اس نے تائید کی۔ جیسے کہہ رہا ہو وہ بھی بات کرنا چاہتا تھا۔

شانی بولی۔ ''دیکھو، تمہارے من کی مراد پوری ہونے والی ہے۔ تم اب آسانی سے اپنی کوکی تک پہنچ سکتے ہو لیکن تمہیں احتیاط بھی بہت کرنا پڑے گی۔ کہیں بنا بنایا کام بگڑ نہ جائے۔ سب سے پہلے تو تمہیں بڑی رازداری کے ساتھ ڈولے سے رابطہ کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ابھی تک تمہاری حویلی میں ہی ہو گا۔''

''اور اگر نہ ہوا تو؟'' راجو کے انداز میں اندیشہ تھا۔

''نہ ہونے کا علاج بھی ہے ہمارے پاس لیکن مجھے پتا ہے کہ وہ وہیں ہو گا۔ تم اسے بے شک میرا حوالہ بھی دے دینا۔ اس کے بعد اپنا تعارف کرا دینا لیکن ایک بار پھر کہتی ہوں کہ یہ سب کچھ رازداری سے کرنا۔ تمہارے ابا جی سمیت کسی کو بھنک نہیں پڑنی چاہئے۔''

''ٹھیک ہے، میں سمجھ رہا ہوں ساری گل۔'' راجو نے کہا۔

''اس کے بعد تم ایسا کرنا کہ کسی طرح ڈولے کو اپنی حویلی سے رہا کراؤ۔ کیا اسے رہا کرانے کا کوئی طریقہ ہے تمہارے دماغ میں؟''

''یہ میرے لئے بڑا آسان ہے۔ میں اسے رات کے وقت حویلی سے نکال دوں گا..... حویلی میں سارے یہی سمجھیں گے کہ وہ کسی طرح پہرے داروں کو چکر دے کر نکل گیا ہے۔''

''لیکن اس کے بعد تلاش شروع ہو جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے ابا جی کے کارندوں نے ڈولے کا کچھ اتا پتا بھی معلوم کر رکھا ہو۔ وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ

سکتے ہیں۔ کئی بے گناہوں کے لئے مصیبت ہوگی۔ مجھ پر بھی شک کیا جا سکتا ہے۔''

''پھر ایک اور بات بھی ہے۔'' راجو نے شانی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈولے کے نکل جانے سے کئی پہرے داروں کی بھی شامت آئے گی۔''

شانی پُرسوچ انداز میں بولی۔ ''کوئی اور راستہ ڈھونڈو۔''

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ''ایک طریقہ اور ہے۔ ہاں یہ بالکل فٹ رہے گا۔'' اس نے مطمئن انداز میں اوپر نیچے سر ہلایا۔ ''میرا ایک یار ہے بخت خاں۔ کوہاٹ کا رہنے والا ہے۔ میرے پاس آتا جاتا رہتا ہے۔ اس کا باپ لکڑی کا بڑا تاجر ہے۔ لاہور اور گوجرانوالہ میں بھی لکڑی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے گاؤں کا سردار بھی ہے۔ میں ابّے سے کہوں گا کہ مجھ سے بخت خاں نے ڈولے کو ایک مہینے کے لئے مانگ لیا ہے..... ہاں یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔'' راجو نے ایک بار پھر اپنی ہی تائید میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو ایسا کر لو۔ بہرحال سب سے پہلا کام تو یہ کرو کہ ڈولے کو لے کر بڑی خاموشی کے ساتھ کوکب کے پاس ملتان پہنچو۔ اس کے والدین سے بات کرو۔ ان کو بتاؤ کہ تم کوکب کے معاملے کو یونہی نہیں لے رہے ہو۔ یہ تمہارے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ تم ہر صورت میں اسی سے شادی کرو گے۔ جواب میں وہ لازماً یہ کہیں گے کہ یہ بچوں کا کھیل نہیں۔ پہلے تم اپنے بڑوں کو مناؤ اور انہیں اس کام کے لئے یہاں بھیجو۔ تم انہیں تسلی دو کہ تم پوری کوشش کر کے اپنے ابا جی کو منا لو گے اور اگر بالفرض نہ منا سکے تو بھی تم پیچھے نہیں ہٹو گے اور کوکب کو ہر حال میں اپناؤ گے۔ تمہاری یہ باتیں ان پر ضرور اثر کریں گی اور ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں کوکب سے ملنے اور بات کرنے کی اجازت بھی دے دیں۔''

شانی کی بات سن کر راجو کی آنکھوں میں جیسے ایک ساتھ بہت سے دیے جل اٹھے۔ یوں لگا جیسے کوکب کو دوبارہ دیکھنا اور اس سے ملنا اس کی زندگی کی بہت بڑی خواہش ہے لیکن پھر عین اسی وقت اس کی آنکھوں میں دُھندلاہٹ سی نمودار ہوگئی۔ وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر کر بولا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر مجھے ایک بات سے ڈر بھی لگتا ہے۔''

''کیسی بات؟''

''تم کہتی ہو کہ ڈولے کو کوکب اور اس کی باجی نے بھیجا ہے۔ میں جب اسے بتاؤں گا کہ میں ہی وہ مُنڈا ہوں جس کا کوکب کے ساتھ معاملہ رہا ہے تو وہ حیران ہو جائے گا۔ اس نے یہاں مجھے بہت کچھ کرتے دیکھا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ..... وہ..... کنجری اور نوکرانیاں شوکرانیاں۔ اگر یہ سب کچھ کوکب کو پتہ چل گیا تو پھر سارا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔ میرا

مطلب ہے.....''

''میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں۔'' شانی نے اس کی بات کاٹی۔ ''تمہارا ڈر غلط نہیں ہے۔ ایک لڑکی پیار میں سب کچھ برداشت کرتی ہے..... سارے زمانے سے لڑائی مول لے لیتی ہے لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس سے پیار کرنے والا کسی اور کی طرف دیکھے اور تم دیکھتے ہی نہیں رہے، بہت کچھ کرتے بھی رہے ہو۔ یہ سب تمہارے ابّے کی چال تھی۔ وہ تمہیں ان گندے کاموں میں ڈال کر کوکی کی پاک صاف محبت سے دور کرنا چاہتا تھا اور تم اس چال میں آ گئے لیکن یہ جو کچھ بھی ہوا تم نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ تمہیں اس گندے کام میں دھکا دیا گیا ہے۔'' شانی چند سیکنڈ خاموش رہی پھر بولی۔ ''لیکن یاد رکھنا عورت کا دل ان معاملوں میں مرد سے بہت بڑا ہوتا ہے۔ وہ معاف کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ اگر تم کسی مناسب وقت میں کوکب کو یہ سب کچھ بتا بھی دو تو مجھے یقین ہے کہ وہ ہمت سے کام لے کر برداشت کر لے گی لیکن فی الوقت یہ سب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔''

''مگر ڈولا؟''

''دیکھو، تم خود بتا رہے ہو کہ تم نے پچھلے کئی مہینوں سے سارے بُرے کام چھوڑ دیئے ہیں۔ تمہارے اندر آنے والی یہ تبدیلی حویلی میں رہنے والوں کو بھی تو نظر آ رہی ہوگی اور ڈولا بھی ان میں شامل ہے۔ تم بے شک اسے بتا دینا کہ ایک رات حویلی میں میری اور تمہاری ملاقات ہوئی تھی۔ اسی ملاقات کے بعد تم نے اپنے آپ کو بدلنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے امید ہے کہ تمہاری بات ڈولے کی سمجھ میں آئے گی۔ جب میرے ساتھ اس کی ملاقات ہوگی تو میں بھی تمہاری باتوں کی تصدیق کر دوں گی۔ تم بے فکر رہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس جیسا میں کہہ رہی ہوں، ویسا کرو۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ابھی تمہارے ابا جی کو اس بات کی بھنک نہیں پڑنی چاہئے کہ تمہیں کوکب کا کوئی کھوج ملا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو بے چاری کے لئے اور اس کے گھر والوں کے لئے خطرناک ہوگا۔''

راجو اثبات میں سر ہلانے لگا۔

شانی نے اپنی چھوٹی انگلی سے چاندی کا ایک چھلا اُتار کر راجو کو دیا اور کہا۔ ''یہ ڈولے کو میری طرف سے دے دینا اور کہنا کہ تمہاری باجی نے دیا ہے۔ اسے میری طرف سے سلام بھی کہنا لیکن ایک بات کا خیال تمہارے ساتھ ساتھ ڈولے کو بھی رکھنا ہے۔ ابھی کچھ دنوں تک تم دونوں مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کرو گے۔''

''لیکن کب تک؟''

''ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میرے اردگرد حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ پولیس والے بھی سادہ کپڑوں میں میرے آلے دوالے موجود رہتے ہیں حالات کچھ اچھے ہوں گے تو میں خود تم دونوں سے رابطہ کرلوں گی۔''

کچھ ضروری ہدایات دے کر شانی نے راجو کو اس کے باپ کے پاس واپس بھیج دیا۔

اسی دوران میں شانی کے خالو اعجاز کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ کچھ گھبرائے ہوئے تھے۔ شانی سے بولے۔ ''دیکھو بیٹا جی! میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ چوہدری اور اس کے بیٹے کو فالفٹ پولیس کے حوالے کردینا چاہئے۔ یہاں اس گھر میں انہیں مہمانوں کی طرح رکھنا کسی طور پر ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں یہ بات کسی طور پر نہیں بھولنی چاہئے کہ علاقے کے لوگ چوہدری اور اس کے بیٹے کو صفیہ کا قاتل سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر راجو کا وجود تو وہ یہاں بالکل ہی برداشت نہیں کرسکتے۔''

''اب کیا بات ہوئی ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''عارف بڑا دکھی ہورہا ہے۔ کچھ بھی ہے صفیہ اس کی بھتیجی تھی۔ وہ تو راجو کے نام سے ہی آگ بگولہ ہوجاتا ہے۔ وہ صرف تمہارے منہ کا چپ ہے۔ بہتر ہے کہ راجو اور اس کا باپ فوراً یہاں سے نکل جائیں ورنہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

''لیکن میں نے عارف سے خود بات کی تھی خالو! میں نے اسے کہا تھا کہ ہم ایک دو گھنٹے سے زیادہ چوہدری اور راجو کو اپنے پاس نہیں رکھیں گے۔''

''مگر بیٹا جی بات صرف عارف کی ہی نہیں ہے۔ ساری کمبوہ برادری راجو کے خون کی پیاسی ہے اور اس میں ایسا غلط بھی کیا ہے۔ ان باپ بیٹے نے کیا کچھ نہیں کیا ہے کمبوہ عورتوں کے ساتھ۔ کبھی انہیں گاڑیوں کے نیچے کچلا، کبھی زبردستی نکاح کیا ہے، کبھی صفیہ کی طرح رکھیل بنا کر رکھا اور حمل ضائع کراتے ہوئے جان لے لی۔''

''آپ کی ساری باتیں ٹھیک ہیں خالو! صفیہ کی موت کا دکھ مجھے بھی کچھ کم نہیں ہے۔ میں نے تو اپنی آنکھوں سے اسے دم دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کی ماں کے بین ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں لیکن ظلم اور تشدد کو ہم کب تک ظلم اور تشدد سے روکنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ اس خوفناک کھیل کو ختم کرنے کے لئے کسی نہ کسی کو تو پہل کرنی ہوگی تو کیوں نہ ہم یہ پہل کرلیں۔''

''لیکن مجرم کو سزا تو ملنی چاہئے۔'' خالو اعجاز نے کہا۔

''آپ کی یہ بات بھی بالکل صحیح ہے لیکن یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے..... قانون کی

عمل داری نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو طاقت ور ہے وہی پولیس ہے، وہی جج اور وہی جلاد ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں ایسے دور دراز علاقوں میں ڈپٹی ریاض جیسے افسروں کے ہوتے ہوئے کسی مظلوم کو انصاف مل سکتا ہے۔ صفیہ کے قتل کو کتنے مہینے گزر چکے ہیں۔ اس کی قبر کشائی بھی ہوئی ہے۔ عارف نے اسے انصاف دلانے کے لئے پوری جان لڑائی ہے لیکن نتیجہ صفر ہے۔ چوہدری حشام کے پیسے اور اثر و رسوخ نے کام دکھایا ہے۔ اس نے گرائے کے دو منشوں کی گرفتاری دے دی ہے اور بس۔'' شانی دکھ کے عالم میں بولتی چلی گئی۔ ''پھر ایک بات اور بھی ہے خالو اور یہ بات میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ اصل مجرم راجو نہیں، اس کا باپ حشام ہے۔ راجو کی حیثیت ایک ناسمجھ لڑکے سے زیادہ نہیں۔ اسے اس گند میں دھکیلنے والا اس کا چالاک باپ ہے اور اس نے ایسا کیوں کیا۔ میں یہ بھی آپ کو تفصیل سے بتا چکی ہوں۔''

''لیکن بیٹی! چوہدری حشام اور راجو کے ساتھ ہماری ''نرمی'' کمبوہ برادری کو کسی طور برداشت نہیں ہوگی۔ بہت سے لوگوں کا تو یہ خیال تھا کہ تمہیں اور دراج کو باپ بیٹے کی رہائی کے لئے جانا ہی نہیں چاہئے تھا۔ ان کو اگر اپنے کئے کی سزا رستم اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں ملنے والی تھی تو مل جاتی۔ وہیں پوٹھوہار میں مرگئے ہوتے یہ دونوں حرامی۔''

''مگر خالو، ان کے مرنے سے دشمنی کی آگ تو ٹھنڈی نہ ہوتی بلکہ یہ تو اور بھڑکتی۔ کیا پتا اب تک بہت کچھ جل کر خاک ہوگیا ہوتا اور مجھے پورا یقین ہے کہ ناریوروں اور کمبوہوں کے ساتھ ساتھ مہتم بھی زد میں آتے کیونکہ رستم کو کھولی میلے سے بچا کر نکالنے والوں میں مہتم بھی شامل تھے۔ اب دیکھیں اس آگ پر پانی کے کتنے چھینٹے پڑے ہیں۔ بے شک یہ بجھی نہیں لیکن بھڑک کر دوبارہ طوفان بھی تو نہیں بنی۔''

چوہدری اعجاز نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی سے سنتے رہے۔

شانی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اور ہمیں بہت کچھ حاصل بھی ہوا ہے خالو! ڈاکٹر زیب النساء اور ڈاکٹر بہروز کا واپس آجانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ میں نے کچھ مقامی لوگوں سے بات کی ہے۔ وہ اس حوالے سے بہت خوش نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر بہروز کی واپسی سے علاقے میں بہت زیادہ تبدیلی آئے گی۔ ہسپتال بڑے اچھے طریقے سے آباد ہوگا۔ شاہی اور پیر قدرت اللہ کے اثر و رسوخ میں کمی آئے گی۔ کیونکہ ڈاکٹر بہروز ہی قدرت اللہ جیسے شخص کا توڑ ہوسکتا ہے۔''

چوہدری اعجاز بولے۔ ''یہ باتیں میری سمجھ میں تو آتی ہیں شانی، لیکن ان لوگوں کو کون سمجھائے گا۔''

''خالو جی! سچائی سورج اور دھوپ کی طرح ہوتی ہے۔ اسے ثابت نہیں کرنا پڑتا بلکہ یہ خود بخود عیاں ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اس قدم سے اچھی تبدیلیاں آئیں گی اور لوگ انہیں محسوس بھی کریں گے۔ جوہرآباد میں فی الوقت سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ قبرستان والی لڑائی کے بعد درجنوں بندے گرفتار ہیں جن میں ہمارا جمشید بھی ہے۔ آج ڈپٹی ریاض سے اس بارے میں بھی میری بات ہوئی ہے۔ اس نے یقین دلایا ہے کہ اس سلسلے میں تعاون کرے گا اور کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی۔''

''لیکن وہ تو کہتا ہے کہ میں چالان عدالت میں پیش کر چکا ہوں۔''

''غلط کہہ رہا ہوگا۔ اپنی جان چھڑانا چاہتا ہوگا۔ ابھی سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہے اور اگر وہ انصاف کرے تو جمشید پر کوئی سنگین الزام نہیں لگ سکتا۔''

اسی دوران میں ایک پولیس اہلکار نے خالو اعجاز کو باہر بلایا۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ پولیس چوہدری اور راجو کو لے کر میانہ روانہ ہونے والی ہے۔

سہ پہر تک یہ ساری کارروائی مکمل ہوگئی اور شانی تانگے پر سوار ہو کر جوہرآباد روانہ ہوگئی۔ خالو اعجاز، ماسٹر انیس اور ایک پولیس اہلکار بھی ہمراہ تھا۔ جمشید چونکہ جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل میں تھا لہٰذا اس سے شانی یا خالو اعجاز کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔

☆======☆======☆

جوہرآباد پہنچ کر شانی سب سے پہلے ڈاکٹر زیب النساء اور ڈاکٹر بہروز سے ملنا چاہتی تھی تاہم اسے راستے میں ہی معلوم ہوگیا کہ فی الحال وہ دونوں جوہرآباد میں نہیں ہیں۔ وہ دو روز جوہرآباد رہنے کے بعد لاہور روانہ ہوگئے تھے۔ ان کے گھر والے وہاں بےقراری سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ خالو اعجاز کے مطابق ڈاکٹر زیب النساء کی حالت تو بہت پتلی تھی۔ وہ بےچاری مخبوط الحواس دکھائی دیتی تھی۔ اسے میانہ کی حویلی میں مسلسل ذہنی وجسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ حویلی میں ہی ایک چوہدری کے ساتھ اس کا زبردستی نکاح پڑھوا دیا گیا تھا...... اور یہ واقعہ ڈاکٹر زیب النساء کے شوہر ڈاکٹر محسن کی موت کے صرف ایک مہینے بعد ہی وقوع پذیر ہوگیا تھا۔ یعنی عدت وغیرہ پوری ہونے سے پہلے ہی اس کی پھر شادی کر دی گئی تھی۔

ڈاکٹر بہروز کی جسمانی حالت نسبتاً بہتر تھی لیکن وہ بھی پہلے سے بہت کمزور نظر آتے تھے۔ انہیں نارپور میں چوہدریوں کی نئی حویلی کے تہہ خانے میں رکھا گیا تھا..... یہاں وہ دو اشتہاری قاتلوں کے زخموں کا علاج کرتے رہے تھے اور مسلسل توہین وتذلیل کا شکار ہو رہے تھے۔ بہرحال ان ساری صعوبتوں کے باوجود ان کا حوصلہ پہلے کی طرح بلند اور عزم جوان

تھا۔ انہوں نے جوہرآباد پہنچتے ہی باقاعدہ ایک جلسے سے خطاب کیا تھا اور لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ جوہرآباد سے ان کی محبت کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوگا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ وہ صرف دو ہفتوں بعد پھر ان کے درمیان موجود ہوں گے۔ عارف، جمشید، دراج اور ماسٹر انیس جیسے لوگ ان کے شانہ بشانہ ہوں گے اور یہ انقلابی قافلہ پھر سے رواں دواں ہوگا۔

جمشید کے گھر میں سب سے پہلے تابندہ ہی آ کر شانی سے لپٹی۔ وہ شانی کے گلے لگ کر دیر تک سسکیاں لیتی رہی۔ پھر عارف کی بیوی جمیلہ پھر خالہ فیروزہ..... اسی طرح بہت سی عورتیں شانی کے گلے لگیں اور اس کی خیر خیریت دریافت کی۔ وہ شانی کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں جیسے یقین کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ یہ نرم ونازک لڑکی واقعی ایک دشوار گزار سفر طے کر کے نامعلوم پہاڑیوں میں ڈکیتوں کے ڈیرے تک پہنچی تھی اور وہاں سے کامیاب واپس لوٹی تھی۔

کچھ دیر تک عورتوں نے اسے گھیرے رکھا۔ پھر شام کے سائے گہرے ہوتے ہی یہ بھیڑ چھٹ گئی۔ جوہرآباد میں چراغ جل اٹھے۔ ایک کمرے میں بیٹھ کر شانی نے تابندہ اور خالہ فیروزہ سے دیر تک باتیں کیں۔ لالٹین کی روشنی میں تابندہ اور فیروزہ کی آنکھوں میں آنسو چمکتے رہے۔ یہ جمشید کے نام کے آنسو تھے، جسے بیٹھے بٹھائے مقدمہ قتل کے عذابوں نے جکڑ لیا تھا۔ فیروزہ نے اشک بار لہجے میں کہا۔ ''شانی! تم نے پولیس کے لئے اتنا بڑا کام کیا ہے۔ اپنی جان خطرے میں ڈالی ہے۔ زخمی ہوئی ہو۔ اب تو ڈپٹی ریاض کو چاہئے کہ تم جس پر انگلی رکھو، وہ اسے چھوڑ دے لیکن وہ اسی طرح لوہے کا تھم بنا ہوا ہے۔ اس کے کارندے لوگوں کو ڈرا ڈرا کر رشوتیں کھا رہے ہیں۔''

''آپ حوصلہ رکھیں خالہ، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس تھوڑا سا وقت لگے گا۔''

''ماسٹر انیس کہتا تھا کہ ڈپٹی نے جمشید کا چالان بنا کر عدالت میں دے دیا ہے۔ اب جو کرنا ہے عدالت نے ہی کرنا ہے۔'' تابندہ روہانسی آواز میں بولی۔

''نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔'' شانی نے تسلی بخش لہجے میں کہا۔ ''میری بات ہوئی ہے ڈپٹی سے۔ ابھی کچھ نہیں ہوا ہے۔''

''تو کیا جمشید رہا ہو جائے گا؟'' تابندہ کے لہجے میں بےتابی تھی۔

''دیکھ تابندہ، مصیبت آتو فٹافٹ جاتی ہے لیکن اسے جاتے ٹائم لگتا ہے۔ جب ایک دفعہ پرچہ کٹ جاتا ہے ناں تو پھر پولیس بھی کارروائی کی پابند ہو جاتی ہے۔ بہرحال میری بہن! میں تجھے اتنا یقین دلاتی ہوں۔ اب جمشید پر قتل شتل کا کیس نہیں بنے گا صرف لڑائی

جھگڑے اور مار پیٹ کی دفعات لگیں گی۔ لہٰذا زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''میرے دل میں بڑے بُرے بُرے خیال آتے ہیں آپا۔ میں دیر تک راتوں کو جاگتی رہتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں میرے دل میں وہم بیٹھ گیا ہے کہ ڈپٹی کے ہاتھوں جمشید کو کچھ ہو جائے گا۔ سنا ہے کہ یہ بندہ اپنے سامنے اکڑنے والے کو کبھی معاف نہیں کرتا اور جمشید اکڑا تھا اس کے سامنے۔''

''وہ سب ٹھیک ہے لیکن اب ہم اس کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی نہیں ہونے دیں گے۔'' شانی نے اعتماد سے کہا۔

خالہ فیروزہ بولی۔ ''ڈپٹی کے نیچے کام کرنے والے پُلیسے بھی ڈپٹی کی طرح بدمعاش ہیں۔ جمعرات تک جمشید تھیکرا کے حوالات میں ہی تھا۔ میرے منع کرتے کرتے بھی یہ جمشید سے ملنے تھانے گئی۔'' اس نے تابندہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں ڈپٹی سے چھوٹے افسر نے دو گھنٹے تک اسے کمرے میں بٹھائے رکھا۔ ساتھ میں اس کا چھوٹا بھتیجا گلزار بھی تھا۔ افسر نے اسے دو سیر کڑاہی گوشت لانے کے لئے بازار بھیج دیا اور خود اس کے ساتھ الٹی سیدھی باتیں کرتا رہا.....''

''بڑی بے حیائی کی باتیں کیں جی اس نے۔ مجھے تو رونا آ رہا تھا۔'' تابندہ بولی۔

''قسمت چنگی تھی کہ اتنے میں گلزار واپس آ گیا۔ دو گھنٹے ہمیں بٹھا کر اس افسر نے بس دو منٹ جمشید سے ہماری بات کرائی اور پھر باہر نکال دیا۔''

''میں نے تم سے کہا بھی تھا تابندہ! جوان عورتوں کو تھانے جانا ہی نہیں چاہئے۔ وہاں کا ماحول عورتوں کے لئے ہے ہی نہیں۔ بہرحال جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب میری یہ نصیحت یاد رکھنی ہے۔ تمہیں پولیس کے منہ لگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

خالہ بولی۔ ''بدھ کے دن ثریا کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا۔ ثریا کا خاوند اور جیٹھ بھی لڑائی کے بعد سے تھانے میں ہیں۔ وہ خاوند سے ملنے گئی تھی..... چھوٹے تھانیدار نے اسے خوب ڈرایا دھمکایا۔ کہنے لگا تیرا خصم تو گیا کام سے۔ دس بارہ سال تو باہر نہیں آئے گا۔ اتنے میں تیرا پنڈا ڈھیلا پڑ جائے گا۔ اچھا ہے کہ کوئی اور خصم ڈھونڈ لے۔ نئیں تو میرے پاس آ جا۔ تیرے سارے کام سیدھے ہو جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ خصم صاحب بھی باہر آ جائیں..... توبہ توبہ..... یہ تو حال ہے ان لوگوں کا۔'' خالہ فیروزہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

رات کو شانی باہر برآمدے میں سوئی۔ موسم اب کافی بدلا ہوا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ برآمدے سے آگے کھلا احاطہ تھا۔ ہینڈ پمپ کا لوہا مدھم چاندنی میں

چمک رہا تھا۔ اس سے آگے دیوار کے ساتھ ساتھ پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ موتیے، رات کی رانی اور گیندے کے پھول مہک رہے تھے۔ برآمدے کے محرابی دروں سے آسمان کا جو حصہ نظر آتا تھا وہ تاروں سے بھرا ہوا تھا۔

شانی نے ان ٹمٹماتے تاروں کو دیکھا اور اچانک اسے کوئی یاد آ گیا..... وہ یاد آیا اور اتنی شدت سے آیا کہ وہ دنگ رہ گئی۔ شاید اب تک وہ اپنی مصروفیات میں گم رہی تھی اور اسے ٹھیک سے یاد کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ کئی دنوں کے بعد وہ آج رات قدرے فارغ تھی اور اچانک کسی کی یاد نے دھاوا بول دیا تھا۔ جیسے یہ یاد بظاہر اوجھل ہونے کے باوجود دل و دماغ میں تسلسل کے ساتھ سرایت کر رہی ہو اور اب یکایک نمودار ہو گئی ہو۔

اس نے گھبرا کر اپنی بائیں طرف دیکھا۔ دو چارپائیوں پر تابندہ اور خالہ فیروزہ سو رہی تھیں۔ شانی کو لگا کہ اگر وہ جاگ رہی ہوتیں تو اس کے دل و دماغ پر اچانک حملہ آور ہونے والے خیالات شاید ان دونوں پر بھی ظاہر ہو جاتے۔ شانی نے ایک گہری سانس لے کر کروٹ لی۔ اپنے دونوں ہاتھ باہم ملا کر رخسار کے نیچے رکھے اور محویت سے ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھنے لگی۔

ہاں یہی ستارے اس وقت پوٹھوہار کے ان سنسان ٹیلوں پر بھی چمک رہے تھے جہاں وہ موجود تھا۔ جہاں وہ سانس لیتا تھا۔ جہاں ایک سرنگ کے اندر وہ اندھی دراڑ موجود تھی جو ایک رات کے لئے اس کا اور شانی کا مسکن بنی تھی۔ اس اونگھتی ہوئی خمار آلود رات اور اس اندھی دراڑ کو یاد کر کے شانی کے سارے جسم میں سنسناہٹ دوڑنے لگی۔ اسے محسوس ہوا کہ پلک جھپکتے میں اس کی ہتھیلیوں پر پسینہ آ گیا ہے۔

وہ سب کچھ ایک عجیب و غریب سپنے جیسا تھا۔ ایک جادوئی سپنا، ایک طلسم، ایک اونگھتا ہوا رنگین واہمہ۔ وہ کیا تھا؟ اور کیا نہیں تھا؟ اس کا تصور کرتے ہی شانی شرم سے پانی ہونے لگی لیکن اس شرم میں ایک طرح کی لذت، ایک انوکھی سنسناہٹ بھی شامل تھی۔ ایک ایسی سنسناہٹ جس کا اس سے پہلے شانی کو کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک بالکل نئی اَن دیکھی، انجانی کیفیت تھی اور اتنی حسین جس کا شانی نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔

ان جادوئی لمحوں میں، ان وارفتہ لمحات میں اس نے شانی کو چوما تھا۔ اس کے چہرے کو، اس کی گردن اور اس کے شانوں کو۔ بڑی ہی نرمی سے بڑی ہی خوشبودار محبت سے۔ پھر اس نے اسے گلے لگایا تھا۔ جیسے وہ مجسم پھول ہو اور وہ بڑی نزاکت سے اسے بانہوں میں سمیٹ رہا ہو۔ ان لمحوں میں شانی کی سماعت نے اس کی دھڑکن سنی تھی اور یہ دھڑکن کہہ رہی

تھی۔

میں اس شخص کا دل ہوں جس کا نام رستم سیال ہے
اور میں تم سے محبت کرتا ہوں
اور اتنی محبت جتنی کوئی انسان دوسرے انسان سے کر سکتا ہے
اور آج سے نہیں
صدیوں سے، زمانوں سے
روزِ اول سے زمینی اور آسمانی ''خداؤں'' کی جتنی پرستش کی گئی ہے
وہ سب جمع ہو کر میری محبت میں شامل ہے
اور روز آفرینش سے اب تک انسانی ذہنوں میں برتر لوگوں کے لئے جتنی بھی عقیدت پیدا ہوئی ہے
وہ سب جمع ہو کر میرے عشق کا جز ہے

(((..... ہاں شانی کو اس جادوئی وقت کا ہر لمحہ یاد تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مرد و عورت کا رشتہ اتنا نفیس، اتنا مہربان اور محبت بھرا ہو سکتا ہے۔ اس نے تو بس سکھی سہیلیوں سے یہی سنا تھا کہ ''شادی'' مرد کی خوشی اور عورت کی قربانی کا نام ہے۔ شادی سے پہلے اسے رنگ والی کی عورتوں نے یہی سمجھایا تھا کہ اسے سسرال جا کر اپنے شوہر کو خوش رکھنا ہے۔ اس کی خوشی میں کسی طرح روڑے نہیں اٹکانے۔ شادی کے پہلے دن سے ہی اپنی مرضی کو اس کی مرضی میں ڈھال لینا ہے۔ دن میں اور رات میں، کسی بھی وقت، کسی بھی حال میں وہ اسے اپنی تنہائی میں بلائے، اسے پہنچ جانا ہے۔ کیونکہ یہ مرد کا حق ہے اور عورت کا فرض ہے۔)))

سسرال پہنچ کر شانی کو واقعی مرد کی اس بالادستی کا پورا پورا تجربہ ہوا تھا۔ بلکہ یہ تجربہ اس کی معلومات اور توقعات سے زیادہ کڑا تھا۔ یہ دہری آزمائش تھی۔ فاخر نے اسے دو طرفہ امتحان سے گزارا تھا۔ جب شانی کے نوخیز جسم میں لہر جاگتی تھی اور وہ بڑی محبت سے شوہر کی بانہوں میں سمانا چاہتی تھی، وہ اسے یکسر نظر انداز کرتا تھا اور جب کبھی وہ اپنے تفکرات کے سبب خود ''گریز'' کا شکار ہوتی تھی، وہ بپھرے ہوئے آبی ریلے کی طرح اس کی طرف لپکتا تھا۔ اسے جھنجھوڑتا اور پٹختا تھا اور غتربود کر کے رکھ دیتا تھا۔ مرد و زن کا بس یہی جارحانہ تعلق شانی کی سمجھ میں آیا تھا۔

پھر اسے ایک چھوٹا سا تجربہ چوہدری بشیر کے گھر میں بھی ہوا تھا۔ چوہدری بشیر نے شانی

کو بلیک میل کیا تھا۔ مُنے کے بلکنے سے مجبور ہو کر..... شانی نے خود کو ایک بے جان گڑیا کی طرح چوہدری بشیر کے آگے پھینک دیا تھا۔ وہ کسی ارنے بھینسے کی طرح اسے دھلیل کر دیوار تک لے گیا تھا اور بڑی وحشت سے چومتا رہا تھا۔ اس کے جارح ہونٹوں کے ناپاک نشان شانی آج تک اپنے چہرے پر محسوس کرتی تھی اور ان نشانوں کا تصور اس کے دل میں کراہت جگاتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ان نادیدہ نشانات کو اپنی جلد سے کھرچ ڈالے۔

ہاں..... شانی کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ مرد و زن کا رشتہ اتنا لطیف، مہربان اور محبت بھرا ہو سکتا ہے۔ اسے لگا جیسے وہ اب تک کنواری تھی، بالکل اَن چھوئی۔ اس اندھی دراڑ میں، ان طلسمی گھڑیوں میں، کسی نے پہلی بار اسے چھوا تھا اور یہ چھونا ایسا دل گداز اور حیرت ناک تھا کہ اس نے شانی کے اندر کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ شانی کو وہ لمس یاد آ رہا تھا، وہ نرمی اور خوشبو یاد آ رہی تھی اور اس کے دل میں ایک طوفان برپا ہونے لگا۔ اسے لگا کہ وہ نہ چاہنے کے باوجود رستم کو یاد کر رہی ہے۔ بے پناہ شدت اور طلب سے..... وہ رستم کو پہلے بھی یاد کیا کرتی تھی لیکن تب کے اور اب کے یاد کرنے میں فرق تھا۔ یہ مختلف یاد تھی۔ اس میں جسم و جاں اور دل و دماغ کی تمام تر چاہتیں شامل ہو گئی تھیں۔

وہ بے حال ہونے لگی..... بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ ان منہ زور خیالات سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی مگر وہ بڑے سرکش تھے۔ کوہی ندی کے ریلوں کی طرح امڈے چلے آ رہے تھے۔ وہ کچے اور ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں ٹہلنے لگی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ اس کیفیت سے فرار چاہتی تھی مگر فرار کا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر راستے پر وہ کھڑا تھا۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ناقابل شکست محبت کی جوت تھی۔ اس کا سینہ دیوار تھا۔ وہ کچھ کہہ نہیں رہا تھا لیکن اس کی خاموشی ہزار تکلم پر بھاری تھی۔

''کیا بات ہے شانی! نیند نہیں آئی؟'' ایک آواز نے شانی کو بُری طرح چونکایا۔ یہ خالہ فیروزہ کی آواز تھی۔ پتا نہیں وہ کب سے چارپائی سے اٹھ کر اس کے پیچھے آن کھڑی ہوئی تھیں۔

''کک..... کچھ نہیں خالہ، بس یونہی۔'' شانی ہکلا کر رہ گئی۔

خالہ کے سر پر موٹی اوڑھنی تھی۔ وہ سوئی سوئی آنکھوں سے شانی کو دیکھتی رہیں۔ پھر ایک گہری سانس لے کر شانی کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ چارپائی کے نیچے رکھی ہوئی لالٹین کی مدھم روشنی برآمدے کے کچے فرش پر رینگ رہی تھی۔

خالہ نے عجیب لہجے میں شانی سے پوچھا۔ ''جہاں ٹُو گئی تھی وہاں رستم ملا تھا تجھے؟''

''کیوں خالہ، آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

خالہ نے ایک نگاہ تابندہ پر ڈالی۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ گھر کے دیگر افراد بھی نیند کی آغوش میں تھے۔ خالہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''شانی جو کچھ ہوا ہے، یہ سب کچھ بہت تکلیف دینے والا ہے، تیرے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی۔ لوگ جب تیرا نام رستم کے نام کے ساتھ لیتے ہیں..... سچ کہتی ہوں..... ہمارے دلوں پر چھری چل جاتی ہے۔ تیرے تایا معصوم کی بیماری کی وجہ بھی یہی ہے۔ انہیں لوگوں کے بہت سے طعنے سننے پڑتے ہیں اور تو اور رنگ والی میں بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کی نظروں میں اب حویلی کی وہ عزت نہیں رہی ہے۔''

''لیکن خالہ! میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کے لئے مجھے یا میرے بڑوں کو شرمندہ ہونا پڑے.....''

''کٹھولی گاؤں کے میلے میں جو کچھ ہوا وہی کچھ کم نہیں تھا شانی..... لیکن اب تو اس سے بھی بڑا کام ہوا ہے۔ پولیس والوں نے چوہدری حشام کو چھڑانے کے لئے تجھے رستم کی طرف بھیجنا چاہا اور تُو فراٹے بھرتی ہوئی چلی گئی۔ اس طرح تُو نے خود ہی یہ بات مان لی کہ رستم کے ساتھ تیرا ناتا ہے۔''

''مجھے پتا تھا خالہ! یہ بات کہی جائے گی..... اس کے باوجود میں وہاں گئی کیونکہ میرے دل میں کوئی چور نہیں تھا۔ میں نے جو کچھ کیا یہاں کے لوگوں کی بھلائی کے لئے کیا اور آئندہ بھی جو کروں گی اسی لئے کروں گی۔ رستم کچھ لوگوں کی نظر میں بہت بُرا ہوگا لیکن کچھ لوگوں کی نظر میں وہ اچھا ہے اور میں بھی اسے اچھا سمجھنے والوں میں سے ہوں۔ باقی یہ بات میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں خالہ! میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گی جو خاندان کی عزت کو خراب کرے۔ میں کوئی ناسمجھ بچی نہیں ہوں۔ دنیا کا بہت گرم سرد دیکھ لیا ہے میں نے۔ آپ اس بارے میں بے فکر رہیں۔''

''کس طرح بے فکر رہیں شانی۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں۔''

''مجھے ان باتوں کی کوئی فکر نہیں ہے خالہ! میرے اندر کی سچائی سورج اور دھوپ کی طرح ہے۔ یہ ظاہر ہو کر رہے گی۔''

''شانی تُو نہیں سمجھتی۔ یہاں پر قدرت اللہ اور اس کے ماننے والوں کا کتنا اثر ہے۔ لوگ ان کی جھوٹی بات پر بھی آنکھیں بند کر کے یقین کرتے ہیں اور تیرے والی بات تو سچ

ہے۔ تجھے پتا نہیں، قدرت اللہ اور اس کی بیبیاں تیرے بارے میں کیا کہتی پھر رہی ہیں۔''

''مجھے ان کی باتوں کی پروا نہیں۔ میں کسی سے ڈرتی نہیں ہوں۔''

''یہ بات بھی غلط ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگوں سے ڈرنا پڑتا ہے۔ اگر تُو ڈرتی نہیں تھی تو دراج اور بلاول وغیرہ کے ساتھ چوروں کی طرح کیوں چلی گئی تھی۔ تجھے بتا کر جانا چاہئے تھا۔ تیرے جانے کے بعد میں رنگ والی گئی۔ وہاں سب ہی تجھ سے ناراض تھے اور سب سے زیادہ تیری چچی پروین۔ رو رو کر اس کا بُرا حال تھا۔''

''وہ دوبارہ ملیں تو ان سے کہہ دینا خالہ! میرے لئے اب نہ روئیں۔ اگر زیادہ رونا آجائے تو سمجھ لیں کہ میں حویلی میں لگنے والی آگ میں بچی ہی نہیں تھی۔ یہ کوئی اور لڑکی ہے۔ اس کی کوئی اور دنیا ہے۔''

''شانی یہ کہنا آسان ہے..... خون کی کشش بڑی زور والی ہوتی ہے۔''

اچانک تابندہ نے کروٹ لی اور غنودگی کی حالت میں اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر اس کے ہونٹوں سے کراہتی ہوئی آواز نکلی۔ ''جمشید..... جمشید کیا ہوا؟'' اس کے ساتھ ہی وہ ایک دم چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی لمبی چوٹی کمر سے نیچے تک جا رہی تھی۔ نو بیاہتا جسم اکیلے پن کی تصویر نظر آتا تھا۔

شانی جلدی سے تابندہ کی طرف گئی۔ خالہ فیروزہ نے لالٹین کی لَو اونچی کی۔ شانی نے تابندہ کو دلاسہ دیا اور دوبارہ چارپائی پر بٹھا دیا۔ تابندہ کچھ دیر بڑبڑاتی رہی پھر ایک آہ بھر کر بستر پر لیٹ گئی۔ شانی نے اس کے اوپر کھیس ڈال دیا۔ خالہ فیروزہ بھی اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گئیں۔ شانی اپنی چارپائی پر آگئی۔ اس نے کروٹ بدل کر اپنا رخ تابندہ کی طرف کر لیا۔ کچھ دیر بعد تابندہ دوبارہ بوجھل سانس لینے لگی۔ وہ سوگئی تھی تاہم نیند کی حالت میں بھی اس کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں تھیں۔ آہنی سلاخوں کے پیچھے چلے جانے والے شوہر کا دکھ اس کی ہر سانس میں سمایا ہوا تھا۔

اچانک ساتھ والے گھر کے ایک حصے سے کوئی بچہ زور سے رو دیا۔ رات کے سناٹے میں اس کی آواز دور تک گئی۔ وہ غالباً چھ سات سالہ بچہ تھا۔ اس کے رونے کی آواز نے شانی کی سوچوں کا رخ کسی اور طرف موڑ ڈالا۔ وہ مُنے کو یاد کرنے لگی لیکن لوگ کہتے ہیں کہ یاد تو اسے کیا جاتا ہے جو بھولا ہوا ہو۔ وہ تو ہر وقت یاد ہی رہتا تھا۔ رستم اور منا، یہ دو ہی تو نام تھے جن کا تعلق شانی کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے تھا۔ وہ توتلی زبان میں اسے ''تاتی'' کہنے والا اپنی معصوم آنکھوں سے اس کے دل کو چھونے والا کہاں تھا؟ کیا کر رہا تھا؟ کس حال میں تھا؟

ایک دم بے شمار سوالات اس کے ذہن پر یلغار کرنے لگے۔ کل اسے خالو اعجاز کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ چوہدری بشیر صحت یاب ہو چکا ہے اور اب اپنی لاہور والی کوٹھی میں ہی مقیم ہے۔ مُنا بھی اس کے ساتھ تھا۔ مُنے کے بارے میں شانی نے کرید کرید کر خالو اعجاز اور خالہ فیروزہ وغیرہ سے پوچھا تھا۔ اسے بس اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ چوہدری کے پاس ہے اور چوہدری کچھ دن پہلے اسے ایبٹ آباد میں اپنے بڑے بھائی ندیم کے پاس لے کر گیا تھا۔ وہاں مُنا بیمار ہو گیا اور چوہدری بشیر کو جلدی واپس لاہور آنا پڑا۔

شانی کا دل مُنے کے لئے رونے لگا۔ اپنے دل پر اس کا بس نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ جھنجھلا کر سوچتی تھی۔ وہ کیا لگتا تھا اس کا؟ وہ کیوں اس کے لئے دیوانی تھی؟ وہ ماں کی محبت سے محروم ہونے والا دنیا کا پہلا بچہ تو نہیں ہے۔ نہ ہی وہ پہلا بچہ ہے جسے باپ کی حقیقی شفقت نہیں ملی پھر وہ اس کا خیال ذہن سے جھٹک کیوں نہیں دیتی۔ وہ بہت کوشش کرتی تھی لیکن اس کے نوخیز جسم کے اندر چھپی ہوئی ہزاروں لاکھوں سال پرانی ''ماں'' اس کی کوئی پیش چلنے نہیں دیتی تھی۔ مُنے کو یاد کرتے ہی اس کی چھاتی میں سنسناہٹ سی ہونے لگتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس کا چہرہ اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لے اور اس کے گرد اپنی بانہوں کا ناقابلِ شکست حصار قائم کر دے۔ ایک دائمی حصار!

☆======☆======☆

یہ ساتویں آٹھویں روز کی بات ہے۔ رات کا وقت تھا، بوندا باندی ہو رہی تھی۔ شانی گھر پر موجود تھی (جب سے وہ واپس آئی تھی گھر سے نکلی ہی نہیں تھی) عارف کمبوہ، ماسٹر انیس اور خالو اعجاز بھی شانی کے ساتھ موجود تھے۔ اطلاع تھی کہ ڈاکٹر بہروز آٹھ دس دن میں جوہر آباد واپس آ رہے ہیں اور ہسپتال کو نئے سرے سے آباد کرنے والے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم بھی یہاں لا رہے ہیں، ان کے ارادے بڑے بلند ہیں۔ یہ پتا چلا کہ ڈاکٹر بہروز شانی سے ملاقات کے بھی شدید خواہش مند ہیں۔ ظاہر تھا کہ وہ اپنی رہائی کے لئے شانی کے بہت احسان مند تھے۔ ڈاکٹر بہروز اور ڈاکٹر زیب النساء نے رہائی کے بعد چوہدری حشام وغیرہ پر کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا۔ دراصل یہ سب کچھ اس معاہدے کا حصہ تھا جو چوہدری حشام اور اس کے بیٹے کی رہائی کے موقع پر کیا گیا تھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محسن کی موت بھی ابھی تک ایک معمہ تھی۔ چوہدریوں کا کہنا یہی تھا کہ اسے حویلی میں سرسام ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے اس کی موت ہوئی۔

شانی، عارف اور چوہدری اعجاز میں بات جاری تھی جب بابا دیناں تیزی سے اندر

داخل ہوا۔ اس نے اپنے داماد چوہدری اعجاز سے مخاطب ہو کر مخصوص لہجے میں کہا۔ ''پتر جی! باہر ایک بندہ آیا ہے۔ دھی شانی سے ملنا چاہتا ہے۔ اپنا نام قیصر شاہ بتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ایک بچہ بھی ہے۔''

''قیصر شاہ؟'' شانی نے حیرت سے زیرلب دہرایا۔

''کیا کھیال ہے۔ اس کو اندر لے آؤں؟'' بابا دیناں نے پوچھا۔

''نہیں چاچا! میں خود جا کر دیکھتا ہوں۔'' عارف کمبوہ نے کہا۔

قریباً چار پانچ منٹ بعد عارف دو افراد کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ شانی نے اپنے سر پر اوڑھنی درست کر لی۔ اندر آنے والوں میں ایک لمبا چوڑا شخص تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی اس کی چادر اس کے کندھوں پر تھی۔ اس کے ساتھ ایک بچہ تھا۔ بارش کے سبب کچھ سردی ہو گئی تھی۔ شاید اسی سردی سے بچنے کے لئے بچے نے سوتی چادر کی بکل مار رکھی تھی اور اسی چادر کو دیہاتی انداز میں منہ سر کے گرد بھی لپیٹ رکھا تھا۔ چادر بارش سے گیلی تھی۔

اچانک شانی کو احساس ہوا کہ نیلے رنگ کی گیلی چادر میں لپٹا ہوا بچہ..... بچہ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں جھما کا سا ہوا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ڈولے کی شکل گھومی۔ عارف کمبوہ بھی چونکتی ہوئی نظروں سے ''بچے نما'' کی طرف دیکھ رہا تھا۔

شانی کو دیکھ کر ''بچے نما'' نے اپنے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ وہ ڈولا تھا۔ شانی اسے دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ خالو اعجاز اور ماسٹر انیس وغیرہ بھی حیران ہوئے لیکن ان کی حیرانی اور شانی کی حیرانی میں فرق تھا۔ شانی کے خیال میں تو ڈولے کو اس وقت ملتان میں کوب اور سنبل وغیرہ کے پاس ہونا چاہئے تھا اور شاید راجو کو بھی وہیں ہونا چاہئے تھا مگر ڈولا حیران کن طور پر یہاں جوہر آباد میں نمودار ہو گیا تھا۔

شانی اٹھی اور ڈولے کو لے کر قریبی کمرے میں آ گئی۔ تاہم اٹھنے سے پہلے اس نے خالو اعجاز، عارف اور انیس کو ہدایت کر دی تھی کہ مہمانوں کی آمد کے بارے میں کسی کو بھنک نہیں پڑنی چاہئے۔

کمرے میں پہنچ کر ڈولے نے بڑی عقیدت سے شانی کو دوبارہ سلام کیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جذبات کی نمی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ''باجی جی! اس کا نام قیصر ہے۔ یہ رشتے میں میرا بھتیجا ہے لیکن دیکھنے میں میرا چاچا لگتا ہے۔''

قیصر نے سر جھکا کر دوبارہ سلام کیا۔ وہ ایک سیدھا سادہ دیہاتی لگتا تھا۔ ڈولے نے

کہا۔''اس کے ساتھ آنے سے مجھے بڑا سہارا ہوا ہے جی۔نہیں تو اس علاقے میں کسی نہ کسی نے مجھے پہچان لینا تھا۔''

''اس وقت کہاں سے آرہے ہو تم؟''شانی نے اپنی حیرت دباتے ہوئے پوچھا۔

جواب دینے سے پہلے ڈولے نے اپنے لمبے تڑنگے بھتیجے کو اشارہ کیا تو وہ باہر چلا گیا۔ ڈولے نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔''شاید آپ کو یقین نہ آئے باجی جی! میں اور قیصر اس وقت سیدھے ملتان سے آرہے ہیں۔''

غالباً ڈولا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔اس کے چہرے پر لمبے سفر کی تھکان تھی۔شانی نے اسے نواڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گئی۔باہر ہلکی بارش بدستور جاری تھی۔ہوا بھی چل رہی تھی۔شانی نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی اچھی طرح بند کردی..... پھر سرگوشی کے انداز میں بولی۔''چھوٹے چوہدری راجو سے ملاقات ہوئی تمہاری؟''

''ہاں باجی! بڑی لمبی چوڑی بات ہوئی۔چوہدری راجو نے مجھے وہ سب کچھ بتایا جو آپ نے اس سے کہا تھا۔مجھے پہلے تو یقین نہیں آیا کہ یہی وہ منڈا ہے جسے ڈھونڈنے کے لئے میں کئی مہینوں سے مخمل خراب ہورہا ہوں۔پر جب اس نے آپ کا حوالہ دیا اور آپ کا چھلا بھی دکھایا تو مجھے کچھ کچھ یقین آیا۔بہرحال جی! یہ سب تو آٹھ نو دن پہلے کی باتیں ہیں۔ اب اس وقت میرے پاس آپ کے لئے کچھ خاص خبر ہے۔''ڈولے کے چھوٹے سے چہرے پر پریشانی کی گہری لکیریں تھیں۔

''راجو تو خیر سے ہے ناں؟''شانی نے پوچھا۔

''ہاں جی۔وہ خیر سے ہے۔پر اس کی وجہ سے بہت گڑبڑ بھی ہوگئی ہے۔معاملہ اتنا خراب ہوگیا ہے کہ وہاں ملتان میں بھی میری سمجھ میں نہیں آیا اور مجھے مجبور ہوکر یہاں آپ کے پاس آنا پڑا۔آپ کو پتا نہیں، کتنی مشکلوں سے میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ہر گھڑی خطرہ تھا کہ کہیں چوہدریوں کا کوئی بندہ مجھے پہچان نہ لے۔''

''ایسی کیا آفت آپڑی ہے؟''شانی نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''آفت ہی سمجھیں جی۔''ڈولے کی آواز بھرا گئی۔''اگر کوئی چھوٹی موٹی بات ہوتی تو میں آپ کے پاس آتا ہی کیوں؟''

''کیا پہیلیاں ہی بوجھواؤ گے؟''

''کوکب کی شادی ہورہی ہے جی..... بس دو تین ہفتے کے اندر۔''

''کس کے ساتھ؟''

''جس کے ساتھ کوکب کی منگنی اس کے ماں پیو نے کی ہے۔راجو کو پتہ چلا تو اس کا بُرا حال ہوگیا ہے۔اتنا رولا ڈولا ہے اس نے کہ بس کچھ نہ پوچھیں۔مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کملا ہوجائے گا یا اپنے آپ کو کچھ کرلے گا۔''

شانی نے اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔''ڈولے، مجھے شروع سے بتاؤ۔اس طرح کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔''

ڈولے نے اپنی آنکھوں سے نمی صاف کرتے ہوئے کہا۔''یہ پچھلے ہفتے کی بات ہے جی! صبح منہ اندھیرے چھوٹے چوہدری راجو نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور چل پڑا۔پہلے ہم گوجرانوالہ پہنچے۔وہاں سے لاہور، لاہور میں کچھ دیر رکنے کے بعد ہمارا سفر پھر شروع ہوا۔ قریباً سات گھنٹے کے سفر کے بعد ہم اگلے روز صبح سویرے ملتان پہنچ گئے۔ہم نے راستے میں ہی یہ پروگرام بنایا کہ پہلے میں اکیلا جاؤں گا اور کوکب کے ابا جی سے ملوں گا۔کوکب اور سنبل کے ابا جی کو میں سیف چاچا کہتا ہوں۔میں ان کی کریانے کی دکان پر پہنچا۔وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔وہ مجھے تقریباً چھ مہینے بعد دیکھ رہے تھے۔انہیں بڑا شکوہ تھا کہ میں انہیں بتائے بغیر خاموشی سے چلا گیا۔وہ میرے بارے میں بہت پریشان رہے تھے۔میں انہیں کیسے بتاتا کہ میں ان کی بیٹی کے لئے ہی ''خوشی'' ڈھونڈنے نکلا ہوا تھا لیکن شاید مجھے کچھ زیادہ ہی دیر ہوگئی تھی۔''بولتے بولتے ڈولے کی آواز بھرا گئی۔

وہ چند سیکنڈ تک خود کو سنبھالتا رہا پھر بولا۔''چاچا سیف سے مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے بڑی اور چھوٹی دونوں بیٹیوں کے رشتے طے کردیئے ہیں۔کچھ دن بعد دونوں کی ایک ساتھ ہی رخصتی ہے۔میں ہکا بکا رہ گیا۔میں نے چاچا سیف سے پوچھا کہ کوکی تو بیمار تھی؟ انہوں نے بتایا کہ اب وہ اچھی ہے۔میں چاچا سیف کے گھر بھی گیا۔وہاں شادی کی تیاری زور وشور سے جاری تھی۔میں نے کوکی کو دیکھا۔اندازہ ہوا کہ چاچا سیف ٹھیک نہیں کہہ رہے تھے۔کوکی اب بھی بیمار ہی نظر آتی تھی۔میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کروں۔راجو کو میں نے بڑے ڈاک خانے کے قریب ایک ہوٹل میں ٹھہرا دیا تھا۔میں راجو کے پاس پہنچا۔وہ میرا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔میں اسے یہ سب کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن چھپا بھی نہیں سکتا تھا۔آخر یہ سوچ کر میں نے راجو کو سب کچھ بتا دیا کہ اگر وہ کوکی کی اس شادی کو روکنے کے لئے کچھ ہاتھ پاؤں مار سکتا ہے تو مارے۔مجھے ہرگز پتا نہیں تھا کہ راجو اتنا جوش دکھائے گا اور ایسی کم عقلی کی بات کرے گا کہ سب کچھ الٹ پلٹ ہوجائے گا۔میں چاہتا تھا کہ راجو کسی طرح کوکی اور سنبل سے ملے اور انہیں بتائے کہ وہ کوکی کو ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچا

ہے لیکن وہ کوکی اور سنبل سے ملنے کے بجائے ان کے ابا جی کے پاس چلا گیا۔ اس نے پہلے تو ان کے ساتھ آرام سے بات کی اور انہیں بتایا کہ وہ اور کوکی ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں اور وہ کوکی کے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن جب چاچا سیف نے طیش سے بات کی تو راجو بھی ہتھے سے اکھڑ گیا۔ اس نے بھی چند سخت باتیں کیں اور چاچا سیف سے کہا کہ وہ یہ شادی نہیں ہونے دے گا۔ وہ کوکی سے محبت کرتا ہے اور اگر کوکی کی ڈولی اٹھی تو ساتھ میں اس کا جنازہ بھی اٹھے گا۔ اسی روز شام کے بعد پتا نہیں کس طرح راجو نے ایک باغ میں کوکی سے ملاقات بھی کر لی۔ اس ملاقات کا پتا مجھے دو تین دن پہلے ہی چلا ہے۔ اس ملاقات میں کوکی نے روتے ہوئے راجو کو بتایا کہ ان دونوں کے راستے ہمیشہ کے لئے الگ ہو رہے ہیں...... اور اس کی شادی لاہور کے ایک امیر شخص سے ہو رہی ہے۔ اس شخص کی پہلی بیوی فوت ہو چکی ہے۔

کوکی سے ملنے اور اس کی باتیں سننے کے بعد راجو کا میٹر کچھ اور گھوم گیا۔ وہ پھر چاچا سیف سے ملا۔ اس نے چاچا کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے یہ شادی نہ روکی تو وہ ان کے گھر کے سامنے اپنے آپ کو کچھ کر ڈالے گا۔ چاچے نے کہا کہ وہ جو کرنا چاہے کر لے لیکن یہ شادی اب نہیں رکے گی۔ راجو ابھی تک وہیں ہوٹل ڈیلیکس میں ہے۔ وہ بہت بپھرا ہوا ہے جی۔ میں نے اسے سمجھانے کی بڑی کوشش کی ہے لیکن وہ کچھ سمجھتا ہی نہیں ہے۔"

"کیا کہا ہے تم نے؟" شانی نے پوچھا۔

"وہی جی...... جو کہنا چاہئے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ محبت صرف پا لینے کا نام ہی نہیں۔ کسی کو کھو کر بھی تو ساری زندگی اس سے محبت کی جا سکتی ہے۔ شاید تم دونوں کی قسمت میں میل نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو ہمیں اتنی دیر نہ ہوتی۔ ہم ڈیڑھ دو مہینے پہلے یہاں پہنچ جاتے۔ اس وقت سب کچھ آسان ہو سکتا تھا لیکن اب جگ ہنسائی اور بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کوکی نے بھی اس سے ایسی ہی باتیں کی تھیں لیکن وہ کسی صورت مانتا نہیں بلکہ مجھے تو لگتا ہے جی کہ میں اسے جتنا سمجھاتا ہوں وہ اتنا ہی ہتھے سے اکھڑتا ہے۔"

"اب وہ اکیلا ہی ہے وہاں؟"

"نہیں باجی جی! اس کا ایک پرانا یار پیجا گجر ہے۔ جب چند مہینے پہلے راجو پاک پتن آیا اور آس پاس کے علاقے میں کوکب کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا، یہ پیجا گجر بھی اس کے ساتھ تھا۔ اب پھر راجو نے پیجا کو وہاں بلا لیا ہے۔ کوکب کے گھر کے سامنے ایک ویڈیو شاپ ہے۔ شاپ میں بیٹھنے والے لڑکے سے راجو اور پیجا نے یاری گانٹھ لی ہے۔ دونوں ہر وقت وہاں بیٹھے

رہتے ہیں۔ راجو نے چاچے سیف کو دھمکی بھی دی ہے [illegible] بھگا کر لے جائے گا۔"

"چاچے سیف نے جواب میں کچھ نہیں کہا؟"

"کہا ہے جی۔ بہت کچھ کہا ہے۔ چاچا سیف بھی اب پہلے [illegible] رہا۔ اس نے چھوٹی بیٹی کا رشتہ اونچی جگہ کیا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے ناں [illegible] پیتا بندہ ہے اور کافی رعب والا بھی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے چاچے کو زیادہ فکر نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ راجو کی کسی بے وقوفی کی وجہ سے کوئی بڑا مسئلہ کھڑا نہ ہو جائے۔ پرسوں رات ایک بجے کے قریب میں نے ایک جیپ چاچے سیف کے گھر کے سامنے کھڑی دیکھی تھی۔ اس وقت راجو اور پیجا ویڈیو شاپ پر موجود تھے۔ سویرے میں نے ہوٹل میں جا کر راجو کو بہت سمجھایا۔ اس کے سامنے ہاتھ بھی جوڑے ہیں لیکن وہ کوئی بات ماننے کو تیار نہیں۔ کہتا ہے کہ یہ شادی نہیں ہونے دے گا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے۔" ڈولے کے لہجے میں ان گنت اندیشے تھے۔

"لیکن تم یہاں کیوں آ گئے؟ تمہیں حالات کو سنبھالنے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔"

"میں نے ہر کوشش کر کے دیکھ لی ہے جی۔ اب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو آپ کے پاس آ گیا ہوں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے باجی! وہاں کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

شانی ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ جب اس نے راجو کو یہاں سے روانہ کیا تو اسے اندیشہ تھا کہ تاؤ حشام کی وجہ سے راجو اور کوکب کے ملاپ میں سخت رکاوٹیں پیدا ہوں گی لیکن یہاں بالکل مختلف صورتِ حال پیش آئی تھی۔ تاؤ حشام سے پہلے خود کوکب کے گھر والے ہی اس ملاپ کی راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے اور رکاوٹ بھی ایسی تھی جو [illegible] کر رہی تھی۔ کوکب کی منگنی ہو چکی تھی اور صرف چند دن بعد اس کی شادی ہو رہی تھی۔

شانی، کوکب سے ملی نہیں تھی...... نہ وہ اس کا مزاج جانتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں [illegible] یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ لڑکی حشام کے بیٹے سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے اور شاید حشام کے بیٹے کے دل میں بھی اس کی محبت کی شدت بہت زیادہ ہے۔ یہ نوعمری کی محبت تھی۔ ایسی محبت، پیار کرنے والوں کو دیوانہ کر کے رکھ دیتی ہے۔

شانی خود بھی تو اپنی زندگی کے ایسے ہی انوکھے موسم سے گزر رہی تھی۔ وہ کوکب اور راجو کی کیفیات کو بڑی اچھی طرح محسوس کر سکتی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے ڈولے! اس مسئلے کا کیا حل ہو سکتا ہے؟"

ڈولے نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنے بالوں میں پھیرا اور غم زدہ لہجے میں بولا۔ ''باجی! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ سنبل اور کوکب کی شادی طے ہو چکی ہے۔ اب واویلا کرنے سے بدنامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ راجو کو کنٹرول کرنے کا ایک ہی طریقہ میری سمجھ میں آتا ہے۔ اس کے گھر والوں کو اطلاع دے دی جائے۔ چوہدری حشام بڑا سخت بندہ ہے وہ کسی نہ کسی طرح اپنے بیٹے کو سنبھال ہی لے گا۔''

''تم کہہ رہے ہو کہ راجو غم سے بے حال ہے۔ الٹی سیدھی باتیں کر رہا ہے۔ اگر اس پر زیادہ سختی ہوئی تو اس کی مایوسی مزید بڑھ جائے گی۔ ایسے میں وہ کوئی خطرناک قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پھر سے اپنے پرانے طور طریقوں کی طرف لوٹ جائے۔ تم نے تو اسے حویلی میں دیکھا ہی تھا۔ وہ کس طرح نشے میں غرق تھا اور عورتوں کے چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ پھر اس دلدل میں جا گرے۔''

''اس لئے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ پتا نہیں کہ یہ آپ کو ٹھیک لگے یا نہیں لیکن میری دلی خواہش یہی ہے کہ کسی طرح آپ راجو سے ملیں۔ اس سے بات کریں۔ مجھے یقین ہے کہ جتنی اچھی طرح اسے آپ سمجھا سکتی ہیں کوئی اور نہیں سمجھا سکتا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں اسے سنبھالنے کے لئے یہاں سے ملتان جاؤں؟'' شانی نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں باجی، میں یہ تو نہیں کہہ رہا لیکن اگر ہمیں راجو کو کسی بڑے حادثے سے بچانا ہے تو پھر آپ کو راجو سے بات کرنے کا کوئی طریقہ ڈھونڈنا پڑے گا۔ دیکھیں مجھ پر اور آپ پر زیادہ ذمے داری آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری وجہ سے ہی یہ معاملہ آگے بڑھا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں باجی۔''

''ہاں۔ کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو لیکن یہ جو کچھ ہوا ہے بے خبری میں ہوا ہے۔ اگر مجھے پہلے پتا چل جاتا کہ کوکب کی شادی تین چار ہفتوں میں ہونے والی ہے تو میں راجو کو تمہارے اور کوکب کے بارے میں کیوں بتاتی۔''

''شاید اسی کو قسمت کا چکر کہتے ہیں جی۔''

رات کو شانی دیر تک جاگتی رہی اور اس نئے بکھیڑے کے بارے میں سوچتی رہی۔ شاید ڈولا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ڈولے اور شانی پر اس معاملے کی بہت زیادہ ذمے داری عائد ہوتی تھی۔ وہی دونوں اس سوئے ہوئے مسئلے کو پھر سے جگانے والے تھے۔ اب یہ مسئلہ نہ صرف جاگا تھا بلکہ ایک دم ہی بہت گھمبیر ہو گیا تھا۔ ڈولے کی تفصیلی گفتگو سننے کے بعد نہ جانے کیوں

شانی کے دل سے بھی یہ آواز آنے لگی تھی کہ اگر اس معاملے کو سنبھالنے کی کوشش نہ کی گئی تو پھر کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔

دراصل یہ سارا معاملہ بُری طرح بگڑ چکا تھا۔ شانی کی معلومات کے مطابق جب پاک پتن میں دو چار ہفتوں کے اندر کوکب اور راجو کا طوفانی عشق پروان چڑھا تھا تو سیف نے راجو کے ساتھ زیادہ سختی نہیں کی تھی۔ تب سیف نے راجو سے کہا تھا کہ اگر وہ کوکب سے واقعی شادی کرنا چاہتا ہے تو پھر اپنے ماں باپ کو لائے اور اس بارے میں ڈھنگ سے بات کرے لیکن جب راجو کے بزرگ اس معاملے میں آئے تھے تو ایک دم سب کچھ تہس نہس ہو گیا تھا۔ چوہدری حشام سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کریانہ فروش سیف جیسے کسی شخص سے اپنا رشتہ جوڑے۔ کوکب جیسی لڑکی اس کے بیٹے کی تنہائی کا کھلونا تو بن سکتی تھی، اس کی بیوی نہیں۔ وہ تو اپنے سے کسی بڑے چوہدری کے ساتھ ناتا جوڑنا چاہتا تھا۔ جس کی بیٹی مربعوں کے حساب سے زمین اپنے جہیز میں لے کر آئے اور جس کو بہو بنا کر حشام کی پگڑی کا شملہ مزید چند انچ اونچا ہو جائے۔ وہ کریانہ فروش کی بیٹی کے لئے اپنے بیٹے کی بات کیسے مان سکتا تھا۔ اس نے وہی کچھ کیا تھا جو ایسے موقعوں پر حشام جیسے ہٹ دھرم لوگ کرتے ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کو میانہ میں چھوڑ کر خاموشی سے واپس پاک پتن آیا۔ اس نے سیف کو بُری طرح ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ وہ اپنی بیٹی کو لے کر کہیں روپوش ہو جائے ورنہ بیٹی کی عزت اور جان دونوں سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

سیف جیسا سفید پوش حشام جیسے کرخت چوہدری کا دباؤ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ وہ اپنی فیملی سمیت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ملتان میں آ چھپا تھا لیکن اب ڈولے کی کوششوں کے سبب وہ ایک بار پھر چھوٹے چوہدری (راجو) کے روبرو تھا۔ ڈولے بے چارے نے تو جو کچھ کیا، اچھی نیت سے کیا تھا..... اور ایسا کرتے ہوئے بہت سی تکلیفیں بھی اٹھائی تھیں لیکن اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلا تھا۔ سب کچھ تہس نہس ہوتا نظر آ رہا تھا۔ سیف کو اپنی بے عزتی اور تذلیل یاد تھی جو چوہدری حشام کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اب اس نے اپنی بیٹی کے لئے ایک خوش حال اور بارسوخ خاوند ڈھونڈا تھا اور اب وہ چھوٹے چوہدری یا بڑے چوہدری کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔

شانی کے دل میں کوکب اور راجو کے لئے عجیب سا درد جاگ اٹھا..... ہاں شانی کے سینے میں ایسا دل تھا جو کسی کی ذرا سی تکلیف محسوس کر کے تڑپ اٹھتا تھا..... اور دل کے اس تڑپنے میں اپنے پرائے کی تشخیص بھی نہیں تھی۔ کبھی کبھی تو وہ اس معاملے میں بے وقوفی کی حد تک

آگے بڑھ جاتی تھی۔ وہ خود کو سمجھاتی تھی، سنبھالتی تھی۔ بے جا کے اضطراب سے باز رکھنے کی کوشش کرتی تھی لیکن کچھ بھی اس کے بس میں نہیں رہتا تھا۔ وہ ایک تند ریلے میں بہہ جاتی تھی اور اس کی فطرت اسے بہاتی چلی جاتی تھی۔

☆======☆======☆

اگلے روز شانی، ڈولے اور اس کے بھتیجے قیصر شاہ کے ساتھ ایک تانگے پر سوار میانہ کی طرف جا رہی تھی۔ عارف کمبوہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ رات کے نو بجے کا عمل تھا۔ شانی شام ہوتے ہی بڑی رازداری کے ساتھ جوہرآباد سے نکل آئی تھی۔ اس نے ایک بوسیدہ سا برقع اوڑھ رکھا تھا۔ پاؤں میں ٹوٹی پھوٹی جوتی تھی۔ جوہرآباد سے اس کی روانگی کا علم صرف خالو اعجاز اور خالہ فیروزہ کو تھا۔ جوہرآباد سے نکل کر انہوں نے تین چار میل پیدل سفر کیا تھا پھر ایک تانگے پر سوار ہو گئے تھے۔ اب یہ تانگہ ایک طویل سفر کے بعد انہیں نہر پر پہنچانے والا تھا۔ وہاں سے انہیں دوسرا تانگا لینا تھا یا کسی ٹریکٹر ٹرالی وغیرہ کی مدد حاصل کرنا تھی اور پکی سڑک تک پہنچنا تھا۔

رات تقریباً بارہ بجے کے قریب وہ نہر پر پہنچے۔ یہاں انہوں نے دو تین گھنٹے ایک چھوٹے سے دیہاتی چائے خانے پر گزارے۔ یہاں وی سی آر پر پاکستانی فلم لگی تھی اور اکا دکا مسافر آ جا رہے تھے۔ صبح تین بجے کے قریب انہیں ایک ایسا تانگا مل گیا جو انہیں پختہ سڑک تک پہنچا سکتا تھا۔ شانی اور ڈولا تانگے کی پچھلی نشست پر موجود تھے۔ عارف کمبوہ اور قیصر آگے تھے۔ عارف کمبوہ کی قمیص کے نیچے بھرا ہوا پستول اور کئی درجن گولیاں موجود تھیں۔ یہ لائسنسی اسلحہ تھا۔ اگر عارف ساتھ نہ ہوتا تو شانی رات کے وقت اس خطرناک علاقے میں سفر نہ کر سکتی۔ عارف ایک مضبوط شخص تھا اور اس کے ہوتے ہوئے شانی کو تسلی رہتی تھی۔

وہ تقریباً دس بجے کے بعد گوجرانوالہ پہنچ سکے۔ شانی کو لگا جیسے وہ ایک عرصے کے بعد کسی شہر کا ٹریفک اور گہما گہمی دیکھ رہی ہے۔ گوجرانوالہ کے گلی کوچے دیکھ کر اسے کئی بھولی بسری باتیں یاد آ گئی تھیں۔ کبھی کبھار وہ اپنے ابا جی اور بھائی وغیرہ کے ساتھ رنگ والی کی کچی گلیوں سے نکل کر یہاں گوجرانوالہ آیا کرتی تھی۔ تب اسے یہ شہر ایک بہت بڑی دنیا لگتا تھا لیکن اب وہ اس سے بڑے بڑے شہر راولپنڈی اور لاہور وغیرہ دیکھ چکی تھی۔ اب گوجرانوالہ اس کے لئے ''بہت بڑی دنیا'' نہیں تھا۔

یہاں سے وہ بس میں بیٹھ کر لاہور روانہ ہوئے۔ ڈولا شانی کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے سر سے نیلی چادر ہٹا دی تھی۔ عارف اور قیصر کو بس کے اگلے حصے میں نشست ملی

تھی۔ ڈولے نے شانی سے پوچھا۔ ''یہ عارف صاحب کیا کرتے ہیں؟''

''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''بس یونہی۔ ان کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی اسٹوڈنٹ لیڈر ہوں۔ بڑے زور سے بات کرتے ہیں اور ان کی بات میں اثر بھی ہوتا ہے۔''

''بس سمجھو کہ یہ اپنے علاقے کا لیڈر ہی ہے۔ یہ ڈاکٹر بہروز کے خاص ساتھیوں میں سے ہے۔ یہ لوگ مل جل کر علاقے میں نئی روشنی لانا چاہتے ہیں۔ چوہدراہٹ کا اثر کم کرنا چاہتے ہیں۔''

''آپ نے عارف صاحب کو کیا بتایا ہے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم بے فکر رہو۔''

''میرے دل میں بڑی امید پیدا ہو گئی ہے باجی جی۔ مجھے لگ رہا ہے کہ آپ اور عارف مل کر اس معاملے کو سنبھال لیں گے۔''

''بس تم دعا کرو۔'' شانی نے کہا۔

چند لمحے کے توقف کے بعد ڈولے نے شانی سے پوچھا۔ ''آپ نے اپنے آنے کے متعلق گھر میں کیا بتایا ہے؟''

''گھر میں صرف خالو اور خالہ کو اصل بات کا پتا ہے۔ باقیوں کو یہی معلوم ہے کہ میں جمشید سے ملنے گوجرانوالہ جیل آئی ہوں۔''

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں بس لاہور میں بادامی باغ کے وسیع و عریض اڈے پر پہنچ گئی۔ یہاں سے انہیں ملتان کی بس پکڑنا تھی۔ معلوم ہوا کہ ملتان کے لئے اگلی ایکسپریس بس کچھ لیٹ ہے اور دو گھنٹے بعد روانہ ہوگی۔ وہ انتظارگاہ میں آ بیٹھے۔ اس بس سٹینڈ کے اردگرد وسیع و عریض لاہور پھیلا ہوا تھا۔ ایک عظیم الشان شہر، سینکڑوں شاہراہیں، ہزاروں گلیاں، ان گنت گھر، شانی کا دھیان آپ ہی آپ لاہور کے نواح میں واقع اس گھر کی طرف چلا گیا جہاں ایک بہت بڑی چار دیواری میں چوہدری بشیر رہتا تھا اور چوہدری بشیر کے ساتھ مُنا بھی رہتا تھا۔ اس کو توتلی زبان میں تاتی کہنے والا اور اس کی گود کو ماں کی گود سمجھنے والا۔

ایک عجیب سی بے تابی شانی کے رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ اسے لگا کہ اس کا دل اندر سے رو رہا ہے۔ وہ مُنے کے شہر سے ہو کر گزر رہی تھی، مُنے سے ملے بغیر۔ وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر اس کے اندر سے ایک عجیب لہر اٹھی اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں جا رہی ہو بہن؟'' عارف نے پوچھا۔

''کہیں نہیں۔بس ایک فون کرنا ہے۔'' شانی نے کہا اور انتظار گاہ سے باہر نکل آئی۔

سامنے ہی ایک پی سی او تھا۔ ماحول پُرسکون تھا، کیبن بنے ہوئے تھے۔

شانی کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ ایک کیبن میں چلی گئی۔ اس کے شولڈر بیگ میں کوئنی کے دونوں نمبر موجود تھے۔ ان میں سے ایک چوہدری بشیر کے بیڈ روم کا تھا، دوسرا کامن روم کا۔ اب شام ہونے والی تھی۔ شانی جانتی تھی عموماً اس وقت چوہدری بشیر فیکٹری سے گھر آجاتا ہے۔ اس نے تصوّر کی نگاہ سے دیکھا۔ وہ کپڑے بدل کر کامن روم کے نیلے صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا ہے۔ ماسی فردوس، زہرا یا کوئی اور نوکرانی اس کے لئے چائے بنا رہی ہے۔ مُنا ڈرا سہما سا ایک طرف لیٹا ہے۔ مُنے کی صورت نگاہوں میں گھومتے ہی شانی کا تذبذب ختم ہوگیا۔ اس نے دو تین گہری سانسیں لیں۔ پھر لرزاں انگلیوں کے ساتھ چوہدری بشیر کی رہائش گاہ کا نمبر پریس کیا۔ پہلی دو تین کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں۔ شانی نے دوسرے نمبر پر ٹرائی کی۔ دوسری طرف چند سیکنڈ تک گھنٹی بجی پھر ایک ایسی آواز شانی کے کانوں سے ٹکرائی جس نے اسے سرتاپا محبت اور خوشی سے معمور کر دیا۔ اسے لگا جیسے اس کے جسم کا ہر ذرہ جی اٹھا ہے۔ یہ مُنا تھا۔ اس کی معصوم آواز ابھری۔ ''ہیلو کون؟ کون بول رہا ہے جی؟''

شانی کا دل چاہا، وہ اسے پکارے۔ اسے بتائے کہ وہ کون بول رہی ہے لیکن وہ ایسا کر کے اس معصوم کو کسی ہیجان میں مبتلا نہیں کر سکتی تھی۔ ''ہیلو، آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟'' معصوم آواز پھر اُبھری۔

شانی نے اپنی سسکی ضبط کرنے کے لئے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ اچانک ریسیور مُنے کے ہاتھ سے لے لیا گیا۔ ایک بھاری بھرکم آواز ابھری۔ ''ہیلو کون؟''

یہ چوہدری بشیر کی آواز تھی۔ وہ اس آواز کو کیسے بھول سکتی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس نے شانی کو بہت سی مصیبتوں سے بچایا تھا اور بدلے میں بہت سی نئی مصیبتیں شانی کی جھولی میں ڈالی تھیں۔ اس نے شانی پر احسان کئے تھے لیکن ہر احسان کو ایک جبر سے نتھی کر دیا تھا۔ اس کی بارعب آواز سنتے ہی شانی کو اپنے چہرے پر نہایت ناپسندیدہ ہونٹوں کا لمس محسوس ہوا اور اس کا دل کراہت سے بھر گیا۔

''ہیلو کون بول رہا ہے؟'' اس مرتبہ چوہدری نے نسبتاً بلند اور کرخت آواز میں پوچھا۔

شانی اب بھی خاموش رہی۔ ریسیور زور سے کریڈل پر پٹخ دیا گیا۔

شانی ریسیور کان سے لگائے اپنے آنسو پونچھتی رہی۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔ چند سیکنڈ

بعد اس نے ایک بار پھر ہمت کی اور چوہدری بشیر کے نمبر پریس کئے۔ ایک دو سیکنڈ بعد دوبارہ چوہدری بشیر کی آواز ابھری۔ ''ہیلو..... کون؟''

شانی خاموش رہی۔ تاہم وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے چند سیکنڈ مزید بات نہ کی تو چوہدری حسب عادت فون بند کر کے ریسیور کریڈل پر سے اٹھا دے گا۔ وہ ہمت کر کے بولی۔ ''ہیلو میں..... میں شانی..... بات کر رہی ہوں۔''

دوسری طرف سناٹا چھا گیا۔ بس چوہدری کی بوجھل سانسیں سنائی دیتی رہیں۔ چند سیکنڈ بعد چوہدری نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا۔ کیا واقعی یہ تم ہو؟''

''ہاں..... میں شانی ہوں۔'' وہ سسک کر بولی۔

''آج کیسے یاد کر لیا تم نے؟'' چوہدری کی آواز میں شدید طنز تھا۔

''میں جانتی ہوں آپ کو مجھ سے بہت سی شکایتیں ہیں۔ یقیناً ان میں سے بہت سی شکایتیں ٹھیک بھی ہوں گی لیکن آپ دیکھ ہی رہے ہیں جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا ہے۔''

''ہاں سب کچھ اس کے بس میں چلا گیا ہے..... جس کے بس میں تم خود چلی گئی ہو۔'' بشیر کے لہجے میں زہر تھا۔

''جج..... جی؟ میں سمجھی نہیں!''

''اب میں اس سمجھنے سمجھانے والی کیا بات ہے۔ کٹھولی کے میلے والے قصے کے بعد ساری دنیا جانتی ہے کہ چوہدری ارشاد کی شرماں والی دھی رانی کس قاتل ڈکیت کے بس میں ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے۔''

''خدا کے لئے چوہدری صاحب، میں پہلے ہی زخمی ہوں، مجھے اور زخمی نہ کریں۔''

''میں زخمی کہاں کر رہا ہوں، زخمی تو تم نے کیا ہے، ہم دونوں باپ بیٹے کو اور اتنی بے دردی سے کہ اس کی مثال نہیں دی جا سکتی ہے۔''

''مم..... میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میں نے.....''

''ہاں تم نے کچھ نہیں کیا ہے لیکن تمہارے کمرے سے ملنے والی وہ گولیاں اس ڈکیت رستم کے پستول کی تھیں۔ تم نے کچھ نہیں کیا ہے لیکن تمہارے سامان سے ملنے والا وہ موبائل سیٹ بھی رستم سے گپ شپ کرنے کے کام آتا تھا۔ تم نے میرے گھر میں رہ کر میرے گھر میں نقب لگائی ہے شانی۔ میرے پاس پورے ثبوت موجود ہیں۔ تم نے کھلی دغابازی کی

ہے۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا چوہدری، کبھی موقع ملا آپ کو بتاؤں گی۔ اب تو بس ایک درخواست کرنے کے لئے فون کیا ہے۔''

''کوئی اور زخم لگانا ہے؟'' چوہدری کی آواز میں درد تھا۔

شانی چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''مجھے ایک دفعہ مُنے سے ملا دیجئے۔ بس ایک دفعہ اسے بس دو چار دن کے لئے میرے پاس چھوڑ جائیں۔ میرا وعدہ ہے کہ میں اسے خود آپ کے پاس واپس پہنچاؤں گی۔''

''نہیں شانی! اب بس ہمیں معاف ہی کر دو تو بہتر ہے۔ میں نے اپنے بچے کو بڑی مشکلوں سے سنبھالا ہے۔ اب وہ تم سے دور رہے تو بہتر ہے۔''

''میں بھی شاید یہی چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے دور رہے لیکن اسے اس طرح تو مجھ سے جدا نہ کریں۔ اس طرح کرنے سے وہ اپنے آپ میں ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ میں دو تین ملاقاتوں میں خود ہی اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ پیدا کر لوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

''فاصلہ پیدا ہو چکا ہے۔'' بشیر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''مناتمہارے بغیر جینا سیکھ رہا ہے۔''

''آپ صحیح نہیں کہہ رہے..... میں جانتی ہوں..... میں نے ابھی اس کی آواز سنی ہے۔ مجھے اس کی آواز بتا دیتی ہے کہ وہ کتنا دکھی یا کتنا خوش ہے۔''

''تم نے میری آواز بھی تو سنی ہے۔ میری آواز تمہیں کیا بتاتی ہے؟'' چوہدری بشیر کے لہجے میں زہریلی کاٹ تھی۔

شانی سسکنے لگی۔ دوسری طرف چوہدری یکسر خاموش تھا۔ آخر شانی نے کراہ کر کہا۔ ''اچھا مجھے اس کی آواز ہی سنا دیں۔''

''میں نرا کھوتا نہیں ہوں۔ تھوڑی بہت عقل اللہ نے مجھے بھی دی ہوئی ہے۔ تم اپنی آواز سنا کر اس کے اور میرے سکون کو پھر سے برباد کرنا چاہتی ہو۔''

''نہیں..... میں نہیں بولوں گی۔ بس اس کی آواز سنوں گی۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''سوری۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔ میں اس کے لئے پورا سیٹ اَپ بنا رہا ہوں۔ اس کے لئے اس گھر کو پھر سے آباد کر رہا ہوں۔ بس تم اور تمہاری بے رحمی اب ہم باپ بیٹے سے دور رہیں۔''

اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا گیا۔

شانی جب انتظار گاہ میں واپس پہنچی تو اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔

''کیا بات ہے باجی جی! آپ کی آنکھیں.....'' ڈولے نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ اُدھر بسوں کا دھواں بہت زیادہ تھا۔'' شانی نے بات بنائی اور ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ مُنے کی صدا اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ چوہدری کی آواز بھی۔ اس نے کہا تھا، میں اس گھر کو پھر سے آباد کر رہا ہوں۔ پتا نہیں اس سے چوہدری کا کیا مطلب تھا۔

☆======☆======☆

وہ لوگ رات بارہ بجے کے قریب ملتان پہنچے۔ یہاں انہوں نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں قیام کیا۔ ڈولے کے بیان کے مطابق یہ جگہ ہوٹل ڈیلیکس سے زیادہ دور نہیں تھی۔ راجو اور اس کا دوست پیجا گجر ہوٹل ڈیلیکس میں ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے دو کمرے لئے۔ ایک میں شانی ٹھہری تھی۔ دوسرے میں ڈولا اور عارف کمبوہ۔ قیصر اپنے گھر واپس چلا گیا تھا۔

شانی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی اور آئندہ حالات کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ راجو اس کی بات مانے گا یا نہیں۔ اسی طرح اسے سیف کے رویے کے بارے میں بھی کچھ اندازہ نہیں تھا۔ رات آخری پہر وہ سو گئی۔ صبح وہ قدرے دیر سے اٹھی۔ اسے ڈولے نے جگایا تھا۔ زوردار دستک کی آواز سن کر شانی ہڑبڑاتی ہوئی بستر سے نیچے اُتر آئی۔ اس نے دروازہ کھولا، ڈولے کے چہرے پر ہیجان کے آثار تھے۔ ''باجی! وہاں چاچے سیف کے گھر کے سامنے جھگڑا ہوا ہے۔''

''کس کا جھگڑا؟''

''تین بندوں نے راجو کو بُری طرح مارا ہے اور گاڑی میں ڈال کر کہیں لے گئے ہیں۔ ابھی قیصر نے آ کر مجھے بتایا ہے۔''

''یا اللہ خیر۔'' شانی کے چہرے پر گہری تشویش امڈ آئی۔ پھر وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ ''راجو کا دوست پیجا اس کے ساتھ نہیں تھا؟''

''نہیں جی۔'' قیصر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''وہ دو دن سے راجو کے ساتھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید کہیں گیا ہوا ہے۔ آپ جلدی چلیں جی۔ پتا نہیں وہ لوگ اسے کہاں لے گئے ہیں۔ کہیں اس کی جان ہی نہ لے لیں۔''

''وہ تھے کون؟'' شانی نے پوچھا۔

''ان میں سے ایک کو کب کا ماما خلیل ہے۔ دو بندے باہر کے تھے۔ وہ جیپ پر آئے تھے۔ اسی جیپ پر لے گئے ہیں راجو کو۔'' ڈولے نے جواب دیا۔

''عارف کو جگاؤ۔'' شانی نے ڈولے سے کہا۔

دو منٹ بعد عارف بھی اس کے سامنے تھا۔ شانی نے اسے ساری صورتِ حال بتائی۔ وہ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ قیصر نے ٹیکسی رکوائی اور وہ چاروں اس میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی تیزی سے حیات کالونی میں واقع کریانہ فروش سیف کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

راستے میں قیصر نے بتایا کہ پرسوں رات بھی راجو اور کوکی کے ماموں خلیل میں تلخ کلامی ہوئی تھی۔ خلیل نے راجو کو بُرا بھلا کہا تھا اور دھمکی دی تھی کہ اب وہ ویڈیو کی دکان پر بیٹھا نظر نہ آئے ورنہ وہ اس کے ہاتھ پاؤں توڑ دے گا۔ راجو نے کہا تھا وہ کسی کو تنگ نہیں کرتا، صرف یہاں بیٹھتا ہے اور اسے بیٹھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ کل سویرے چاچے سیف اللہ نے اینٹیں لگوا کر چھت کی منڈیر اونچی کروادی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید کوکی بھی راجو کو دیکھنے کے لئے چھت پر آتی تھی۔

ٹیکسی نے ابھی ڈیڑھ دو کلومیٹر ہی طے کئے ہوں گے کہ سامنے سے آنے والے ایک موٹر سائیکل سوار نے ٹیکسی میں ڈولے کو پہچان لیا اور ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ یہ نوجوان قیصر کا دوست تھا۔ اس نے قیصر اور ڈولے وغیرہ کو بتایا کہ راجو کا پتا چل گیا ہے۔

تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''میں تھانے جارہا تھا کہ شاید وہ لوگ اسے تھانے لے گئے ہوں۔ راستے میں شہاب فیکٹری کے ساتھ درختوں میں کچھ بندے جمع تھے۔ مجھے شک گزرا۔ میں نے رک کر دیکھا تو وہ راجو تھا۔ اس کے ناک منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک حاجی صاحب اسے گرم دودھ پلا رہے تھے۔ اب بھی وہ وہیں ہے۔ میں حاجی صاحب سے کہہ کر آیا ہوں کہ اس کا خیال رکھیں۔ میں ابھی دس پندرہ منٹ میں واپس آرہا ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ اسے مارکوٹ کر وہاں پھینک گئے ہیں۔'' عارف کمبوہ نے کہا۔

''بالکل جی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ سر پر بھی چوٹ آئی ہے۔ پتلی حالت ہے وچارے کی۔'' قیصر کے دوست نے کہا۔

ٹیکسی کا رخ فوراً شہاب فیکٹری کی طرف موڑ دیا گیا۔ ٹیکسی کو گنجان علاقے سے نکل کر کھلی سڑک تک پہنچے میں بیس پچیس منٹ لگ گئے۔ یہ صبح کا وقت تھا، دفتروں اور سکولوں

کالجوں کی طرف بھاگنے والوں کا رش تھا۔ وہ ٹریفک کے ازدھام سے بمشکل نکل کر بڑی سڑک پر آئے اور شہاب فیکٹری کی طرف روانہ ہوگئے۔ قیصر کا دوست نذیر بھائی اپنی موٹر سائیکل پر ٹیکسی کے آگے تھا۔

وہ لوگ موقع پر پہنچے۔ فیکٹری کے ساتھ کچھ خالی پلاٹ تھے اور درخت وغیرہ نظر آرہے تھے۔ دو تین کھوکھا نما دکانیں بھی تھیں۔ ایسی ہی ایک دکان پر ایک سفید ریش حاجی صاحب اور دو تین مزید افراد بیٹھے تھے۔ راجو کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ قیصر کے دوست نذیر نے حاجی صاحب سے راجو کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا۔ ''اسے روکنے کی بڑی کوشش کی پر وہ رکا ہی نہیں۔ کہتا تھا میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے کہا ابھی تمہارے یار بیلی آتے ہیں، تمہیں گاڑی میں بٹھا کر لے جائیں گے پر وہ نہیں مانا۔ ایک ویگن والے کو ہاتھ دے کر روکا اور بیٹھ کر نکل گیا۔''

''ویسے وہ ٹھیک تھا۔ پریشانی کی بات نہیں ہے۔'' ایک دوسرے بزرگ نے کہا۔ ''اس کے سر کا خون بند ہوگیا تھا۔ کہہ رہا تھا میں تھانے جارہا ہوں۔''

''کہاں گیا ہوگا؟'' شانی نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

''کہیں تھانے ہی نہ چلا گیا ہو۔'' ڈولے نے سرگوشی کی۔

''یا پھر واپس ہوٹل؟'' قیصر نے کہا۔

شانی نے اپنے برقع کا نقاب درست کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو ڑرگ رہا ہے۔ کہیں وہ پھر سیف کے گھر نہ چلا گیا ہو۔''

عارف نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

وہ چاروں ایک بار پھر لپک کر ٹیکسی میں بیٹھے اور ٹیکسی حیات کالونی کی طرف روانہ ہوگئی۔

''ذرا تیز چلو ڈرائیور۔'' شانی نے اضطرابی کیفیت میں کہا۔

ڈرائیور نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ شانی کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ صورتِ حال سنگین ہوتی جارہی تھی۔ غالب گمان یہی تھا کہ جیپ والے افراد اسی بااثر شخص کے کارندے تھے جس کے ساتھ کوکی کی شادی طے ہوئی تھی۔

ٹیکسی حیات کالونی میں داخل ہوئی اور ایک چھوٹی گلی میں پہنچ کر رک گئی۔ شانی کو سامنے ہی سیف اللہ کا مکان نظر آگیا۔ اس کی نشانی یہ تھی کہ چھت کی تین فٹ اونچی منڈیر پر تازہ تازہ کچھ اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک دم شانی کا دل بے طرح دھڑک اٹھا۔ ڈولے اور

قیصر وغیرہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ دور گلی کے آخری سرے پر لوگوں کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ پروگرام کے مطابق ڈولا اور قیصر وہیں پر ٹیکسی سے اُتر گئے۔ وہ دونوں یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کہ شانی وغیرہ کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ انہیں اتارنے کے بعد ٹیکسی آگے بڑھی اور سیدھی ہجوم کے قریب جا کر رک گئی۔ شانی اور عارف کمبوہ باہر نکلے...... منظر سنسنی خیز تھا۔ دو ہٹے کٹے افراد راجو پر جھپٹ رہے تھے۔ محلے کے ایک دو افراد انہیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں افراد راجو کو بے رحمی سے مارنے لگے۔ راجو جو پہلے ہی زخمی تھا، زمین پر گر پڑا۔ اس کے جسم پر لباس دھجیوں کی صورت میں تھا، اب یہ لباس اور بھی تار تار ہو گیا۔

عارف نے سوالیہ نظروں سے شانی کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے حملہ آوروں کی طرف بڑھا۔ شانی کا خوف بھی چھوٹی چوہدرانی کی دلیر فطرت کے عقب میں اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ بھی اپنے سر اور چہرے کو برقع سے آزاد کرتی ہوئی عارف کے پیچھے لپکی۔ راجو سے چمٹے ہوئے ایک حملہ آور کو عارف نے دبوچا اور جھٹکے سے دور پھینک دیا۔ دوسرے شخص نے پلٹ کر عارف کو مکا رسید کرنا چاہا۔ قد آور عارف نے ایک طرف جھک کر خود کو بچایا، پھر اس کی زوردار لات مدِمقابل کے سینے پر لگی۔ وہ ڈکراتا ہوا وڈیو شاپ کے اندر گرا اور اس کے شوکیس کو چکنا چُور کر دیا۔ وڈیو شاپ کی حالت پہلے ہی بہت ابتر ہو رہی تھی۔

ایک حملہ آور نے عقب سے عارف کے سر پر ہاکی رسید کرنا چاہی۔ شانی چیل کی طرح جھپٹی اور راس کے سامنے آ گئی۔ اس شخص کی اٹھی ہوئی لاٹھی شانی نے اپنی گرفت میں لے لی اور چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف عارف اپنے دونوں حریفوں کو ٹھیک ٹھاک ضربیں لگا چکا تھا۔ وہ بے حد مشتعل نظر آ رہا تھا۔ پھر اچانک اس نے اپنی قمیص کے نیچے سے بھرا ہوا پستول نکال لیا۔ اس کی دلیر آواز شانی کے کانوں میں پڑی۔ ''خبردار پیچھے ہٹ جاؤ۔ جان سے مار دوں گا۔'' وہ حملہ آوروں کو وارننگ دے رہا تھا۔

دوسری طرف ہاکی بردار اور شانی میں زور آزمائی بدستور جاری تھی۔ ہاکی پر شانی کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ ہاکی بردار اپنے ہی زور میں پشت کے بل زمین پر گر گیا۔ شانی نے اس کے منہ پر ٹھوکر رسید کر کے ہاکی چھین لی۔ وہ طیش سے پھنکاری۔ ''کیا سمجھ رکھا ہے تم نے، وہ اکیلا ہے...... بے سہارا ہے۔ تم جو چاہو اس کے ساتھ کر سکتے ہو۔'' اس نے ہاکی دور پھینک دی۔

حملہ آوروں کو شاید اچانک اور اتنی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ وہ دور ہٹ گئے

تھے۔ عاف کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا پستول خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا یہ پستول کسی بھی وقت شعلہ اگل کر کسی کو موت کے سفر پر روانہ کر سکتا ہے۔ محلے کے کچھ معززین نے عارف کو گھیر لیا تھا اور اس سے درخواست کر رہے تھے وہ فائر نہ کرے۔

یکایک شانی کی نگاہ راجو پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ وہ وڈیو شاپ کے بکھرے ہوئے شیشوں کے اوپر پڑا تھا۔ اس کا زخمی سر ایک دیوار سے ٹکا ہوا تھا۔ اس کا ریشمی کڑھائی والا کرتہ تار تار ہو کر اس کے جسم سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ اس کی بنیان بھی پھٹی ہوئی تھی۔ اس کے اکھرے جسم پر کئی ضربات نظر آ رہی تھیں۔

شانی نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا۔ اس کا زخمی سر اپنی گود میں رکھا۔ ''راجو اٹھ جاؤ۔ اٹھ کر بیٹھ جاؤ، شاباش۔'' شانی نے اسے ہمت دلائی...... لیکن پھر اچانک اس کے جسم میں کرب ناک سنسناہٹ دوڑ گئی۔ راجو کو صرف ضربات کا صدمہ ہی نہیں تھا، اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہو چکا تھا۔ کیا ہوا تھا؟ اس کی حالت کیوں غیر ہو رہی تھی؟ ایک ساتھ کئی سوال شانی کے ذہن میں ابھرے۔

اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے راجو کی ٹھوڑی تھامی اور چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں اوپر کی طرف جا رہی تھیں۔ اس کی ایک باچھ کے قریب شانی کو جھاگ کے بلبلے سے دکھائی دیئے۔

''راجو کیا ہوا ہے؟ کیا کیا ہے تم نے؟'' اس نے راجو کو جھنجھوڑا۔

راجو کے سینے سے خرخر کی عجیب آواز نکلی۔ اس کی پتلیاں چڑھتی جا رہی تھیں۔

شانی چلائی۔ ''عارف...... دیکھو اسے۔ اس نے کچھ کھا لیا ہے۔''

عارف نے پستول قمیص کے نیچے لگایا اور لپک کر شانی کی طرف آیا۔ ایک دو افراد اور بھی لپکے۔ راجو کی حالت واقعی غیر ہو رہی تھی۔ یہ مار پیٹ کا اثر ہرگز نہیں تھا۔ ''لگتا ہے شانی اس نے کچھ کھا لیا ہے۔'' عارف نے کہا۔

''کوئی گاڑی روکو عارف۔ اسے ہسپتال پہنچائیں۔ اس کی سانس اکھڑ رہی ہے۔'' شانی کی آواز فرطِ غم سے لرز رہی تھی۔

''گاڑی ہے میرے پاس۔ میں لاتا ہوں۔'' ہجوم میں سے ایک شخص بولا۔

راجو کی ابتر حالت دیکھ کر کوکی کا ماموں اور دیگر حملہ آور تتر بتر ہو گئے تھے۔ چاروں طرف سراسیمگی پھیل گئی۔ راجو کی حالت دیکھنے کے لئے لوگ امڈ پڑے۔ راجو شیشے کی کرچیوں پر نیم دراز تھا۔ اس کا سر شانی کی گود میں تھا۔ شانی کے برقع کا بالائی حصہ اُتر کر اس کے

کندھوں پر تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ الم و اضطراب کی تصویر نظر آتی تھی۔

ایک گاڑی تیزی سے شانی اور راجو کے قریب آ کر رکی۔ راجو کو اٹھا کر پچھلی نشست پر لٹایا گیا۔ شانی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی اور اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ عارف اور ایک محلے دار بھی ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ راجو اب نیم بے ہوش تھا۔ گاڑی تیزی سے نشتر ہسپتال کی طرف روانہ ہوئی۔ شانی، راجو کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ وہ مکمل طور پر بے ہوش نہ ہو جائے لیکن وہ دھیرے دھیرے کسی اتھاہ تاریکی میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

ہسپتال پہنچتے ہی راجو کو آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا۔ اس وقت تک وہ مکمل بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے اور ہونٹ نیلے ہوتے جا رہے تھے۔ اس نے کوئی زہریلی شے کافی بڑی مقدار میں کھائی تھی۔ یہ میڈیکولیگل کیس تھا۔ ہسپتال والوں نے پولیس کو مطلع کر دیا تھا۔

آپریشن تھیٹر کے باہر شانی، عارف اور محلے کے ایک دو افراد موجود تھے۔ شانی کے دل سے خیر کی دعائیں نکل رہی تھیں۔ ویڈیو شاپ کے سامنے ہونے والی لڑائی میں عارف نے پستول نکال لیا تھا۔ شانی چاہتی تھی کہ پولیس کے آنے سے پہلے عارف کہیں ادھر ادھر ہو جائے لیکن وہ بے فکر نظر آ رہا تھا۔ اس نے شانی کو بھی تسلی دی۔

ایک جاں گسل انتظار کے بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ایک ڈاکٹر نے انہیں بتایا کہ لڑکے نے بھاری مقدار میں گندم میں رکھنے والی زہریلی گولیاں نگل لی تھیں۔ اس کا معدہ واش کر دیا گیا ہے اور دیگر طبی امداد بھی دی ہے لیکن اس کی حالت ابھی خطرے سے باہر نہیں ہے۔

قریباً ایک گھنٹے بعد راجو کو آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید تھا اور اسے آکسیجن لگی ہوئی تھی۔

اسی دوران میں پولیس کے دو افراد بھی کارروائی کے لئے پہنچ گئے۔ یہ سارا معاملہ عارف نے خود ہینڈل کیا۔ اس نے پولیس اہلکاروں کو ایک کارڈ بھی دکھایا۔ یہ کارڈ ایس پی حاجی حیات خان کے بااعتماد ماتحت ایس آئی اختر نے ہی اسے دے رکھا تھا۔ پولیس والوں نے زیادہ میں میخ نہیں نکالی اور واجبی کارروائی کر کے چلے گئے۔

شانی نے عارف سے پوچھا۔ ''اب کیا ہوگا۔ راجو تو بالکل بے ہوش ہے۔''

اتنے میں وہی ڈاکٹر نظر آیا جس نے راجو کا معدہ صاف کیا تھا۔ شانی نے ڈاکٹر سے یہی سوال پوچھا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''محترمہ، ہم ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دوائی کی کافی مقدار معدے میں گئی ہے۔ قریباً بیس بارہ گولیاں تو ہوں گی۔ شاید اس سے بھی زیادہ ہوں۔ پھر معدہ واش ہونے تک کافی ٹائم بھی گزر رہا ہے اور پھر اسے کافی چوٹیں بھی آئی ہیں جن میں اس کا خون بھی بہت بہا ہے۔ آپ لوگ دعا کریں۔''

''اسے کب تک ہوش آ جانا چاہئے؟'' شانی نے پوچھا۔

''اگلے تین چار گھنٹے اہم ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں مزید صفائی بھی کرنا پڑے۔''

وہ بڑا تکلیف دہ دن تھا۔ راجو کی حالت بدستور تشویش ناک تھی۔ اس کی سانس بار بار اکھڑ جاتی تھی اور منہ سے خون رسنے لگتا تھا۔ اگلے آٹھ گھنٹے میں اسے دوبارہ آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ کئی نالیوں نے اس کے جسم کو جکڑ رکھا تھا۔ آخر جب اس کی حالت بہتر نہیں ہوئی تو شانی نے التماس بار لہجے میں عارف سے کہا۔ ''عارف! ہمیں راجو کے وارثوں کو اطلاع دے دینی چاہئے۔ اللہ نہ کرے اسے کچھ ہو گیا تو۔۔۔؟'' اس کا گلا رندھ گیا اور وہ بات مکمل نہ کر سکی۔

عارف نے کہا۔ ''لیکن اطلاع پہنچائے گا کون؟''

''اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ایس پی حاجی حیات صاحب یا سب انسپکٹر اختر سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا جائے اور انہیں بتا دیا جائے کہ وہ میانہ میں تاؤ حشام تک اطلاع پہنچا دیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی مقامی پولیس افسر کو کہا جائے اور وہ وائرلیس وغیرہ پر تھانہ فقیرا تک خبر پہنچانے کی کوشش کرے۔''

کچھ دیر تک اس بارے میں عارف اور شانی میں مشورہ ہوتا رہا۔ اسی دوران میں عارف نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ چیزیں شانی کے حوالے کیں۔

ان میں سے کچھ چیزیں راجو کے پھٹے ہوئے کُرتے سے برآمد ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک طلائی انگوٹھی اور ایک طلائی زنجیر تھی۔ کُرتے سے برآمد ہونے والی اشیاء میں سات آٹھ سو کی نقدی، ایک دو رسیدیں اور کچھ کاغذات تھے۔ ان کاغذات میں دو خط بھی تھے۔ ایک خط کوکی نے راجو کو لکھا تھا۔ دوسرا راجو نے کوکی کو لکھا تھا۔ کوکی والا خط تو راجو کے پاس آ گیا تھا لیکن راجو والا خط اس کے پاس ہی رہ گیا تھا۔

کوکی والے خط کے مضمون سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ پچھلے چار پانچ دنوں کے اندر ہی لکھا گیا ہے۔ کوکی نے لکھا تھا۔ ''راجو! تم نے آنے میں بہت دیر کر دی ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم نے کہا ہے کہ میں تم سے ملوں۔ میں ایک بار تو کسی طرح ملی، اب دوبارہ تم سے نہیں

مل سکوں گی۔ ابا جی اور ماموں خلیل ہر وقت مجھ پر نظر رکھتے ہیں۔ اب شادی تک میرے گھر سے نکلنے پر پابندی ہے۔ دل تو چاہتا ہے کہ ساری پابندیاں توڑ دوں اور اُڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں لیکن راجو میں اپنے ماں باپ کو اور دکھ نہیں دے سکتی۔ اب تو جو کچھ ہے سہنا پڑے گا۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ کچھ کھا کر مر جاؤں لیکن مروں گی تو ماں پیو کی عزت مٹی میں ملے گی۔ ٹھیک ہے میرے مُردے کو ڈولی میں ڈال کر بھیج دیں یہ لوگ لیکن میں تمہیں بتا دوں راجو میں زیادہ دیر جیوں گی نہیں۔

تم سے کچھ اور نہیں کہنا راجو! بس ایک آخری درخواست ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اسے نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کر لو۔ میں جانتی ہوں یہ بڑا مشکل کام ہے لیکن میری خاطر راجو صرف میری خاطر۔ تم چلے جاؤ یہاں سے اور کبھی لوٹ کر نہ آنا۔ میں جب تک زندہ رہوں گی تمہاری اس قربانی کو یاد کرتی رہوں گی۔ تمہارے نام کے آنسو ہمیشہ میری آنکھوں میں رہیں گے۔''

اس سے آگے کچھ غم ناک شعر لکھے گئے تھے اور راجو کو خدا حافظ کہا گیا تھا۔

اسی خط کا جواب راجو نے لکھا تھا یا اپنے دوست سے لکھوایا تھا لیکن یہ خط کوکب یعنی کوکی تک پہنچ نہیں سکا تھا۔ راجو کا مختصر خط کچھ یوں تھا۔ ''کوکی! میں تیرے پیار میں بہت آگے جا چکا ہوں۔ اب میری واپسی نہیں ہو سکتی۔ تم نے لکھا ہے کہ میں نے آنے میں بہت دیر کر دی لیکن تم ہی بتاؤ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ تم پاک پتن سے آ گئیں اور اپنا کوئی نشان تک نہ چھوڑا۔ اگر تم مجھے ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہی ہوتو میں بھی جھلوں کی طرح جگہ جگہ تمہیں تلاش کرتا رہا ہوں۔ اگر تم پاک پتن میں اپنی سہیلی کو ہی کچھ بتا جاتیں تو میں تم تک پہنچ جاتا لیکن یہ بھی نہ ہوا۔

تمہارے لئے مرنا مشکل ہوگا لیکن میرے لئے تو نہیں ہے۔ میرا کون ہے پیچھے رونے والا۔ ایک باپ ہے وہ بھی بس نام کا ہی باپ ہے۔ جس طرح تمہارے باپ کو اپنی بے عزتی نہیں بھول رہی، اسی طرح میرے باپ کو وہ دولت نہیں بھول رہی جو وہ میری شادی کے ذریعے سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے یہ لوگ مجھے تم کو نہیں دیں گے لیکن یہ مجھے مرنے سے تو نہیں روک سکتے۔ میں تمہارے گھر کے سامنے اپنی جان دے دوں گا۔ تمہاری ڈولی اٹھنے سے پہلے میرا جنازہ اٹھے گا۔ ٹھیک ہے پھر میرے مرنے کے بعد تم جس کی چاہے ہو جانا۔ لوگ کہتے ہیں کہ مرنا مرنا سب کرتے ہیں مگر مر کر کوئی نہیں دکھاتا۔ میں تمہیں مر کر بھی دکھا دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

خط پڑھتے ہی شانی کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اس نے آئی سی یو کے دیوار گیر شیشے کے پار دیکھا۔ وہ نوخیز عاشق مختلف مشینوں اور نالیوں میں جکڑا ہوا بے حرکت پڑا تھا۔ اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید تھا۔ زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی اس کے چہرے پر۔

وہ رات امید وبیم کی کیفیت میں گزر گئی۔ ڈاکٹر پوری کوشش کر رہے تھے۔ وہ زندگی اور موت کے درمیان تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کدھر جائے گا۔

شانی مسلسل شیشے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ مریض کی حالت ایسی تھی کہ ڈاکٹر کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

صبح سورج کی کرنوں کے ساتھ ہی امید کی کچھ کرنیں بھی نظر آئیں۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ مریض کے وائٹل سائنز کچھ بہتر ہوئے ہیں۔ قریباً ایک گھنٹے بعد وہ گہری بے ہوشی سے نیم بے ہوشی کی کیفیت میں آ گیا ہے۔ شانی اسٹاف سے اصرار کر کے اندر چلی گئی۔ اس نے راجو کو قریب سے دیکھا۔ اس کے چہرے اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی پلکوں کی مدھم جنبش محسوس کی اور اطمینان کے احساس سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کے اندر ایک عجیب جذبہ پیدا ہوا۔ ایک انوکھی لہر۔ وہ عارف کو راجو کے پاس چھوڑ کر ہسپتال سے باہر نکلی اور ایک تانگے پر سوار ہو کر سیدھی حیات کالونی پہنچ گئی۔ اس نے برقع ہسپتال میں ہی چھوڑ دیا تھا اور سر پر موٹی اوڑھنی لے لی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کوکی اور اس کے گھر والوں کا رویہ اس کے ساتھ کیا ہوگا لیکن وہ ہر اندیشے کو ایک طرف رکھ چکی تھی۔

اس نے کال بیل پر انگلی رکھی۔ دروازہ کھولنے والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ شانی دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ یہی سیف اللہ ہوگا۔ وہ اکہرے بدن کا تھا۔ بال سفید تھے بس کہیں کہیں سیاہی نظر آتی تھی۔ کسی وقت وہ ایک خوبرو شخص رہا ہوگا مگر اب بڑھاپے اور مالی مشکلات نے اس کے چہرے کو عام سا چہرہ بنا دیا تھا۔ کئی تلخ سلوٹیں اس کے چہرے پر موجود تھیں۔

''جی، کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' اس نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ وہ شانی کو کل والے قصے کے حوالے سے پہچان نہیں پایا تھا۔

''میں آپ ہی سے ملنے آئی ہوں۔ آپ کا زیادہ وقت بھی نہیں لوں گی۔''

''لیکن ؟'' وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔ پھر بولا۔ ''ایک منٹ ٹھہریں۔ میں دوسرا دروازہ کھولتا ہوں۔''

وہ گھر کے اندر چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد بیٹھک نما کمرے کی چٹخنی کھلی اور سیف نے شانی کو اندر بلا لیا۔ یہاں فرش پر ایک دری بچھی تھی۔ کمرے کی سجاوٹ سے پتا چلتا تھا کہ یہ ایک

سفید پوش شخص کا گھر ہے۔ کمرے کے ایک گوشے میں ڈھولک اور گلاب کے مرجھائے ہوئے گجرے پڑے تھے۔ غالباً پرسوں ہونے والی شادی کے سلسلے میں یہاں ڈھولک بجتی رہی تھی۔ سیف نے شانی کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بیٹی! میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں۔''

''آپ کا بیٹی کہنا اچھا لگا ہے۔'' شانی نے ممنونیت سے کہا۔

''بیٹی کو بیٹی نہیں کہوں گا تو اور کیا کہوں گا؟''

''میں بھی آپ کو باپ کی جگہ سمجھ کر آپ سے ایک بات کہنے آئی ہوں..... میں آپ سے راجو کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔'' سیف کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا۔ وہ شانی کو عنصیلی نظروں سے تکتا رہا۔ پھر اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ''تم کیا لگتی ہو راجو کی؟''

''کچھ بھی نہیں۔ میرا کوئی رشتہ تعلق نہیں ہے۔ وہ میرے لئے اسی طرح اجنبی ہے جیسے آپ کی بیٹی کوکب۔ بس ایک اتفاق کی وجہ سے مجھے کچھ دن راجو کی حویلی میں رہنا پڑا ہے۔ میں نے وہاں رہتے ہوئے راجو کو دیکھا اور پرکھا ہے اور اس کی سچائی اور محبت کو محسوس کیا ہے جو اس کے دل میں آپ لوگوں کے لئے موجود ہے۔''

''کیا تم اس کی وکالت کرنے کے لئے یہاں آئی ہو؟'' سیف کا لہجہ بگڑ گیا۔

''نہیں انکل! میں آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ وہ نشتر ہسپتال میں بے ہوش پڑا ہے۔ کبھی لگتا ہے بچ جائے گا، کبھی لگتا ہے ختم ہوجائے گا۔ اس کی حالت نازک ہے۔ اس نے جو کچھ کیا غلط کیا ہے لیکن اس سے کم از کم اتنا تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وہ لڑکیوں کے پیچھے بھاگنے والا کوئی آوارہ گرد نہیں ہے۔ وہ آپ کی بیٹی کو دل سے چاہتا ہے اور اسے اپنانا چاہتا ہے۔''

''دیکھو! اس خبیث کے ساتھ میری بیٹی کا نام تمہاری زبان پر نہ آئے۔'' سیف نے وارننگ دینے والے انداز میں اپنی انگلی شانی کی طرف اٹھائی۔ غصے سے اس کا سارا وجود لرز رہا تھا۔

''معاف کیجئے انکل! آپ کی بیٹی کے ساتھ اس کا نام آچکا ہے۔ میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے دیکھنے میں بڑے اچھے لگتے ہیں۔ آپ کے سینے میں دل بھی بہت اچھا ہوگا۔ آپ اپنی انا کو ایک طرف رکھ کر ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ آپ ان بچوں کو بے گناہی کی سزا دے رہے ہیں۔ اگر اس سارے معاملے میں کوئی قصوروار تھا تو وہ چوہدری

حشام تھا۔ بلاشبہ اس نے آپ کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔ آپ کے ساتھ بدتمیزی سے بولا اور ڈرایا دھمکایا۔ سزا تو اس کو ملنی چاہئے تھی اور سزا یہ تھی کہ آپ اس کی خواہش سے الٹ کرتے لیکن آپ تو ان دونوں بچوں کو جدا کر کے حشام کی ہی آرزو پوری کر رہے ہیں۔''

''میں کسی کی آرزو پوری نہیں کر رہا اور نہ کسی کی آرزو برباد کر رہا ہوں۔ میں صرف وہ کر رہا ہوں جو ایک بیٹی کے باپ کی حیثیت سے مجھے کرنا چاہئے اور یہ میرا حق بھی ہے۔ مجھے کسی باپ بیٹے سے کچھ لینا دینا نہیں۔ میں کیوں پھنسوں اس دلدل میں۔ میں ایک غریب کمزور بندہ ہوں۔ اپنی زندگی جینا چاہتا ہوں لیکن اگر کسی نے مجھ پر کچھ ظلم ڈھانے کی کوشش کی تو میں چپ چاپ نہیں سہوں گا۔ منہ توڑ جواب دوں گا۔''

''منہ توڑ جواب تو آپ اسے دیں گے جو آپ سے لڑے گا۔ وہ جو آپ کی بیٹی کو چاہتا ہے، وہ تو نوعمری میں دنیا سے ہی منہ موڑ کر جا رہا ہے۔ کیا آپ اس کی لاش کو منہ توڑ جواب دیں گے۔ یا اس بیٹی کو جو آپ کے سامنے زبان بھی نہیں ہلا سکتی؟''

سیف دہاڑ کر بولا۔ ''دیکھو تم نے پھر میری بچی کے ساتھ اس کا نام لیا ہے۔ تم نے پھر بکواس کی ہے۔ میں نے تم سے کہا نہیں تھا یہ بکواس نہ کرنا۔ تمہاری جرأت کیسے ہوئی ہے میرے گھر میں اس طرح کی بات کرنے کی۔ تم ہو کون؟ آئی کہاں سے ہو؟ کون ہو تم؟'' وہ بڑے زور سے چنگھاڑا۔

''آپ میری بات سنیں۔ آپ تو.....''

''میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔'' اس نے چلا کر شانی کی بات کاٹی۔ ''تم جو کوئی بھی ہو نکلو یہاں سے..... نکلو۔'' اس نے دروازے کی طرف انگلی اٹھائی۔

اس سے پہلے کہ شانی اسے کوئی سخت جواب دیتی، اچانک کسی اندرونی کمرے سے ہلکی سی چلانے کی آواز آئی۔ یہ کوئی عورت تھی۔ سیف کا چہرہ متغیر ہوا۔ وہ شانی کو وہیں چھوڑ کر اٹھا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ شانی نے کھلے دروازے میں سے اندر جھانکا۔ اندرونی کمرے میں بلب روشن تھا۔ اسی روشنی میں شانی کو ایک لڑکی فرش پر پڑی نظر آئی۔ ایک فربہ اندام عورت نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھا ہوا تھا۔ ایک لڑکی اس کی ہتھیلیوں کی مالش کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ گھبراہٹ میں چیخ رہی تھی۔ ''پانی لاؤ ثریا۔ جلدی کرو۔''

ایک اور عورت بھاگی ہوئی آئی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ وہ بے ہوش لڑکی کے چہرے پر چھینٹے مارنے لگی۔

سیف کا رنگ ہلدی تھا۔ وہ بھی تیزی سے فرش پر بیٹھ گیا اور لڑکی کو اخبار سے ہوا دینے

لگا۔

شانی سے رہا نہیں گیا۔ وہ اندر چلی گئی۔ اس دوران میں سیف اللہ کسی ڈاکٹر کو بلانے دوڑ گیا تھا۔ شانی نے لڑکی کو دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ وہ دبلی پتلی لیکن خوبصورت تھی۔ اس کے چہرے کی اہم خوبی نقوش کی معصومیت تھی۔ اس کے بال بے حد نفاست سے تراشے گئے تھے۔ شانی سمجھ گئی کہ یہی کوکی ہے۔ جولڑکی اس کی ہتھیلیوں کی مالش کرتے ہوئے رو رہی تھی وہ یقیناً اس کی بڑی بہن سنبل تھی۔

''کیا ہوا ہے اسے؟'' شانی نے بے ساختہ پوچھا۔

''دل گھٹ گیا ہے۔'' پانی لانے والی عورت نے دیہاتی لہجے میں جواب دیا۔ ''ایک دو بار پہلے بھی ایسے ہوا ہے۔''

اتفاقاً شانی کے شولڈر بیگ میں کورامین کے ڈراپس موجود تھے۔ یہ اس نے جوہر آباد کے ہسپتال سے تابندہ کے لئے منگوائے تھے۔ وہ جلدی سے کوکی کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کا سر اونچا کیا تاکہ اس کا منہ کھلے اور وہ آسانی سے سانس لے سکے۔ اس کے گلے میں دوپٹے نے سختی سے بل کھا رکھا تھا۔ شانی نے یہ بل ڈھیلا کیا۔ پھر تھوڑا سا پانی منگوایا اور اس میں قطرے ڈال کر چمچ سے کوکی کو پلانے کی کوشش کی۔

اسی دوران میں سیف ہانپتا کانپتا ہوا واپس آ گیا۔ ڈاکٹر نہیں ملا تھا۔ وہ بے حد خوفزدہ آواز میں بولا۔ ''میں ٹیکسی لاتا ہوں، اسے ہسپتال لے جاتے ہیں۔''

شانی نے کہا۔ ''ایک منٹ ٹھہریں، دوا کا اثر دیکھنے دیں۔''

سب آنسو بہا رہے تھے۔ شانی نے دیکھا سیف کی آنکھوں میں بھی نمی تیرنے لگی تھی۔ کوکی کی والدہ دل گیر لہجے میں بولی۔ ''یا اللہ! میری بچی کو کچھ نہ ہو۔ اس کے بدلے میری جان لے لے۔ اس کی ساری بلائیں مجھے دے دے۔ ہائے میری بچی!'' وہ اس کی ٹھنڈی ٹھار پیشانی چومتی چلی گئی۔

ذرا دیر بعد کوکی کی سانس ہموار ہو گئی اور اس کی پلکوں میں بھی جنبش پیدا ہوئی۔ گھر والوں کو تھوڑا سا حوصلہ ہوا۔ اسے اٹھا کر پلنگ پر ڈالا گیا۔ بالکل ہلکی پھلکی تھی وہ۔

اچانک نہ جانے کوکی اور سنبل کی والدہ کو کیا ہوا۔ انہوں نے زمین پر بیٹھ کر اپنے شوہر کے پاؤں پکڑ لئے۔ ''خدا کے لئے کوکی کے ابا! اس پر رحم کریں۔ اسے یوں بے موت نہ ماریں یا اس سے پہلے مجھے ماردیں۔'' وہ شوہر کی ٹانگوں سے چمٹ گئیں اور بلکنے لگیں۔

سیف نے انہیں بمشکل اپنے قدموں سے اٹھایا۔ وہ خود بھی اشک بار تھا۔ پھر وہ تیزی

سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ شانی بھی وہیں رہی اور دوسروں کے ساتھ مل کر کوکی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد کوکی سنبھل گئی۔ اس کی آنکھیں شفاف جھیل جیسی تھیں اور اس کے باقی چہرے کی طرح ہی معصوم نظر آتی تھیں۔

کوکب کے گرد موجود عورتیں جو باتیں کر رہی تھیں، ان سے شانی کو معلوم ہوا کہ وہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ اسی کمزوری کے سبب اسے ایک دو دفعہ پہلے بھی غشی کی کیفیت سے گزرنا پڑا تھا۔ ہاتھ پاؤں بالکل ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ رنگ زرد ہو جاتا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے اپنے ابا جی کو بیٹھک میں گرجتے برستے سنا تھا اور بے چاری کو پھر اختلاجِ قلب ہو گیا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو گئی تھی۔

پورے گھر میں سوگواری کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ شادی والا گھر تھا اور یہاں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ ایک نادیدہ خوف تھا جس نے گھر کی خواتین کو آسیب کی طرح جکڑ رکھا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں باتیں کرتی تھیں اور گاہے بگاہے سوالیہ نظروں سے شانی کو دیکھنے لگتی تھیں۔

سنبل نے آنسو بہاتے ہوئے پوچھا۔ ''باجی! ابو جی آپ سے غصہ ہو رہے تھے؟''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیوں بیٹی؟'' ثریا نامی عورت نے پوچھا۔

''بس میرا ہی قصور تھا۔'' شانی اشک بار ہو کر بولی۔

''آپ کہاں سے آئی ہیں؟'' سنبل نے پوچھا۔ وہ دلکش آواز کی مالک تھی۔

''ہسپتال سے۔ جہاں راجو زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہا ہے۔''

اس سے پہلے کہ شانی سے کوئی اور سوال پوچھا جاتا وہ تیزی سے واپس بیٹھک نما کمرے میں آ گئی۔ سیف بڑے غم ناک انداز میں گھٹنوں پر سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ شانی چند سیکنڈ کھڑی رہی پھر اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ دھیمی آواز میں بولی۔ ''ابھی آپ کی بیوی نے جو بات کہی ہے وہی میں بھی آپ سے کہتی ہوں۔ خدا کے لئے اپنی بیٹی پر رحم کریں۔ اسے یوں بے موت نہ مرنے دیں۔''

''کیا کروں میں؟ کیا کروں؟'' سیف کراہتی ہوئی بلند آواز میں بولا۔

''دیکھیں، آپ پھر بلند آواز میں بات کر رہے ہیں۔ آپ کے اسی طرح بولنے سے کوکب کو کچھ ہوا ہے۔''

سیف کے تنے ہوئے اعصاب ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے سر جھکا لیا۔ شانی

مسلسل سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ دوبارہ بولی۔ ''میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتی کہ آپ کسی اور کی طرف دیکھنے کی بجائے صرف اپنی بیٹی کی طرف دیکھیں اور کوئی بہتر فیصلہ کریں۔''

سیف نے سر جھکائے جھکائے کہا۔ ''ابھی مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ تم جاؤ یہاں سے۔ میری سمجھ میں ابھی کچھ نہیں آ رہا۔'' اس کا ہاتھ اپنی پیشانی پر تھا۔

شانی سمجھ گئی کہ اب اس کے بیٹھنے سے اس کا جانا زیادہ سود مند ہے۔

وہ وہاں سے سیدھی ہسپتال آئی۔ اس کی آنکھوں میں مسلسل کوکب کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ کتنی معصومیت، کتنی سادگی تھی۔ اس کی عمر یقیناً سولہ سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی لیکن وہ اپنے چہرے سے بچی نظر آتی تھی اور یہ بچی خاموشی کی زبان میں اپنے باپ سے کہہ رہی تھی، میرا جرم اتنا بڑا نہیں ہے۔ مجھے موت کی سزا نہ دو۔ ابھی میں نے دنیا میں کچھ دیکھا نہیں۔

شانی ہسپتال پہنچی تو عارف بے تابی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ راجو کی حالت قدرے بہتر ہے۔ شانی نے کہا۔ ''پھر کیا خیال ہے؟ ابھی میانہ میں اطلاع پہنچائی جائے یا نہیں؟''

''بہتر تو یہ ہے کہ اب ذرا دیکھ لیا جائے۔'' عارف نے کہا۔

شانی کی اپنی رائے بھی یہی تھی۔ اگلے چوبیس گھنٹے میں راجو کی حالت میں اُتار چڑھاؤ آتا رہا لیکن اس کی طبیعت مجموعی طور پر بہتری کی طرف مائل رہی۔ دو تین مرتبہ شانی نے اندر جا کر اس سے مختصر بات بھی کی۔ اس نے زبان سے کسی بات کا جواب نہیں دیا، بس اثبات یا نفی میں سر ہلاتا رہا۔ شانی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت بھی نمودار ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے مسلسل نم تھے۔

☆======☆======☆

اگلے روز شانی پھر حیات کالونی میں سیف اللہ کے گھر پہنچی۔ اسے اس بات کا اندیشہ تھا کہ سیف بُری طرح بگڑے گا لیکن وہ ان اندیشوں کے سبب اس معاملے سے پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ خلاف توقع سیف بالکل گم صم اور آزردہ خاطر تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے اندر کچھ تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ وہ کہیں جانے کے لئے تیار نظر آتا تھا لیکن شانی کو دیکھ کر بیٹھ گیا۔

شانی نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع کیا جہاں سے کل چھوڑا تھا۔ اس نے سیف سے کہا۔ ''انکل! آپ نے مجھ سے زیادہ دنیا دیکھی ہوئی ہے۔ آپ مجھ سے کہیں بڑھ کر عقل و

بصیرت رکھتے ہیں۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ یہ عشق محبت کا کوئی عام معاملہ نہیں ہے۔ یہ دونوں واقعی ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے بڑے ڈاکٹر سے خود بات کی ہے۔ وہ راجو کے بچنے کو معجزہ قرار دے رہے ہیں۔ یہاں کوکب کی حالت بھی میں نے دیکھی ہے۔ پلیز انکل..... پلیز اس بارے میں کچھ سوچیں۔''

سیف نے عجیب بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ ''نہیں..... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب وقت گزر گیا ہے۔''

''پلیز انکل۔'' شانی نے بڑی اپنائیت سے سیف اللہ کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

''نہیں، اب نہیں۔ پوری تیاریاں ہو چکی ہیں۔ کارڈ بھیجے جا چکے ہیں۔ پتا نہیں کیا کیا ہو چکا ہے۔ میرا ہونے والا داماد کبھی نہیں مانے گا۔ بہت بڑا طوفان آئے گا۔''

''کوئی طوفان نہیں آئے گا اور نہ آنا چاہئے۔ جس شخص سے کوکب کی شادی ہو رہی ہے اسے بھی سوچنا چاہئے۔ ساری زندگی جھوٹ کے ساتھ گزارنے سے بہتر ہے کہ اس وقت آپ سیٹ کو برداشت کر لیا جائے۔''

''نہیں، یہ بہت مشکل ہے۔ تم لوگ سمجھ نہیں رہے ہو۔ ہم دو طرف سے مارے جا رہے ہیں۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ راجو کے گھر والے یہ کام ہونے دیں گے۔ راجو کا باپ جتنا سخت ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اس کی سختی دیکھ کر ہی میں نے پاک پتن میں اپنا گھر بار چھوڑا تھا۔''

شانی نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ''دیکھیں انکل سیف! چوہدری حشام وغیرہ کی طرف سے میں آپ کو مکمل اطمینان دلاتی ہوں۔ اس کا بیٹا..... سب سے لاڈلا بیٹا، زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہا ہے۔ وہ اگر اب بھی نہیں سمجھے گا تو اس کے سینے میں دل ہی نہیں ہے۔ اسے اب سب کچھ ماننا پڑے گا۔''

''مم..... مگر جن لوگوں میں کوکب کا رشتہ طے ہوا ہے وہ اب کسی صورت پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ وہ بڑے زور والے ہیں۔ چوہدری حشام کا ماننا یا نہ ماننا تو بعد کی بات ہے، پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ کوکب کے سسرالی اپنی منگ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ بہت بڑا بکھیڑا ہے، اس میں بدنامی اور دکھ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اب یہ سب کچھ جھیل سکوں۔ میں تو کہتا ہوں کہ میرے حال پر رحم کرو۔ جو کچھ طے ہو چکا ہے اسے ہو جانے دو۔ اس کی راہ میں روڑے نہ اٹکاؤ۔''

شانی سمجھ گئی کہ بیٹی کے جگر پاش اشکوں نے باپ کے پتھریلے سینے میں درڑ اپیدا کر دی ہے۔ وہ اب مختلف انداز سے سوچ رہا ہے لیکن اب اس کے ذہن میں دو خوف ہیں، ایک

جگ ہنسائی کا... اور دوسرا اپنے سمدھیوں کا۔ پہلا خوف بھی زیادہ اہم نہیں رہا تھا۔ کیونکہ ویڈیو شاپ والے واقعے کے بعد اور راجو کی خودکشی کی نہایت سنگین کوشش کے بعد کوکی اور راجو کی بات راز نہیں رہی تھی..... جو تماشا لگنا تھا وہ تو لگ ہی چکا تھا لیکن دوسرا خوف شدید تھا۔

شانی کے پوچھنے پر پتا چلا کہ کوکی کا ہونے والا شوہر لاہور کا کوئی صنعت کار ہے۔ خاصی بڑی پراپرٹی اور حیثیت کا مالک ہے۔ والدین فوت ہو چکے ہیں۔ وہ جواں سالی میں ہی کلی طور پر خودمختار ہے۔ گارڈز کا ایک دستہ ہر وقت اس کے ہمراہ رہتا ہے۔

اسی دوران میں دروازے پر دستک ہونے لگی۔ سیف کی بیوی شانی کے پاس آ بیٹھی اور سیف اٹھ کر باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک موٹر سائیکل کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی، جس سے پتہ چلا کہ سیف کہیں چلا گیا ہے۔

شانی جلد ہی سیف کی بیوی سے گھل مل گئی۔ کچھ دیر بعد سنبل اور ثریا بھی شانی کے پاس آ بیٹھیں۔ شانی نے کل کوکب کو ہوش میں لانے میں ان کی بڑی مدد کی تھی۔ وہ تینوں عورتیں شانی کی ممنون نظر آ رہی تھیں۔ شانی نے ان سے اپنا مختصر تعارف کرایا اور انہیں بتایا کہ وہ راجو اور کوکب کی سچی ہمدرد کی حیثیت سے یہاں موجود ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ کچھ عرصہ راجو کے گاؤں میانہ میں رہی ہے۔ وہاں راجو سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ راجو ایک اچھا لڑکا ہے لیکن اس کے باپ نے اسے غلط ماحول میں رکھا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ راجو پاک پتن والی لڑکی کو بھولا نہیں ہے اور اس کا غم اندر ہی اندر اسے کھا رہا ہے۔ اس سارے قصے میں شانی نے ڈولے کا ذکر بوجوہ گول کیا۔

باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی دوران کوکب بھی نقاہت سے چلتی ہوئی وہاں آ گئی۔ اس نے شانی کو سلام کیا اور موگوارسی ایک طرف بیٹھ گئی۔ کوکب کی والدہ عطیہ نے شانی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''بیٹی! یہی باجی ہیں جنہوں نے کل تمہیں دوا کھلائی تھی اور تمہیں ہوش دلایا۔''

کوکب یعنی کوکی نے ایک بار پھر سلام کیا۔ ''ابو کہاں گئے ہیں؟'' اس نے کمزور آواز میں ماں سے پوچھا۔

''ہسپتال..... ڈاکٹر نے بلایا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔'' عطیہ بیگم نے جواب دیا۔

''کیوں آنٹی خیر ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''کوکی کے چھوٹے چاچا ہسپتال میں ہیں۔ پانچ چھ مہینے پہلے اس کا موٹر سائیکل پر ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ کمر کی ہڈی پر چوٹ آئی تھی۔ بہت بیمار ہو گیا تھا۔ پچھلے مہینے آپریشن ہوا ہے۔ اب اللہ کے فضل سے ٹھیک ہے۔''

شانی نے دیکھا کہ کوکی کے گلے میں دوپٹہ کل کی طرح مضبوطی سے لپٹا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے گلے کو باندھ کر رکھنا چاہتی ہے یا کچھ چھپا رہی ہے۔

شانی نے نرمی سے کہا۔ ''تم اس طرح دوپٹہ کیوں لپیٹی ہو۔ کل اسی وجہ سے تمہارا دم گھٹنے لگا تھا۔''

کوکی نے دوپٹے کا بل ذرا ہلکا کر دیا۔ عطیہ بیگم نے ہاتھ بڑھا کر اسے بالکل ہی کھول دیا۔ ذرا جھنجھلا کر بولیں۔ ''کیوں کرتی ہے اس طرح، چھوٹا سا نشان ہی تو ہے۔ اب تو ویسے بھی مدھم پڑ گیا ہے۔''

شانی نے دیکھا کوکی کی گردن کی نہایت ملائم اور شفاف جلد پر ایک سیاہی مائل نشان موجود تھا۔ شانی سوالیہ نظروں سے عطیہ بیگم کی طرف دیکھنے لگی۔ عطیہ بیگم کے بجائے کوکی کی چاچی ثریا نے جواب دیا۔ ''تین مہینے پہلے کوکی کافی بیمار ہو گئی تھی۔ ہم نے ایک اللہ والے سے نوری عمل کرایا تھا۔ اسی کا نشان ہے۔''

''نوری عمل کا نشان؟'' شانی نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بیٹی! کوٹ لکھپت میں بڑے پہنچے ہوئے اللہ والے ہیں۔ میرے ماموں سسر اور اس کے تینوں بچوں کو دماغ کا دورہ پڑتا تھا۔ دنیا جہاں کے ڈاکٹروں سے علاج کرا کے دیکھ لیا۔ لاکھوں ہی خرچ کئے ہوں گے۔ پر آرام آیا تو پیر مستان جی سے آیا۔ اب بالکل بھلے چنگے ہیں اور ایسے ہزاروں ہی لوگ ہیں جن کو پیر مستان شاہ سے فیض پہنچا ہے۔ اللہ سوہنے نے بڑی شفا دی ہے ان کے ہاتھ میں۔''

''لیکن یہ نشان؟'' شانی نے پوچھا۔

''یہاں سے گندہ خون نکالا تھا انہوں نے۔ اس خون کے نکلنے سے کوکی پر ''اثر'' ختم ہوا تھا۔ پیر صاحب کی کرامات یہی ہے کہ مریض کے پنڈے میں سے بس وہی خون نکالتے ہیں جس میں بیماری ہوتی ہے..... باقی خون اسی طرح پنڈے کے اندر رہتا ہے۔''

ثریا اپنی بول چال سے اَن پڑھ نظر آتی تھی اور حلیہ بھی ایسا ہی تھا۔

شانی کچھ چونک سی گئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ پیر صاحب ہیں کون؟''

''یہ پہلے فیصل آباد میں تھے۔ وہاں ان کے ہزاروں ماننے والے ہیں۔ پھر یہاں

لاہور آ گئے لیکن فیصل آباد سے لوگ اب بھی یہاں آتے ہیں۔ ایک پیران پیر ''حضرت صاحب'' ہیں، یہ پیر مستان ان کی لڑی میں سے ہیں۔ میرا مطلب ہے ان کے شاگردوں میں سے ہے......''

شانی نے آنٹی عطیہ اور سنبل وغیرہ کے چہرے دیکھے۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ ثریا کی باتوں سے کچھ زیادہ متفق نہیں ہیں۔ اسی دوران میں کسی مرد نے دیہاتی لہجے میں ثریا کو آواز دی۔ ''او ثریا اِدھر آ۔ یہ کاکے نے موتر کر دیا ہے میرے کپڑوں پر۔''

ثریا اپنے قدرے بھاری جسم کو ہلکورے دیتی ہوئی باہر نکل گئی۔

آنٹی عطیہ نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''بکواس کرتی ہے۔ کوئی نوری عمل شمل نہیں ہے۔ میری گُڈی کا تو ستیاناس ہی اس پیر کے پاس جانے سے ہوا ہے۔ نہ یہ وہاں جاتی نہ یہ رشتہ ہمارے پلے پڑتا۔ اب ایسے بُرے پھنسے ہیں کہ نہ مر کر جان چھوٹتی ہے نہ زندہ رہ کر۔ پتا نہیں کیوں اللہ کو بھی ترس نہیں آتا ہماری حالت پر۔'' آنٹی عطیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

شانی نے انہیں تسلی دی۔ ''آپ ہمت نہ ہاریں۔ اللہ ضرور مدد کرے گا۔''

ثریا نے جو کچھ کہا تھا اسے سن کر شانی کے سینے میں ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔ ثریا نے واضح طور پر ''حضرت صاحب'' کا نام لیا تھا۔ اس حضرت صاحب نے اپنے چیلوں چانٹوں کے ذریعے پتا نہیں کہاں کہاں پنجے گاڑ رکھے تھے۔ شانی کو ''گندہ خون نکالنے'' والی بات سے ہی شک گزرا تھا۔ اب اس شک کی پوری تصدیق ہو گئی تھی۔

شانی نے اس بارے میں آنٹی عطیہ سے تھوڑی سی تفصیل چاہی تو انہوں نے بتایا۔ ''یہ ثریا اور اس کا بندہ عنایت ہی ہمیں لے کر گئے تھے کوٹ لکھپت میں۔ آنے جانے اور دوسرے خرچوں پر کوئی چودہ ہزار روپیہ لگ گیا تھا ہمارا۔ چھ ہزار تو سیدھا سیدھا اس جھوٹے پیر نے ہی لے لیا تھا۔ ساتھ میں مار مار کر میری گُڈی کا بھی حشر کر دیا...... اللہ کی مار ہو ایسے لوگوں پر۔'' آنٹی عطیہ کی آواز میں گہرا کرب تھا۔

''کیا کیا تھا اس نے؟'' شانی نے پوچھا۔

''کہتا تھا لڑکی پر اثر ہے۔ اس لڑکی کے اندر جو چیز ہے اسے باہر نکالنا پڑے گا اور اس کے لئے لڑکی کو تھوڑی بہت تکلیف بھی دینا پڑے گی لیکن یہ تکلیف لڑکی کو نہیں اس کے اندر کی چیز کو ہو گی۔ بس وہی ڈھکوسلے جو ایسے لوگ کرتے رہتے ہیں۔ اس خبیث نے ہمارے سامنے ہماری جوان بچی کو الٹا لٹکا دیا۔ اس کے جسم پر بے رحمی سے چٹکیاں کاٹیں اور چمڑے کے ایک لمبے پتلے ٹکڑے سے اسے پیٹا۔ وہ کہتا تھا یہ شیر کا چمڑا ہے۔ مار مار کر اس نے لاسیں

(لکیریں) ڈال دیں میری بچی کے پنڈے پر۔ یہ روتی تڑپتی رہی۔ اس خبیث نے اسے چارپائی سے باندھ رکھا تھا۔ اگلے روز ہم سے کہنے لگا۔ اس کے اندر کی چیز بڑی ڈھیٹ ہے۔ ابھی تک ڈیرہ جمائے بیٹھی ہے، دوسرا عمل کرنا پڑے گا۔ اس کے لئے اس نے ہم سے تین ہزار روپے اور لے لئے۔ کوکی کو ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا۔ ساتھ میں ایک موٹی تازی مریدنی بھی تھی۔ پیر اور مریدنی نے دو تین جگہ سے کوکی کا خون پیا۔ وچاری کو نڈھال کر کے رکھ دیا۔ ہاں سچ کہہ رہی ہوں بیٹی! انہوں نے سچ مچ اپنے منہ سے کوکی کا خون پیا۔''

آنٹی عطیہ نے بڑے دکھ کے عالم میں کوکی کے جسم پر زخموں کے تین چار ماہ پرانے نشان دکھائے۔ ایک نشان بائیں کلائی پر تھا۔ دوسرا گردن پر۔ تیسرا نشان دکھانے سے وہ قاصر تھی کیونکہ وہ اس کی قمیص کے نیچے تھا۔ کوکی خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی اور بے بسی کی تصویر نظر آتی تھی۔

آنٹی عطیہ نے کہا۔ ''اتنا کچھ کر کے بھی کوکی ویسی کی ویسی ہی رہی۔ یہ بالکل گم صم ہو گئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے برف ہو جاتے تھے اور غش سا آ جاتا تھا۔ جس دن پیر اور اس کی مریدنی نے خونی عمل کیا، اس سے اگلے ہی دن ہوٹل میں اسے پھر غش آ گیا۔ کوکی کے ابو نے جا کر پیر مستان سے بات کی اور اس سے کہا کہ اتنا خرچہ کر کے بھی لڑکی کی وہی حالت ہے۔ ابھی تو ہم یہیں پر ہیں، اگر واپس ملتان پہنچ کر یہ معاملہ ہوا تو پھر وہاں سے بھاگے آئیں گے؟ اپنی عادت کے مطابق انہوں نے پیر مستان سے ایک دو سخت باتیں بھی کیں۔ پیر مستان نے یہ بات مانی کہ لڑکی کو ٹھیک ہو کر ہی یہاں سے جانا چاہئے۔ اس نے بتایا کہ بڑے ''حضرت صاحب'' تین دن بعد لاہور آنے والے ہیں۔ ان سے ملاقات کے لئے ہفتوں پہلے ٹائم لینا پڑتا ہے لیکن وہ کوشش کر کے لڑکی کو دکھا دے گا۔ اس نے کہا کہ وہ اس کام کے لئے مزید رقم بھی نہیں لے گا۔ بس ہمیں دو تین دن مزید ہوٹل کا کرایہ برداشت کرنا پڑے گا۔ پیر مستان کے ایک مرید نے ہمیں بتایا کہ حضرت صاحب مُردوں کو بھی اٹھا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ ان کے پاس وہ خاص جونکیں ہیں جو بُرے سے بُرے آسیب اور مرض کو بندے کے خون میں سے یوں چوستی ہیں کہ بیماری کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ انسانی صورت کی یہ دو ہم شکل جونکیں دور و نزدیک مشہور ہیں اور بڑے بڑے نامی لوگ ان سے اپنا خون چسواتے ہیں۔'' آنٹی عطیہ نے چند لمحے توقف کیا اور بولیں۔ ''ہماری تو بیٹا مت ہی ماری ہوئی تھی۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا کرتے جا رہے تھے۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ ایسے لوگوں کی زبان میں پتا نہیں کیا جادو ہوتا ہے۔ کبھی ذرا

دھکا کر، کبھی امید دلا کر اپنی بات منوا لیتے ہیں۔''

''تو پھر آپ مزید تین دن کے لئے رک گئے؟''

''تین دن کیا بیٹی! پانچ دن لگ گئے۔ جس دن وہ حضرت صاحب آئے، ہم نمازِ فجر کے وقت سے پیرستان کے ڈیرے پر موجود تھے۔ پیرستان کا ٹھکانہ کسی مزار وغیرہ پر نہیں۔ یہ ایک بڑی سی فیشن ایبل کوٹھی ہے۔ پوری کوٹھی پر ہرا رنگ کیا گیا ہے۔ دیواروں اور دروازوں پر پتا نہیں کیا لکھا ہوا ہے۔''

سنبل نے کہا۔ ''پیرستان کے پیر حضرت قدرت اللہ کے قول لکھے ہوئے ہیں۔ کچھ تعویذوں کے بندے ہیں اور کچھ عربی کے لفظ بھی ہیں لیکن کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔''

آنٹی عطیہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے قریباً آٹھ گھنٹے تک اپنی باری کا انتظار کیا۔ وہاں بہت رش تھا۔ رش کی وجہ سے ثریا کی اپنی طبیعت بھی خراب ہوگئی اس کے بچہ ہونے والا تھا ناں، ان دنوں۔ بہرحال دوپہر کے بعد پیرستان نے کوکی کا دوپٹہ اور ہاتھ کی دو چوڑیاں اندر منگوائیں۔ مجھے تو لگتا ہے یہ بھی چکر ہی تھا۔ وڈے حضرت صاحب کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ سارے مریضوں کو دیکھ سکتے۔ دو گھنٹے بعد پیرستان خود باہر آیا اور اس نے دوپٹہ اور چوڑیاں ہمیں واپس کرتے ہوئے بتایا کہ کسی اور عمل وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت صاحب نے جو عمل کرنا تھا مریضہ کی ان چیزوں پر کر دیا ہے۔ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔ اول تو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ اگر ہوئی تو پہلے ٹیلی فون یا خط کے ذریعے رابطہ کرنا ہے۔

ابھی ہم کوٹھی سے نکل ہی رہے تھے کہ کوکی کو پھر چکر آنے لگے۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا۔ پاس ہی ایک بڑی جیپ کھڑی تھی۔ جیپ والے نے دروازہ کھولا اور ہمیں کہا کہ کوکی کو اندر سیٹ پر لٹا دیں۔ یہ بڑی شاندار جیپ تھی۔ اس کے اندر ہی فریج وغیرہ بھی تھا۔ ہم نے کوکی کو پانی پلایا اور ہوا دی۔ وہ سنبھل گئی۔ جیپ والے شخص کا نام امان اللہ تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور گورا چٹا بندہ بھی جیپ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے منہ اور ہاتھوں پر چھوٹے چھوٹے نشان تھے۔ جیسے کچھ دن پہلے اسے چھالے وغیرہ نکلے ہوں۔ یہ بھی ہمارے ساتھ بڑی ہمدردی سے پیش آیا۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ ہم نے بادامی باغ والے لاری اڈے کا بتایا۔ اس نے کہا کہ ہم گورنمنٹ کی بس پر جائیں وہ زیادہ اچھی رہے گی۔ اس نے کہا کہ وہ اس طرف جا رہا ہے ہمیں گورنمنٹ اڈے پر اُتار دے گا۔ راستے میں اس نے ایک جگہ اپنی جیپ روکی۔ یہ ایک بہت بڑے ڈاکٹر کی دکان تھی۔ یہ ڈاکٹر

جیپ والے کا دوست تھا۔ اس نے ہمیں جیپ سے اُتارا اور سیدھا ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے بڑی توجہ سے کوکی کو دیکھا اور کچھ دوائیاں لکھ کر دیں۔ اس نے کہا بچی بالکل ٹھیک ہے، کوئی بیماری شیماری نہیں ہے اسے..... بس کمزوری ہے یا پریشانی ہے۔ اس کی شادی کر دو، سولہ آنے ٹھیک ہو جائے گی۔

ڈاکٹر سے فارغ ہو کر ہم اڈے کی طرف روانہ ہوگئے۔ جیپ والے دوسرے بندے کا نام بشیر تھا۔ یہ لاہور میں ایک بہت بڑے کارخانے کا مالک تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ملتان میں بھی کام شروع کر رہا ہے اور آج کل وہیں آتا جاتا رہتا ہے۔ وہ مجھے بڑے پیار سے ماں جی کہہ رہا تھا۔ اس نے کہا ماں جی! اب آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ اس نے کوکی کے ابو کو یہاں ملتان کا ہی ایک پتا دیا اور کہا کہ وہ اگلے پیر کو یہاں آ کر اس سے ملیں۔ وہ ان کے لئے کسی نوکری کا انتظام کر سکتا ہے۔

اس نے کوکی کے بارے میں کہا کہ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اگر احتیاط سے دوائیں کھائے گی تو دو چار ہفتوں میں بھلی چنگی ہو جائے گی۔ اس نے کہا کہ پیری فقیری میں بھی بہت ملاوٹ آ چکی ہے۔ ان میں کچھ ٹھیک لوگ بھی ہوں گے لیکن زیادہ تر فراڈ ہیں یا اناڑی ہیں۔ اس نے کہا کہ اگر ہم نے کبھی کوئی دم درود وغیرہ کرانا ہو تو پھر شاگرد پیشہ لوگوں کے بجائے استاد سے ملنا چاہئے۔ جیسے خود حضرت صاحب ہیں۔

ہم ملتان واپس آ گئے۔ اس کے بعد ملتان میں ہی کوکی کے ابو کی بشیر سے دو تین ملاقاتیں ہوئیں۔ بشیر کی پہلی بیوی فوت ہو چکی ہے۔ اس بیوی سے اس کے دو بچے ہیں۔ ایک بچہ ایبٹ آباد میں رہتا ہے، دوسرا بشیر کے پاس ہے۔ بشیر چند دن بعد اپنی جہاز جتنی جیپ لے کر ہمارے گھر بھی آیا۔ وہ ہم سے بڑی محبت سے ملتا رہا۔ کوکی کے ابو نے تو ملازمت نہیں کی لیکن کوکی کے ماموں خلیل کو بشیر نے اپنی نئی فیکٹری میں اچھی ملازمت دلا دی ہے۔ اپنے چھوٹے دیور (کوکی کے چاچو) کے بارے میں تو میں نے تمہیں بتایا ہی ہے۔ اس کی کمر کی ہڈی بہت خراب ہوگئی تھی۔ سرکاری ہسپتال میں دھکے مل رہے تھے اور پرائیویٹ ہسپتال میں آپریشن بہت مہنگا تھا۔ کم از کم ایک لاکھ روپیہ لگتا تھا۔ یہ آپریشن بھی بشیر کی مدد سے ہوا۔ ان ہی دنوں میں کوکی کے ابو نے مجھے بتایا کہ بشیر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے اور اس کا خیال ہماری کوکب کی طرف ہے۔ میں حیران رہ گئی۔ کہاں وہ کروڑ پتی اور کہاں ہم کرائے کے ایویں سے مکان میں رہنے والے..... بے شک کوکی خوبصورت تھی، اب صحت مند بھی تھی لیکن پھر بھی بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے کوکی کے ابو سے بہت کہا کہ اچھی طرح سوچ سمجھ

لیں۔ بے شک وہ دولت مند ہے لیکن عمر کا کچھ بڑا ہے، رنڈوا ہے اور بچے بھی ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ہماری بچی کی مرضی ہو۔ مجھے اچھی طرح پتا تھا کہ کوکی کے دل سے اب بھی وہ پاک پتن کے عرس والا لڑکا نہیں نکلا ہے۔ وہ اس کے لئے چھپ چھپ کر روتی ہے لیکن تمہیں تو پتا ہے بیٹی! ان مردوں کی سوچیں و کھری ہی ہوتی ہیں۔ عورت کے مشورے کو تو یہ کسی گنتی میں ہی نہیں لاتے اور تو اور میرا سگا بھائی خلیل بھی اڑ گیا کہ نہیں بشیر صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔ ہماری بچی کی قسمت کھل گئی ہے، شہزادیوں کی طرح رہے گی..... بس چٹ منگنی والی بات ہوئی 'ور رشتہ طے ہو گیا۔ ہماری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ اب آہستہ آہستہ پتا چل رہا ہے کہ بشیر کی پہلے والی ساری ہمدردی اور محبت اس رشتے کے واسطے ہی تھی۔ تم دیکھ ہی رہی ہو میری بچی کی عمر کتنی ہے۔ ابھی ہم دو تین سال تک اسے رخصت کرنے والے نہیں تھے۔ پر بشیر چاہتا تھا کہ یہ کام چھپتی سے چھپتی ہو۔ وہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ ہم نے بہانہ بنایا کہ بڑی سے پہلے چھوٹی کی شادی کیسے کر دیں۔ اس نے کوشش کر کے بڑی کا رشتہ بھی ہماری ہی من پسند جگہ پر طے کرا دیا۔ اب کوئی عذر نہیں رہ گیا تھا۔ مجبوراً ہمیں شادی کی تاریخ دینا پڑی۔''

آنٹی عطیہ کی باتیں سن کر شانی کے ذہن میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ اب اس امر میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ پیرستان اور پیر قدرت اللہ کے آستانے کی ''برکتوں'' سے سیف اللہ کو جو ''مایہ ناز رشتہ'' ملا تھا وہ نارپور کے چوہدری بشیر کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ یہ صورتِ حال شانی کے لئے بھونچکا کر دینے والی تھی۔ وہ گمان بھی نہیں کر سکتی تھی کہ ملتان آتے ہوئے اس نے جس شخص سے فون پر بات کی تھی اور جسے مُنے کے حوالے سے واسطے دیئے تھے، وہ ملتان پہنچتے ہی ایک نئے روپ میں اس کے سامنے آئے گا۔ فون پر چوہدری بشیر کے کہے ہوئے یہ الفاظ شانی کے کانوں میں گونج گئے۔ ''میں اس گھر کو پھر سے آباد کر رہا ہوں۔''

ان الفاظ نے شانی کو الجھایا تھا لیکن اب یہ الجھن باقی نہیں رہی تھی۔

آنٹی عطیہ نے سائیڈ ٹیبل کی دراز سے ایک تصویر نکال کر شانی کو دکھائی۔ ''یہ ہے اس کا ہونے والا شوہر۔'' آنٹی نے یاس انگیز لہجے میں کہا۔

شانی نے دیکھا۔ چوہدری بشیر اس کے سامنے تھا۔ گھنی مونچھیں، توانا گردن، عینک کے پیچھے دو سرد گہری آنکھیں، اس کے بائیں رخسار پر صرف ایک دو مدھم نشان نظر آ رہے تھے۔ یہ تصویر غالباً اس وقت اُتاری گئی تھی جب چوہدری کی جلدی بیماری اختتام پذیر تھی۔

چوہدری بشیر کا ذکر کوکی کو سخت ناگوار گزرا تھا۔ وہ سسک کر اپنی جگہ سے اٹھی اور تیزی

سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

''میں اسے دیکھتی ہوں۔'' سنبل نے کہا اور وہ بھی کوکی کے پیچھے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اسی دوران میں گھر کے دروازے پر دستک ہونے لگی۔ ثریا باہر گئی اور اس نے آ کر بتایا کہ فیکٹری سے دو تین بندے آئے ہیں، گھر کو باہر سے رنگ و روغن کرنے کے لئے۔ بشیر صاحب نے بھیجے ہیں۔ بشیر صاحب کل شام سے ملتان آئے ہوئے ہیں۔ شانی دیکھ رہی تھی کہ یہ گھر اس کی توقع سے بڑھ کر کشادہ اور سجا ہوا ہے۔ غالباً اس گھر کی سجاوٹ اور کشادگی میں بھی چوہدری بشیر کا عمل دخل تھا۔

شانی نے آنٹی عطیہ کے ساتھ چند تسلی بخش باتیں کیں اور انہیں بتایا کہ اس سے جو کچھ بھی ہو سکا راجو اور کوکی کے لئے ضرور کرے گی۔ اس کی بات سن کر آنٹی عطیہ باقاعدہ رونے لگیں۔ پتا نہیں انہیں شانی کی تسلیوں پر یقین آیا کہ نہیں لیکن وہ غم زدہ ضرور ہو گئی تھیں۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوکی کے ساتھ ساتھ سنبل کی طرف سے بھی بہت فکرمند تھیں۔ ظاہر ہے کہ کوکی کے حالات کا اثر سنبل کے رشتے اور شادی پر بھی پڑ سکتا تھا۔

شانی ٹیکسی پر واپس نشتر ہسپتال روانہ ہوئی تو اس کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ بے شمار سوالات ذہن میں اُبھر رہے تھے۔ روحانیت کیا ہے؟ روحانیت کے نام پر شعبدے باز لوگوں کی عزت اور جان سے کھیل رہے ہیں۔ اس جدید دور میں بھی جو لوگ ایسے نوسر بازوں کے مٹھے چڑھتے ہیں اور بار بار چڑھتے ہیں ان کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ وہ سوچتی رہی اور اپنے آپ میں ہوتی رہی۔ چند دن پہلے وہ یہاں سے بہت دور پوٹھوہار کے سنسان ٹیلوں میں تھی..... اس ویرانے میں جہاں رستم آباد تھا۔ اپنی واپسی سے دو دن قبل اسے پتا چلا تھا کہ وہاں کسی فراڈیئے عامل نے نادیہ کو اپنی باتوں کے جال میں میں الجھایا تھا اور اسے نیم برہنہ کر کے اس کی کمر پر تعویذ نویسی کی تھی۔ یہ شعبدہ باز ہر جگہ موجود تھے۔ ہر قسم کے لوگوں کو ان کی ذہنی سطح کے مطابق دھوکا دے رہے تھے اور اپنی سفلی خواہشات کی تکمیل کر رہے تھے۔ یہ لوگ..... یہ مادہ پرست لوگ روحانیت کو بدنام کر رہے تھے۔ ان کے کرتوت کی وجہ سے لوگوں کا یقین اٹھ رہا تھا۔

پھر وہ دوسرے زاویے سے سوچنے لگی۔ کیا ایسی چیزوں کا وجود حقیقت ہے جو حواسِ خمسہ اور انسانی علم کے دائرے سے باہر ہیں؟ کیا واقعی ابھی جدید علوم کو ایک غیر مرئی کائنات چھونے کے لئے ایک لمبا سفر کرنا ہے؟ ٹیکسی ملتان کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی اور شانی کا ذہن

ہزار گنا تیز رفتار سے ایک انجانے رستے پر دوڑ رہا تھا۔ اسے ایک بار پھر پوٹھوہار کے سنسان ویران پُراسرار ٹیلے یاد آ گئے۔۔۔۔ اور وہ اندھی دراڑیں یاد آ گئی جس میں اس نے رستم کے ساتھ ایک رات گزاری تھی۔ شانی کو یاد آیا کہ اس رات کی صبح وہ اپنے کپڑے بدل کر قدیم سیڑھیوں کے سامنے بیٹھی تھی۔ یہ مسمار سیڑھیاں اس نیم تاریک دراڑ میں کسی ہزاروں سال پرانے کھنڈر کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ رستم اس وقت چند فٹ کی دوری پر موجود تھا۔ اچانک ہی شانی کے نتھنوں میں گلاب اور گجرے کی ملی جلی خوشبو گھسی تھی۔ وہی خوشبو جس کا تعلق ماضی کے ایک ناقابلِ فہم واقعے سے تھا۔ ابھی شانی اس خوشبو پر ہی غور کر رہی تھی کہ اسے سیڑھیوں پر ایک ہیولا نظر آیا تھا۔ شانی سرتاپا لرز گئی تھی۔ اسے لگا تھا یہ نگینہ کا ہیولا ہے۔ ہاں وہی نگینہ جو نارپور کی حویلی میں آگ لگنے کے دوران میں مری تھی اور اپنے مرنے کے دو دن بعد شانی کو ریٹائرڈ حوالدار کے گھر میں ملی تھی۔ شانی کی نظر ایک لمحے کے لئے پتھرا گئی۔ وہ مسمار سیڑھیوں کے آخری زینے سے قریباً دو فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ شانی کو بس اس کی ایک جھلک نظر آئی۔ شانی کو لگا نگینہ کے چہرے پر دنیا جہاں کی خوشی سمٹی ہوئی ہے اور اس کی دیہاتی آنکھیں وفورِ مسرت سے چمک رہی ہیں۔ شانی ایک دم ڈر کر سیڑھیوں سے پیچھے ہٹ گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی نگینہ کا ہیولا بھی گم ہو گیا تھا۔ رستم نے شانی کو یوں ڈر کر پیچھے ہٹتے دیکھ لیا۔ اس نے پوچھا تھا۔ ''کیا ہوا بی بی؟''

''کچھ نہیں۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔'' شانی نے نفی میں جواب دیا تھا اور ہکلا کر رہ گئی تھی۔

رستم نے الجھے ہوئے انداز میں ٹارچ کا روشن دائرہ سیڑھیوں کے آس پاس پھینکا تھا اور پھر ایک طرف جا کر بیٹھ گیا تھا۔

وہ سارے کا سارا منظر شانی کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر ملتان کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے، اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ سوچنے لگی۔ وہ سب کیا تھا؟ کوئی وہم؟ تخیل؟ بصری دھوکا؟ یا جاگتی آنکھوں کا خواب؟ دراڑ میں نشہ آور گیس کے سبب اس کا ذہن مسلسل اونگھتا رہا تھا۔ کیا حوالدار کے گھر کی طرح ایک بار پھر اس کے اونگھتے ذہن نے کوئی تصوراتی منظر اسے دکھا دیا تھا۔۔۔۔؟ لیکن رستم؟ کیا رستم کو بھی نگینہ کے حوالے سے دھوکا ہی ہوا تھا۔ حوالدار کے گھر میں رستم نے جو باتیں کہی تھیں وہ شانی کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ ایک بار پھر اس کے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ ایسی باتوں پر یقین کرنے کو ہرگز ہرگز تیار نہیں تھی لیکن اس نے نفسیات اور مابعد النفسیات کے بارے میں بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا۔ کیا یہ بھی کوئی ایسا ہی معاملہ تھا؟

اسی الجھے سلجھے معاملے کے بارے میں سوچتی ہوئی وہ نشتر ہسپتال کے پارکنگ لاٹ میں جا پہنچی۔ وہ عارف کے پاس پہنچی تو وہ کچھ پریشان نظر آیا۔ اس نے شانی کو بتایا کہ راجو اب ہوش میں آ چکا ہے لیکن اس کی ذہنی حالت درست نہیں ہے۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' شانی نے پوچھا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے اس نے بہت واویلا کیا ہے۔ ڈرپس وغیرہ اُتار دی تھیں، بستر سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا مجھے مر جانے دو۔ مجھے زہر کا ٹیکہ لگا دو۔ سٹاف نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا اور کوئی سکون آور انجکشن دیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سویا ہے۔ پولیس والا بھی آیا ہوا تھا اس کا بیان لینے کے لئے لیکن ڈاکٹر نے منع کر دیا۔''

شانی اندر گئی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید تھا۔ کوئی کثافت نظر نہیں آ رہی تھی اس پر۔ اس کی آنکھوں کے نیچے وہ سفید پیپڑیاں سی تھیں جو آنسوؤں کے خشک ہونے سے بنتی ہیں۔ یہ چہرہ جیسے خاموشی کی زبان میں شانی سے کہہ رہا تھا۔۔۔۔ کیا محبت کرنا جرم ہے؟ اگر نہیں تو پھر اس کی سزا اتنی کڑی کیوں ہے؟ کیا لڑکیوں میں مر جانا یا ساری عمر سینے میں گھاؤ لے کر زندہ رہنا ہی میرا مقدر ہے؟

''نہیں!'' شانی کے دل نے پکار کر کہا۔ اس کے سینے سے ایک لہر اٹھی۔ اس لہر نے کی نس نس میں ایک بے نام توانائی بھر دی۔ وہ راجو کے ہاتھ کو چھوڑ کر آئی سی یو سے باہر نکل آئی۔ عارف سامنے ہی کھڑا تھا۔ شانی کے تاثرات دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے شانی؟''

''میں ایک کام سے جا رہی ہوں۔''

''کہاں؟'' عارف نے چونک کر پوچھا۔

''میں آ کر بتاؤں گی۔'' وہ حتمی لہجے میں بولی۔

''لیکن اس طرح اکیلی؟ کسی کو ساتھ لے جائیں۔''

''نہیں۔ وہاں مجھے اکیلے ہی جانا ہے۔'' شانی نے کہا اور عارف کو تسلی دے کر ہسپتال سے باہر آ گئی۔

سیف کے گھر میں ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ چوہدری بشیر کل سے ملتان آیا ہوا ہے۔ یہاں ملتان میں اس کی ٹیکسٹائل فرم کا نام وغیرہ بھی شانی کو پتا چل گیا تھا۔ لاہور کی طرح یہاں بھی چوہدری کی رہائش ٹیکسٹائل مل کے ساتھ ہی ایک کوٹھی میں تھی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ مزاروں، مسجدوں اور قدیم عمارتوں کا شہر ملتان دھیرے دھیرے جگمگانا شروع ہو گیا تھا۔ ہوا

میں ایک خوشگوار حرارت تھی۔ اس نے ٹیکسی لی اور عثمانیہ ٹیکسٹائل پہنچ گئی۔ وہ صورتِ حال کا مکمل جائزہ لینے کے بعد اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ موجودہ حالات میں اگر کوکی اور راجو کے ملاپ میں کوئی رکاوٹ ہے تو وہ راجو کا باپ نہیں ہے، چوہدری بشیر ہے۔ راجو کے باپ کے حوالے سے اسے یقین تھا کہ وہ جیتے بیٹے کی دگرگوں حالت دیکھ کر اپنی ہٹ دھرمی پر کسی صورت قائم نہیں رہ سکے گا۔ اب یہ معاملہ چوہدری بشیر، اس کے ارادے اور اس کی بے پناہ انا پرستی کا تھا۔ پچھلے پانچ چھ ماہ میں چوہدری بشیر بہت تبدیل ہوا تھا۔ یہ تبدیلیاں کئی طرح کی تھیں۔ چوہدری بشیر پیر قدرت اللہ جیسے لوگوں کے خلاف تھا اور انہیں بہروپیا قرار دیتا تھا لیکن جب وہ خود جلدی بیماری میں مبتلا ہوا تو اس کی ساری روشن خیالی ڈانواڈول ہوگئی۔ اب قدرت اللہ (حضرت صاحب) کے بارے میں اس کے خیالات وہ نہیں رہے تھے جو پہلے تھے۔ اسی طرح آج سے پانچ چھ ماہ پہلے تک وہ شانی پر دل و جان سے فدا تھا۔ اس کی خاطر اپنی پوری برادری سے ٹکر لینے پر تیار تھا لیکن اب وہ ایک سولہ سالہ لڑکی کو دلہن بنانے کے چکر میں پڑا ہوا تھا۔ وہی جاگیردارانہ سوچ جس میں عورت کو پالتو جانور کی طرح ضرورت کی چیز سمجھا جاتا ہے۔

.....اور آج اس نیم گرم شام میں شانی اسی چوہدری بشیر سے ملنے اور اس سے کچھ سوال پوچھنے جارہی تھی۔ شانی نے چادر اوڑھی ہوئی تھی اور اس نے پلو میں نقاب کی صورت چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ شولڈر بیگ اس کے کندھے پر تھا۔ عثمانیہ ٹیکسٹائل کے ساتھ واقع کوٹھی بہت وسیع تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ چار دیواری کے اندر دس بارہ کنال رقبہ احاطے کے طور پر موجود تھا۔ کوٹھی کی اصل بلڈنگ ایک طویل ڈرائیو وے سے آگے نظر آرہی تھی۔ احاطے میں کافی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کوئی تقریب وغیرہ ہے۔ ایک طرف تین چار کنال کے رقبے میں ایک قنات بھی دکھائی دے رہی تھی۔ گیٹ کے سامنے شانی ٹیکسی سے اُتری اور کرایہ دے کر کوٹھی کی سمت آئی۔ گیٹ پر موجود دو تنومند گارڈز اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''جی میڈم!'' ایک گارڈ نے اسے سرتاپا گھور کر پوچھا۔

''مجھے چوہدری بشیر صاحب سے ملنا ہے۔''

''آپ نے ٹائم لیا ہوا تھا؟'' ایک گارڈ نے پوچھا۔

شانی نے نفی میں سر ہلایا اور ایک پرچی گارڈز کی طرف بڑھادی۔ ''یہ چوہدری صاحب کو دکھا دیجئے۔'' پرچی پر شانی نے اپنا اصل نام شہناز ارشاد لکھا تھا۔

گارڈ پرچی لے کر چلا گیا۔ اس کی واپسی میں کافی دیر ہوئی۔ شانی کو احاطے سے

اُبھرنے والی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ رنگ برنگی قنات کے پیچھے کوئی کھیل تماشا ہو رہا ہے اور وہاں کافی تعداد میں تماشائی موجود ہیں۔ یہ تماشائی گاہے بگاہے تالیاں بجاتے تھے یا نعرہ ہائے تحسین بلند کرتے تھے۔ قنات کے پیچھے دودھیا روشنی نظر آرہی تھی اور ہلکا سا میوزک بھی تھا۔

کافی انتظار کے بعد گارڈ واپس آیا اور شانی کو اندر لے گیا۔ شانی دھڑکتے دل کے ساتھ قنات تک پہنچی۔ قنات کے پیچھے کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ یہاں کھلی جگہ پر آرام دہ کرسیاں اور صوفے وغیرہ لگے تھے۔ کرسیوں اور صوفوں کے درمیان کافی وسیع جگہ خالی تھی۔ اس خالی جگہ کو ایک چھ فٹ اونچے آہنی جنگلے کے ذریعے باقی پنڈال سے علیحدہ کیا گیا تھا۔ یہاں ریسلنگ والا ایک بڑا گدا بچھا ہوا تھا اور مختصر کپڑوں میں دو یورپین لڑکیاں کشتی میں مصروف تھیں۔ ان کے سنہری بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ بُری طرح ہانپ رہی تھیں لیکن ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں۔

پنڈال کی اگلی قطار میں جو آرام دہ صوفے رکھے تھے، ان پر کوئی یورپین اور مقامی مہمان تشریف فرما تھے۔ ان سفید فام مرد و زن کے درمیان شانی کو چوہدری بشیر بھی نظر آیا۔ وہ سفید براق شلوار قمیص میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا۔ اس کا سنہری کھسہ ٹیوب لائٹس کی دودھیا روشنی میں دمک رہا تھا۔ شانی نے پندرہ بیس میٹر کی دوری سے چوہدری بشیر کی طرف دیکھا لیکن وہ تماشے میں بُری طرح مگن تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے شانی کی آمد کی خبر ہی نہیں یا وہ جان بوجھ کر نظر انداز کر رہا ہے۔ شانی کو بعد میں پتا چلا، چوہدری کو خبر ہی نہیں تھی۔ دراصل وہ دیگر مہمانوں کی طرح نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے ملازم نے اسے شانی کے نام والی پرچی دکھائی اور اس نے ٹھیک سے پڑھے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ملازم نے سمجھا کہ اسے شانی کو لانے کا اذن مل گیا ہے۔

شانی خاموشی سے وہاں کھڑی یہ طوفانِ بدتمیزی دیکھتی رہی۔ یوں لگتا تھا یہاں باقاعدہ شرطیں وغیرہ لگی ہوئی ہیں۔ سفید فام مہمانوں سمیت بہت سے لوگ زبردست جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ سرخ لباس والی لڑکی کی دونوں عریاں ٹانگیں دہری ہو کر اس کی پیشانی سے چھو رہی تھیں اور وہ خود کو چھڑانے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی مگر دوسری لڑکی حاوی نظر آتی تھی۔ یہ ٹی وی پر دکھائی جانے والی نورا کشتیوں جیسی فائٹ نہیں تھی۔ اس میں حقیقی غیظ و غضب اور زور آزمائی نظر آرہی تھی۔ دونوں لڑکیاں زور آزمائی کے دوران میں فرطِ غضب سے چیخ بھی رہی تھیں۔ ایک دو منٹ تک یہ شدید کشمکش جاری رہی۔ حوا کی دو بیٹیاں درجنوں

مردوں کے سامنے اپنے وقار اور نسوانیت کا تیا پانچا کرتی رہیں۔ پھر مقامی ریفری نے گنتی کی اور تماشائیوں کے بلند شور میں ایک لڑکی کو فاتح قرار دے دیا۔ چوہدری بشیر کے قریب بیٹھا ہوا ایک سفید فام جوڑا اٹھ کر خوشی سے ناچنے لگا۔ دونوں نے جوشیلے انداز میں ایک دوسرے کے کئی طویل بوسے لئے اور Hurry کے نعرے بلند کئے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ جوڑا کوئی بڑی شرط جیت گیا ہے۔ ہارنے والی لڑکی مردانہ چال چلتی اور لنگڑاتی ہوئی ایک طرف اوجھل ہوگئی۔ جیتنے والی اپنے ساتھی مردوں کے کندھوں پر سواری کرنے لگی۔

شانی نے سوچا کہ شاید اب چوہدری اس کی طرف متوجہ ہوگا لیکن وہ تو اپنے غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ جام لنڈھانے میں مصروف تھا۔ غیر ملکی مہمانوں میں ایک دو عورتوں کے لباس موسم کی نسبت سے بے حد مختصر تھے۔ ایک عورت کی عریاں ٹانگوں پر اس کے ساتھی مرد کے ہاتھ مسلسل رینگ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ مے نوشی بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ اسی دوران میں دوسری کشتی شروع ہوگئی۔ یہ مردانہ کشتی تھی۔ ایک مقامی پہلوان تھا اور دوسرا انگریز، مقامی پہلوان کا جسم خاصا کسرتی تھا اور وہ جدید کشتی میں طاق نظر آتا تھا۔ تماشائی ایک بار پھر اس کھیل میں پوری طرح غرق ہوگئے۔ اپنے اپنے پہلوان کے حق میں جوشیلے نعرے بلند کئے جانے لگے۔ یہ رومن سٹائل کی کشتی تھی جس میں حریف کو ضربات نہیں لگائی جاتیں صرف پچھاڑا جاتا ہے۔ ایک گارڈ کے کہنے پر شانی ایک طرف پڑی خالی کرسیوں کی طرف بڑھی اور بیٹھ گئی۔ کشتی دم بدم زور پکڑ رہی تھی۔ ہیجان خیز میوزک ان مناظر کو اور بھی تاثر انگیز بنا رہا تھا۔

شانی سمجھ گئی تھی کہ وہ غلط وقت پر یہاں آ گئی ہے۔ وہ اٹھنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک کوٹھی کی طرف سے دو تین افراد کے چلانے کی آواز آئی پھر کوئی عورت خوفزدہ انداز میں چیختی چلی گئی۔ بہت سے تماشائی مڑ کر کوٹھی کی عمارت کی طرف دیکھنے لگے۔ عمارت کا داخلی دروازہ بمشکل پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر تھا۔ میوزک تھم گیا۔ ریفری نے کشتی رکوادی۔ یکایک کوٹھی کے کسی اندرونی حصے سے کوئی بڑا شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی دو تین عورتیں مل کر چلانے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے پنڈال میں سراسیمگی پھیل گئی۔ لمبا تڑنگا چوہدری بشیر نشے میں ڈولتا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔ تمام تماشائی بھی اکھاڑے کی طرف سے منہ پھیر کر عمارت کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ سراسیمگی کی کیفیت بڑھتی جارہی تھی۔ کوٹھی کے اندر سے ایک شخص تیزی سے باہر نکلا۔ یہ کوئی ملازم تھا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے خوفزدہ انداز میں بشیر سے کچھ کہا اور

انگلی سے دائیں طرف اشارہ کیا۔ اسی دوران میں دو تین افراد مزید باہر نکل آئے اور اسی جانب اشارہ کرنے لگے۔ وہ سب ہانپ رہے تھے اور ان کے رنگ زرد تھے۔ چوہدری بشیر چند لمحے تو متذبذب رہا پھر دو تین گارڈز کے ساتھ وہ داخلی دروازے میں گھس گیا۔ زخمی شخص دہشت زدہ انداز میں بار بار چند کھڑکیوں کی طرف اشارہ کررہا تھا اور چیخ رہا تھا۔ اسی دوران میں کوٹھی کے عقب سے گرے باؤنڈ کتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید انہوں نے بھی اس خوف کو محسوس کرلیا تھا جسے کوٹھی کے ملازمین محسوس کررہے تھے۔ دفعتاً شانی کو عمارت کی لمبوتری کھڑکیوں کے عقب سے ایک مدھم آواز سنائی دی اور اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ یہ کسی جانور کی آواز تھی۔ کس جانور کی تھی؟ یہ بات شانی نہیں جان سکی۔ ایک طیش بھری چیختی ہوئی باریک لیکن وحشی آواز۔ ان کھڑکیوں کے پیچھے کوئی تھا اور وہ جو بھی کوئی تھا اس کی موجودگی مکینوں کو سخت ہراساں کررہی تھی۔ اندر سے اکھاڑ پچھاڑ کی آوازیں آرہی تھیں اور گاہے بگاہے وہ آواز بھی سنائی دیتی تھی۔

پھر ایک فائر ہوا۔ یہ بڑے بور کی رائفل کا فائر تھا۔ دھماکے کی آواز دور تک گئی۔ یہ فائر لمبوتری کھڑکیوں کے عقب میں ہوا تھا لیکن اس کے بعد جو کچھ ظہور پذیر ہوا وہ لمبوتری کھڑکیوں کی طرف سے نہیں دائیں جانب ایک بڑے بلوری دروازے کی طرف سے ہوا۔ ایک زوردار چھناکا ہوا اور ایک چھ سات فٹ اونچا سیاہ جسم تیزی سے باہر آیا۔ شانی کانپ اٹھی۔ یہ ایک قوی ہیکل جنگلی ریچھ تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی انگارہ آنکھیں دودھیا روشنی میں چمکیں۔ اس کی خوفناک تھوتھنی کھلی تھی اور اندر سے لمبے سفید دانت جھانک رہے تھے۔ وہ اتنی تیزی سے حملہ آور ہوا کہ کسی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

سب سے پہلے اس کی زد میں وہی نیم برہنہ سفید فام لڑکی آئی جس نے شرط جیتنے کے بعد اپنے ساتھی مرد کو کئی طویل بوسے دیئے تھے۔ ریچھ نے اسے پنجہ مارا اس کا مختصر بالائی لباس نشو پیپر کی طرح کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا اور وہ دہشت سے چیختی ہوئی کئی فٹ دور جا گری۔ اس کے بعد ایک مقامی میٹھ ریچھ کے پنجوں کی ضربات کھا کر سوئمنگ پول میں گرا۔ پھر ایک اور عورت ریچھ کے ہتھے چڑھی۔ یہ مقامی تھی اور اس کی گود میں ایک بچہ بھی تھا۔ ریچھ نے اسے اپنے خونی پنجوں میں دبوچا اور ایک لطمے میں اس کی شہ رگ ادھیڑ کر رکھ دی۔ بدنصیب عورت چلاتی ہوئی اوندھے منہ گری۔ بچہ اب بھی اس کی بانہوں میں دبا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ دو یا تین سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا۔ درجنوں تماشائی مڑے اور دیوانہ وار چلاتے ہوئے خونی جانور کی مخالف سمت میں بھاگے۔ شانی بھی بھاگنے والوں میں شامل تھی۔ اس

سے دو قدم آگے وہ لمبی ترنگی عورت بھاگ رہی تھی جس نے تھوڑی دیر پہلے میدان جیتا تھا.....

شانی دس پندرہ قدم تک بھاگنے والوں میں شامل رہی لیکن پھر وہ رک گئی۔ اس کے کانوں میں مسلسل بچے کی دہشت زدہ چیخیں گونج رہی تھیں۔ ''ممی..... ممی!'' وہ مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ شانی نے مڑ کر دیکھا۔ وہ زخمی عورت کے نیچے دبا ہوا تھا۔ صرف اس کا آدھا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ریچھ کے قاتل پنجے کسی بھی لمحے اس تک پہنچ سکتے تھے۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ وہ کس کا بچہ ہے؟ اور اسے کیسے بچایا جا سکتا ہے؟ یہی کافی تھا کہ وہ بچہ ہے اور موت کے منہ میں ہے..... شانی ایک کمزور و ناتواں ہستی تھی لیکن اس کے اندر چھپی ہوئی عورت کمزور نہیں تھی۔ وہ رک تو پہلے ہی چکی تھی، اب وہ مڑی اور بچے کی طرف بھاگی.....

☆======☆======☆

چار پانچ سالہ بچہ خوف سے چیخ رہا تھا۔ ''ممی..... ممی۔'' ریچھ کی خوفناک سیاہ پشت شانی کی طرف تھی۔ شانی کو اپنے اور ریچھ کے درمیان ایک کام کی شے نظر آئی۔ یہ ایک ٹوٹے ہوئے صوفے کا چوبی بازو تھا۔ وہ بھاگتے بھاگتے رک گئی لیکن صرف ایک لمحے کے لئے۔ اس نے وہ موٹا چوبی بازو اٹھایا اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر خونی جانور پر پل پڑی۔ لکڑی کی دو نہایت شدید ضربیں ریچھ کی کنپٹی پر لگیں۔ وہ منہ سے ایک طیش بھری آواز نکال کر پلٹا اور شانی پر جھپٹا..... خدا کی پناہ..... اس کی چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھوں میں قاتلانہ چمک تھی۔ سفید دانت خطرناک انداز میں تھوتھنی میں سے جھانک رہے تھے۔ اس کے گلے میں سرخ رنگ کا ایک چوڑا پٹا اور مونی رسی بھی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس موذی جانور کو کہیں باندھا گیا تھا اور یہ وہاں سے رسی تڑا کر بھاگ نکلا ہے۔

حیوانی ہُو کا ایک ناگوار جھونکا شانی کے نتھنوں سے ٹکرایا۔ ریچھ کی قاتل تھوتھنی اسے اپنے چہرے سے بمشکل تین فٹ کے فاصلے پر نظر آئی۔ شانی نے پیچھے ہٹتے ہوئے ایک بار پھر پورے زور سے جانور کے منہ پر وار کیا۔ گوشت اور لکڑی کے ٹکرانے سے ''بھد'' کی لرزہ خیز آواز ابھری، پھر دوسری..... پھر تیسری۔ شانی نے اگلے قدموں سے پیچھے ہٹتے ہوئے تین ضربیں لگائیں۔ ریچھ کی سیاہ تھوتھنی سے اُڑنے والے خون کے چھینٹے اسے صاف دکھائی دیئے۔ اس کے کانوں میں اَن گنت دہشت زدہ چیخیں گونج رہی تھیں۔ یہ اس کے اردگرد موجود مرد و زن تھے۔ وہ پیچھے ہٹ رہی تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ مشتعل جانور کا جوابی وار بڑا سخت ہوگا..... جانور کے نوکیلے پنجوں نے ابھی اسے چھوا نہیں تھا لیکن اسے ان پنجوں کی

بے پناہ کاٹ کا اندازہ تھا۔

کیا مجھے کوئی بچانے آئے گا..... یہ سوال بے پناہ شدت سے شانی کے ذہن میں گونجا۔

اچانک اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ نشیب میں گری۔ پانی کا زوردار چھپاکا ہوا۔ وہ سوئمنگ پول میں گری تھی۔ نیم سرد پانی نے ایک ساعت میں اس کے سارے جسم کو بھگو دیا۔ لکڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے دیکھا، بپھرے ہوئے جانور نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر شانی کے پیچھے پول میں چھلانگ لگا دی۔ وہ کسی گائیڈڈ میزائل کی طرح شانی کے پیچھے تھا۔ یہ سوئمنگ پول کا اتھلا حصہ تھا۔ شانی کے پاؤں پول کے فرش کو چھو رہے تھے..... لیکن یہ اس کی زندگی کے بدترین لمحے تھے، کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

پھر شانی نے یکے بعد دیگرے تین خوفناک دھماکے سنے۔ اسے لگا کہ دو مرتبہ ریچھ کے جسم کو شدید جھٹکا لگا ہے۔ چند سیکنڈ بعد نسبتاً قریب سے ایک اور دھماکہ ہوا۔ شانی نے دھماکے کے ساتھ ہی اپنی بائیں جانب سے ایک شعلہ بھی لپکتے دیکھا۔ ریچھ پلٹ کر پانی میں گرا۔ ایک بار پھر زوردار چھپاکا ہوا..... شانی کو پول کے نیلگوں پانی میں ایک دم سرخی تیرتی نظر آئی۔ یقیناً یہ ریچھ ہی کا خون تھا۔ چلانے کی آوازیں چاروں طرف سے بدستور بلند ہو رہی تھیں۔ کچھ افراد پانی میں کود پڑے، انہوں نے شانی کو سنبھالا اور سہارا دے کر باہر نکال لیا۔ چند افراد اس مقامی سیٹھ کو بھی سہارا دے رہے تھے جو خونی جانور کے دھکے سے پانی میں گرا تھا۔

پھر شانی کو اپنے سامنے چوہدری بشیر دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ غالباً اس کا سارا نشہ اب ہرن ہو چکا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شانی کو دیکھنے لگا۔ ایک انگریز عورت تیزی سے آگے بڑھی اور اس نے اپنی گرم شال شانی کے کندھوں پر ڈال دی۔

''تمہیں کوئی زخم تو نہیں آیا؟'' کسی عورت نے شانی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' شانی نے جواب دیا۔

ایک دوسری عورت نے آگے بڑھ کر شانی کو اپنے ساتھ لگا لیا اور سسکیاں لینے لگی۔ چند فٹ کے فاصلے پر کہرام مچا ہوا تھا۔ جس عورت کی شہ رگ پر ریچھ نے پنجہ مارا تھا، وہ آخری سانسیں لے رہی تھی۔ چند افراد نے اسے ہاتھوں میں اٹھایا اور گاڑیوں کی طرف چلے گئے۔ عورت کو بچانے کی ''رسمی'' کوشش کی جا رہی تھی۔ جس بچے کو شانی نے بچایا تھا وہ گورا چٹا سفید فام تھا۔ اس کے بال سنہری مائل تھے۔ گردن پر چند خراشوں کے سوا اسے کوئی زخم نہیں آیا تھا۔ اب وہ اسی انگریز عورت کی گود میں تھا جس نے زار دیر پہلے شانی کو گلے سے لگا کر سسکیاں لی

تھیں۔

اب وہ بچے سمیت ایک بار پھر شانی کے گلے سے لگ گئی اور اس کا بھیگا ہوا سر چومنے لگی۔ اس نے انگلش میں کہا۔ ''تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ میں ذرا واش روم تک گئی تھی باہر آ کر دیکھا تو قیامت مچی ہوئی تھی۔''

''وہ عورت کون تھی جس کے پاس بچہ تھا؟'' ایک مہمان نے اردو میں پوچھا۔

''وہ اس کی آیا تھی۔'' چوہدری بشیر نے بھاری آواز میں کہا۔

''پتا نہیں، پچتی بھی ہے یا نہیں۔'' ایک اور شخص نے خدشہ ظاہر کیا۔

چوہدری بشیر ابھی تک حیرت زدہ نظروں سے شانی کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ شانی یہاں کیسے اور کیونکر پہنچی۔

دور دور تک بکھر جانے والے مہمان اب سمٹ کر جائے واردات کی طرف آ رہے تھے۔ کچھ لوگ تالاب کے پاس مر جانے والے ریچھ کے گرد جمع تھے، اس کا بہت بڑا سیاہ جسم پانی میں ڈولتا ہوا خوفناک لگ رہا تھا۔ کوٹھی کے احاطے میں ہر طرف الٹی ہوئی کرسیاں، بکھری ہوئی جوتیاں اور دیگر سامان دکھائی دے رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے بیٹی کو اندر لے جاؤ۔ ساری بھیگ گئی ہے بے چاری۔'' ایک بڑی عمر کے شخص نے شانی کے بارے میں مشورہ دیا۔

چوہدری بشیر اور دیگر افراد شانی کو لے کر کمروں کی طرف آ گئے۔ راستے میں شانی نے ننھے فام بچے کو اٹھایا اور کئی بار اس کا منہ چوما۔ ایسا کرتے ہوئے شانی کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے تھے۔

''یہ ہیں کون؟'' مہمانوں میں سے کسی کی آواز شانی کے کانوں سے ٹکرائی۔

''میری عزیزہ ہیں۔'' چوہدری بشیر نے جواب دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد شانی، چوہدری بشیر کے ساتھ ایک کمرے میں موجود تھی۔ انگریز عورت کی گرم شال ابھی تک شانی کے کندھوں پر تھی۔ چوہدری بشیر نے ایک ملازمہ کو شانی کے پاس چھوڑا اور گیس ہیٹر لگوا دیا۔ شانی سے بولا۔ ''تم چاہو تو کپڑے وغیرہ بدل سکتی ہو۔ میں باہر کا بندوبست کرا بھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ باہر چلا گیا۔ ملازمہ شانی کے قریب خاموش کھڑی تھی۔ شانی نے سر اٹھا کر دیکھا تو چونک گئی۔ یہ زہرا تھی۔ لاہور والی کوٹھی کی وہی نوعمر ملازمہ جو اکثر ''ہیڈ ٹو کرائی'' جالاں کے جبر و تشدد کا شکار رہتی تھی۔ کوٹھی میں کئی مرتبہ زہرا کو جالاں کی زبردست مار پیٹ کا سامنا کرنا پڑا تھا اور پھر ایک مرتبہ چوہدری بشیر نے بھی اسے مارا تھا۔

وجہ یہ تھی کہ وہ موبائل سیٹ چوہدری کی نظر میں آ گیا تھا جس پر شانی، رستم سے رابطہ کرتی تھی۔ چوہدری کو شک گزرا کہ شاید اس موبائل کا تعلق زہرا سے ہے۔

ایک لمحے میں شانی کو سب کچھ یاد آ گیا۔ زہرا نے حیرانی سے کہا۔ ''چوہدرانی جی! آپ پھر یہاں آ گئی ہیں؟ آپ کیوں آئی ہیں یہاں؟''

''بس زہرا..... آنا پڑا ہے اگر وقت ملا تو تمہیں تفصیل بتاؤں گی۔ ابھی تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ خونی جانور یہاں کوٹھی میں پہنچا کس طرح تھا؟''

زہرا نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''چوہدرانی جی! آپ کو تو پتا ہی ہے کہ ان کوٹھیوں اور حویلیوں میں مالک لوگ کیا کیا تماشے کرتے ہیں۔ یہاں بھی آج کچھ الٹے سیدھے تماشے ہو رہے تھے۔ پتا نہیں کہ آپ نے دیکھا ہے یا نہیں، ابھی باہر احاطے میں انگریز لڑکیوں کی کشتی ہو رہی تھی۔ وہ آدھی سے زیادہ ننگی تھیں۔ ان کو دیکھ کر بھی شرم آتی تھی۔ اس کے بعد ریچھ اور کتوں کی لڑائی ہونی تھی۔ اس لڑائی پر بڑی بڑی شرطیں لگی ہوئی تھیں۔ آپ نے باہر دیکھا ہی ہوگا، کچھ انگریز لوگ بھی تماشا دیکھنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ یہ چوہدری جی کے ملاقاتی ہیں۔ کویت میں ان کے ساتھ رہے تھے۔''

بات اب شانی کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ ریچھ اور کتوں کی لڑائی دیہی علاقوں میں ایک خاص تفریح ہے اس نامعقول کھیل کو دیکھنے کے لئے لوگ سینکڑوں کی تعداد میں کھلے میدانوں میں جمع ہوتے ہیں اور شور شرابا کرتے ہیں۔ آج یہ لڑائی اس وسیع و عریض کوٹھی کے احاطے میں ہونے والی تھی۔

''لیکن یہ ریچھ کھل کیسے گیا؟'' شانی نے پوچھا۔

''یہ ایک نہیں ہے جی دو ریچھ ہیں۔ مجھ سے لڑاکے کتے بھی پچھواڑے میں بندھے ہوئے ہیں۔ دراصل چوہدری جی کے کارندوں ارشد حسین وغیرہ نے ریچھوں کو ذرا تیز کرنے کے لئے انہیں شراب پلائی ہے۔ اس ریچھ نے شاید کچھ زیادہ ہی پی لی تھی۔ رسّی تڑا کر بھاگ نکلا اور باورچی خانے کے کھلے دروازے سے اندر گھس آیا۔ یہاں کافی توڑ پھوڑ کی ہے جی اس نے۔ کئی دروازے اور شیشے برباد ہوئے ہیں۔ شادی کے لئے بہت سی رنگ دار بتیاں چوہدری جی لاہور سے لے کر آئے تھے وہ بھی کرچی کرچی ہو گئیں۔''

شانی چونک گئی۔ اس نے پوچھا ''کس کی شادی ہو رہی ہے یہاں؟''

زہرا نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا پھر سرگوشی میں بولی۔ ''آپ کو نہیں پتا جی؟'' شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ زہرا دو تین سیکنڈ خاموش رہی، پھر کہنے لگی۔ ''میری جان پہلے ہی بڑی

مصیبت میں آئی رہتی ہے جی۔ آپ کسی کو یہ نہ بتانا کہ میں نے کچھ کہا ہے۔"

"زہرا! تمہیں میرا پتا ہی ہے۔" شانی نے اسے تسلی دی۔

وہ بولی۔ "چوہدرانی جی! چوہدری صاحب ویاہ کر رہے ہیں۔ یہاں ملتان کی ہی ایک کُڑی ہے۔ سنا ہے کہ عمر کی بھی زیادہ نہیں ہے لیکن ہے سوہنی۔ اگلے ہفتے چوہدری جی اسی کوٹھی سے اس کُڑی کی جنج لے کر جائیں گے۔"

"تمہیں پکا پتا ہے؟" شانی نے پوچھا۔ زہرا نے ایک بار پھر پورے زور و شور سے تصدیق کی۔ شانی نے زہرا سے پوچھا۔ "مُنا کہاں ہے؟"

"وہ بھی یہاں ہی ہے جی۔ اوپر والی منزل پر سو رہا ہے۔ آج کل فردوس اس کی آیا بنی ہوئی ہے۔"

مُنے کا ذکر سن کر شانی کا دل دھڑک اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھے اور دروازوں، دیواروں سے ہوا کی طرح گزرتی ہوئی مُنے تک پہنچ جائے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس سوچ کو عملی جامہ پہنانا ممکن نہیں ہے۔ شانی نے زہرا سے مُنے کے بارے میں چند مزید باتیں پوچھیں۔ اسی دوران میں باہر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ زہرا صورتِ حال جاننے کے لئے باہر گئی۔ وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ دھواں دھواں تھا۔ اس نے بتایا کہ زخمی ہونے والی عورت چل بسی ہے۔ اس کی گردن شرابی ریچھ کے پنجے سے بُری طرح زخمی ہوئی تھی اور ہسپتال پہنچنے تک اس کے جسم کا بہت سا خون بہہ چکا تھا۔

اتنے میں بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ شانی اس چاپ کو بڑی اچھی طرح پہچانتی تھی۔ چوہدری بشیر آ رہا تھا، اپنی تمام تر چودھراہٹ اور رعب و دبدبے کے ساتھ۔ اس کے آتے ہی زہرا اپنی اوڑھنی درست کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ چوہدری نے دروازہ بھیڑ دیا اور شانی کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ لگتا تھا کہ وہ اچھی طرح منہ ہاتھ دھو کر آیا ہے۔ اس کی آنکھیں ابھی تک سرخ تھیں لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ نشہ اُتر چکا ہے۔ وہ بولا۔ "میرے دماغ میں کئی سوال اٹھ رہے ہیں لیکن سب سے پہلے تو میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے بروقت ہمت کی اور کوشش کر کے سٹیفن کے بچے کو موت کے منہ سے بچایا۔ بچے کی والدہ گریس تمہاری بے حد شکر گزار ہیں اور تم سے دوبارہ ملنا چاہتی ہیں۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا چوہدری صاحب! جو کچھ ہوا اللہ کی طرف سے ہوا، میں تو صرف وسیلہ بنی ہوں۔"

"میں تمہیں یہاں دیکھ کر بہت زیادہ حیران ہوا ہوں۔ ابھی تک میری سمجھ میں کچھ نہیں

آ رہا۔" چوہدری بولا۔

شانی نے کہا۔ "میں نے کچھ دیر پہلے آپ کے لئے چٹ بھجوائی تھی۔ پتا نہیں کہ آپ کو ملی ہے یا نہیں۔"

"کیسی چٹ تھی؟"

"میں نے آپ سے آپ کے گھر میں آنے کی اجازت مانگی تھی۔"

چوہدری نے ذرا چونک کر اپنی گرم واسکٹ کی جیبیں ٹٹولیں۔ چٹ نکل آئی۔ چوہدری نے چٹ پڑھی۔ اندازہ ہوا کہ وہ پہلی بار چٹ دیکھ رہا ہے۔ ایک لمبی سانس لے کر اس نے چٹ دوبارہ جیب میں رکھ لی۔ اس کی نظر بے ساختہ شانی کی طرف گئی۔ شانی کے جسم پر نم لباس تھا اور اس کی نسوانیت کو نمایاں کر رہا تھا۔ چوہدری کی پاٹ دار آواز شانی کے کانوں میں گونجی۔ "دو دن پہلے لاہور میں جب تمہارا فون آیا تو میں نے ہرگز نہیں سوچا تھا کہ اتنی جلدی تم سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔"

"بس آپ سے ایک دو باتیں کرنا تھیں، اس لئے یہ ملاقات ضروری تھی۔"

"میں جانتا ہوں، تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ تم مُنے سے ملنا چاہتی ہو لیکن تم میری مجبوریاں سمجھنے کی کوشش بالکل نہیں کر رہی ہو۔ مُنے سے ملنے اور اسے اپنانے کا ایک وقت تھا۔ جو تم کھو چکی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ میں بھی کافی کچھ کھو چکا ہوں۔ اب میں بڑی مشکلوں کے بعد مُنے کو سنبھالنے میں کامیاب ہوا ہوں...... میں اس کی بہتری کے لئے بہت کچھ سوچ رہا ہوں اور بہت کچھ سوچ بھی چکا ہوں۔ چند دن میں ایک دو بڑی تبدیلیاں آنے والی ہیں۔ میں اپنی زندگی کو بڑی مشکل سے نئی Shape دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اب میں اس بات کی اجازت کسی کو ہرگز نہیں دوں گا کہ وہ مجھے یا میرے بچے کو پھر سے ڈسٹرب کرے۔"

شانی نے چند لمحے توقف کیا اور بولی۔ "آپ جن ایک دو تبدیلیوں کی بات کر رہے ہیں ان کے بارے میں، میں بھی تھوڑا بہت جانتی ہوں۔ آپ شادی کر رہے ہیں۔"

بشیر چند سیکنڈ تک شانی کا چہرہ تکتا رہا، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہاں، میں کر رہا ہوں شادی۔ تمہاری دغا بازی کے بعد میں اس طرح ٹوٹ پھوٹ گیا تھا کہ زندگی کی شکل ہی پہچانی نہیں جاتی تھی لیکن اب امید پیدا ہو رہی ہے کہ شاید جینے کا کوئی راستہ نکل آئے۔"

"دغا بازی" کا لفظ سیدھا شانی کے دل پر لگا لیکن وہ اس لفظ کی وضاحت طلب کر کے

چوہدری بشیر سے کسی لمبی بحث کا آغاز نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کس طرح اسے دغاباز کہہ سکتا تھا۔ اس کے اور شانی کے درمیان مُنے کے سوا کوئی رابطہ نہیں تھا، کوئی ناتا نہیں تھا۔ اگر چوہدری بشیر کے دل میں ''کچھ'' تھا تو وہ یک طرفہ تھا۔ اس یک طرفہ جذبے کے زیر اثر وہ شانی کے قریب آنے کے لئے حربے استعمال کرتا رہا تھا۔ اس نے اپنے معصوم بچے کو بھی حربے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ مُنے کے ذریعے شانی کو بلیک میل کرنے کی مسلسل کوشش کی تھی اور ایک موقع پر کامیاب بھی ہوا تھا۔

شانی کو اپنے چہرے پر ماضی کا وہی کراہت آمیز لمس محسوس ہونے لگا جب اس کے چہرے سے چوہدری کی بدبودار سانسیں ٹکرائی تھیں اور اس کی پشت پر ایک سخت دیوار تھی۔

اس نے چوہدری کا زہریلا لفظ بڑے تحمل سے برداشت کیا اور بولی۔ ''چوہدری بشیر! آپ اونچی حیثیت اور رُتبے کے مالک ہیں۔ آپ کو خدا نے بہت کچھ دیا ہوا ہے۔ آپ جس طرف نظر اٹھائیں گے آپ کو اپنے لئے اچھی سے اچھی شریکِ حیات نظر آئے گی۔ اس حوالے سے آپ کو کسی طرح کی کوئی کمی نہیں ہے۔ مم..... میں چاہتی ہوں کہ آپ اپنے لئے کوئی بہتر شریکِ حیات ڈھونڈیں۔''

چوہدری نے چونک کر شانی کو دیکھا۔ ''کیا کہنا چاہ رہی ہو۔ کیا تم اس لڑکی کو جانتی ہوں جو میرے گھر آرہی ہے؟'' شانی نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

چوہدری کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس کا چہرہ تمتمانے لگا اور ''جلدی بیماری'' کے جو دو تین داغ ہنوز اس کی پیشانی اور رخسار پر موجود تھے مزید نمایاں ہو گئے۔ ''تم کہاں ملی ہو اس سے؟'' وہ کڑے لہجے میں بولا۔

''بس اتفاق سے ملاقات ہوگئی ہے اور مجھے پتا چلا ہے کہ پاک پتن کے کریانہ فروش سیف کی بیٹی آپ کی بیوی بننے والی ہے۔ امید ہے کہ آپ اس بارے میں تفصیل نہیں پوچھیں گے۔''

چوہدری بشیر کچھ دیر تک شانی کو گھورنے کے بعد بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں نہیں پوچھتا تم سے تفصیل، لیکن تمہیں کیا کمی نظر آئی ہے اس لڑکی میں؟''

''لڑکی میں کوئی کمی نہیں ہے چوہدری صاحب! اس بے چاری کو تو ماں باپ جس ڈولے میں بٹھائیں گے وہ بیٹھ جائے گی اور زندگی بھر ڈولے میں بیٹھنے کا حق بھی ادا کرتی رہے گی۔ کمی ان حالات میں ہے جن سے وہ گزر رہی ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ بھی ان حالات کے بارے میں تھوڑا بہت جانتے ہیں.....''

''مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ کوئی لڑکا ہے جو کوکب اور اس کے گھر والوں کو پریشان کر رہا ہے۔ گھر کے سامنے ایک دکان پر اڈا بنا کر بیٹھا رہتا ہے، کوکب کا پیچھا بھی کرتا ہے۔ ایسے لوفروں کی شہری علاقوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔ میرے دو بندے سیف کے محلے میں گئے تھے اور اس کا دماغ درست کر دیا تھا۔''

''اس کے بعد کسی واقعے کا آپ کو پتا نہیں؟'' شانی نے دریافت کیا۔

''پرسوں پتا چلا تھا کہ اس نے کوئی زہریلی شے کھا کر خودکشی کا ڈرامہ رچایا ہے۔'' چوہدری نے بے زار لہجے میں کہا۔

''اس نے ڈرامہ نہیں رچایا، وہ مرتے مرتے بچا ہے۔ مجھے اس لڑکے سے کوئی غرض نہیں اور نہ کوئی تعلق واسطہ ہے لیکن میں جو کہہ رہی ہوں، سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ بہت بُری طرح لڑکی کے چکر میں ہے۔ جہاں تک لڑکی کی بات ہے، وہ پوری طرح اپنے ماں باپ کی فرمانبردار ہے۔ وہ اس کے لئے جو فیصلہ کریں گے وہ اس پر سر جھکا دے گی لیکن.....'' شانی کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

''بات مکمل کرو۔'' چوہدری تحکم سے بولا۔

''چوہدری جی، شاید وہ لڑکی آپ کو وہ محبت اور خوشی نہ دے سکے جس کے آپ شادی کے بعد حق دار ہوں گے۔ آپ انجان نہیں ہیں۔ آپ ان معاملوں کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔''

''یہ سب کہنے سننے کی باتیں ہیں۔'' چوہدری بے زاری سے بولا۔ ''فلموں اور کہانیوں والے عشق اب اس نئے زمانے میں نہیں ہوتے اگر کسی کے سر پر اس قسم کا بھوت سوار ہو بھی تو شادی کے بعد ایک دو مہینے میں اُتر جاتا ہے۔ تمہیں اس معاملے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے حالات کو اور اپنی ہونے والی بیوی کو تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''سب ٹھیک تو ہو جائے گا چوہدری صاحب..... کیونکہ آپ جیسے لوگ سب ٹھیک کر لیتے ہیں مگر بات تو سچی محبت اور سچی خوشی کی آجاتی ہے.....''

''سچی محبت اور خوشی۔'' چوہدری نے خوب چبا کر کہا۔ ''کیا تم مجھے دے سکتی ہو یہ سچی محبت اور خوشی؟'' یہ سوال پوچھتے ہوئے وہ براہِ راست شانی کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

شانی لرز کر رہ گئی۔ ہونٹ ایک لمحے میں خشک ہو گئے۔ چوہدری نے زہریلے الفاظ کی بوچھاڑ کی۔ ''تمہارے پاس کہاں سے آئے گی محبت اور خوشی۔ تم تو یہ سب کچھ اعلیٰ خاندان

کے ایک اعلیٰ چشم و چراغ کو دے چکی ہو۔ وہ بندہ جس کی نیک نامیوں کی تفصیل پنجاب کے ہر تھانے میں لکھی ہوئی ہے۔ جس نے درجنوں سہاگ اجاڑے ہیں، اَن گنت بچوں کو یتیم کیا ہے۔ جو پتا نہیں کتنی عزتوں کا لٹیرا اور کتنے بے گناہوں کا قاتل ہے۔ سوچتا ہوں تو دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ کہاں رنگ والی کی وڈی آپا اور اُچے شملہ والا چوہدری ارشاد.....اور کہاں ان کی یہ بیٹی جس نے ایک ڈاکو سے ڈنکے کی چوٹ پر یارانہ لگا رکھا ہے.....''

''خدا کے لئے چوہدری.....خدا کے لئے۔ مجھ پر ایسے الزام نہ دھریں جنہیں میں برداشت نہ کرسکوں۔ میں پہلے ہی بہت زخمی ہوں، مجھے اور زخمی نہ کریں۔''

شانی باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگی۔ موٹے موٹے آنسو اس کے ہاتھوں اور جھولی میں گرے۔ چوہدری خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر رحم کی کوئی رمق نمودار نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد شانی نے کہا۔ ''میں یہاں صرف اس لئے آئی ہوں کہ آپ کو اس شادی سے روک سکوں۔ آپ یہ شادی نہ کریں، یہ ہی آپ کے لئے اچھا ہوگا۔ آپ کے لئے بہترین رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ کوئی اور ڈھونڈ لیں اپنے لئے جو دل و جان سے آپ کی شریکِ حیات بن سکے۔ میں یہ بات پورے خلوص سے کہہ رہی ہوں۔''

چوہدری اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''تم نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ تم کیسے کوکب اور اس کے گھر والوں سے ملی ہو؟ کہاں جوہر آباد اور کہاں ملتان شہر۔ تم یہاں پہنچی کیسے ہو؟''

''میں نے آپ سے سب سے پہلے یہی درخواست کی تھی کہ آپ مجھ سے اس بارے میں نہیں پوچھیں گے، کیونکہ اس سے آپ کو کچھ حاصل بھی نہیں ہوگا لیکن وہ ساری باتیں میں آپ کو بتا سکتی ہوں جن سے آپ کو کچھ حاصل ہوگا۔''

''کیا مطلب؟''

شانی نے الٹے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ کو پتا ہے کہ جس لڑکے نے کوکب کے لئے خودکشی کی ہے، وہ کون ہے؟''

''نہیں..... مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔'' وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

''آپ کو پتا ہوتا تو شاید آپ اس معاملے کی سنگینی کو زیادہ اچھی طرح محسوس کر سکتے۔'' شانی نے کہا، پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''وہ لڑکا رشتے میں آپ کا کزن ہے..... میانہ کے تاؤ حشام کا بیٹا ہے۔''

''تاؤ حشام کا؟'' چوہدری نے بے حد حیرت سے کہا۔ عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں معمول سے زیادہ بڑی نظر آنے لگیں۔ وہ کچھ دیر تک غیر یقینی نظروں سے شانی کو دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔ ''لیکن تاؤ حشام کے تو کئی بیٹے ہیں، تم کس کی بات کر رہی ہو؟''

''سب سے چھوٹے راجو کی۔''

چوہدری کا بھاری بھرکم چہرہ حیرت کی تصویر بننے لگا۔ شانی نے چوہدری کو اس بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتائی۔ وہ توجہ سے سنتا رہا۔ تاہم اس کے چہرے کی سختی میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ شانی نے آخر میں چوہدری کو یہ بھی بتا دیا کہ کوکب اب بھی شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ کل بھی وہ اپنے والد کے ذرا اونچا بولنے کی وجہ سے چکرا کر گر گئی اور بے ہوش ہوگئی۔ کیا پتا وہ چوہدری کے گھر جا کر بھی ایسے ہی حالات کا شکار رہے یا حالات اس سے بھی ابتر ہو جائیں۔

چوہدری نے سب کچھ سننے کے بعد ایک گہری سانس لی۔ ''شادی کی ساری تیاری ہو چکی ہے۔ یہ معاملہ اب اتنا آگے بڑھ چکا ہے کہ واپسی ممکن نہیں ہے۔ بہرحال تم نے جو ایک دو باتیں بتائی ہیں وہ بھی قابلِ غور ہیں۔ میں اس معاملے پر سوچ بچار کرنے کے بعد ہی کچھ کہہ سکتا ہوں۔''

شانی کے دل میں امید کی کرن جاگی۔ اس نے کہا۔ ''آپ بہت ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ ہر پہلو پر غور کرلیں۔ اس کے علاوہ آپ راجو کے بارے میں بھی پوری تصدیق کرلیں۔ میں نے آپ کو کچھ غلط نہیں بتایا ہے۔''

کچھ دیر بعد شانی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے چوہدری کی طرف ایک کارڈ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں یہاں ہوٹل فاران میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ آپ نے اگر کچھ مزید پوچھنا ہو تو یہاں فون کر کے مجھ سے پوچھ لیں پھر آپ جو فیصلہ کریں اس کے بارے میں مجھے بتا دیجئے گا۔''

چوہدری بشیر نے کارڈ لے لیا اور پتھریلے تاثرات کے ساتھ شانی کو دیکھتا رہا۔ شانی دبیز قالین پر پاؤں دھرتی دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کے کندھوں پر ابھی تک سفید فام گریس کی شال تھی۔ اسے یہ شال لوٹانی تھی اور اپنی چادر واپس لینی تھی۔ وسیع کمرے کے دروازے کی طرف جاتے ہوئے شانی محسوس کر رہی تھی کہ چوہدری کی پُرتپش نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔ اس کے بدن کی ہر جنبش کا جائزہ لے رہی ہیں۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ یہ سات آٹھ قدم کا فاصلہ جلدی سے طے ہو جائے اور وہ چوہدری کی

نگاہوں کی زد سے باہر نکل جائے۔ ابھی وہ دروازے سے دو تین قدم دور تھی کہ چوہدری کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ''مُنے سے ملنا چاہتی ہو؟''

شانی بے ساختہ پلٹی اور امید بھری نظروں سے چوہدری کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کا سینہ دھک دھک کرنے لگا تھا۔ چوہدری اٹھا اور دھیمے قدموں سے چلتا شانی کے پاس آ گیا۔ اس کی پُرتپش نگاہوں نے سر سے پاؤں تک شانی کا جائزہ لیا۔ اس نے بڑی بے باکی سے شانی کا نرم کندھا تھاما اور بولا۔ ''تم یہ شادی رکوانے کے لئے یہاں آئی ہو۔ مجھے ابھی ٹھیک سے معلوم نہیں کہ تم ایسا کیوں چاہتی ہو، بہرحال تمہارے کہنے پر میں یہ شادی روک سکتا ہوں۔ تم مُنے سے بھی مل سکتی ہو۔ اس کے علاوہ بھی تمہاری جو شرطیں ہوں گے مجھے قبول ہوں گی لیکن اس سب کے بدلے میں میری بھی ایک شرط ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے چوہدری کا لہجہ بالکل ڈرامائی ہو گیا۔ شانی اس کو دیکھ رہی تھی۔ گھنی مونچھوں کے نیچے اس نے اپنے موٹے ہونٹوں کو حرکت دی۔ ''میں سب کچھ بھول کر، اب بھی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں..... اگر تم ہاں کہہ دو، تو میں سیف اللہ اور کوکب والے معاملے کو فل اسٹاپ لگا دوں گا۔''

شانی حیران نگاہوں سے چوہدری کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ ایک لمحے میں جیسے اس کی رگوں سے سارا خون کسی نے نچوڑ لیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ چوہدری کو کیا جواب دے..... اس کے لب بس تھرا کر رہ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ چوہدری کے کرخت چہرے سے نگاہ ہٹا کر واپس مڑ جاتی چوہدری نے بلند آواز میں فردوس کو پکارا اور کہا۔ ''منے کو یہاں لے کر آؤ۔''

شانی جیسے پتھرا گئی۔ اسے لگا کہ قدم زمین میں گڑ گئے ہیں۔ وہ آگے جا سکتی ہے نہ پیچھے۔ چند سیکنڈ بعد بالائی منزل پر قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی۔ پھر شانی کو لمبی تڑنگی فردوس سیڑھیوں پر دکھائی دی۔ وہی نوکرانی، جس کا سر ایک مرتبہ شانی نے لہولہان کر دیا تھا۔ شانی کے سامنے وہی تھا جو اس کے سپنوں میں آتا تھا جو کبھی منظر، کبھی آواز اور کبھی لمس بن کر اس کے اردگرد موجود رہتا تھا۔ شانی تڑپ گئی اور وہ تو تھا ہی بچہ۔ وہ چلایا اور فردوس سے ہاتھ چھڑا کر تیزی سے شانی کی طرف آیا۔ شانی بھی سب کچھ بھول گئی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی اور مُنا اس سے لپٹ گیا۔ وہ اس سے یوں چمٹا جیسے اس کے جسم کا ہی حصہ ہو۔ شانی اسے بے تحاشا چومنے لگی۔ چوہدری نے اشارہ کیا اور فردوس ان تینوں کو کمرے میں چھوڑ کر باہر چلی گئی۔ شانی مُنے سے پیوست تھی لیکن محسوس کر رہی تھی کہ چوہدری ان دونوں کو گہری نظروں

سے دیکھ رہا ہے۔ مُنا اس سے جدا ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ شانی اسے اپنے ساتھ لپٹائے ہوئے صوفے پر آ بیٹھی۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔ ایک بار پھر اس کا منہ سر چومنے لگی۔ ''تاتی! تم کہاں تلی (چلی) گئی تھیں۔ میں تم کو ڈھونڈتا رہا۔ میں بڑے دنوں تک روتا رہا لیکن تم مجھے چپ کرانے کے لئے نہیں آئیں۔ تم کیوں نہیں آئی تاتی؟'' وہ بڑے معصوم لہجے میں اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

''مم..... میں بیمار ہو گئی تھی بیٹا۔ ہسپتال میں تھی۔'' شانی نے اسے بہلایا۔

مُنے نے ذرا پیچھے ہٹ کر دھیان سے شانی کا چہرہ دیکھا۔ اپنے چھوٹے ہاتھوں سے اس کے رخسار سہلائے۔ ''اب تو تم بیمال نہیں ہوناں۔ اب تو تم کہیں نہیں جاؤ گی؟'' مُنے نے پوچھا۔

''اچھا بیٹا، نہیں جاؤں گی۔'' وہ اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔

مُنے نے چوہدری سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ابو جی! میں نے نئی امی نہیں لینی۔ میں تاتی کے ساتھ ہی رہوں گا۔ آپ سالے دلواجے بند کر دیں۔ تاتی اب کہیں نہیں جائیں گی۔''

چوہدری نے کہا۔ ''بیٹا! تمہاری چاچی دروازے بند کرنے سے نہیں رکے گی۔ اس کے دل میں ایک چور دروازہ ہے، وہ بند ہو گیا تو پھر شاید رک جائے۔ ورنہ ہم دونوں کو ہمیشہ ہی اس کی راہ دیکھنا پڑے گی۔''

''نہیں..... میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔'' مُنے نے ایک بار پھر بے تاب ہو کر شانی کے گلے میں باہیں ڈالیں اور اسے بھینچ لیا۔

شانی نے بہت کوشش کی لیکن وہ خود کو مُنے سے جدا نہ کر سکی۔ آخر اس نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''کیا، میں مُنے کو ایک دن کے لئے اپنے ساتھ لے جا سکتی ہوں؟''

وہ بے رحمی سے بولا۔ ''تم ایک دن کی بات کرتی ہو، میں چاہتا ہوں تم ہر وقت اس کے ساتھ رہو۔'' اس کا جملہ معنی خیز تھا۔

''میں فی الحال ایک دن کی بات کر رہی ہوں۔'' وہ سر جھکائے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے لے جاؤ، لیکن جو بات میں نے کہی ہے اس پر غور ضرور کرنا۔''

اس سے پہلے کہ شانی باہر نکلتی، دروازے پر دستک ہوئی۔ چند سیکنڈ بعد وہی انگریز عورت اندر داخل ہوئی جس کے بچے کو شانی نے بچایا تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی سرخ نظر آ رہی تھیں۔ یہ گریس تھی۔ اس نے ایک بار پھر تشکر کے انداز میں شانی کے دونوں ہاتھ

لئے۔اس نے بشیر کی طرف ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا اور بولی۔''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ذرا دیر مس کے ساتھ بات کرلوں؟''

''ضرور۔'' چوہدری بشیر نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔''آپ نشست گاہ میں آرام سے بات چیت کرلیں۔''

گریس نے انگلش میں چوہدری کا شکریہ ادا کیا اور شانی کے ساتھ نشست گاہ کی طرف آگئی۔مُنا بدستور شانی کی بانہوں میں تھا۔نشست گاہ میں جانے کے لئے دونوں برآمدے میں پہنچیں تو احاطے میں بدستور افراتفری کے آثار نظر آئے۔تالاب کے کنارے کئی افراد مُردہ ریچھ کی لاش کے گرد جمع تھے۔زیادہ تر مہمان واپس جا چکے تھے لیکن کچھ ابھی تک یہاں وہاں ٹولیوں کی صورت میں کھڑے تھے۔دونوں پہلوان عورتیں برآمدے میں ایک جانب لوہے کی کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔اب وہ پورے لباس میں تھیں۔شانی کی بس ایک نگاہ ان پر پڑی۔نہ جانے کیوں وہ شانی کو خجل سی نظر آئیں۔شاید انہیں اس بات کا احساس تھا کہ ایک عام سی دبلی پتلی لڑکی نے ان سے زیادہ دلیری اور جسمانی قوت کا مظاہرہ کیا ہے۔احاطے میں بکھری ہوئی کرسیوں کو اکٹھا کیا جا رہا تھا......

شانی اور گریس نشست گاہ میں آ بیٹھیں۔یہاں گریس کا انگریز شوہر بھی موجود تھا۔یہ چوڑے شانوں والا ایک دراز قد شخص تھا۔اس کی آنکھیں ہلکی نیلی تھیں۔عمر قریباً تیس بتیس سال ہوگی۔اس نے بھی آنکھوں میں آنسو بھر کر شانی کا شکریہ ادا کیا۔جس وقت ریچھ نے ڈیوی نامی بچے اور اس کی مقامی آیا پر حملہ کیا، یہ شخص چوہدری بشیر کے ساتھ کوٹھی کے اندر تھا۔بعد میں شور شرابا سن کر یہ لوگ باہر نکلے۔ریچھ پر ایک گولی چوہدری بشیر اور دوسری اسی اسٹیفن نامی شخص نے ایک گارڈ سے رائفل لے کر چلائی تھی۔

وہ تینوں کچھ دیر تک اس جانکاہ حادثے پر تبصرہ کرتے رہے۔اسٹیفن نے بھی تصدیق کی کہ ریچھ کے رکھوالوں نے اسے زیادہ مستی میں لانے کے لئے شراب پلائی تھی۔یہ ایک سنگین معاملہ تھا اور اب چوہدری بشیر کے اہلکار کوشش کر رہے تھے کہ اس معاملے کو کسی طرح دبایا جاسکے۔گریس نے بڑے جذباتی لہجے میں شانی سے کہا۔''میں اب تمہاری یہ چادر دینے والی نہیں ہوں اور نہ ہی اپنی چادر تم سے واپس لوں گی۔یہ ہمارے پاس ایک دوسرے کی نشانی رہے گی۔''

وہ بہت جذباتی نظر آرہی تھی۔شانی کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔''میں اور اسٹیفن انگلینڈ سے آئے ہیں۔چوہدری بشیر سے ہماری دوستی اس وقت کی ہے جب یہ کویت میں

تھے۔یہ ہمیں بہت دفعہ پاکستان آنے کا کہہ چکے ہیں۔اب یہاں پنڈی میں اسٹیفن اور ان کے دوست رائٹ کو ایک کام بھی تھا۔ہم نے سوچا یہ دونوں کام ہو جائیں گے۔'' گریس دیر تک اپنے بارے میں بتاتی رہی۔

وہ ایک اچھی خاتون لگتی تھی، لیکن پتا نہیں کیوں شانی کو محسوس ہوا کہ وہ یہاں اپنی آمد کے حوالے سے کچھ چھپا رہی ہے۔

شانی وہاں سے سیدھی ہوٹل پہنچی۔مُنا اس کے ساتھ تھا اور شانی کو لگتا تھا کہ پوری کائنات اس کے ساتھ ہے۔وہ جاگتی آنکھوں سے ایک...... پھولوں سے لدے ہوئے چھوٹے سے گھر کا جو خواب دیکھا کرتی تھی اس میں دو ہی تو کردار تھے۔ایک منا، جو اس کی بانہوں میں جھولا جھولتا تھا اور دوسرا فراخ شانوں اور چوڑے سینے والا وہ مرد جو بھاری قدموں سے چل کر آتا اور شانی اور مُنے کو ایک ساتھ بڑی محبت سے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتا تھا۔

☆======☆======☆

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
چوتھے حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔